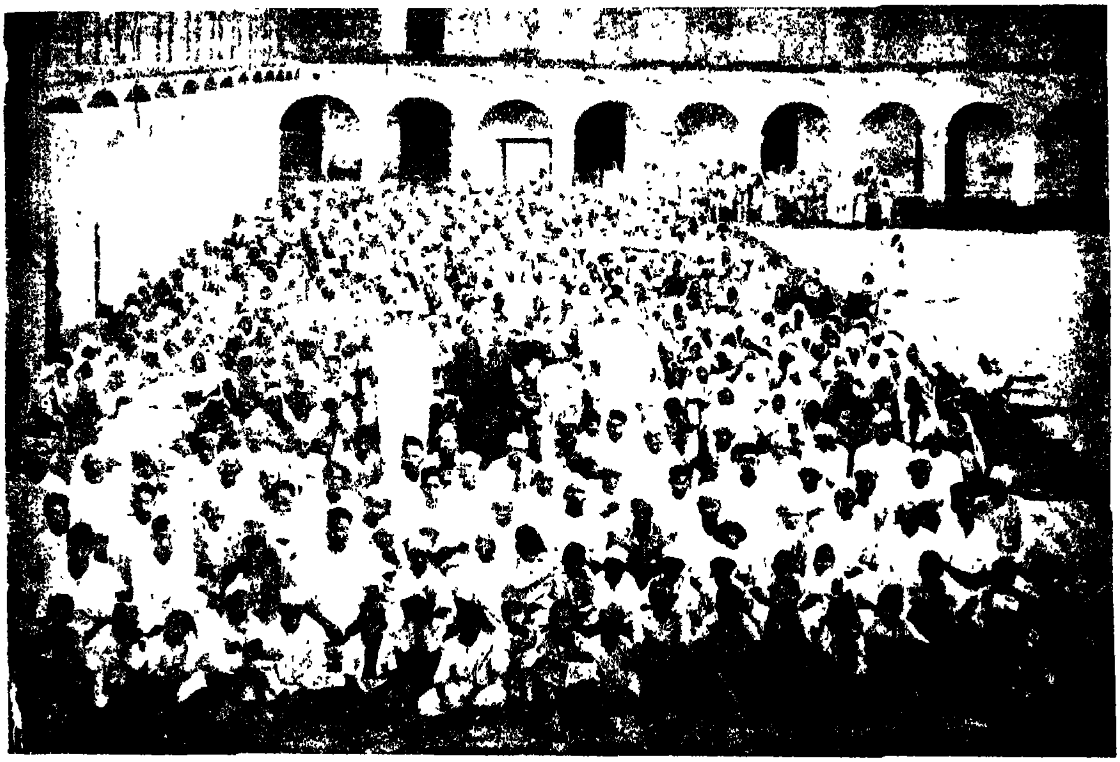
علم الانسان ما لم یعلم

کتبخانہ
جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی

شعبہ ۰۵۱
شمارہ ۴۲۱
عدد داخلہ ۱۶۱۱۱


سالانہ چندہ
معہ خاص نمبر
Checked 1966-67

شہ میان ڈاکٹر این آر صاحب شرما موجد پرل کلو یم آئی ڈراپ رجسٹرڈ اپنے زیر علاج آنکھوں کے مریضوں کے ساتھ قیام علی گڑھ آپ کے دائیں
طرف آپ کے پرسنل اسسٹنٹ پنڈت ایس ایل بھارگو بی اے ایم آر اے ایس ایف آر ٹی ایس ہیڈ ماسٹر [illegible] پنڈت امرو رداس صاحب آئی ایس اور
ایڈیشنل کمشنر [illegible] ریاست [illegible] پرل کلو یم آئی ڈراپ کی شیشی پکڑے کھڑے ہیں اس فوٹو میں آنکھوں کے زیر علاج مریضوں کی تعداد جو تین
ہزار وسو مرد [illegible] ۵۵ بڑے بڑے شہروں میں قیام فرماتے
ہوئے زائد از تین لاکھ آنکھوں کے امراض کے مریضوں کو شفا بخشی ہے



پرل کلو یم آئی ڈراپ رجسٹرڈ

فوائد سوائے پیدائشی اندھے کے آنکھوں کی تمام بیماریوں [illegible] کا دھبہ
بالکل باہر نکل آنا [illegible] آنکھ چوٹ سے ضائع ہونا [illegible] آنکھ کا ناسور [illegible] رات کو نظر
نہ آنا) دن اندھا دن کو نظر نہ آنا عینک لگانے کی عادت [illegible] وغیرہ کو شفا دیتی
ہے اگر اچھی آنکھوں میں بھی ہفتہ میں ایک دو بار ڈالا جائے تو بھی [illegible] قیمتیں [illegible] روپے چار آنے
نارمل تو شیشی بڑی شیشی چار روپے چار آنے چھوٹی شیشی [illegible] جو صاحبان دو شیشی بسیل
پو شیشی یا چھ شیشی بڑی یا ایک [illegible] نارمل پو شیشی کی [illegible] صرف
ایک تہائی وقت لیتی ہے [illegible]

منیجر پرل اینڈ کمپنی رجسٹرڈ کوٹھی بالمقابل نشاط تھیٹر ایبٹ روڈ - لاہور۔

MUSLIM UNIV
1911

ڈاکٹر این آر شرما (موجد پرل کلوریم آئی ڈراپ) اور پولیس کی نگرانی کی جلد ضرورت

ڈاکٹر شرما صاحب کے آنکھوں کے مریضوں کی روزانہ تعداد آج کل پندرہ سولہ سو تک پہنچ چکی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنا پروگرام قیام علی گڑھ پہلے ہفتہ اکتوبر تک رکھا ہے۔ مریضوں کی تعداد روز بروز ترقی پر ہے۔ جو دو وقتہ ڈاکٹر صاحب کے یہاں جاتے ہیں۔ اس وجہ سے اس طرف ٹریفک بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ ایسی صورت میں جلد اور سخت ضرورت ہے کہ صبح و شام ٹریفک کی نگرانی کی غرض کیلئے پولیس کا خاص انتظام کیا جاوے۔ ہم کو امید ہے کہ شہر کے منتظم کوتوال اس طرف ضرور توجہ فرماوینگے۔

ڈاکٹر شرما صاحب کی کامیابی کی شہادت مریضوں کے رجحان اور ان کی حالت کے اندازہ سے ہو سکتی ہے۔ امید ہے کہ علی گڑھ کی پبلک ڈاکٹر صاحب کے قیام علی گڑھ سے فائدہ اٹھا ویگی (خلاصہ اور سرگذشت علی گڑھ) ہزار ہا سفارشات و سرٹیفکیٹ میں سے

ایک ممتاز ترین رائے کا خلاصہ

عالیجناب نواب بہادر کیپٹن محمد عبد السمیع نواب آف طالب نگر سٹیٹ برادر رائٹ آنریبل سر نواب آف چھتاری سابق گورنر یو پی۔ آنکھوں کے مدہا مریض جن کو آنکھوں کے ماہر ڈاکٹر صاحبان نے لاعلاج قرار دیکر مایوس کر دیا تھا۔ وہ بکثرت ڈاکٹر این آر صاحب شرما کے علاج اور ان کی دوا (پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ) کے استعمال سے صحت کلی پاکر کامیاب ہو رہے ہیں اور تمام مریضوں کو جنکو دکھائی نہ دیتا ہو۔ پھولی۔ جالا۔ دھند ہر قسم۔ چیچک سے ضائع آنکھیں موتیا بند ہر قسم۔ آنکھ کا بیٹھ جانا۔ ناصور چشم، ککرے، پڑبال وغیرہ کو ضرور بالضرور ڈاکٹر صاحب کے علاج اور دوا سے فائدہ اٹھانا چاہئے اور اس زریں موقع کو جو قدرت نے اپنی فیاضی اور ہماری خوش نصیبی سے ہم کو عطا کیا ہے، ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہئے۔ دنیا میں ایسے کامل انسان کی مثال ملنا مشکل ہے۔

ہزار ہا مقتدر شخصیتوں میں سے ایک کے اسمائے گرامی جو پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ کے استعمال سے شفا ہونے کے بارہ میں پرزور سفارشات فرماتے ہیں ——— عالیجناب راؤ بہادر کنور سردار صاحب رئیس اعظم مراد آباد ممبر لیجسلیٹو کونسل یو پی چیرمین ڈسٹرکٹ بورڈ مراد آباد عالیجناب خان بہادر ملک محمد حسین صاحب سیشن جج صوبہ پنجاب و سابق پریذیڈنٹ میونسپل کمیٹی لاہور۔ عالیجناب راؤ بہادر سیٹھ جوالا سرن صاحب رئیس اعظم و ممبر لیجسلیٹو کونسل یو پی۔ عالیجناب ملک برکت علی صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی ایڈووکیٹ ہائیکورٹ لاہور ممبر لیجسلیٹو کونسل پنجاب عالیجناب رائے بہادر سیٹھ شوک پرشاد صاحب رئیس اعظم و بنکر بنارس شہر۔ عالیجناب خانصاحب محمد عبد السمیع سپرنٹنڈنٹ ٹیلیگراف ڈیپارٹمنٹ گورکھپور وغیرہ وغیرہ۔

ہزار ہا اخبارات ہیں۔ سے چند ایک جنہوں نے پرل کلوریم آئی ڈراپ کے استعمال سے لاعلاج آنکھوں کے شفا ہونے کے بارہ میں اپنی جانب سے ایڈیٹوریل نوٹ اور ریویو نکالنے کے علاوہ موجد کے فوٹو نکالے ہیں۔ پرتاپ لاہور۔ زمیندار لاہور۔ احسان لاہور۔ ملاپ لاہور۔ انقلاب لاہور۔ شہباز لاہور۔ ہندی ملاپ لاہور۔ خیام لاہور۔ عالمگیر لاہور۔ چتر الاہور۔ گورو گھنٹال لاہور۔ راجپوت لاہور۔ زمزم لاہور۔ منصور لاہور۔ شیر پنجاب لاہور۔ اکالی لاہور۔ پارس لاہور۔ آفتاب علی گڑھ۔ سرگذشت علی گڑھ۔ آج بنارس۔ ہندو دہلی۔ تیج دہلی۔ ارجن دہلی۔ پیغام بنارس۔ مشرق گورکھپور۔ آفتاب ہند علی گڑھ وغیرہ وغیرہ۔ مفصل معلومات کیلئے سامنے کے صفحہ کو ملاحظہ فرماویں۔

منیجر پرل اینڈ کمپنی رجسٹرڈ لاہور کوٹھی ۹ بالمقابل نشاط ٹاکیز ایبٹ روڈ لاہور

عالمگیر ہندوستان بھر کے مصوّر علمی و ادبی معیاری ماہناموں میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۳۴ — شمارہ اوّل

خاص نمبر ۱۹۴۱ء

تصاویر

(سہ رنگی) ۱۔ راز و نیاز ۲۔ لب بام ۳۔ شباب کی سمت

(یک رنگی) ۴۔ شیریں فرہاد ۵۔ غازی عصمت انونو،

۶۔ غازی اتاترک مرحوم ۷۔ ملکہ حبش کا نامۂ شوق ۸۔ مراکش کی مسجدیں

فہرست مندرجات ماہ دسمبر ۱۹۴۰ء

منظومات

مکتبہ جامعہ

خنداں — زندگی کے مختلف دلچسپ پہلوؤں پر پروفیسر رشید احمد صدیقی کا اعلیٰ قسم کا مزاح لطیف ترین طنز اور خواہ مخواہ دل کو گدگدا کر محظوظ کرنے والی تحریریں اگر آپ کو دیکھنا ہوں تو موصوف کی یہ نئی تصنیف ملاحظہ فرمایئے چالیس مضامین کا مجموعہ قیمت مجلد عہ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ - نئی دہلی

شاخیں
دہلی - لاہور - لکھنؤ - بمبئی

حافظ محمد عالم ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر از ریلوے روڈ لاہور سے شائع کیا!

ملاحظات

"عالمگیر" کا خاص نمبر ۱۹۴۱ء ہدیہ قارئین ہے اس کی ترتیب و تکمیل کیلئے ادارہ عالمگیر کو کس درجہ محنت و کاوش اور سعی و جہد سے کام لینا پڑا؟ اس کا صحیح جواب زیر نظر صفحات ہی دے سکیں گے لیکن جہاں تک فرض کی بجا آوری کا تعلق ہے قارئین ہم سے اتفاق کریں گے کہ کاغذ اور سامان طباعت کی بے انتہا گرانی کے باوجود ہم نے اس میں کوتاہی نہیں کی اور حتی المقدور ہندوستان کے بہترین علمی و ادبی گلستانوں سے گلچینی کر کے ایک ایسا نادر و نایاب گلدستہ تیار کر دیا ہے جو باصرہ نواز ہونے کے علاوہ فکر انگیز اور معلومات افزا بھی ہے۔

"خاص نمبر" میں کئی خاص چیزیں ایسی پیش کی گئی ہیں جن پر ہم مفصل تقریظ لکھنا چاہتے تھے لیکن افسوس "ملاحظات" کی تنگ دامانی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی اور ویسے بھی خاص نمبر میں اتنے مضامین نظم و نثر جمع کر دیئے گئے ہیں کہ ان پر تفصیلی گفتگو کرنا بحر ذخار کو کوزے میں بند کرنے کی سعی لاحاصل کے مرادف ہے تاہم قارئین کی توجہ ہم ان تین خاص چیزوں کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جو اپنے گوناگوں محاسن کی بنا پر اردو ادب میں یقیناً خاص درجہ حاصل کریں گی۔

ان میں سے پہلی چیز "سحر انور" کا دوسرا [illegible] ادیب کے دوسرے خطوط کی طرح اس خط میں بھی [illegible] دکھایا گیا ہے اور ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ میرزا صاحب کا یہ [illegible] ان کے گزشتہ تمام قصوں میں امتیازی درجہ رکھتا ہے۔

دوسری چیز "مقدس پیالہ" ہے یہ ڈراما انگریزی [illegible] کی حیثیت رکھتا ہے اور جناب رحمٰن مذنب نے اس کو [illegible] اردو میں منتقل کیا ہے کہ اصل کی خوبیوں میں سے کوئی [illegible]۔

تیسری چیز مشہور و معروف سنسکرت داں انگریز [illegible] ایف۔ ڈبلیو۔ بین کا ایک کیف انگیز رومان ہے جس کا ترجمہ جناب عشق احمد صاحب بی۔ اے نے نہایت کامیابی سے کیا ہے۔

عالمگیر خاص نمبر ۱۹۴۱ء

از:— ادارہ

پروفیسر حامد حسن قادری، مولانا اظہر امرتسری، مولوی بشیر احمد برہانپوری، محترمہ رقیہ بیگم سیوہاروی، مرزا محمد بشیر ایم اے، مولانا عبدالقیوم ندوی، علامہ [illegible] اور جناب [illegible] صاحب آتش اکبرآبادی نے اپنے [illegible] تحقیق و تدقیق سے لکھے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ان سے قارئین کی معلومات میں بہت زیادہ اضافہ ہوگا۔

افسانے صرف وہی پیش کئے گئے ہیں جو کسی نہ کسی خاص خوبی کے حامل تھے اور اس کے لئے دوسروں کے علاوہ جناب احمد ندیم قاسمی، جناب شفیق الرحمن، جناب مظفر واسطی، جناب بادشاہ حسین حیدرآبادی، جناب آتش [illegible]، جناب احسان علی شاد، جناب ایم۔ اے خاں یوسفی، جناب سالک لکھنوی، جناب ممتاز حسین لسبل، جناب عزیز احمد مستحق تشکر ہیں۔

منظومات کے متعلق غالباً صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ "خاص نمبر" میں ہندوستان کے ان تمام جدید و قدیم طرز میں کہنے والے اساتذہ و نوجوان شعرا کو جمع کر دیا گیا ہے جن پر ہندوستان کو بجا طور پر ناز ہے، ہم ان تمام حضرات کے ممنون احسان ہیں جنھوں نے ہماری استدعا پر "خاص نمبر" عالمگیر کے لئے اپنے رشحات گرامی ارسال فرمائے۔

بین الاقوامی حالات اگرچہ حد درجہ مخدوش اور حوصلہ فرسا ہیں لیکن ادارہ عالمگیر کے عزائم بہت بلند اور ترقی یافتہ ہیں چنانچہ عالمگیر کو جدید اردو ادب کی سطح پر لانے کے لئے گزشتہ دو سال سے جو کوششیں ہم کر رہے ہیں اب ان کے نتائج واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ماہ جنوری سے نہ صرف عالمگیر کے ظاہری محاسن میں نمایاں تبدیلی پیدا کی جائے گی بلکہ اس کی معنوی حیثیت کو بھی چار چاند لگانے کی کوشش کی جائے گی۔ امید ہے اہل قلم حضرات اس باب میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے اور معاونین کرام بھی حوصلہ افزائی کرنے سے دریغ نہ فرمائیں گے۔

ضروری تصحیح:— ۲۴۰ کے صفحے کے بعد غلطی سے ۱۴۱ چھپ گیا ہے صحیح نمبر ۲۴۱ ہے قارئین درست فرمالیں۔

عالمگیر بکڈپو کی جدید کتابوں کی فہرست صفحہ ۱۸۳-۱۸۴ پر ملاحظہ فرمائیے

مینائے امیر

غیر مطبوعہ کلام

از حضرت امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ

ملامت کے مزے اب یوں لئے جائیں
کہ برسے جائیے واعظ ہم پئے جائیں

قدم مے خانہ میں واعظ کے آئیں
تو ہاتھوں ہاتھ رندوں میں لئے جائیں

گریباں کی ہے کیا اے چارہ گر فکر
جگر کے چاک تو پہلے سئے جائیں

پتہ کیا کوئی انکے گھر کا پوچھے
وہ جب ہر اک دل میں گھر کئے جائیں

ترے خنجر کو زخموں نے کیا تنگ
بڑے منہ پھٹ ہیں منہ انکے سئے جائیں

امیر آنچل کا سایہ ڈالدیں وہ
کفن ہلکا سا میت کو دئیے جائیں

حقائق و معارف

جدید شاعری کا معشوق

از ـــــ ادارہ

شاعر کا معشوق مذکر ہو یا مؤنث؟ یہ ہے آج کل کی شاعری کا اہم ترین سوال جو بحث و نظر کے تمام دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔ اس وقت اس مسئلہ کے متعلق شاعروں کے تین طبقے ہیں۔ پہلا طبقہ وہ ہے جو اساتذہ کے نقشِ قدم پر چلتا ہے۔ یہ جماعت معشوق کو غیر مشروط طور پر مذکر بناتی ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جس کا رنگِ سخن طرزِ قدیم و مؤثراتِ جدید کے امتزاج سے پیدا ہوا ہے۔ یہ لوگ معشوق کی جنسیت کا کوئی خاص تعین نہیں کرتے۔ یا دوسرے لفظوں میں کچھ اس قسم کا انداز اختیار کرتے ہیں کہ معشوق کی جنسیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تیسرا طبقہ سلمیٰ و عذرا کا پرستار ہے۔ یہ گروہ اپنی شاعری کا نصب العین ایک حسین و جمیل عورت کا وصل قرار دیتا ہے۔ اگر ان تینوں جماعتوں کے اختلاف پر نظر ڈالی جائے تو یہی کہنا پڑیگا۔ اردو شاعری کیلئے کوئی خیالی معشوق متعین نہیں۔ یہی حالت آج سے ایک ہزار برس پہلے ایران میں تھی۔ عربوں کا سیلاب فتوح جب عراق کی حدیں پھاند کر ایران میں داخل ہوا تو عرب فاتح اپنے ساتھ اپنی فطری اور سادہ شاعری بھی لیگئے تھے۔ عرب شاعر کا معشوق مؤنث ہوتا تھا۔ چنانچہ زمانہ جاہلیت کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب شاعر اپنی شاعری کی آگ بھڑکانے کے لئے عموماً اپنے چچا کی بیٹی کو معشوق قرار دے لیا کرتا تھا۔ کیونکہ بعد کو وہ اس کی منکوحہ ثابت ہوتی تھی۔ وہ اسی کے حسن و جمال کی قصیدہ خوانی، اسی کے ناز و انداز کی ستائش، اسی کے ناز و غمزہ کی تشریح اور اسی کے ہجر و وصال کی حکایات سے اپنی شاعری کو جگمگاتا تھا۔ عربی شاعری میں چونکہ مقامی رنگ غالب ہوتا تھا اسلئے وہ حسن و عشق کے لوازم میں انہی امور کو شامل کرتا تھا جو عربی معاشرت و زندگی کا سنگِ اساس ہے۔ مثلاً متنبی اپنی ایک طویل نظم میں اپنی معشوقہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ:—

اے میری پیاری۔ میں اس خاندان سے تعلق
رکھتا ہوں جس کی دہشت سے بہادر تلواریں پھینک کر
بھاگ جاتے ہیں جن کے گھوڑے کی ٹاپوں سے ریگستان
کے ذرے اُڑ اُڑ کر ہوا سے ہاتھا پائی کرتے ہیں جن کی
تلواریں موت کی نیابت کرتی تھیں۔ کیا تو ایسے بہادر
خاندان کے رکن سے محبت نہ کرے گی۔

ایک اور جگہ وہ کہتا ہے کہ:—

شبِ مہتاب کی چاندنی نے ریگستان پر نور کی
چادر بچھا رکھی تھی۔ میں دبے پاؤں اپنی معشوقہ کے خیمہ
میں گیا اور اُسے نہایت رازداری سے باہر نکال لایا اور
ہم دونوں ریت کے ٹیلے پر بیٹھکر پیار محبت کی باتیں کرتے رہے۔

یہ تو تھی عرب کی سادہ شاعری۔ لیکن جب عربیت پر عجمی تصنع غالب آگیا تو اس فطری نغمے نے بھی مصنوعی لے اختیار کر لی۔ چنانچہ جب عرب ایران میں پہونچے تو وہاں کے مجوسی نژاد اور یہودی لڑکے حسن و زیبائی کے اعتبار سے ایرانیوں کے دلوں پر قابض تھے۔ اس سرزمین میں چونکہ امرد پرستی حد اعتدال سے گذر چکی تھی اسلئے تمام شاعر مجوسیوں اور یہودیوں کے حسین و جمیل بچوں ہی کی مدح سرائی منتہائے شاعری سمجھتے تھے۔ اس ماحول سے عربی دماغ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عم زاد لڑکی پر مرنے والے عرب بھی مغبچوں کے دامِ گیسو میں گرفتار ہو گئے۔ اس زمانے سے ایشیائی شاعری میں مذکر معشوق کو داخل ہونے کا موقع ملا۔ مجوسی لڑکے چونکہ میخانوں، کنشتوں اور مندروں میں رہا کرتے تھے۔ اسی مناسبت سے نغمہ سرایانِ حرم بھی کنشت و کلیسا کے گیت گانے لگے۔ لیکن جب ایرانی شاعری نے تصوف کی گود میں آنکھ کھولی تو اس رسم نے عقیدہ کی صورت اختیار کر لی۔ چونکہ معشوقِ حقیقی مذکر ہے اسلئے شاعرانہ معشوق کو بھی مذکرانہ خصوصیات کا حامل قرار دینا پڑا۔ ایرانی فاتح جب ہندوستان میں داخل ہوئے تو یہاں کی شاعری کیلئے ایک مذکر معشوق کو بنا سنوار کر لے آئے۔ اُس دن سے لے کر آج تک ہندوستان کی فارسی اور اس کے بعد اردو شاعری کیلئے مذکر معشوق ہی بہتر سمجھا گیا ورنہ ایرانیوں کی آمد سے پہلے ہندوستانی شاعری کا معشوق مذکر تو نہ تھا۔ لیکن شاعر اپنے آپ کو مؤنث ظاہر کرتا تھا۔ ایرانی اثر سے یہ انقلاب رونما ہوا کہ عاشق و معشوق دونوں مذکر بن گئے۔ یہاں تک کہ غالب جیسا فلسفی شاعر بھی مذکر معشوق کے ناز و جمال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے ؎

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست
دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست

سبزۂ خط سے تیرے کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرّد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہُوا

لیکن انقلابِ زمانہ دیکھیے کہ جدید ماحول نے جہاں ہماری تہذیب و معاشرت کو بالکل الٹ کر رکھدیا ہے وہاں اردو شاعر بھی ایک الٹی زقند بھر کر جاہلیتِ عرب کی اُس فضا میں پہونچ چکی ہے جہاں شاعر کا معشوق مؤنث ہوتا تھا۔ ہمیں اس جدّت طرازی پر اعتراض نہیں لیکن اردو شاعروں کو اخلاق و کردار کے اعتبار سے بھی شعرائے جاہلیہ کا ہم پایہ ہونا چاہیئے۔ اُس زمانہ کی شاعری خوش کرداری کے آغوش میں پل کر جوان ہوئی تھی۔ اور شاعر کا کیرکٹر دُنیا کے لئے مشعلِ تقلید ہوتا تھا۔ چنانچہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جاہلیہ کی ہر لڑکی شاعر عاشق کی تلاش میں رہتی تھی۔ چونکہ اس زمانہ کے شاعر بالکل فرشتہ سیرت ہوتے تھے۔ اس لئے یہ تجسّس واحتیاط کسی اعتراض وتنقیص کا مستحق نہ ہوتا تھا جس لڑکی کے چچا کا کوئی لڑکا نہ ہو (اگر ہو تو وہ شاعری سے محروم ہو) تو یہ لڑکی اپنے آپ کو بد قسمت خیال کرتی تھی۔ اس سلسلہ میں ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک عورت ایک اونٹ لے کر ایک شاعر کے ہاں گئی اور اُسے کہنے لگی کہ میری لڑکی کا چونکہ ہمزاد بھائی نہیں اس لئے تم اس کے عاشق بن جاؤ اور عاشقی کے عوض یہ اونٹ لے لو۔ شاعر نے یہ سودا کر لیا۔ تیسرے دن وہی عورت پھر شاعر کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ جس لڑکی کا میں نے تمہیں عاشق بنایا تھا اس کا آج نکاح ہونے والا ہے۔ لہٰذا تم میری دوسری لڑکی کے عاشق بن جاؤ۔ شاعر نے کہا اس کام کے ایک اور اونٹ لاؤ۔ کیونکہ پہلا اونٹ پہلی لڑکی سے شاعرانہ محبت کرنے کا معاوضہ تھا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس زمانہ کے شعراء کی اخلاقی حالت اس درجہ بلند تھی کہ غیور و غیرتمند عرب جو صرف ایک گالی پر کئی پشتوں تک لڑائیوں کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ شاعر کی محبت کو اپنی لڑکی کے لئے باعثِ مسرت خیال کرتے تھے۔ اگر ہمارے شاعر بھی ضبط و تزکیہ کے اعتبار سے اس بلندی پر پہنچ جائیں تو کتابِ ادبیات میں سے زمانۂ جاہلیت کا ورق اُلٹنے میں کوئی بُرائی نہیں۔ لیکن اس راہ میں بہت سی مشکلات حائل ہیں۔ اور یہ رکاوٹیں موروثی صورت اختیار کر چکی ہیں۔ اردو شاعری فارسی شاعری کی صدائے بازگشت ہے اور فارسی شعراء نے معشوق کے بارہ میں خداوندِ حقیقی اور کودکِ مجازی میں کوئی امتیاز نہیں کیا۔

چنانچہ حافظ کہتا ہے ؎

شکر صد شکر میانِ من و اُو صلح فتاد
حوریاں رقص کناں نعرۂ مستانہ زدند

اس شعر سے معشوق کی حقیقت ظاہر ہے۔

اب مجازیت ملاحظہ فرمائیے ؎

فغاں کیں لولیانِ شوخ و شیریں کارِ شہر آشوب
چناں بردند دل عاشق چو ترکاں خوانِ یغما را

مے دو سالہ و معشوق چاردہ سالہ
مرا خوش است بس ایں صحبتِ صغیر و کبیر

اسی اعتبار سے اردو شاعری میں بھی معشوق کی حقیقت مجازیت سے ہم آغوش نظر آتی ہے۔

سچ پوچھیے تو ہماری شاعری حقیقت و مجاز کے درمیانہ محلے پر کھڑی ہے۔ کبھی اُسے حقیقت کی زبان سے الستُ بربکم کی آواز سُنائی دیتی ہے تو وہ عارفانہ استغراق میں بلیٰ کہہ اُٹھتی ہے۔ کبھی اس کے کان میں معشوقِ مجازی کی شباب آزما آواز پڑتی ہے تو وہ تمام نفسانی عشرتوں کی طرف دوڑنے لگتی ہے۔ گویا حقیقت و مجاز کی کشمکش نے ہماری شاعری کو اصول و نصب العین سے بالکل محروم کر رکھا ہے۔ معشوق کی تعیین اُسی وقت ہو سکتی ہے یا تصوّف و معرفت کو شاعری سے علیحدہ کر دیا جائے یا سفلی اور نفسانی رجحانات کو شہرِ سخن میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ موجودہ حالت تو بالکل یہی ہے کہ ؎

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں
ایں خیال است محال است و جنوں

جب تک شاعری خدا و بُت کی رزمگاہ ہے معشوق کی تعیین ناممکن ہوگی۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ شاعری اس مرقع کا نام ہے جس میں انسان کی تمام وجدانی و نفسانی خواہشات کی تصویریں ہوتی ہیں۔ شاعر ان تمام احساسات کی ترجمانی کرتا ہے جو کفِ پا سے لیکر موئے سر تک حاوی ہیں۔ اور ان احساسات میں عرفانی و روحانی کیفیتیں بھی ہیں۔ خدا و بندہ کے رموز و اسرار بھی ہیں۔ اور دنیوی عشرتوں کی تمنائیں بھی۔ شاعر وہی کامل ہو سکتا ہے جو تمام وجدانیات کی تصویر بوجوہ تمام کھینچ سکے جس طرح مصوّر کوئی تصویر بناتے وقت جسم کے سفلی حصہ یا علوی جزو کو نظر انداز نہیں کر سکتا اسی طرح شاعر بھی فرائضِ ترجمانی ادا کرتے وقت احساسات کی لطافت و کثافت کے جھگڑے میں نہیں پڑتا۔ اس اعتبار سے سفلی محبت اور علوی عشق میں حدِ امتیاز قائم کرنا شاعر کیلئے بہت زیادہ مشکل ہے۔ تاہم اگر حقیقت و مجاز کیلئے مناسب حدیں

قائم کرلی جائیں تو یہ الجھن بڑی حد تک دور ہوسکتی ہے لیکن حدود کا قائم کرنا ہی محال ہے۔ اس میں شک نہیں کہ چند شاعر ایسے بھی ہوسکتے ہیں جو عرفان و تصوف کی وادی سے دور رہ کر صرف سلمیٰ و عذرا ہی کے تصور میں محو رہتے ہیں۔ لیکن ان کا رویہ شاعری کیلئے قولِ فیصل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ایک عام تبدیلی اور ہمہ گیر انقلاب کی ضرورت ہے جس کے اسباب و علل پر اردو شعراء کو دور اندیشی سے سانحہ غور کرنا چاہیئے

آخر میں ہم اس تلخ حقیقت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مذکر معشوق نے جہاں عرفان و تصوف کے حقائق و معارف کی راہ اظہار آسان بنادی ہے وہاں غیر فطری عشق و محبت کو بھی غیر ضروری طور پر تقویت پہنچائی ہے۔ اس طرح مؤنث معشوق نے محبت کے پاکیزہ جذبہ کو اس درجہ عریاں کردیا کہ اس پر ہوس کا گمان ہوتا ہے۔ لہٰذا ان مشکلات کے پیش نظر اس مسئلہ پر غور ہونا چاہیئے۔

اخبار وافکار

از ——— ادارہ

مولینا اظہر امرتسری کی رفتارِ صحت!

ہم قارئین کو پہلے اطلاع دے چکے ہیں کہ مولینا اظہر امرتسری کی بائیں آنکھ کی پتلی پر ایک ورم ہوگیا تھا جس کے پھٹ جانے سے آپ کی اس آنکھ کی بصارت زائل ہوگئی۔ لاہور کے اکثر ماہرین چشم کے علاوہ صوبہ پنجاب کے سب سے بڑے دارالصحت "میو ہسپتال" نے بھی فتویٰ دے دیا کہ ایلوپیتھی کے نزدیک اب یہ آنکھ لاعلاج ہے۔ لیکن ڈاکٹر این آر شرما (موجد پرل کلوریم آئی ڈراپ) نے یقین دلایا کہ چار ساڑھے چار ماہ کے باقاعدہ علاج سے یہ مایوس امید کی روشنی قبول کرنے کے قابل ہوجائیگی۔ چنانچہ مولینا اظہر نے ڈاکٹر صاحب موصوف کی ہدایات کے ماتحت پرل کلوریم آئی ڈراپ کا باقاعدہ استعمال شروع کردیا اور اب ہمیں یہ اعلان کرنے میں مسرت ہوتی ہے کہ بناوٹ کے لحاظ سے مولینا کی آنکھ سو فی صدی درست ہوگئی ہے اور پہلے کی طرح اب نہ تو سر میں درد ہوتا ہے نہ آنکھ سے پانی بہتا ہے۔ اور بینائی بھی اسقدر آگئی ہے کہ بائیں روشنی اور رنگ دونوں میں بخوبی تمیز ہوسکتی ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ان کی بائیں آنکھ بھی دائیں آنکھ کی طرح ذی بصارت ہوجائے گی۔ ڈاکٹر این آر نہایت محنت و توجہ سے مولینا کا علاج کررہے ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ نے جس ہمدردی اور حسن اخلاق کا ثبوت دیا۔ اس کیلئے ادارۂ عالمگیر آپ کا بہت زیادہ ممنون ہے۔

ڈاکٹر صاحب ایک کہنہ مشق اور تجربہ کار ماہر چشم ہیں اور ہزاروں لاکھوں مریض آپ کے کمالات سے فیضیاب ہوچکے ہیں۔ ہم ہندوستان کے تمام مریضانِ چشم سے درخواست کرینگے کہ وہ مایوس ہونے یا اپریشن وغیرہ کی زحمت گوارا کرنے سے قبل کم سے کم ایک مرتبہ ڈاکٹر این آر شرما (موجد پرل کلوریم آئی ڈراپ) سے ضرور مشورہ کرلیں۔

۱۹۴۱ء کی مطبوعات!

عالمگیر بکڈپو لاہور کے کارکنوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ۱۹۴۱ء کا آغاز ہوتے ہی علمی و ادبی ذخائر میں شاندار اضافہ کیا جائے چنانچہ ذیل کی معرکہ آرا کتابیں زیرِ طباعت ہے۔

۱۔ **خونی تحریکیں**۔ (از مولانا اظہر امرتسری) جس میں عہد اسلامیہ کی ان مسلسل ہمہ گیر انقلاب انگیز تحریکات کا مفصل تذکرہ ہے جن کے اثر و اقتدار سے ملوکانہ قوتوں کو بھی جائے پناہ ڈھونڈنا پڑی۔ تاریخی واقعات کو ادیبانہ سحر نگاری کا لباس اس خوبی سے پہنایا گیا ہے کہ واقعات ماضی جدید ماحول میں نظر آنے لگتے ہیں۔ ان میں تحریکات عباسیہ۔ علویہ۔ باطنیہ۔ قرامطہ۔ مہدویہ۔ کاذبیہ اور وہابیہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۲۔ **نادر شاہ**۔ (از شبلی بی کام) نادر شاہ کی شجاعت و سطوت سے صرف افغانی تاریخ ہی دوپہر کے سورج کی طرح روشن نہیں بلکہ اسکی عاشقانہ ہنگامہ آرائیاں بھی کتابِ ماضی کا وہ باب ہیں جس کی ایک ایک سطر کیف و سرور اور عشق و شوق کی آئینہ دار ہے۔ یہ کتاب اسی اجمال کی دلآویز تفصیل ہے۔

۳۔ **نورجہاں اور جہانگیر**۔ اس تاریخی معاشقے کو مولانا احمد ایم اے نے افسانہ کا لباس پہنایا ہے۔ مصنف کی جادو نگاری نے گلستانِ تاریخ کے اس مرجھائے ہوئے پھول کو بہارِ تازہ بخشی ہے۔

ان کے علاوہ **"تاریخی مضامین"** (کوثر چاندپوری)۔ **"رنگین افسانے"** (ماہر القادری) **"میری سیاہ کاریاں"** (تیرتھ رام فیروزپوری) **"صبح مسرت"** (رفیع اجمیری) بھی زیورِ طباعت سے آراستہ ہورہی ہیں۔ قارئین کو چاہئے کہ ان دلچسپ اور مفید کتابوں کو حاصل کرنے کیلئے اپنا آرڈر جلد سے جلد عالمگیر بکڈپو سید مٹھا بازار لاہور کو بھجوادیں تاکہ یہ کتابیں تیار ہوتے ہی ان کو بھجوادی جائیں۔

راز و نیاز



بہشت اک نام ہے شاید اُسی پاکیزہ گوشے کا
جہاں ہم تم ملا کرتے ہیں چھپ کر چشم عالم سے

موجِ فصاحت

پردہ اُٹھا بھی نہیں اور آنکھیں خیرہ ہو گئیں

از استاذ السلطان فصاحت جنگ حضرت جلیل مانکپوری

حُسن کی نیرنگیاں جس دم نمایاں ہو گئیں — جلوۂ رُخ سے نگاہیں گل بداماں ہو گئیں

آخرش بیتابیاں راحت کا ساماں ہو گئیں — اُلجھنیں اتنی بڑھیں زلفِ پریشاں ہو گئیں

کیا اثر ہے موسمِ گُل کا گھٹا سے باغ میں — بجلیاں گُل ہو گئیں گُل سے گلستاں ہو گئیں

پھول کیا، کوئی حسیں کیا جب سے آئی ہے بہار — پیاری پیاری صورتیں سب آفتِ جاں ہو گئیں

حُسن دیکھا ہے بہت لیکن یہ صورت اور ہے — پردہ اُٹھا بھی نہیں اور آنکھیں حیراں ہو گئیں

ہیں کوئی گلچیں نہیں لیکن جو آئی فصلِ گُل — پھول سب کھل کر مرے دامن کی کلیاں ہو گئیں

یہ غلط ہے حُسن کو کچھ عشق کی پروا نہیں — آہ کی میں نے تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

دن کو تھیں آنکھیں مری گہوارۂ طفلِ اشک کا — رات کو جولانگہِ خوابِ پریشاں ہو گئیں

حسرتوں کا سلسلہ کب ختم ہوتا ہے جلیل

کھل گئے جب گل تو پیدا اور کلیاں ہو گئیں

مسیلمہ کذّاب کی معشوقہ

"خونین تحریکیں" کا ایک باب

از :۔ مولانا اظہر امرتسری،

سجاح بنت حارث، قبیلہ بنو تمیم کی ایک ممتاز عورت تھی، بنو تمیم اس زمانہ میں عرب کے شمال مغربی گوشہ میں آباد تھے جو فرات و دجلہ کے دوآبہ میں واقع ہے۔ اسی اعتبار سے اس علاقہ کو الجزیرہ کہا جاتا ہے۔ سجاح مسیحیۃ المذہب تھی اور اپنے ہم عقیدہ لوگوں میں راہبہ و کاہنہ کی حیثیت سے مشہور تھی، وہ اس درجہ فصیح البیان تھی کہ اس کی ہر بات پر چلتے ہوئے جادو کا گمان ہوتا تھا، اس درجہ بلیغ تھی کہ ہر جملہ نکات و اسرار کا حامل نظر آتا تھا، اس قدر فہیم و عقیل تھی کہ اپنی دور اندیشی کے باعث آنے والے وقت کا نقشہ صفحۂ حال پر کھینچ دیتی تھی۔ لیکن ان خوبیوں کے علاوہ جس وصف نے اسے ریگستان عراق میں ممتاز کر رکھا تھا وہ اس کا حسن جہانسوز تھا۔

نبوّت کا دعویٰ

سنہ ۱۱ھ میں جب مسیلمہ کی نبیّت کا سورج نصف النہار پر تھا اس زمانہ میں متذبذبین اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ رسول ہاشمیؐ پر نبوت و رسالت کی جو منزل ختم ہوئی تھی اس کے لئے نیا رستہ کھل چکا ہے۔ سجاح نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نبوّت کا دعویٰ کر دیا۔ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس دنیا سے رخصت ہوئے تو اس وقت الجزیرہ سے حسن و لطافت میں ڈوبی ہوئی ایک آواز اٹھی، یہ آواز سجاح کے منہ سے نکلی تھی جس نے دجلہ و فرات کے ساحلوں پر اعتقادی انقلاب برپا کر دیا سجاح نے کہا کہ میں غیر مشروط طور پر نبیّہ ہوں۔ کتاب الادیان میں لکھا ہے کہ جب اس سے پوچھا گیا کہ تمہارا محمد علیہ السلام کی نبوت کے متعلق کیا خیال ہے تو اس نے جواب دیا "وہ نبی برحق تھے اور ان کے خاتم النبیین ہونے میں شبہ نہیں، مگر وہ خاتم النبیات نہیں تھے۔ مردوں کی نبوت تو واقعی ختم ہو چکی ہے۔ اب عورتوں کی رسالت کا زمانہ آیا ہے اور اس عہد کی میں سب سے پہلی نبیّہ ہوں۔"

سجاح کا کرشمۂ حسن

بعض لوگوں نے کہا کہ اگر تم نبیّہ ہو تو کوئی معجزہ دکھاؤ۔ سجاح نے اپنی نرگسی آنکھوں کو جنبش دیتے ہوئے کہا کہ میں بذاتِ خود معجزہ ہوں میرا حسن ہی میری صداقت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس زمانہ میں سجاح چونکہ عالم دلربائی میں فرد تھی اس لئے سب کو یہ معجزہ تسلیم کرنا پڑا۔ سجاح کے تیر اعتقاد کا سب سے پہلا شکار قبیلہ بنو تغلب کا رئیس تھا جس نے اس کے حسن سے مسحور ہو کر مسیحیت ترک کر دی اور سجاح کا دین اختیار کر لیا،

عرب میں خواہ لاکھ خوبیاں ہوں لیکن اس کی یہ کمزوری چھپائے نہیں چھپتی کہ وہ حسن اور جدّت کا دلدادہ ہوتا ہے۔ سجاح کے دین سے یہ دونوں چیزیں وابستہ تھیں، اس لئے اسے دن دونی رات چوگنی ترقی ہونے لگی، سینکڑوں حسن پرست محض جذبات محبت سے مجبور ہو کر اس کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہو گئے اس کے بعد اس نے شیوخ عرب کو تحریری طور پر دعوت دی، چونکہ سجاح کے حسن کا شہرہ گھر گھر پہنچ چکا تھا اس لئے الجزیرہ کے اکثر شیوخ نے اپنے دل سے مجبور ہو کر اس کا دین قبول کر لیا۔

بنو تمیم پر حملہ!

جب اعتقادی طور پر سجاح کامیاب ہو گئی تو اسے حکمرانی کا شوق بیقرار کرنے لگا۔ وہ موجودہ زمانہ کے متنبیّوں کی طرح تو تھی نہیں کہ غلامی اور بزدلی ہی کو منشائے نبوّت قرار دے لیتی اسے معلوم تھا کہ جس مذہب پر سیاسی قوت کا ہاتھ نہ ہو وہ میدان زندگی میں زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتا اس لئے سجاح نے اپنی جماعت کو عسکری نظام سے بدلنا شروع کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ مردوں کی نبوّت چونکہ ختم ہو چکی ہے اس لئے مردانہ خلافت کا وجود بھی غیر ضروری ہے لہٰذا وہ مدینہ پر فوجکشی کرنے پر آمادہ ہو گئی، لیکن الجزیرہ کے قبائل میں خانہ جنگی کی آگ پوشیدہ طور پر سلگ رہی تھی جسے شعلہ زن کرنے کے لئے دونوں پارٹیوں کے لیڈر بیقرار تھے بنو تمیم کی مخالف جماعت کے شیخ کا نام وکیع ابن مالک تھا، اس نے سجاح کو اپنی اغراض کے دام میں الجھا لیا، اور سجاح نے ابن مالک کے کہنے پر مدینہ پر چڑھائی کرنے کی بجائے بنو تمیم پر حملہ کر دیا، تمیمی پہلی جھڑپ کی بھی تاب نہ لا سکے وہ بے سروسامانی کی حالت میں ادھر ادھر بھاگ نکلے۔ لیکن سجاح کی فتح

بھی اس کے لئے کامیابی کا باعث نہ ہو سکی، چنانچہ بنو رباب اور بنو ضبہ نے متفق ہو کر اس پر دھاوا بول دیا۔ آخر گھمسان کی لڑائی کے بعد سجاح کو بُری طرح پسپا ہونا پڑا لیکن دونوں فاتح قبیلے سجاح کی تیغ حسن سے مسخر ہو گئے، انھوں نے اس کا مذہب اختیار کر لیا اور متفقہ قوت سے مدینہ پر حملہ کرنے کی ٹھان لی۔ وہ ہزاروں جانبازوں کا لشکر لے کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئی لیکن رستہ ہی میں نباح کے مقام پر اوآس بن خزیمہ نے بنی عمرو کے نوجوانوں کو لیکر اس پر حملہ کر دیا جس میں لشکر سجاح کے دو سالار گرفتار کر لئے گئے۔ سجاح نے جب دیکھا کہ بنی عمرو کا مقابلہ کرنا آسان نہیں تو اس نے ان سے صلح کر لی۔ اس مصالحت پر ابن مالک ناراض ہو گیا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر واپس چلا آیا۔

مسیلمہ کی دعوت ملاقات

اس کے بعد سجاح آگے چل پڑی۔ رستہ میں اُسے خدا جانے کیا خیال آیا کہ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگی کہ مجھے خدا کی طرف سے حکم ہوا ہے کہ یمامہ پر حملہ کیا جائے اس زمانہ میں یمامہ اور اس کے قرب و جوار میں مسیلمہ کی نبوّت کا طوطی بول رہا تھا اور وہ شرجیل اور عکرمہ کو شکست دینے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ مسیلمہ نے جب دیکھا کہ سجاح طوفانی ندی کی طرح بڑھتی چلی آرہی ہے تو اسے فکر دامنگیر ہوئی کہ اگر اس سے لڑائی چھیڑ دی گئی تو اسلامی لشکر کو آگے بڑھنے کا موقع مل جائے گا، لہٰذا اس نے حکمت عملی سے کام لینا شروع کر دیا، اور بنو حنیفہ کے چالیس مدبّروں کو سجاح کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ پہلے عرب کا سارا ملک آدھا ہمارا اور آدھا قریش کا تھا لیکن قریش نے بدعہدی کی ہے اس لئے ان کا حصہ میں تمھیں دیتا ہوں، بنو حنیفہ کا وفد جب سجاح کے پاس پہنچا تو وہ جہاں اسے مسیلمہ کی شرط منوانے میں کامیاب ہو گیا وہاں ارکان وفد نے صحیح طور پر یہ اندازہ بھی لگا لیا کہ یہ خوبصورت عورت تلوار کی بجائے محبت سے زیادہ متاثر ہو سکتی ہے انھوں نے واپس آکر مسیلمہ کو تمام حالات سے آگاہ کیا۔ وہ ایسے موقع کے انتظار میں پہلے ہی سے تھا اس لئے سجاح کو دعوت ملاقات دی گئی جسے اُس نے منظور کر لیا۔

آراستہ خیمہ میں

مسیلمہ نے ایک آراستہ خیمہ نصب کیا جس میں قسم قسم کی خوشبوئیں لا کر رکھ دی گئیں کیونکہ اسے معلوم تھا کہ عورت کا جذبۂ محبت خوشبو سے بیدار ہو جاتا ہے۔ سجاح بن ٹھن کر دلربایانہ انداز میں اس کے پاس آئی

مسیلمہ اگرچہ عمر کے اعتبار سے قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا لیکن اس کا جسم جوانوں کی طرح توانا اور دلکش تھا۔ مسیلمہ نے سجاح سے سب سے پہلے یہ سوال کیا کہ کہئے آج آپ پر وحی نازل ہوئی ہے یا نہیں؟ اس نے کہا، "نہیں، البتہ آپ اپنی وحی سے مجھے آگاہ کریں۔"

مسیلمہ بہت عقیدت فہم تھا، اس کی نظریں سجاح کے دل میں ڈوب کر جذبات کا مطالعہ کر رہی تھیں، اس لئے وہ سمجھ چکا تھا کہ اس عورت کی رسالت پر ہوس رانی کا جوش غالب آچکا ہے اس نے کہا آج مجھ پر یہ وحی نازل ہوئی ہے۔

"الم ترالی ربک کیف فعل بالحبلی۔ اخرج منھا نسمۃ تسعی بین صفاق وحشی"۔ یعنی ــــ "کیا تم اپنے رب کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ حاملہ عورتوں سے کیسا سلوک کرتا ہے ان میں سے چلتے پھرتے جاندار پیدا کرتا ہے جو پیدائش کے وقت پردوں اور جھلیوں سے لپٹے ہوتے ہیں۔"

یہ وحی سجاح کے سفلی جذبات کی ان سنی آواز کا صحیح جواب تھی اس لئے وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔ جوش شباب نے شرم و حیا کی حدیں پھاند کر بے تکلفی کے میدان میں کودنا چاہا۔ لیکن اُس نے مسیلمہ کی الہام میں لپٹی ہوئی ہوس رانی کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے دوبارہ کہا کہ کوئی اور آیت سنائے۔ مسیلمہ نے جواب دیا کہ یہ آیتیں بھی آج ہی نازل ہوئی ہیں۔

"ان اللہ خلق النساء افراجا وجعل الرجال لھن ازواجا فنولج فیھن ایلاجا ثم نخرجھا اذا نشاء اخراجا فینتجن لنا سخالا انتاجا ــــ" ان آیتوں میں شب عروسی کے خلوت افروز معاملات کا تذکرہ نہایت بیباکی کے ساتھ کیا گیا تھا اس لئے مسیلمہ کا "الہام" سجاح کے سمند ہوس پر تلملا دینے والا تازیانہ ثابت ہوا۔ بالآخر ہوس نے آنکھیں کھولیں۔ شرم و حیا اور عفت کروٹ بدل کر سو گئی۔ دونوں رات بھر باغ عشرت کی گلچینی میں مصروف رہے۔

شب زفاف کے بعد

جب سورج نے پردۂ افق سے اس انوکھے تماشے کو جھانک جھانک کر دیکھنا شروع کیا تو ایک آراستہ خیمہ میں سجاح کے پیراہن نبوّت کی دھجیاں اڑ چکی تھیں اور اس کے ساتھ ہی دامن عفت پارہ پارہ ہو چکا تھا لیکن دونوں کے اُمتی باہر کھڑے اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ شاید سجاح و مسیلمہ پر الہامی استغراق کی کیفیت طاری ہے مگر یہاں تو

کچھ اور ہی عالم تھا، اور اس استغراق کا سلسلہ متواتر تین شبانہ روز جاری رہا۔ مسیلمہ اگرچہ بوڑھا تھا لیکن ایک پیکرِ شباب کی ہم آغوشی سے اُسے جوانی کی دولت دوبارہ میسر آگئی۔ جب تیسرے دن دونوں کے ارمان معصیت کا لباس پہن کر نکل گئے تو سجاح خیمہ سے باہر نکلی، اس کا گلِ حسن صرصر ہوس کے جھونکوں سے کسی حد تک مرجھا چکا تھا۔ لیکن گفتار و کردار میں صبح بہار کی رنگینیاں سکرا رہی تھیں اس کی پیشانی پر اگرچہ عرقِ ندامت کے قطرے چمک رہے تھے لیکن ہونٹوں پر بناوٹی سکراہٹ تھی۔ تاکہ لشکریوں میں سے کسی کو "بلبل چہ گفت، گل چہ شنید و صبا چہ کرد" کے مسئلے سے آگاہی نہ ہوسکے لیکن عشق اور شعلہ رموز و اسرار کے تنکوں سے چھپا نہیں کرتا اس لئے فوجی سردار سجاح کے روّیہ کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ انھوں نے بیقراری کے ساتھ پوچھا کہ مسیلمہ کے ساتھ کیا قرار پایا۔ سجاح بات کو چھپانا چاہتی تھی لیکن اس کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا کہ مسیلمہ واقعی سچا رسول ہے اور میں نے اس سے نکاح کرلیا ہے کیونکہ مرسلہ کے لئے ایک رسول کی بھی ضرورت تھی۔ انھوں نے پوچھا کہ مہر کیا ٹھہرا ہے؟ اس سوال پر سجاح سٹپٹا سی گئی اور اس نے مارے ندامت کے آنکھیں جھکا لیں اور دبے لب سے کہنے لگی کہ افسوس یہ بات تو کہنا میں بھول ہی گئی۔ سردار بہت زیادہ برافروختہ ہوئے اور غضبناک لہجہ میں کہنے لگے کہ تم نے تو خاندان کی ناک ہی کٹوا دی بے مہر کا نکاح تو اس عورت سے باندھا جاتا ہے جو مغویہ ہو۔ اگر تم نے مسیلمہ سے زرِ مہر نہ لیا تو عرب میں مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہوگی۔

سجاح کا حق مہر

سجاح اپنی غلط کاری پر بہت پشیمان ہوئی اور تلافی مافات کے لئے مسیلمہ کے پاس دوبارہ گئی۔ لیکن وہاں جاکر دیکھا تو خیمہ کا نام و نشان تک نہ تھا اور مسیلمہ قلعہ کے دروازے بند کرکے محصور ہوچکا تھا کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ کہیں سجاح کے پیرو اس عیش پرستانہ نکاح سے مشتعل ہوکر حملہ نہ کردیں۔ سجاح نے قلعہ کے دروازے پر پہنچ کر دربانوں کی معرفت دعوت ملاقات دی لیکن مسیلمہ نے اس پیغام کو مزعومہ خطرے کا پیش خیمہ سمجھا، اس لئے دروازے پر تو نہ آیا لیکن قلعہ کی دیوار پر کھڑا ہوکر پوچھنے لگا۔ "کہو سجاح کیا کہتی ہو؟ ـــــ" سجاح نے کہا کہ تم نے میری عارضی خواہشوں سے فائدہ اٹھاکر نکاح تو کرلیا لیکن یہ تو بتاؤ کہ حق مہر کیا مقرر کیا ہے؟ مسیلمہ نے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا کہ تمھارے ساتھ تمھارا منادی بھی ہے؟ سجاح نے جواب دیا کہ ہاں شبیث بن ربیع میرا موذن یہیں ہے

کہا ـــ "تو جاؤ منادی کرادو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی معرفت جو پانچ نمازیں فرض کی گئی تھیں ان میں سے خدا نے فجر اور عشاء کی نماز مسیلمہ کے مہر کے طور پر معاف کردی ہیں۔"

اسلامی لشکر کی یلغار

اس واقعہ کے بعد سجاح کے عقیدتمندوں میں اس کے متعلق بدگمانی پیدا ہوگئی اور وہ پکار پکار کر اس مفہوم کا شعر پڑھنے لگے کہ ہماری نبی وہ عورت ہے جسے ہم ساتھ ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ حالانکہ دوسرے لوگوں کے رسول مرد ہوتے ہیں۔

اس کے بعد مسیلمہ نے سجاح سے کہا کہ یمامہ کی نصف پیداوار تمھاری ہے اور اس آدھے حصہ میں سے آدھا تو آپ لے جاؤ اور آدھے حصے کی وصولی کے لئے اپنے آدمی چھوڑ جاؤ۔ سجاح نے اپنے تین آدمی اس کام کے لئے چھوڑ دیئے اور اپنے لشکریوں کے ساتھ جزیرہ کو روانہ ہوگئی لیکن رستہ ہی میں اس کی بدقسمتی خالد ابن ولید کے بھیس میں رونما ہوگئی۔ خالد کو دیکھتے ہی سجاح کے آدمی اس درجہ حواس باختہ ہوئے کہ لڑائی کی دعوت کا انتظار کئے بغیر ہی بھاگ نکلے۔ سجاح بھی بھاگ کر جزیرہ میں آگئی۔ اور اس کے جو عامل یمامہ میں مقیم تھے وہ بھی اسلامی لشکر کی یلغار کے وقت بھاگ گئے۔

سجاح کا انجام بخیر

سجاح جب جزیرہ میں پہنچی تو اس کا حلقۂ عقیدت ختم ہوچکا تھا کوئی اُسے مُنہ لگانے پر آمادہ نہ تھا اس کس مپرسی کے باعث اس کا دماغ جنون نبیت سے پاک ہوگیا اور تمام ہنگامہ آرائیوں سے الگ ہوکر تنہائی کی زندگی بسر کرنے لگی۔ بالآخر جب امیر معاویہ کا عہد آیا تو قبیلہ بنو تمیم میں اس درجہ قحط پڑا کہ شکم پری کے لئے کوئی وسیلہ و ذریعہ نہ رہا۔ امیر معاویہ نے ازراہ مہربانی بنو تمیم کے تمام قبیلوں کو بصرہ کے قرب وجوار میں لاکر آباد کیا۔ سجاح بھی مہاجرین کے ساتھ تھی۔ اس نے یہاں آتے ہی اسلام قبول کرلیا اور ایک متقی، پرہیزگار اور پابندِ شریعت دخترِ اسلام کی حیثیت میں اس جہاں سے رخصت ہوئی۔



ڈرائنگ ماسٹر

افسانہ

از جناب احمد ندیم قاسمی بی اے

آج اتوار کا دن تھا۔ ہائی اسکول کے تمام استاد اپنے اپنے گھروں میں اپنے بے شمار ننھے ننھے بچوں کو گھٹنوں اور کاندھوں پر بٹھا کر بیٹھے تھے۔ کسی کی نظر اس کڑاہی پر جمی ہوئی تھی جس میں سُوجی کا حلوہ پک رہا تھا اور چولھے کے پاس اس کی بیمار بیوی بیٹھی کمزور پیلی انگلیاں چٹخا رہی تھی، کوئی اپنی موٹی بیوی کی قمیص کا ناپ لے رہا تھا کیونکہ درزی نے پچھلی دفعہ شکایت کی تھی کہ "مجھے آپ کی بیگم کے پیٹ کی گولائی کا کچھ علم نہیں اور پھر اندر سے شکایتیں آتی ہیں کہ قمیص تنگ ہے"۔ کسی کی نظریں اپنی جوان لڑکی پر جمی ہوئی تھیں جو چھت پر گیلا کپڑا سکھانے کے بہانے سے چڑھ کر پڑوس میں میونسپل کمیٹی کے محرر سے اشارے کر رہی تھی ——— اور کوئی اکیلا بیٹھا مشہور رسالہ "ہیلتھ اینڈ افیشنسی" کی ننگی تصویروں سے اپنا جی بہلا رہا تھا ——— آج اتوار کا دن تھا!

اسکول کا ڈرائنگ ماسٹر بڑا خوش مزاج اور ہنس مکھ نوجوان تھا۔ بچہ بچہ اس کی بلند اخلاقی کا معترف تھا، خدا کی حمد گاتے وقت جس دن لڑکے استادوں کی قطار میں ڈرائنگ ماسٹر کو نہ پاتے تو چھٹی کے بعد سب کے سب اس کے گھر پر جمع ہو جاتے اور فکرمند چہروں، خشک ہونٹوں اور جھپکتی آنکھوں سے اپنی محبت کا اظہار کرتے اور کہتے "ماسٹر جی کیا آپ بیمار ہیں؟" ——— "ماسٹر جی کیا میں ہسپتال سے دوا لے آؤں؟" "ماسٹر جی کیا آپ چھٹی لے لیں گے؟"

پچھلے سال اُس نے اپنے کمرے کی سجاوٹ کسی خاص اہتمام سے نہ کی تھی۔ اس لئے اس کی ترقی روک لی گئی تھی۔ اس دن تمام اساتذہ اس کے گھر اُس سے ہمدردی ظاہر کرنے آئے تھے۔

"خان صاحب۔ خدا کی قسم ہمیں آپ کی اس مصیبت پر دلی صدمہ ہوا ہے"۔

ڈرائنگ ماسٹر اپنی ٹوپی کو ایک طرف کرتے ہوئے بولا "میں آپ کا ممنون ہوں۔ لیکن ذاتی طور پر مجھے کوئی خاص صدمہ نہیں پہنچا۔ فنکار کو ہمیشہ ناکامیوں کا سامنا رہتا ہے، اور یہی اس کی سچی خوشی ہے"۔

سب پر اس کی اس شانِ بے نیازی کا بڑا اثر ہوا اور سوچنے لگے۔ "بڑا بے پروا اور بلند ظرف انسان ہے!" اور "یہ سول اتر سول برخاست کر دیا گیا تو فنکاری دھری رہ جائے گی" ——— "دو چار لکیریں گھسیٹ کر ایک ڈھانچہ کھڑا کر دیا اور پنسل سے ایک طرف سایہ دکھا دیا اس کے نزدیک آرٹ ہے!" وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ڈرائنگ ماسٹر جی ہی جی میں کڑھ رہا تھا کہ اس کی ذرا سی غفلت نے اُسے زینے کی اگلی سیڑھی پر قدم رکھنے کے ناقابل بنا دیا تھا۔ اُس نے محسوس کیا تھا جیسے وہ ایک کمزور چیونٹا ہے، جو منہ میں باجرے کا ایک دانہ دبا کر دیوار پر چڑھتا ہے اور چھت کے آخری کنارے پر پہونچنے سے پہلے ایک اُبھرے ہوئے تنکے سے اُلجھ کر وہیں آ گرتا ہے جہاں سے اس کے سفر کی ابتدا ہوئی تھی! ——— لیکن چیونٹا مایوس نہیں ہو جاتا ——— اُس نے سوچا تھا اور اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنی پتلی پتلی انگلیوں میں بجلی کی لہریں حلول کرتی ہوئی محسوس کی تھیں۔ اُس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب کے وہ اپنے کمرے کو دلہن بنا دیگا اور اتنی تصویریں بنائیگا ایسی تصویریں بنائے گا کہ رنگوں کے کئی ڈبے خالی ہو جائیں گے!

اُس نے پہلی تصویر ایک ایک حسینہ کی بنائی، جو تالاب کے کنارے بیٹھی تھی۔ تالاب کے عین وسط میں کنول کا ایک پھول اُگ رہا تھا جس کی ایک پتی پر شہد کی مکھی بیٹھی اُس کا رس چوس رہی تھی اور دور سر کنڈوں کی اوٹ میں ایک نوجوان اُس حسینہ کو جھانک رہا تھا۔ آسمان پر بھورے بھورے بادل چھائے ہوئے تھے اور کہیں کہیں نقاب پوش سورج کی وجہ سے بدلیوں کے کنارے ہلکے گلابی اور سنہری ہو رہے تھے!

ہیڈ ماسٹر صاحب نے تصویر دیکھی تو اُن کی گول گول آنکھیں غصے سے چنگاریوں کی طرح چمک اُٹھیں۔ بدحواسی میں وہ قلمدان کی میز پر اُلٹ بیٹھے۔ میز کا کپڑا بھی خراب ہو گیا اور تصویر پر بھی ایک جگہ سیاہی کا بدنما دھبہ پڑ گیا۔ ڈرائنگ ماسٹر کی آنکھوں میں خون تیر آیا۔ اس نے ہیڈ ماسٹر کے ہاتھوں سے تصویر تقریباً چھین لی، اور پکارا "لائیے۔ آپ نے میرے شاہکار کا ستیاناس کر دیا"۔

"آپ کو اپنے شاہکار کا غم ہے"۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنی ناک کو جو زکام اور غصے کی وجہ سے چقندر کی طرح لال ہو رہی تھی، اوپر چڑھاتے ہوئے کہا "آپ کو اپنے شاہکار کا غم ہے اور میز کے قیمتی کپڑے کی کوئی فکر نہیں، عجیب سمجھ ہے آپ کی! آپ ڈرائنگ ماسٹر ہیں اور یہاں ڈرائنگ ماسٹر کی حیثیت سے رہنا پڑے گا۔ آپ کے دماغ میں تو بہزاد اور مانی اور جوشوا رینالڈ گھومتے پھر رہے ہیں۔ یاد رکھئے۔ مصوری اور ڈرائنگ ماسٹری میں

بڑا فرق ہے۔ آپ لڑکوں کے مذاق کا بھی خیال رکھا کیجئے نا۔ یہ تصویر تو شہر کی کسی فاحشہ کی خواب گاہ کی زینت بڑھانے کیلئے اچھی رہیگی۔ اسے لے جائیے۔ میں اپنے لڑکوں کے اخلاق تباہ نہیں کرنا چاہتا۔"

اب وہ سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ اور اُس سال اُس نے چودہ ایسی تصویریں بنائی تھیں جن کے ذریعے لڑکوں کو بڑے بڑے بلند سبق دئے گئے تھے اور جنہیں وہ خود بھی دن دن بھر دیکھنے سے نہیں تھکتا تھا۔ آج اتوار کا دن تھا۔ اور وہ اپنے کمرے میں ایک تختے پر جھکا ہوا تھا۔ اُس کے لانبے خشک بال اس کے کانوں اور گالوں کو ڈھانپے ہوئے تھے۔ اُس کی قمیص اور دھوتی پر مختلف رنگوں کے بے شمار دھبے نظر آرہے تھے اور اسکی پتلی پتلی انگلیاں موقلم تھامے، جیسے کچھ سوچ رہی تھیں! —— اچانک اُس نے تیزی سے آنکھیں جھپکائیں۔ رنگوں کے ڈبے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور موقلم کو انگلیوں میں تھرتھرا کر کچھ اس شان سے تختے پر جھک گیا۔ جیسے وہ ایک ذرا سی جنبش سے دُنیا کی تقدیر پلٹنے والا ہے!

اُس کے سامنے ایک تصویر تھی۔ ایک نوخیز بچہ گھاس کے تختے پر بیٹھا تھا۔ اس کی کتابیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ اس کے لبوں پر ایک مقدس مسکراہٹ تھی۔ اُس نے کمال اشتیاق سے اپنی روشن آنکھیں آسمان پر گاڑ رکھی تھیں۔ جس کی نیلاہٹوں میں سے ایک حسین وجمیل فرشتہ ظاہر ہو رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک شمع تھی۔ جس کے گرد ایک نورانی ہالا تھا۔ شمع کی لَو میں لفظ "علم" لکھا ہُوا تھا۔ اس فرشتے کے پیچھے بہت دور تک ننھے ننھے بے شمار فرشتوں کے سایے تھے جو آہستہ آہستہ دُور کہیں گم ہو جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فرشتوں کی فوج لڑکے پر علم کے انوار نچھاور کرنے کے لئے زمین پر اُترنے والی ہے۔

اُس نے اپنے موقلم سے بچے کے دائیں جانب ایک جھاڑی بنائی جس کی چوٹی پر دو کوّے بٹھا دیئے، ایک چھوٹا اور ایک بڑا۔ بڑے نے چھوٹے کی چونچ میں اپنی ساری چونچ ڈال رکھی تھی۔ دونوں کی آنکھیں بند تھیں اور پر پھیلے ہوئے! اُن کے قریب ہی ایک ننھے سے جھرنے کے کنارے ایک گلہری پانی میں اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔ اور دُور ایک درخت میں ایک گھونسلے سے کوئی پرندہ سر نکال کر پر تول رہا تھا!

اُس نے موقلم کو پرے پھینک دیا۔ اور اچانک یوں اُچھل پڑا جیسے اسے کسی زہریلے بچھو نے ڈس لیا ہے۔ "سلمیٰ!" وہ پکارا۔

باہر سے ایک نوجوان عورت دوڑتی ہوئی آئی اور کمرے میں قدم رکھتے ہی بولی۔ "کیوں! مکمل کر لی؟"

"ہاں" ڈرائنگ ماسٹر نے بڑی مشکل سے یہ لفظ جیسے اُگل دیا۔ اور اسکی آنکھوں میں مسرت کے آنسو جھلملا اُٹھے۔ "میں نے اپنے تصورات کا عرق نچوڑ کر اس تصویر میں حل کر دیا ہے۔ اس تصویر کا نام ہوگا "طالب علم"۔ سچ کہنا سلمیٰ۔ کیا یہ تصویر میرا شاہکار نہیں؟"

سلمیٰ انتہائی شوق سے تصویر پر جھک گئی اور پھر اچانک لرز کر پیچھے گر گئی!

"کیوں؟ کیا ہوا؟" ڈرائنگ ماسٹر نے آگے بڑھتے ہوئے مضطربانہ لہجے میں پوچھا۔

"شکر ہے میرے آنسو تصویر پر نہیں گرے ورنہ سب کچھ تباہ ہو جاتا!"

دونوں فرطِ مسرت سے مجبور ہو کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور بہت دیر تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے مسکراتے بھی رہے اور روتے بھی رہے۔ جیسے اب اُن کا اس دُکھوں بھری زمین سے کوئی تعلق نہیں رہا اور وہ اپنی تصویروں کی گٹھری باندھ کر ستاروں میں اُڑ جائینگے۔

سلمیٰ نے اپنی قمیص کی پھٹی ہوئی جگہ پر ہاتھ پھیرا جس میں سے اس کا گلابی شانہ جھلک رہا تھا۔ اور ڈرائنگ ماسٹر نے اپنی آستین کو گھمایا جو دُھل دُھل کر تقریباً اُڑ چکی تھی۔ دونوں مسکرائے اور ڈرائنگ ماسٹر بولا۔ "اب کے جب انسپکٹر صاحب یہ تصویر دیکھیں گے تو یقیناً عش عش کر اُٹھیں گے۔ تیس روپیہ ماہانہ والا ڈرائنگ ماسٹر اگر دُنیا کی ایک بہترین تصویر تیار کر لے، تو کیا قدر شناس لوگ انگشت بدنداں نہ رہ جائیں گے؟ اور یہ بڑے افسر بہت قدر شناس ہوتے ہیں سلمیٰ۔ بس یہ ایک دفعہ متاثر ہو جائیں پھر کئی غریبوں کے بیڑے پار ہو جاتے ہیں۔ شاید اب کے ترقی کھل جائے۔"

ڈرائنگ ماسٹر بہت دیر تک اپنی تازہ تصویر کو دیکھتا رہا۔ کبھی مسکراتا تھا کبھی سوچتا تھا۔ کبھی بے شمار خطوط کے دلفریب پیچ وخم پر نگاہیں گاڑ دیتا تھا۔ اس کے دل میں مختلف خیالات کے قافلے برقی سرعت سے آجا رہے تھے۔ اُسے اپنے مستقبل کے افق پر ایک خیرہ کن روشنی نظر آنے لگی۔ جس کی کرنوں میں وہ قہقہے لگاتا۔ اشرفیوں سے کھیلتا اڑا پھرتا تھا!

سارا دن وہ تصویریں چوکھٹوں میں جڑتا رہا۔

سوموار کو صبح سویرے وہ اسکول پہنچا اور اپنے کمروں میں ساری تصویریں ایسے ایسے زاویوں پر لٹکائیں کہ سارا کمرہ مسکرانے لگا! دروازے کے سامنے اُس کی آخری تصویر "طالب علم" لٹک رہی تھی۔ اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے علم کی شمع کی کرنیں پتلے شیشے سے چھن چھن کر سارے کمرے کو بقعۂ نور بنا رہی ہیں!

دس بجے ہیڈ ماسٹر صاحب اُس کے کمرے میں آئے اور تصویروں پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا۔ "خان صاحب آپ نے

پچھلے سال کی کسر پوری کر دی۔ میں بہت اسکولوں میں رہ چکا ہوں اور اچھے اچھے ڈرائنگ ماسٹر نظر سے گزرے ہیں۔ لیکن مجھے یاد نہیں کہ کسی نے اپنا کمرہ اتنی محنت اور کاوش سے سجایا ہو۔ آپ تو اچھے خاصے مصوّر ہیں!"

"حضور کی مہربانی ہے!" ــــ ڈرائنگ ماسٹر کی پتلی خوبصورت ناک کا بانسہ لرز کر سُرخ ہو گیا!

"آپ کو میں کئی بار بُرا بھلا کہہ چکا ہوں" ــــ ہیڈ ماسٹر رفتہ رفتہ مہربان ہو رہے تھے۔ "لیکن دیکھئے نا خان صاحب۔ میں اپنے فرائض کی بجا آوری پر مجبور ہوں۔ اُس دن ہاکی گراؤنڈ میں میں نے آپ کو جھڑک دیا تھا تو آپ کو چاہیئے تھا کہ آپ خاموش ہو رہتے۔ لیکن آپ کے تیور دیکھ کر مجھے تو ایسا معلوم ہوا جیسے آپ مجھے چبا ڈالیں گے۔ بہر حال گزشتہ را صلوات! اب آپ کا کام دیکھ کر میری خفگی مٹ چکی ہے، میں انسپکٹر صاحب کے آگے آپکی زبردست سفارش کروں گا!"

ڈرائنگ ماسٹر نے محسوس کیا جیسے اس کی تنخواہ میں یکلخت بیس روپوں کا اضافہ ہو گیا ہے!

شام کو اُس نے بہت مدت کے بعد ایک فلم دیکھا۔ سلمیٰ سے ایسے ایسے مذاق کئے کہ وہ بے چاری حیرت اور مسرت سے ہنستے ہنستے چپ ہو جاتی اور بیٹھے بیٹھے ہنس دیتی۔ ڈرائنگ ماسٹر نے ساری رات "بدری برس گئی، نکلے گگن سے تارے!" گانے گاتے گزار دی۔

آج انسپکٹر صاحب تشریف لانے والے تھے۔ وہ صبح سویرے اُٹھ کر بھاگا بھاگا نائی کی دُکان پر گیا۔ ڈاڑھی منڈا کر بھاگا بھاگا گھر آیا۔ نئے کپڑے پہنے۔ چہرے پر "سلمیٰ" کی کریم ملی اور نو بجے اسکول جاتے ہوئے بولا۔ "سلمیٰ۔ آج شام کو کوئی لذیذ کھانا پکانا۔ آج میری زندگی ایک نئی کروٹ بدلیگی"

اسکول آ کر اس نے اپنے کمرے کی میزوں کرسیوں کو ایک نئی ترکیب سے ترتیب دیا ــــ بے شمار قوسوں کی شکل میں ــــ جب گھنٹی بجی اور دسویں جماعت کے لڑکے اُس کے کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے نہایت محبت سے کہا۔ "بھائیو۔ ذرا خاموش بیٹھے رہنا اور جو ماڈل میں تمہارے سامنے رکھ رہا ہوں، اُس کا نقش پوری کوشش سے کاغذ پر اُتارنا۔ آج ہنسی مذاق کا دن نہیں۔ آج میرا معائنہ ہے!" ــــ اور اُس کی نظریں از خود کمرے کی چاروں دیواروں کا چکر کاٹ کر باہر انسپکٹر صاحب کی چمکتی دمکتی موٹر پر جم گئیں جس میں ایک السیشین نسل کا کتا لیٹا ہوا تھا! اسکول پر موت کی سی خاموشی چھا رہی تھی۔ انسپکٹر صاحب ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے میں تشریف فرما تھے۔

چپراسی برآمدوں میں یوں ساکت و صامت کھڑے تھے جیسے وُہ بھی برآمدے کے ستون ہیں۔ کمروں میں لڑکے چپ چاپ کتابوں پر نگاہیں جمائے انسپکٹر صاحب کی آمد کے منتظر تھے۔ اور تختہ ہائے سیاہ پر اساتذہ کھریا مٹی سے خطاطی کے بے شمار نمونے پیش کر رہے تھے۔ ڈرائنگ ماسٹر دروازے کے شیشوں سے دفتر کی مُردہ چق کو گھور رہا تھا! اور اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اُسے اپنے چاروں طرف اس قسم کی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں جیسے کوئی دیو کسی بہت بھاری آہنی ہتھوڑے سے زمین کی بنیاد پر چوٹیں لگا رہا ہے۔ کئی بار وہ چپراسی کے پاؤں کی چاپ سن کر چونک پڑا اور ادب سے کھڑا ہو گیا۔ سمجھا انسپکٹر صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ وہ سوچنے لگا۔ انسپکٹر صاحب کمرے میں داخل ہوتے ہی ٹھٹک کر کھڑے ہو جائیں گے اور تعجب سے پوچھیں گے۔ "یہ تصویریں کس نے بنائی ہیں؟" میں عرض کرونگا "حضورِ عالی۔ فدوی نے!" وہ فرمائیں گے "ہیں؟ تم نے؟ ہیڈ ماسٹر آپ خوش نصیب ہیں کہ آپ کے اسکول میں ایسا سحر طراز مصوّر موجود ہے۔ تمہاری تنخواہ کیا ہے؟" میں عرض کروں گا "حضورِ عالی۔ تیس روپے!" وہ فرمائیں گے "صرف تیس روپے؟ میں تمہاری زبردست سفارش کرونگا۔ تمہارا فن تیس روپے میں بہت سستا ہے! ــــ اور شاید اپنی جیب سے کچھ نقد روپے بھی دے جائیں!"

وہ دروازے کے شیشوں میں سے بدستور جھانک رہا تھا کہ انسپکٹر صاحب دفتر سے ہیڈ ماسٹر صاحب سمیت نکلے اور ایک کمرے میں چلے گئے۔ معائنہ شروع ہو چکا تھا! اس کا جی چاہا کہ انسپکٹر صاحب سب کمرے چھوڑ کر پہلے اس کا کمرہ دیکھیں تاکہ یہ دل کی دھک دھک اور دماغ کی طوفانی گونج ختم ہو اور سلمیٰ کی طرف ایک بچہ دوڑا دیا جائے کہ وہ ایک روپے کے بتاشے بانٹ دے! انسپکٹر صاحب اس کمرے سے نکلے۔ اُن کے پیچھے پیچھے ہیڈ ماسٹر صاحب تھے جن کا ریشمی ازار بند لٹک کر اُن کے بوٹوں کو چھو رہا تھا اور وہ بار بار پسینہ پونچھنے کے لئے سفید رومال ملتے اور گردن پر اس تندی سے پھیرتے تھے کہ سُرخ ٹوپی ٹیڑھی ہو ہو جاتی تھی!

اب اُس کی باری تھی۔ اُس نے اپنی گردن اِدھر اُدھر ہلا کر کالر کو درست کیا۔ کوٹ کی جیب سے گلابی رومال کھینچ کر ذرا اوپر کر دیا۔ ٹوپی اُتار کر پھر سر پر جما دی اور اپنی تصویروں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر دھیرے سے کھنکارا اور مسکرایا!

اُس کا دل کھڑاک سے اُس کی پسلیوں سے جا ٹکرایا۔ انسپکٹر صاحب ساتھ والے کمرے سے باہر آ رہے تھے۔ ہیڈ ماسٹر اپنے ازار بند سمیت اُسی طرح تھر تھر کانپ رہے تھے۔ اُنہوں نے اپنی لرزتی انگلی اوپر اُٹھا کر کہا۔ "جناب۔ یہ ہمارا ڈرائنگ روم ہے۔"

انسپکٹر صاحب سگار کا کش لگا کر بولے "ڈرائنگ ماسٹر کا کیا نام بتایا تھا آپ نے؟"

"خاں محمد اجمل ــــــ اے خاں صاحب!" ہیڈ ماسٹر صاحب پکارے۔

"جناب عالی!" ڈرائنگ ماسٹر نے کمرے سے باہر برآمدے میں آکر مؤدبانہ سلام کیا اور دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

انسپکٹر صاحب کمرے دروازے تک جا کر رک گئے۔

"سٹینڈ!" ڈرائنگ ماسٹر پکار اٹھا۔ تمام کمرہ لڑکوں کے نئے لباسوں کی سرسراہٹ سے لبریز ہو گیا۔

"کون سی کلاس ہے؟"

"حضور عالی - دسویں"

"ہیڈ ماسٹر صاحب۔ کیسا کام ہے ان کا؟"

"جناب خان صاحب ذرا سست ہیں اور بے پروا ــــ اور ــــ اور ڈس اوبیڈی انٹ"

ڈرائنگ ماسٹر کا سر جیسے کسی نے دو چٹانوں کے درمیان کچل ڈالا ہے، انسپکٹر ایک لمبی "ہوں" کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

"حضور میرا کمرہ تو دیکھتے جائیے" اس کے دل میں دبکے ہوئے کسی احساس نے پکارا۔ اور اُسے شبہ ہوا کہ انسپکٹر صاحب نے یہ آواز سن بھی لی ہے! لیکن دونوں "قدر شناس" ایک کمرے میں گھس گئے اور باہر انسپکٹر صاحب کے سگار کا دھواں عجیب عجیب شکلیں بنا کر ڈرائنگ ماسٹر پر دیوانگی کی حالت طاری کرتا رہا!

اُس نے اپنے مستقبل کے اُفق پر ایک خیرہ کن چمک دیکھی اور اُس نے محسوس کیا جیسے اس کی ساری کائنات اس دوزخ میں جھونک دی گئی ہے!

اُس کے دماغ کی گونج ایک دہشتناک اندھی میں میں تبدیلی ہو گئی۔ اور وہ اندر آ کر اور چالیس پچاس لڑکوں کی موجودگی سے بے پروا ہو کر اپنی کرسی سے دھڑام سے گرا اور اتنا رویا کہ اس کا رومال ایک بسورتے لڑکے نے کھڑکی سے باہر جا کر نچوڑا۔

دیر تک کئی لڑکوں کی دبی دبی سسکیوں کی آوازیں بھی سنائی دیتی رہیں!

اور جب چار بجے وہ رائے بک دیکھنے کے لئے دفتر میں گیا تو یہ الفاظ زہریلے کیڑے بن کر اُس کے پردۂ دماغ میں رینگنے اور بل کھانے لگے ــ

"خان محمد اجمل ــــ ڈرائنگ ماسٹر۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اس کی بہت شکایت کرتے ہیں۔ کام میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔ کمرے کی سجاوٹ کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ نتائج بھی تسلی بخش نہیں۔ معائنہ کیا گیا۔ کسی لڑکے نے میرے سوالات کا ٹھیک جواب نہ دیا اور نہ ہی کسی کا ماڈل درست تھا۔ اُسے آئندہ محتاط رہنا چاہیئے ورنہ اُسے برخاست کر دیا جائیگا۔ اس کی ترقی مزید ایک سال کے لئے روک دی جائے ــــــــ ڈویژنل انسپکٹر!"

دوسرے روز جب لڑکے خدا کی حمد گا کر اسکول کے گیٹ میں داخل ہوئے تو ڈرائنگ روم کے سامنے اُنہیں ٹوٹے ہوئے شیشوں اور چوکھٹوں کا ڈھیر نظر آیا۔ پاس ہی ایک گندی نالی میں بے شمار رنگین تصویروں کے پُرزے تیر رہے تھے۔

ــــ اور ڈرائنگ ماسٹر ہسپتال میں تھا!

سحرِ تغزّل

از جناب سیّد شجاعت علی عظمت دیال سنگھ کالج۔ لاہور

بہارِ جاوداں مجھ کو خزاں معلوم ہوتی ہے
جوانی میں ہر اک شے دلستاں معلوم ہوتی ہے

ستارے جھانکتے ہیں آسماں کی صاف چلمن سے
کوئی پُر دیں ادا صورت نہاں معلوم ہوتی ہے

شفق کی وادیوں میں کیف کی لبریز دریا ہیں
یہ منت منتِ پیرِ مغاں معلوم ہوتی ہے

یہ خوں آلودگی جس چشم کی رسوائے عالم ہے
مرے قلب و جگر کی داستاں معلوم ہوتی ہے

جہاں چاہا کیا سجدہ جہاں چاہا جبیں رکھ دی
ہمیں ہر خشت خشتِ آستاں معلوم ہوتی ہے

عہدِ نو

دھوپ بن کر پھیل جانے کا زمانہ آگیا

از علامہ سیماب اکبرآبادی

انقلابِ نو کے آنے کا زمانہ آگیا — ہمتِ دل آزمانے کا زمانہ آگیا
رات بھر شمعیں جلانے کا زمانہ آگیا — گرمیٔ محفل بڑھانے کا زمانہ آگیا
آتشیں نغمے سنانے کا زمانہ آگیا — زندگی کی لے بڑھانے کا زمانہ آگیا
وقت وہ رخصت ہوا جب بن گیا تھا دردِ دل — درد کو پھر دل بنانے کا زمانہ آگیا
حُسن کی پردے اُٹھانے کا محل باقی نہیں — عقل سے پردے اُٹھانے کا زمانہ آگیا
دل کو دیوانہ بنانے کا ہے اب موقع کہاں — ہوش میں دنیا کو لانے کا زمانہ آگیا
ابر و خورشید بننے سے بھی نکلے گا نہ کام — آگ بن کر جگمگانے کا زمانہ آگیا
جھونپڑوں کی سمت ایوانوں سے ہے نقلِ بہار — غمزدوں کے مسکرانے کا زمانہ آگیا
آسمانی اک کشش ہے مژدہ بخشِ ارتقا — بےکسوں کے سر اُٹھانے کا زمانہ آگیا
کیجئے کیوں انتظارِ آمدِ ابرِ بہار — اب تو خود گلشن پہ چھانے کا زمانہ آگیا
قبر کی سی نیند آنکھوں پہ مستولی نہیں — جاگنے کا اور جگانے کا زمانہ آگیا
کیوں سمٹ کر بیٹھئے گوشوں میں سائے کی طرح — دھوپ بن کر پھیل جانے کا زمانہ آگیا

پھر وہی رفعت مآبی پھر وہی جوشِ نشاط
پھر وہی اگلے زمانے کا زمانہ آگیا

بالشوزم کی جدید رجحانات

سیاسیات

از:- عبدالرحیم شبلی، بی کام

بالشوزم اس اقتصادی، معاشری، سیاسی اور اخلاقی نظام کا نام ہے جس کی بنیاد لینن نے کارل مارکس کے باغیانہ اور انقلاب پسندانہ خیالات سے متاثر ہو کر روس میں رکھی لیکن آج کل اس کی باگ ڈور بعض ایسے خود پرست اور اقتدار پسند لوگوں کے ہاتھ میں ہے جن کے طرز عمل نے روسی اشتمالیت کو ایک طرف بحیرۂ بالٹک اور دوسری طرف بحرالکاہل کی محشر خرام موجوں میں غرق کر کے نہ صرف اشتراکی تصور کو بدنام کر دیا ہے بلکہ ملک میں حکومتی طبقہ کی آمریت و استبدادیت قائم کر کے پھر ان ایام کی یاد تازہ کر دی ہے جب روس کا پرولتاری طبقہ زار کے شہنشاہی عصا کے نیچے کراہ رہا تھا۔ اس مضمون میں ہم ان تغیرات پر سرسری نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں جو اکتوبر ۱۹۱۷ء سے آج تک روسی نظام عمل میں واقع ہو چکے ہیں تاکہ اندازہ لگایا جا سکے کہ جس اشتراکیت کا ایوان زاریت کے کھنڈروں پر تعمیر کیا گیا تھا وہ آج کل نا اہل ہاتھوں میں آ کر بنیادی طور پر کس درجہ بگڑ کر اور متزلزل ہو چکا ہے لیکن حال کی جڑ ماضی میں ہوتی ہے اس لئے بالشوزم کے جدید رجحانات کا جائزہ لینے سے پہلے ہمیں ان حالات کا مطالعہ کرنا چاہئے جن کے ماتحت روس میں یہ نظام قائم کیا گیا۔

انقلاب روس کے محرکات

روس کے سیاسی ارتقا کا آغاز بالکل قریب کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے پندرہویں صدی کے آخر تک روس چند چھوٹی چھوٹی جاگیروں پر مشتمل تھا جن کا اندرونی نظام سراسر مستبدانہ اور بہت حد تک فرسودہ تھا۔ ماسکو کے بڑے بڑے ڈیوکوں نے ان جاگیروں میں "مرکزیت" قائم کرنے کی کوشش کی اور وہ بہت حد تک کامیاب بھی ہو گئے لیکن کامیابی کی آخری منزل ایوان کے زمانۂ اقتدار میں دیکھنے میں آئی۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے سرکاری طور پر اپنا خطاب زار تجویز کیا اس کے عہد میں روس نے اگرچہ کافی ترقی کی لیکن ابھی تک وہ اپنے ہمسایہ ممالک سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اٹھارویں صدی کے اوائل میں پیٹر اعظم نے بہت سی اصلاحات جاری کیں لیکن روس پھر بھی یورپ کی "تہذیب نو" کی سطح پر نہ آ سکا۔ زار روس کو اب بھی "دین و دنیا کا مختار کل" سمجھا جاتا تھا۔ ضمیر کی آزادی مفقود تھی، پولیس جب چاہے بغیر وجہ بتائے لوگوں کو گرفتار کر سکتی تھی۔ تحریر و تقریر پر پابندی تھی حاکم و محکوم کے لئے قانون یکساں نہ تھا عوام کو بادشاہ سے ملنے کی اجازت نہ تھی ان تمام امور کی شکایت عوام الناس نے ایک متحدہ عرضداشت کی صورت میں کی لیکن زار روس نے ان کے مطالبات کو "غرق مئے ناب اولیٰ" کر دیا۔

لینن کا نعرۂ بغاوت

ادھر کارل مارکس اور اینجلز کے جمہوریت پسندانہ خیالات نہایت سرعت کے ساتھ دنیا میں پھیل رہے تھے روس میں لینن وہ پہلا شخص تھا جس نے ان خیالات سے متاثر ہو کر زار کی شہنشاہی کے خلاف "نعرۂ جہاد" بلند کیا لیکن وہ دوسرے مفکرین کی طرح مزدور اور سرمایہ دار کی طبقاتی منافقت کو قوانین کے ذریعے سے دور کرنے کا حامی نہ تھا وہ جنگ اور بغاوت کا قائل تھا وہ آگ اور خون سے کھیل کر ملک میں جماعت عاملہ کا اقتدار قائم کرنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے روس میں فرقہ وار جنگ کی بنیاد رکھی اور سب سے پہلے ۱۹۰۵ء میں ایک بہت بڑی بغاوت کی آگ لگائی لیکن اس میں لینن کو شکست ہوئی اور وہ اپنے ملک سے بھاگ گیا اس تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لینن نے بغاوت کو کامیاب بنانے کے لئے بعض اصول قائم کئے اور لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرنے کے لئے ذیل کے حقائق پیش کئے۔

۱- تاریخ بتاتی ہے کہ حکومت بالآخر مزدوروں کے ہاتھ آ جائیگی، اس لئے بطور اصل حکومت ہمیشہ مزدوروں کی ہونی چاہئے۔

۲- مزدوروں اور سرمایہ داروں کے درمیان جنگ ہو گی جس میں فتح مزدوروں کے نام لکھی ہے۔

۳- وقت آ گیا ہے کہ مزدور بغاوت کر کے اپنے حقوق حاصل کریں۔

۴- طبقاتی منافقت کو دور کرنے کے لئے عقلی اور قانونی جنگ فضول ہے۔ کوئی دولتمند باتوں میں آ کر اپنی دولت چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا اس لئے جنگ شروع کر دو تو مقصد حل ہو جائیگا۔

۵- بغاوت میں مزدوروں کا نقصان نہیں کیونکہ اگر وہ اس راہ میں

ہلاک ہوگئے تو بھوک سے بہرحال موت اچھی ہے اگر انہیں شکست ہوئی تو ایک نیک کام میں ہوگی اور اگر وہ کامیاب ہوگئے تو حکمرانی ان کے قدم چومے گی۔

پھر لینن نے "بغاوت" کے متعلق اپنی مفصل ہدایات جاری کیں جن کو یہاں درج کرنا طوالت کا باعث ہوگا قصہ کوتاہ یہ کہ زار کی شہنشاہی سے عوام پہلے ہی تنگ آچکے تھے بارود تیار تھی صرف چنگاری دکھلانے کی ضرورت تھی اور وہ لینن نے مہیا کردی چنانچہ "جمہوریت پسند قومیں" انگڑائی لے کر آندھی کی طرح تمام روس پر چھا گئیں اور زار کے بوسیدہ نظام پر کڑک کر اُسے آناً فاناً خاکستر کرکے رکھ دیا۔

سٹالین زار کے نقش قدم پر

لیکن افسوس یہ انقلاب ظاہر میں جتنا چمکیلا تھا اندرونی طور پر اتنا ہی گھناؤنا تھا۔ اشتراکیت ویسے بھی ایک "آہنی ہاتھ" کی مقتضی ہے مگر بدقسمتی سے لینن کے بعد عنان اقتدار ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں آگئی جو طبعاً حکومت پسند اور مستبد واقع ہوا ہے چنانچہ روس میں گزشتہ پندرہ برس سے پے در پے ایسے واقعات رونما ہو رہے ہیں جن کو دیکھ کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ اب روس سے اشتراکیت کا جنازہ اُٹھ رہا ہے۔

روس کے موجودہ آمر کا نام جوزف سٹالین ہے جو اگرچہ ایک مزدور خاندان سے تعلق رکھتا ہے لیکن اسے آج تک اپنے ہاتھ سے کام کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ سٹالین، لینن کا غالی معتقد ہے لیکن اس نے اپنے طرز عمل سے روس کو ایسی شاہراہ پر ڈال دیا ہے جو مارکسزم یا لینن ازم کی طرف جانے کی بجائے آمریت اور شہنشاہی کی شاہراہوں سے جا ملتی ہے اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ سٹالین نے محسوس کرلیا ہے کہ جن عقاید کی تبلیغ و اشاعت لینن نے شروع کی تھی ان پر عمل کرنا آسان بات نہیں ہے۔ لینن زندگی کے تمام شعبوں میں حیرت انگیز انقلاب برپا کردینا چاہتا تھا لیکن یکلخت انقلاب برپا کرنا کسی انسانی طاقت کے اختیار میں نہیں ہے۔ مثلاً ذاتی ملکیت کو بالکل اڑا دینا تقسیم دولت میں انقلاب برپا کردینا۔ حکومت کے اختیارات کارخانوں اور صنعتوں کو سونپ دینا، ایسی باتیں ہیں جو بہت حد تک انسانی فطرت کے خلاف ہیں چنانچہ سٹالین نے اس انقلاب کے رستہ میں عملی مشکلات دیکھ کر اپنے طرز عمل کو کافی حد تک بدل دیا اور کمیونزم (اشتمالیت) کے اصول میں مناسب ترمیم کے بعد وہ عقیدہ اختیار کیا جس کو ہم بالشوزم یا سوویٹ ازم کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج روس اشتراکیت کے نظری پہلو سے اس درجہ انحراف کرچکا ہے کہ اگر لینن اور مارکس کسی طرح دنیا میں واپس آسکیں تو کمیونزم کے نام پر روس میں جو کچھ ہو رہا ہے اُسے دیکھ کر وہ یقیناً لرز اُٹھیں۔

حکومتی طبقہ کی آمریت

روس میں آج کل جو حکومت قائم ہے اُسے ٹراٹسکی کے الفاظ میں "حکومتی طبقہ کی آمریت" کہا جاسکتا ہے۔ یعنی تمام اختیارات جماعت عاملہ کی بجائے سٹالین اور اس کے مشیر کاروں کے ہاتھ میں ہیں۔ صحیح اشتراکی نظام یہ ہے کہ عنان اقتدار مزدوروں کے قبضہ میں ہو اور نظم و نسق کے تمام امور کارخانوں صنعتوں اور کسانوں کے نمائندوں کے ذریعہ سے طے پائیں چنانچہ ۱۹۱۸ء کے روسی دستور اساسی کے مطابق حکمرانی کے اختیارات کسانوں کو دیئے گئے تھے لیکن اب جو نظام روس میں قائم ہے اُسے ٹراٹسکی "بگڑی ہوئی مزدور حکومت" قرار دیتا ہے۔ کیونکہ عملی طور پر نظام حکومت میں کسانوں کی کوئی آواز نہیں رہی۔ تمام سیاہ و سفید کا مالک خود سٹالین ہے اور حکومت اپنے آپ کو عوام کا خادم کہنے کی بجائے مخدوم سمجھتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مارکسزم اور لینن ازم کا اقتضا بھی یہی تھا کہ اشتراکی نظام کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لئے ملک میں "جماعت عاملہ کی آمریت"[1] قائم کی جائے لیکن سٹالین نے جس قسم کی آمریت قائم کر رکھی ہے اُسے "پرولتاری آمریت" کی بجائے شخصی خود مختاری کہنا زیادہ موزوں ہے۔ سوال یہ ہے کہ سٹالین ایسی آمریت قائم کرنے میں کیونکر کامیاب ہوا؟ اس کا جواب

حاشیہ [1] اشتراکی نظام کی دو منزلیں ہیں (ا) زمانہ انقلاب کی عبوری منزل، (ب) انقلاب کے بعد جب طبقات مٹ جاتے ہیں۔ ان دونوں منزلوں میں اشتراکیین کے نزدیک "پرولتاری آمریت" قائم کرنا ضروری ہے چنانچہ اینجلز لکھتا ہے ——"انقلاب میں جو جماعت فتحیاب ہوتی ہے وہ ضرورت کے تقاضے سے مجبور ہوتی ہے کہ اپنے اقتدار کو اس خوف کے ذریعے سے قائم رکھے جو رجعت پسندوں کے دلوں میں لرزہ پیدا کردیتا ہے"

پھر ایک جگہ کہتا ہے —— "عبوری منزل میں ریاست چونکہ ایک عارضی ادارہ ہوگا اور اس کا زیادہ تر کام یہ ہوگا کہ مخالفت کو دبائے اس لئے اس زمانہ میں ایک آزاد اور مقبول ریاست کا چرچا کرنا بے معنی ہے"

گویا انقلاب کی عبوری منزل میں ریاست چند سخت گیر شخصیتوں کی ایک جماعت کا نام ہوگا جو اپنی جابرانہ قوت سے سرمایہ داروں کی مخالفت کو دبائیگی جب انقلاب برپا ہوجائے گا تو اشتراکیت کا نظام چلانے کے لئے بھی مزدوروں کی آمریت قائم کرنا ضروری ہے اور یہی مارکس کی تعلیم ہے۔ (راقم)

ٹرانسکی کے الفاظ میں یہ ہے کہ ۔۔۔" روس کے غیر ترقی یافتہ ہونے، غیر ممالک سے تعلق نہ ہونے اور دوسرے ممالک میں پرولتاریوں کی شکست نے سٹالین کو موقع دیا کہ وہ ایک حکومتی طبقہ بنالے۔" گویا سٹالین کے استبداد کی طرف جانے کے تین وجوہ ہیں۔(۱) روسی مزدور اور کسان اتنے تعلیم یافتہ اور بیدار مغز نہیں تھے کہ وہ سٹالین کو حکومتی طبقہ بنانے سے روکتے اور نظام حکومت میں اپنی آواز کو تسلیم کرانے کے لئے جدوجہد کرتے۔

۲۔ دوسرے ممالک سے روس کے تعلقات نہیں تھے ورنہ وہاں کے مزدور سٹالین پر زور دیکر اسے اپنے ارادہ سے باز رکھتے۔

۳۔ دوسرے ممالک میں "مزدور تحریک" زیادہ کامیاب نہ ہوئی اس لئے سٹالین کو روس میں بھی اُسے ٹھکرانے کا موقع مل گیا۔

الغرض بالشوزم کا پہلا رجحان یہ ہے کہ وہ اپنے مقاصد کے صریح خلاف "پرولتاری آمریت" کی بجائے "شخصی استبداد" اور "سرمایہ دارانہ اقتدار" کی طرف جارہا ہے۔

سٹالین کی خارجہ سیاست

کیونزم میں دوسری تبدیلی جو سٹالین کے عہد میں ہوئی یہ ہے کہ اس نے خارجہ سیاست کے نظریہ میں تبدیلی کرلی۔ لینن کے زمانہ سے سٹالین کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ سوشلزم ہر ملک میں علیحدہ علیحدہ قائم ہونا چاہئے اگرچہ ٹرانسکی نے اس خیال کی پرزور تردید کی اور کہا کہ اس نظریہ کے نتیجہ میں مختلف ممالک کی انقلابی تحریکات کا باہمی تعلق ختم ہوجائیگا۔ لیکن سٹالین نے اپنے عہد حکومت میں اس اعتراض کا جواب ٹرانسکی کو جلاوطن اور اس کے حامیوں کو تہ تیغ کرکے دیا۔ اور خود مندرجہ ذیل اصول پر کاربند ہوا ۔۔۔،

۱۔ اس نے ملک میں ایک بگڑی ہوئی مزدور حکومت قائم کرلی۔

۲۔ بیرونی ممالک کی انقلابی تحریکات سے قطع تعلق کرلیا اور اگر کوئی رابطہ قائم کیا تو صرف یہ کہ روس کے حکومتی طبقہ کی تائید و امداد کے لئے صرف اپنے پٹھوؤں کو انقلابی جماعتوں کا لیڈر مقرر کیا۔

۳۔ سرمایہ دار ممالک سے دوستی بڑھائی حالانکہ یہ کمیونزم کے تخیل کے صریح خلاف تھا۔ چنانچہ روم، برلین، ٹوکیو اور ماسکو کا محور صاف بتا رہا ہے کہ اب سٹالین مارکسزم اور لینن ازم کا پیرو نہیں ہے بلکہ اُس کے عزائم سراسر جارحانہ اور ملک گیرانہ ہیں ۔۔۔،

نازیت سے دوستی

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ موجودہ جنگ میں سٹالین کا طرز عمل کمیونزم سے بالکل ہم آہنگ ہے کیونکہ موخرالذکر کا اقتضا بھی یہی تھا کہ اشتمالیت کو تمام ممالک میں پھیلا دیا جائے لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ یورپی ڈکٹیٹروں سے یارانہ گانٹھ کر سٹالین کمیونزم کی اشاعت نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس کا مقصد ان کی امداد و اعانت حاصل کرکے جہانگیری و جہانبانی کے عزائم کو پورا کرنا ہے اگر وہ ٹرانسکی، لینن اور کارل مارکس کے بتلائے ہوئے طریقہ پر عمل پیرا ہوکر دوسرے ممالک میں "مزدور انقلاب" برپا کرنے کی کوشش کرتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ وہ صحیح کمیونزم کو بروئے کار لارہا ہے لیکن وہ تو دوسرے ممالک پر قبضہ غاصبانہ کرکے اپنے سرمایہ دارانہ اقتدار کو بڑھانا چاہتا ہے اور یہ کمیونزم کے اقتضا کے صریح خلاف ہے۔ پھر مبصرین سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ کمیونزم اور نازی ازم میں ازلی بَیر ہے چنانچہ ہٹلر بالشوزم کو ہمیشہ اپنا دشمن سمجھتا رہا اور اس نے سٹالین کو ہمیشہ جلی کٹی سنائیں۔ اسی پروپیگنڈے سے متاثر ہوکر اٹلی اور جاپان نے بھی ہٹلر کی ہمنوائی کی اور "خلاف اشتراکیت اتحاد" کی بنا ڈالی لیکن سٹالین ہمیشہ کوشش کرتا رہا کہ جرمنی کے ساتھ اتحاد و اتفاق کا رشتہ استوار کیا جائے چنانچہ اس نے باوجود کمیونسٹ پارٹی کی مخالفت کے ہٹلر کی حمایت میں تقریریں کیں اور آخر اس سے یارانہ گانٹھ لیا۔ آخر اس کی کیا وجہ تھی؟ اگر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ سٹالین اشتراکیت کے اصول کو خیرباد کہہ کر آمریت کے تخت پر جلوہ افروز ہوچکا ہے اور اب یورپی ڈکٹیٹروں کی لوٹ کھسوٹ میں حصہ دار بننے کا تمنائی ہے۔

ہوسِ ملک گیری

ممکن ہے کہ کہا جائے سٹالین موجودہ جنگ میں اس لئے شریک ہوا ہے کہ بالشویک روس کو سرمایہ دار ممالک کے حملوں سے بچایا جائے چنانچہ اُس نے بحیرہ بالٹک کی ریاستوں اور رومانیہ کے ایک حصے پر محض اس لئے قبضہ کیا تاکہ اس کی جنوبی اور جنوب مغربی سرحدات مستحکم ہوجائیں اور جرمنی کو اس پر حملہ آور ہونے کا موقع نہ مل سکے۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ ہٹلر نے تحریک بالشوزم کا جانی دشمن رہا ہے مگر سٹالین کو اس کا دشمن قرار دینا صحیح نہیں کیونکہ وہ تو ہمیشہ یہی کوشش کرتا رہا کہ کسی طرح ہٹلر اس کا دوست بن جائے۔ چنانچہ سنہ ۳۳ء سے سنہ ۳۸ء تک سٹالین کی تمام تقریریں پڑھ جائیے آپ کو یہی نظر آئیگا کہ سٹالین جرمنی سے

رشتۂ مودت استوار کرنا چاہتا تھا۔ ہٹلر متامل رہا لیکن موجودہ جنگ کے مشترکہ مفاد نے ان دونوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا۔ پس یہ کہنا غلط ہے کہ سٹالین نے اپنے ہمسایہ ممالک پر محض مدافعت کی خاطر قبضہ کیا۔ دراصل یہ "حملے" اس کے استعماری پروگرام کا ایک جزو ہیں اور وہ نہایت چالاکی اور ہوشیاری سے موجودہ جنگ کی لوٹ کھسوٹ میں حصہ دار بن رہا ہے۔ اگر اس کے مدنظر محض روس کی محافظت ہوتی تو وہ صرف دفاعی لائحہ عمل کو اختیار کرتا لیکن ہمسایہ ممالک پر اس کا غاصبانہ قبضہ صاف بتاتا ہے کہ وہ بھی زار روس کے نقش قدم پر چل کر جہانبانی و جہانگیری کو اپنا نصب العین قرار دینا چاہتا ہے۔ محوری سازباز پر دستخط، یورپی آمروں سے خلوت آرائیاں، برطانیہ سے قطع تعلق، ایران و افغانستان کو دھمکیاں، ہندوستان اور چین پر نگاہیں اور فوجی نقل و حرکت "دفاع" نہیں بلکہ ان پراسرار عزائم کا ایک حصہ ہیں جن میں رنگ عمل بھرنے کے بعد سٹالین "عہد حاضر کا نپولین" کہلا سکے گا۔

پس اس لحاظ سے بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ سٹالین اشتمالیت سے دستکش ہو کر استعمار پرستوں کے حلقہ میں آچکا ہے۔

طریق پیداوار

اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ سٹالین کے عہد میں روس کی اندرونی حالت میں کیا انقلاب آچکا ہے۔

جب روس میں اشتمالیت کا نفاذ ہوا تو اشتراکی اصول کے ماتحت ہر قسم کی ذاتی ملکیت کو ممنوع قرار دیدیا گیا۔ تقسیم دولت کو زیادہ منصفانہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ سرمایہ دارانہ طریق کاشتکاری کو بدل کر اجتماعی زراعت کاری کو مروج کیا گیا۔ صنعتی اداروں کو منظم کرنے کے لئے ان کے نمائندوں کی مجلسیں قائم کی گئیں اور سلطنت کے امور میں ان کا مشورہ قبول کیا جانے لگا۔ بچوں کی پرداخت سرکاری پرورش خانوں میں ہونے لگی اور لوگوں میں جنسی اور اقتصادی مساوات قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔

ان سب اصلاحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت کی تقسیم و پیدائش بہت حد تک متوازی ہو گئی۔ بیکاری یا کساد بازاری کا مسئلہ حل ہو گیا۔ ملک میں معاشی عدم مساوات کا بہت حد تک خاتمہ ہو گیا۔ مزدور جماعت کی حالت پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ تسلی بخش ہو گئی اور اوقات کار میں کمی کی وجہ سے لوگوں کو فنون لطیفہ، کھیل کود اور دوسرے تفریحی مشاغل کے لئے فرصت کا زیادہ وقت ملنے لگا۔

لیکن اس نظام کے میدان عمل میں آتے ہی وہ خرابیاں بھی پیدا ہونا شروع ہو گئیں جن کی طرف اس نظام کے نقاد ہمیشہ توجہ دلاتے رہے ہیں مثلاً اجتماعی کاشتکاری میں چونکہ ذاتی نفع اور زر اندوزی کا امکان نہ رہا اس لئے لوگوں کو اپنے پیشہ میں زیادہ دلچسپی بھی نہ رہی اور انہوں نے جدت و اختراع سے کام لینا چھوڑ دیا۔ اسی طرح صنعتی اداروں اور فیکٹریوں میں "غیر ذمہ داری" کا عنصر بہت بڑھ گیا۔ مزدوروں نے محسوس کیا کہ انہیں "معاوضہ" تو بہرحال ملتا ہے اس لئے وہ زیادہ توجہ اور محنت سے کام کیوں کریں؟ چنانچہ انہوں نے آلات اور مشینوں کو بھی نقصان پہنچانا شروع کر دیا کیونکہ یہ چیزیں سرکاری یا غیر ذاتی تھیں۔ اس طرح کارخانوں میں وقت اور مال کا ضیاع بہت بڑھ گیا اور اشتمالی نظام کے "فوائد" بھی "نقصان" میں تبدیل ہونے لگ گئے۔

جب حکومت نے دیکھا کہ اجتماعی زراعت کے سلسلہ میں "مرکزی اقتدار" کا نظریہ غلط ثابت ہوا ہے اور کارخانوں میں بھی مزدوروں کو ڈھیل دے دینا خالی از خطرہ نہیں تو اس نے اپنے قوانین پر نظر ثانی کی اور شخصی ملکیت کا حق بہت بڑھا دیا۔ چنانچہ مسٹر پیرز کے الفاظ میں:۔

"گزشتہ چند سال کے عرصہ میں جو تبدیلیاں روس میں ہوئی ہیں وہ صحیح معنی میں بہت اہم تبدیلیاں ہیں نظر ثانی کے بعد اجتماعی کاشت کے جو قواعد بنے ہیں ان میں یہ خاص خیال رکھا گیا ہے کہ افراد کو زیادہ سے زیادہ ڈھیل دی جائے شخصی ملکیت کا حق بھی بہت بڑھا دیا گیا ہے کسان اب اپنا ذاتی گھر، تین ایکڑ کا باغ، ایک یا زیادہ گائیں اور جتنے سور اور مرغیاں حاصل کر سکے رکھ سکتا ہے ہر شخص کی آمدنی اس کی ملکیت قرار دی گئی ہے قانوناً محفوظ کر دی گئی ہے اور موروثی مانی جاتی ہے اسی وجہ سے سیونگ بنکوں میں خوب روپیہ جمع رہتا ہے بہت سے کسان جو جلاوطن کر دیئے گئے تھے اب وطن واپس بھیج دیئے گئے ہیں۔ البتہ سوویٹ کے زرعی نظام میں تجارت اور اجرت پر کام کرانے کے اصول کی گنجائش نہیں رکھی گئی —"

الغرض بالشوزم کا موجودہ رجحان یہ ہے کہ ذاتی ملکیت کے اصول کو بہت حد تک تسلیم کر لیا جائے اور کاروبار میں "انفرادیت" اور "ذاتی منفعت" کا بھی خیال رکھا جائے۔

---

۵۱ برنارڈ شا: "ذہین عورت کیلئے سوشلزم کا رہنما" ۵۲ برنارڈ پیرز "روسا اینڈ سلافونیک"

اس لحاظ سے ٹرانسکی کا یہ خیال غلط نہیں ہے کہ "موجودہ سوویٹ یونین کا طریق پیداوار سرمایہ داری سے زیادہ قریب نظر آتا ہے"؎

پنجسالہ پروگرام

جب سٹالین برسر اقتدار آیا تو اسے یقین تھا کہ اشتراکی نظام دوسرے ممالک کی مدد کے بغیر بھی قائم کیا جا سکتا ہے چنانچہ اس نے اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے اور ملکی و قومی وسائل کو فروغ دینے کی غرض سے پنج سالہ پروگرام بنائے۔ جن کے ماتحت ملک نے ایک خاص حد تک معاشی ترقی حاصل کرنا تھی۔ چنانچہ پہلا پروگرام ۱۹۲۸ء سے شروع کیا گیا اس کو کامیاب بنانے کے لئے نہ صرف ماہرین بکثرت اکٹھے کئے گئے بلکہ اسکولوں کا نصاب تک تبدیل کر دیا گیا ——— اور لڑکوں کو ایسی تعلیم دی گئی جس کے اثر کے ماتحت وہ تحقیق و تجسس کی طرف مائل ہو سکتے تھے۔ یہ پروگرام ۱۹۳۳ء میں ختم ہو گیا ——— اور کافی حد تک کامیاب رہا۔ اس کے بعد دوسرا پنجسالہ پروگرام شروع کیا گیا جو ۱۹۳۷ء میں ختم ہوا اور اب روس تیسرے پروگرام پر عمل کر رہا ہے۔

بہ حیثیت مجموعی یہ پروگرام کس حد تک کامیاب رہا؟ اس کا جواب ٹرانسکی کی زبانی سنئے جو اشتمالی نظام کے ناقد ہونے کی وجہ سے اس مسئلہ پر حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔

> "پنجسالہ پروگرام کے مطابق پیداوار نے ہر سال تدریج کم ہونا تھا۔ اس اندازہ سے مجھے سخت اختلاف تھا۔ یہ اختلاف جب بڑھا تو گرما گرمی کی نوبت آئی۔ میں نے اس پروگرام کا نام بطور طعن "تخریب صنعت" رکھا کیونکہ اس پروگرام سے پست خیالی اور کم ہمتی ٹپکتی تھی اور جس قدر پیداوار ہو سکتی تھی۔ یہ پروگرام اس سے بہت کم پر اکتفا کرتا تھا۔"

ٹرانسکی نے صاف کہدیا تھا کہ اگر سٹالین نے ملکی پیداوار پر ضبط نہ رکھا تو یہ اقتصادی منصوبے ایک ہولناک "آشوب" پر منتج ہونگے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور سٹالین کی کاروباری نااہلیت کے باعث روس کی صنعت و حرفت کے نظام میں ہڑبونگ مچ گئی اس میں شک نہیں کہ معیشی منصوبوں کی وجہ سے روس نے صنعتی طور پر کافی ترقی کی اور ملک کے معیشی وسائل نفع آور بنا دیئے گئے لیکن اس کی وجہ وہاں کا "حکومتی طبقہ" نہیں ہے بلکہ انفرادی ملکیت اور پروگرام سے کام کرنا ہے۔ اگر روس میں صحیح اشتراکیہ قائم ہوتی تو ٹرانسکی کے ساتھ ہمیں بھی یقین ہے کہ روس اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ جادۂ ترقی پر گامزن ہوتا۔ بہر حال "معاشی نظم" کے تجربے نے سٹالین کو بتا دیا کہ ایک تو کاروبار میں "حکومتی مداخلت" بہت زیادہ مفید نتائج پیدا نہیں کر سکتی اور دوسرے تجارت وغیرہ کے سلسلے میں غیر ممالک سے تعلقات بھی منقطع نہیں کئے جا سکتے چنانچہ اس نے اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کر کے نہ صرف "شخصی حقوق" کو تسلیم کر لیا ہے بلکہ دوسرے ممالک سے تجارتی روابط بھی قائم کر رہا ہے۔

اخلاق و معاشرت

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ اخلاق و معاشرت کے باب میں بالشوزم کا جذبہ رجحان کیا ہے ———؟

جدید اشتراکیت کا منشا ابتدا میں صرف یہ تھا کہ شخصی ملکیت کو ختم کر کے دولت اور اس کے وسائل آفرینش کو سب لوگوں میں برابر تقسیم کر دیا جائے لیکن رفتہ رفتہ وہ معاشیات کی حد سے نکلنے پر مجبور ہو گئی کیونکہ زندگی کے تمام شعبے مربوط ہیں اور جب تک تمام شعبوں کو ادھیڑ کر از سر نو مرتب نہ کیا جائے انقلاب برپا کرنا محال ہے اسی بنا پر اشتراکیت و اشتمالیت نے غیر معاشی امور میں بھی مداخلت شروع کر دی اور ۱۹۱۷ء میں جب لینن کی اشتراکی جماعت برسر اقتدار آئی تو اس نے سوویٹ یونین میں مذہب کو بزور شمشیر مٹا دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ لینن نے ایک تقریر میں کہا۔

> "مذہب لوگوں کے لئے افیون کا حکم رکھتا ہے۔ مارکسی مسلک کی نگاہ میں تمام مذاہب دراصل متوسط خوشحال طبقہ (بورژوا) کی رجعت پسندی کے آلات کار ہیں اور محنت کش طبقہ کو فریب دینے اور لوٹنے کے لئے دھوکے کی ٹٹی کا کام دیتے ہیں۔"

غیر مادی خدا سے اپنا تعلق قطع کر کے اشتراکیت نے اپنے مندر میں جسمانی خواہشات کا بت بٹھا دیا جس کے پجاری صرف یہی تلقین کرتے تھے کہ انسانی اعمال کے اصلی محرکات بھوک اور شہوت ہیں لہذا صرف انہی کی پرستش کرنی چاہیئے چنانچہ اس "میکانکی نظریہ حیات" کا نتیجہ یہ ہوا کہ اشتراکی سوسائٹی میں اخلاق کی بنیادیں مسمار ہو گئیں، خاندان کی بجائے فرد کو معاشرہ کا جزو ترکیبی قرار دیا گیا اور اہلی زندگی کے نظام کی پراگندگی نے انسانی اخلاق کی اینٹ سے اینٹ بجا دی حیوانیت کی نشوونما ہوئی۔ تعلقات کی پاکیزگی ختم ہو گئی۔ ماں اور بیٹے بھائی اور بہن میں کوئی تمیز نہ رہی، مرد اور عورت کو نکاح کی قید سے آزاد کر دیا گیا۔ ضبط تولید کی کھلم کھلا تلقین کی گئی اور گناہ و ثواب میں عملاً کوئی فرق نہ رہا۔ یہ سب اس لئے کہ اشتراکیوں کے نزدیک مذہب اور

؎ ڈیوی کمیشن کے سامنے ٹرانسکی کا بیان۔

اشتراکیت دو متضاد چیزیں تھیں۔

ان تعلیمات کا جو ہولناک اثر ہونا تھا وہ ظاہر ہے۔ جب سٹالین نے اس معاشری و اخلاقی انتشار کو محسوس کیا تو اس نے اپنے قوانین پر نظر ثانی کرکے ان میں بہت حد تک ردّ و بدل کیا۔ چنانچہ اب روس میں مذہب و اخلاق کی اتنی مخالفت نہیں کی جاتی جتنی انقلاب کے بعد ابتدائی زمانہ میں تھی اس کے ثبوت میں مسٹر ہیبرز کا مشاہدہ پیش کر دینا کافی ہوگا۔ آپ لکھتے ہیں۔

"والدین کے حقوق اور اختیارات اب بحال کر دیئے گئے ہیں اور بچوں کی تربیت میں ان کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نوجوانوں میں آوارگی اور غنڈے پن کو ہر طرح روکا جاتا ہے۔ طلاق کے معاملہ میں اگر ایک فریق کو اختلاف ہو تو مسئلہ عدالت میں پیش کیا جاتا ہے۔ حمل گرانا اب بہت برا سمجھا جاتا ہے اور اس کی سختی سے روک ٹوک کی جاتی ہے۔ مذہب اور مذہبی تعلیم کے خلاف جو احکام جاری کئے گئے تھے وہ ابھی تک منسوخ تو نہیں ہوئے البتہ ان پر عمل کرنے کی اب تاکید نہیں کی جاتی۔"

الغرض بالشوزم نہ صرف صحیح اشتراکیت کو خیرباد کہہ چکا ہے بلکہ اپنے اخلاقی و مذہبی لائحہ عمل میں بھی ترمیم کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

تعلیم و تربیت

۱۹۱۷ء میں جب بالشوزم کی بنیاد رکھی گئی تو روس کے نظام تعلیم میں بھی انقلاب برپا کیا گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوّے فیصدی سے زائد آبادی تعلیم یافتہ ہو گئی۔ اسکولوں کی عام حالت بہت بہتر بنا دی گئی اور بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام بالشویک حکومت کی طرف سے ہونے لگا لیکن اس تعلیم کی بنیاد مادیت پر رکھی گئی تھی یعنی بچّوں کو جو کچھ پڑھایا جاتا وہ محض دماغی تفریح یا اخلاقی حالت کو سنوارنے کے لئے نہ ہوتا بلکہ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ بچّے بڑے ہو کر اشتراکیہ روس کے معاشی و صنعتی نظام کو تقویت پہنچائیں اس سے نقصان یہ ہوا کہ بچّوں کا ذہنی تصور بہت محدود ہو گیا اور ان میں سے اکثر کو یہ علم نہ ہوتا کہ روس سے باہر کے ممالک میں کیا ہو رہا ہے۔ چنانچہ مسٹر کیز لٹ اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں۔

"اوڈیسا میں میں نے نئے طرز کا ایک سکول دیکھا جو بہت ہی اچھا تھا۔ عمارت خوشنما تھی کمرے کشادہ اور ضرورت کے مطابق تھے۔ استاد بہت مہربان اور خلوص کے ساتھ کام کرنے والے تھے۔ بچوں کی دیکھ بھال اچھی طرح کی جاتی تھی بعض کو دن کا کھانا سکول کی طرف سے ملتا تھا لیکن اس تعلیم کے باوجود یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ایسے بچے بہت ہی کم ہیں جن کو خبر ہے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ غیر ملکوں کے اخبار روس کے اندر لے جانا یا منگوانا منع ہے اور روس کے اخبارات میں صرف وہی خبریں شایع ہوتی ہیں جو حکومت پسند کرتی ہو۔"

پھر تعلیم کے باب میں تعصب سے کام لیا گیا ہے اور بورژوا (متوسط و خوشحال طبقہ) کے بچوں کا یونیورسٹی میں داخلہ ممنوع قرار دیا گیا۔ اس طرح گویا بالشوزم نے "مساوات" کے دعوی کو خود بخود جھٹلا دیا۔

تاہم اب حالات بہتر ہو رہے ہیں اور تعلیم و تربیت کے متعلق بالشوزم کا جدید رجحان مسٹر ہیبرز کے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

"بچّوں کی تربیت میں والدین کی امداد بھی حاصل کی جاتی ہے یونیورسٹی کے داخلہ پر جو پابندیاں طبقوں کی تفریق کی بنا پر لگائی گئی تھیں یعنی یہ کہ بورژوا خاندان کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکتے وہ دور کر دی گئی ہیں سکولوں اور یونیورسٹیوں میں تاریخ اور جغرافیہ ایسے مضامین کی تعلیم اب خالص علمی اصول پر دی جاتی ہے یعنی ان میں کمیونزم کا پروپیگنڈا نہیں کیا جاتا اسی نقطۂ نظر سے نصاب کی تمام کتابوں پر نظر ثانی کی گئی ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ اب روس میں بچوں کے لئے ہر موضوع پر بے شمار کتابیں شایع کی جاتی ہیں چنانچہ ۱۹۳۸ء میں صرف بچوں کے دارالاشاعت کی طرف سے دو کروڑ اسی لاکھ کتابیں شایع کی گئیں ۱۹۴۰ء میں یہ ادارہ نئی کہانیوں اور ناولوں کی دو کروڑ مزید کتابیں شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اس سے روس کی موجودہ تعلیمی پالیسی اور رفتار تعلیم و تربیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مزدوروں کی اُجرت

مارکسزم یا اشتمالیت کا منشا یہ تھا کہ چونکہ "منافع" مزدور کی محنت ہی سے حاصل ہوتا ہے اس لئے اشتراکی نظام میں اُسے مزدوروں ہی پر تقسیم کر دینا چاہئے۔ دوسرے مزدوروں کی اُجرت ان کی ضروریات کے مطابق مقرر ہونی چاہئے اس نظریہ پر سرمایہ پرست ماہرین معاشیات کی طرف سے کڑی نکتہ چینی کی گئی اور کہا گیا کہ اگر سرمایہ دار کو منافع کی توقع نہیں ہوگی تو وہ "کاروباری مخاطرات" کا مقابلہ کرنے کو تیار نہیں ہوگا

دوسرے محض ضروریات کی بنا پر دولت کی تقسیم غیر منصفانہ ہوگی، تقسیم دولت کے لئے مزدور کی اہلیت اور کارکردگی پر بھی نظر ڈال لینی چاہئے۔

معلوم ہوتا ہے سٹالین نے حامیانِ سرمایہ داری کے اس پروپیگنڈے کا اثر قبول کر لیا ہے چنانچہ سنہ ۱۹۳۶ء میں اُس نے روسی دستور اساسی میں جو ترمیم کی اس کے ماتحت مزدوروں کی اُجرت ان کی اہلیت کارکردگی کے مطابق متعین کی گئی مثلاً سنہ ۱۹۳۶ء کے سٹالینی دستور اساسی کی دفعہ ۱۱۸ یہ ہے:

"اشتراکیہ روس کے تمام باشندوں کو کام کرنے کا حق حاصل ہے انھیں کام کی نوعیت اور مقدار کے مطابق اُجرت دی جائے گی۔"

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مزدوروں کے متعلق بالشوزم کا رجحان وہی ہے جو سرمایہ دار ممالک میں پایا جاتا ہے۔ اگر اس قانون سے بھی مزدوروں کی حالت بہتر ہو جاتی تو سٹالین کا دستور اساسی نکتہ چینی کا مرکز نہ بنتا لیکن مصیبت یہ ہے کہ سٹالین کے دورِ حکومت میں جماعت عاملہ کی حالت سرمایہ دار ممالک کی مزدوروں کی بہ نسبت بھی خراب ہے اور اُن کی محنت کے معاوضہ کی تعیین کرتے وقت اشیاء کے نرخ کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ بعض اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ روس میں مزدور کو اوسطاً چھ روبل اور انگلستان میں اوسطاً چھ شلنگ ملتے ہیں۔ اگر ہم یہ دیکھیں کہ چھ روبل سے کیا کیا خریدا جا سکتا ہے اور چھ شلنگ سے کیا تو ہمیں اندازہ ہو سکے گا کہ کس کو زیادہ ملتا ہے۔ انگلستان میں چار پونڈ کی ڈبل روٹی ۳/۴ شلنگ کو ملتی ہے۔ روس میں اس کی قیمت ۲ شلنگ ہوگی۔ انگلستان میں ایک گیلن دودھ دو شلنگ کو ملتا ہے روس میں ۶ شلنگ کو۔ مکھن کا نرخ روس میں ۲۰ شلنگ فی سیر ہے اور اچھے قسم کا گوشت دس شلنگ فی سیر۔ کیا ان نرخوں کے پیش نظر ایک اوسط درجے کا روسی مزدور اپنا گزارا کر سکتا ہے؟ یقیناً نہیں، تو پھر اشتراکی نظام سے فائدہ؟ جب مزدوروں کی حالت ہی بہتر نہیں ہوئی تو اشتمالیت اور بالشوزم کا ڈھونگ رچانا کیا معنی؟

حق یہ ہے کہ روس میں اشتمالیت بہت مسخ ہو چکی ہے۔ اور سٹالین کا نظام حکومت نہ صرف "حکومتی آمریت" کی طرف مائل ہے بلکہ سرمایہ دارانہ اثرات بھی قبول کر رہا ہے اور اس کے ثبوت میں غالباً مندرجہ بالا حقائق غالباً کافی ہونگے۔

مغل لائن لمیٹڈ

جنگ کی وجہ سے حاجیوں کے جہازوں کی صحیح تاریخ روانگی متعین نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن ہمیں یہ پڑھ کر مسرت ہوئی کہ حکومت ہند کے مشورہ سے حاجیوں کے جہازوں کی روانگی کا انتظام ہو گیا ہے اور مغل حج لائن امسال بھی حسب معمول حاجیوں کو خاطر خواہ سہولتیں اور گنجائش بہم پہنچائے گی۔ مغل لائن کا اشتہار اس پرچہ کے صفحہ ۱۱۲ پر شایع ہو رہا ہے یہ اشتہار چھپ چکا تھا کہ اطلاع موصول ہوئی کہ "حکومت ہند کے بیان ۱۹ نومبر ۱۹۴۰ء کے مطابق حج کے خواہشمند حضرات کو بمبئی کی بندرگاہ میں ۱۶ دسمبر تک اور کراچی کی بندرگاہ میں ۱۹ دسمبر تک پہنچ جانا چاہئے" امید ہے کہ عازمانِ حج بیت اللہ مغل لائن لمیٹڈ کے جہازوں کی خدمات حاصل کریں گے کیونکہ یہ جہاز ہر لحاظ سے آرام دِہ اور محفوظ ہیں اور ان جہازوں کے ملازم بھی سلیقہ مند اور خوش اخلاق ہیں۔

(مینجر عالمگیر)

محویات

ٹپٹور، علاقۂ میسور کے مشاعرے کی صدارتی غزل

از حضرت علامہ محوی صدیقی لکھنوی

سکونِ بے محل تیرا یہ اے عزمِ جواں کب تک
ہلاکِ جورِ چنگیزی، دلِ فردوسیاں کب تک

بہارِ بزمِ امکاں تو ہے پھر نذرِ خزاں کب تک
گلستانِ جہاں میں صورتِ بلبل فغاں کب تک

خبر بھی ہے کہ تو ہی مسند آرائے خلافت ہے
غلامی کی ترے پائے عمل میں بیڑیاں کب تک

تجھے تشریفِ انسانی عطا کی ہے جو قدرت نے
رہیگی اے اسیرِ جہل و غفلت وہ نہاں کب تک

عدو کُش ہمتِ دل کیوں فنا ہونے لگی دل سے
رہے گا آشنائے خطرۂ سود و زیاں کب تک

زباں پر نعرۂ اللہ اکبر کیوں نہیں آتا
لبِ رنگیں پہ تیرے نغمۂ عشقِ بتاں کب تک

کہاں ہے غیرتِ دل کام اپنا کیوں نہیں کرتی
ترے خرمن پہ آخر حملۂ برقِ تپاں کب تک

جبیں ناآشنائے جلوۂ تیری ہو گئی یکسر
رہیگا صفحۂ ہستی پہ تیرا پھر نشاں کب تک

نہ ذوقِ خونچکانی ہے نہ شوقِ تیغ رانی ہے
یہ عالم ہے تو امیدِ حیاتِ کامراں کب تک

اُبھرتے کیوں نہیں وہ ولولے پھر عہدِ ماضی کے
نہ ہوگا خنجرِ خارا شگاف آخر عیاں کب تک

جزورِ انقلابِ دہرِ فطرت کا عطیہ ہے
اسے تو چھوڑ کر پامالِ جورِ آسماں کب تک

دکھا دے جوہرِ انسانیت پھر بزمِ دُنیا کو
رہیگا جذبۂ حیوانیت ہر سو عیاں کب تک

محبت موت سے جن کو ہے وہ کب مٹنے والے ہیں
فریبِ زندگی دینگے ہمیں اہلِ جہاں کب تک

نجات اس کشمکش سے مشرق و مغرب کی ممکن ہے
مگر ہم بھی تو دیکھیں یہ فریبِ جانستاں کب تک

ہمارا عہدِ ماضی ایک نقشِ غیر فانی ہے
رہے گی پردۂ غفلت میں اپنی داستاں کب تک

عمل کی آگ جو روشن تھی محویؔ بجھنے والی ہے
رہے گا نورِ ایمانی دلوں میں میہماں کب تک

گُلنار

افسانہ

از جناب ظفر واسطی شاہ آبادی

یہ افسانہ جناب ظفر واسطی صاحب نے ۲۲ اگست ۱۹۴۰ء کو دہلی ریڈیو سٹیشن سے براڈکاسٹ کیا تھا اور ہم سٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو دہلی کی اجازت اور شکریہ کے ساتھ عالمگیر میں شائع کر رہے ہیں۔ (ایڈیٹر)

گُلنار اور خورشید کو اُن کا ایک رشتہ دار ملنے آیا تھا۔ گو چائے کا وقت نہیں تھا لیکن گُلنار اُسے دیکھتے ہی چائے کا اہتمام کرنے لگی۔ حامد زیادہ دیر ٹھہرنا نہ چاہتا تھا۔ وہ گلنار کو ایک نظر دیکھنے گیا تھا اور ایک نظر دیکھنے کے بعد چاہتا تھا کہ فوراً واپس چلا آئے۔ لیکن گلنار شاید اُسے کچھ دیر بٹھانا چاہتی تھی کچھ نہیں تو چائے ہی بنانے لگی اور دراصل حامد اُن کے یہاں گیا ہی تھا اُس کے بلانے پر۔ خورشید اور گلنار وطن سے باہر ہی رہتے تھے اور حامد بھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ خورشید چھٹی لیکر بچوں سمیت آیا ہوا تھا کہ حامد بھی تین چار دن کے لئے آ گیا۔

وطن پہنچکر حامد کو پتہ چلا کہ گُلنار اور خورشید بھی آئے ہوئے ہیں۔ اس خبر سے اُسے خوشی تو ہوئی لیکن صرف دو چار لمحوں ہی کیلئے پھر ایک نامعلوم غم اُس کے دل پر چھا گیا اور اسی غم کا نتیجہ تھا کہ اُس نے اُن سے ملنے نہ جانے کا ارادہ کر لیا۔ سوچا کہ خورشید بازار میں یا کسی رشتہ دار کے یہاں مل جائے تو اچھا ہے لیکن گلنار —— گلنار کو دیکھنے کی اُس میں طاقت نہیں تھی اور اسی لئے وہ اُسے دیکھنا ہی نہ چاہتا تھا۔ مگر ابھی چھٹی کا ایک دن باقی تھا کہ گلنار رات کو اُن کے یہاں آئی چاندنی رات تھی حامد دن چھپتے ہی دریا کی سیر کو چلا گیا تھا اور وہاں دریا کے صاف و شفاف پانی نے اور چاندنی نے اُسے کچھ بھولی ہوئی باتیں یاد دلا دی تھیں۔ وہ اُدھر دریا کے کنارے ہری ہری گھاس پر مست و بیخود بیٹھا رہا اور اِدھر گلنار اُس کا انتظار کر کے چلی گئی۔

حامد واپس آیا تو بہن نے بتایا کہ گلنار آئی تھیں بڑی دیر تک بیٹھی رہیں۔ یہ کچھ نہ بولا۔ اُس نے پھر کہا وہ کہہ گئی ہیں کہ بھائی حامد سے کہنا کہ ہمیں بغیر ملے نہ چلے جائیں آخر ایسا بھی کیا خون سفید ہو گیا ہے ——

اُس نے پوری بات نہیں سُنی۔ دُوسرے کمرے میں کپڑے بدلنے چلا گیا۔ کپڑے بدل کر آیا تو بہن نے پھر اپنی بات دُہرائی۔ وہ کہہ گئی ہیں ایسا بھی کیا خون سفید ہو گیا ہے کہ چھٹی آئے ہوئے تین دن ہو گئے اور آکر شکل تک نہیں دکھائی۔

وہ اب بھی کچھ نہیں بولا اور پھر باہر جانے لگا تو اُسکی والدہ نے کہا۔
"اب پھر کہاں چلے میں کب سے تمہارے انتظار میں کھانا لئے بیٹھی ہوں"۔
"مجھے بھوک نہیں ہے اُمی"۔
"کیا ظہور کے یہاں کھا آئے؟"
حامد نے اُن کی بات نہیں سُنی یا اگر سُنی تو جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔

~~~~~~

دُوسرا دن ہوا عقل کہتی تھی کہ گلنار سے بغیر ملے ہی واپس چلا جانا چاہئے۔ دل کہتا تھا ایسا ہرگز نہ کرنا۔ وہ غریب خود ملنے آئی اور تم نہیں ملے تو پیغام دے گئی۔ اگر اب بھی نہ گئے تو اُس کے دل پر کیا گذرے گی عقل نے اس دلیل کے جواب میں کہا اور تمہارے اپنے دل پر کیا گذر رہی ہے۔ دل بولا کہ انسان کو اپنی فکر نہیں کرنی چاہئے۔ اچھا انسان وہ ہے جو دُوسرے کے فائدے کو اپنے فائدے سے اچھا سمجھے۔

آخر بہت سوچ بچار کے بعد اُن کے یہاں چلا ہی گیا۔ خورشید گھر ہی میں موجود تھا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ گلنار بولی بھائی حامد سلام۔ اس نے نظر اُٹھا کر اُسکی طرف دیکھا۔ سلام کا جواب دیا اور دم بخود رہ گیا۔ اب اُس کے سامنے وہ گلنار نہیں تھی جسے اُس نے آج سے چار برس پہلے دیکھا تھا اور جو گلنار اُس وقت سے ہمیشہ اُس کے تصور میں پھرا کرتی تھی۔ اُس کا رنگ ہلدی جیسا زرد ہو گیا تھا۔ اور ہاتھوں یا چہرے پر کہیں خون کی سُرخی نظر نہ آتی تھی۔

حامد سے اُس کی یہ حالت نہ دیکھی گئی۔ ایک دم چار برس کی دبی ہوئی آگ بھڑک اُٹھی۔ ایک دم وہ محبت جو اس طویل عرصے میں سمٹ سمٹ کر دل میں جمع ہو گئی تھی اُسکی رگ رگ میں سرایت کر گئی۔ گلنار کی یہ حالت دیکھ کر اُسے بے انتہا رنج پہنچا۔ وہ چار برس تک یہ سمجھتا رہا تھا کہ گلنار آرام سے ہے اور پُرمسرت زندگی بسر کر رہی ہے۔ لیکن اُس کا پیلا رنگ اُسکی دھنسی ہوئی آنکھیں اور اُس کے پچکے ہوئے رُخسار سب اس بات کی چغلی کھا رہے تھے کہ گلنار کے دن رنج و غم میں بسر ہوتے ہیں۔
~~~~~~

جلد ذرا دیر بیٹھا تھا کہ دل نے کہا چلئے اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔ اور عقل طعنہ دینے لگی میں پہلے ہی نہ کہتی تھی کہ یہاں نہ جائیے۔

اس نے آنے کی اجازت مانگی اور گلنار بولی۔

"ابھی چائے تیار ہو جاتی ہے چائے پی کر جائیے گا۔"

گلنار چائے بنا رہی تھی کہ اسکی بچی رونے لگی۔ گلنار نے اُسے اپنے پاس پیڑھے پر بٹھا رکھا تھا۔ حامد کے جی میں آیا کہ بچی کو گود میں اُٹھا لے اور خورشید پر تعجب ہوا کہ یہ کیسا بے فکر بیٹھا باتیں بنا رہا ہے بچی کو کیوں نہیں چُپ کراتا۔ کہ خورشید غصہ سے بولا۔

"کیسی بیوقوف عورت ہے بچی رو رہی ہے یہ نہیں کرتی کہ اُسے گود میں اُٹھا لے۔"

حامد کو خورشید کا یہ بے موقع غصہ بہت بُرا معلوم ہوا۔ سوچنے لگا کہ غلطی اپنی ہے اور ناراض ہوتا ہے گلنار پر۔ لیکن گلنار خورشید کی بات کے جواب میں صرف مُسکرا پڑی۔ اور گلنار کے مُسکرانے سے حامد کو وہی موتی سے سفید دانت دکھائی دیئے جو چار سال پہلے اُس کے مُسکرانے پر نظر آتے تھے۔ گلنار ساری بدل گئی تھی مگر اُس کے دانت نہ بدلے تھے۔ اُن میں اب تک وہی موتیوں کی آب تھی اور وہی پہلے سی چمک۔

بچی بدستور روتی رہی۔ حامد باتیں کرتے کرتے اُٹھا اور بولا۔

"بچی رو رہی ہے میں اسے گود میں لے لوں۔"

خورشید بولا۔

"اجی آپ بیٹھئے!"

اور پھر پہلے سے بھی زیادہ غصہ سے گلنار سے کہنے لگا۔

"اگر تو نے اب بھی اسے گود میں نہ اُٹھایا تو آکر چائے کا پکتا پکتا پانی تیرے سر میں ڈال دوں گا۔"

گلنار نے پہلے سے زیادہ مُسکراتے ہوئے بچی کو گود میں لے لیا۔ اور حامد کو محسوس ہوا۔ کہ خورشید چائے کا کھولتا ہوا پانی گلنار کے سر میں ڈالنے کی بجائے حامد کے دل پر ڈال دیا ہے۔

چائے تیار کر چکی تو گلنار کو خیال آیا کہ کچھ توس بھی بنا دوں۔ خورشید سے بولی۔

"دیکھئے صبح میں نے مکھن کی دونوں ٹکیاں آپکے توسوں میں لگا دی تھیں، اب اگر اور مکھن لا دیتے ۔۔۔۔"

اُس نے اپنی بات نامکمل ہی چھوڑ دی اور مُسکرانے لگی۔ جیسے اُسے خوف تھا کہ کہیں خورشید ناراض نہ ہونے لگے۔

حامد نے کہا۔

"بھئی مکھن کی ضرورت نہیں۔ میں خشک توس ہی کھا لوں گا اور اوّل تو توسوں کی بھی ضرورت نہیں تھی۔"

گلنار بولی۔

"خشک توس کیوں کھا لیں گے آپ۔ یہ ابھی مکھن لا دیتے ہیں۔"

اور خورشید نے کہا۔

"ہاں ہاں میں ابھی مکھن لے آتا ہوں۔"

اُس کے جانے پر حامد اور گلنار نے ایک ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھا، دونوں کی نظریں ملیں اور پھر دونوں نے ایک ساتھ نگاہیں نیچی کر لیں کچھ لمحے خاموشی میں گذرے۔ پھر گلنار بولی۔

"یہ تمہیں کیا ہو گیا بھائی حامد ——— تمہارے دشمن تو ایسے کمزور ہو گئے کہ ———"

خبر نہیں وہ ابھی اور کیا کہتی حامد بیچ میں ہی بول پڑا۔

"کبھی تم نے اپنی حالت بھی شیشہ میں دیکھی؟"

"کیوں مجھے کیا ہوا۔ میں تو بھلی چنگی ہوں۔" گلنار نے ایک دلکش تبسم سے کہا۔ اُسکے دلکش تبسم پر حامد کی نظروں میں سالئے بیل کی تازہ تازہ سفید کلیوں کا تصور پھر گیا۔

"شکل تو دیکھو جیسے برسوں کی بیمار ہو اور کہتی ہو کہ میں بھلی چنگی ہوں۔ خدا خورشید کو عقل دے کہ وہ تمہاری قدر کرے۔"

آخری فقرہ کہتے ہوئے اُس کا دل دُکھا لیکن مُنہ پر آئی ہوئی بات روکنے کا وہ عادی نہیں تھا۔

اور گلنار نے جواب دیا۔

"خورشید میری مناسب قدر کرتے ہیں اور اس سے زیادہ کی میں مستحق بھی تو نہیں۔"

حامد کے جی میں آیا کہ کہے یہ کوئی میرے دل سے پوچھے کہ تم کتنی قدر کی مستحق ہو، لیکن اُس نے ضبط سے کام لیا اور صرف اتنا کہا۔

"یہ مناسب قدر ہے!"

گلنار نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"اور تم اپنی بیوی کی کتنی قدر کرتے ہو؟"

"لیکن میں اُسے اس طرح بُرا بھلا تو نہیں کہتا۔"

"بُرا بھلا تو بے شک نہیں کہتے لیکن ——— مجھے زیب نہیں دیتا کہ عمر میں چھوٹی ہو کر نصیحتیں کروں لیکن شوہر ہونے سے جو فرائض تم پر عائد ہو گئے ہیں، اُنہیں پورا کرنا تمہارا سب سے بڑا فرض ہے۔"

"لیکن گلنار ——" وہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ گلنار فوراً ہی بول اُٹھی۔

"حامد یہ دُنیا ہے یہاں آدمیوں کی مُنہ مانگی مُرادیں نہیں مِل جاتیں۔"

"لیکن مُرادیں نہ ملنے پر بھی یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ خوش رہو۔"

ابھی گلنار اُس کی بات کا جواب دینے نہ پائی تھی کہ خورشید مکھن لیکر آگیا۔ گلنار نے جلدی جلدی توسوں پر مکھن لگایا اور چائے تیار کر کے اُن دونوں کے آگے رکھدی۔

چار برس کی مُدت میں حامد کو پہلی مرتبہ زندگی دلکش معلوم ہوئی۔ بھائی حامد یہ توس اور کھلیئے۔ بھائی حامد ایک پیالی اور لیجئے۔ بھائی حامد لکھنؤ میں رہکر بالکل ہی لکھنوی بن گئے آپ تو۔ اِن الفاظ میں ایسا رس تھا کہ حامد کو زندگی بے حد شیریں معلوم ہونے لگی۔

گلنار کا مخاطب کرنے کا طریقہ اُسے بہت ہی پسند تھا چار برس پہلے ان ہی الفاظ نے اُسے گلنار کا گرویدہ بنا دیا تھا اور یہ الفاظ ہمیشہ اُس کے کانوں میں گونجتے رہے تھے۔ علیگڑھ سے کالج بند ہونے پر گھر آیا تھا کہ ماں باپ کی صحبت میں کچھ دن گذار کر کشمیر چلا جائے۔ گلنار بھی اپنے والدین کے ہمراہ وطن آئی تھی اور حامد کے یہاں مہمان تھی۔ ہوش سنبھالنے کے بعد ایک دوسرے کو اُنہوں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اِدھر حامد نے گھر میں قدم رکھا اُدھر گلنار نے کہا بھائی حامد سلام۔ یہ دیکھتا ہی رہگیا کہ یہ لڑکی کون ہے۔ ماں نے بتایا کہ یہ تمہاری بہن ہے گلنار ارشد کی لڑکی —— اُس کی نظروں میں وہ سارا نقشہ پھر گیا۔ کتنے دن گلنار اُن کے یہاں مہمان رہی اور کتنے دن یہ کشمیر جانے کا ارادہ ملتوی کرتا رہا۔ پھر جب اس نے اپنی ماں سے کہا کہ گلنار کو آپ اتنا پسند کرتی ہیں کیا۔ یہ آپ کو بہو کی حیثیت سے بھی پسند آجائیگی۔ اور ماں کے بتلانے پر کہ وہ پہلے ہی اُسے بہو بنانے کیلئے اِنتخاب کر چکی ہیں۔ حامد کی باچھیں کھِل گئیں۔ اور جب کچھ دِنوں میں نسبت کی ابتدائی رسم ادا کی گئی تو اسے ایسا محسوس ہُوا گویا دونوں جہان کے خزانے مِل گئے۔ بعد کے واقعات کی یاد بڑی تلخ تھی۔ پھر کسی بات پر گلنار اور حامد کی ماں میں لڑائی ہو گئی۔ اور یہ لڑائی آہستہ آہستہ اتنی بڑھ گئی کہ دونوں نے گلنار اور حامد کی منگنی فسخ کرنے کا اعلان کر دیا اور صرف اعلان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ دونوں کو یہ شوق سوار ہُوا کہ فوراً ہی کہیں دوسری جگہ بات پکّی کر دی جائے۔ لہذا گلنار کے لئے خورشید کا اِنتخاب کیا گیا اور حامد کیلئے ایک رشتہ دار لڑکی پسند کیگئی۔ حامد کی والدہ نے اس سارے جھگڑے اور نئے انتخاب کے متعلق حامد کو اطلاع دینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی اور بیچاری گلنار تو لڑکی تھی وہ اپنی ماں کے آگے کیا بولتی اور اس طرح محبت کرنے والے دو دِلوں کو ہمیشہ کے لئے جُدا کر دیا۔

حامد یہ باتیں یاد کر رہا تھا اور چائے پیتا جا رہا تھا۔ گلنار شاید یہ سب کچھ بھول چکی تھی۔ یا شاید وہ پہلی مُلاقات کی یاد تازہ کرنے کیلئے بار بار بھائی حامد بھائی حامد کہہ رہی تھی۔ خورشید کو ان واقعات کا علم نہ تھا اور اس سے بھی زیادہ وہ اُن دونوں کی دِلی کیفیات سے بے خبر تھا۔ ایکدفعہ جو اُس نے اتفاقیہ حامد کی طرف دیکھا تو حامد کو اپنے خیالات میں گُم دیکھ کر اُسے فطرتاً حیرت ہوئی اور وہ اُسے گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔ گلنار شاید اسکی نظریں تاڑ گئی۔ بولی۔ "بھائی حامد کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

حامد اس فقرے سے گویا اپنے خواب سے جاگ اُٹھا۔

چائے کا دور ختم ہُوا تو حامد نے پھر آنے کی اجازت مانگی۔ گلنار نے کہا ایک منٹ اور ٹھہریئے میں پان لگا لاؤں۔ حامد کو اُس کے ہاتھ کا پان بہت اچھا لگتا تھا۔ چار برس پہلے اُس کا خیال تھا کہ گھر میں اور کسی کو پان لگانے کا سلیقہ ہی نہیں آتا۔ اور پھر اُس نے جانے کیوں پان کھانا ہی چھوڑ دیا تھا۔

لیکن گلنار کو اِس بات کا علم کیسے ہو گیا۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ باہر سے کسی نے خورشید کو آواز دے لی۔ اِدھر خورشید باہر گیا اور اُدھر گلنار پان لے کر آ گئی۔ حامد نے طشتری میں سے پان اُٹھایا اور نہایت دبی زبان سے کہا "شکریہ!" اور یہ لفظ کہتے ہی اچانک اُسے گلنار کا وہ فقرہ یاد آگیا "مجھے آپکی زبان سے شکریئے کا لفظ بہت اچھا لگتا ہے۔" اور یہ فقرہ یاد آتے ہی اُس نے نظر اُٹھا کر گلنار کی طرف دیکھا۔ وہ نیچی نگاہیں کئے خاموش کھڑی تھی۔ ہاتھ میں پان کی طشتری تھی جس میں ابھی ایک پان رکھا تھا۔ حامد کو محسوس ہُوا کہ گلنار کا طشتری والا ہاتھ کانپ رہا ہے۔

اُس نے کہا۔ "گلنار ——"

"پھر خود ہی چُپ ہو گیا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ سوچ رہا تھا کہ اگر میری شادی گلنار سے ہو جاتی تو ہم دونوں کی زندگیاں آپ سے کتنی مختلف ہوتیں۔

گلنار بدستور نیچی نظریں کئے ہوئے بولی۔ اُسکی آواز میں درد تھا اور مایوسی بھی۔

"میں آپ کے جذبات کو پہچانتی بھی ہوں اور قدر بھی کرتی ہوں، لیکن آپ اپنی بیوی کی طرف سے جو غفلت برتتے ہیں وہ مجھے بالکل پسند نہیں، آخر اُس غریب کا کیا قصور ہے۔"

بیوی کا ذکر سُن کر حامد کو اپنی بدنصیبی کا احساس اور زیادہ شدت کے ساتھ ہونے لگا اور اس احساس کے ساتھ اُس کے تصور میں اُسکی بیوی آگئی جسے گلنار کے مقابلہ میں دیکھ کر حامد کے دل و دماغ میں ایک آگ سی

لگ گئی۔ اور اُسے ایک عجیب قسم کی دحشت سی محسوس ہونے لگی۔
گلنار نے اُس کے چہرے سے شاید اُس کے خیالات پڑھ لئے۔ بولی۔
"آپ کو شاید میری باتیں بُری معلوم ہوتی ہوں لیکن ——"
حامد نے اُسے کچھ اور کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ فوراً ہی لجاجت آمیز لہجہ میں بول اُٹھا۔
"اِن نصیحتوں کو رہنے دو —— اس وقت صرف اتنا کہہ دو کہ تم آب بھی مجھ سے محبت کرتی ہو"
گلنار نے جذبات سے خالی آواز میں جواب دیا۔
"پاگل نہ بنو۔ اَب مَیں خود کچھ نہیں ہوں۔ میری ہستی خورشید کی ہستی میں فنا ہو چکی ہے۔
گلنار کے جواب سے حامد کی نظروں میں بیوی کا تصور اور زیادہ تیز ہو گیا۔ اور تصور کے تیز ہونے سے دِل کی آگ اور وحشت بھی تیز ہو گئی۔ اُٹھا —— گلنار کو مایوس نگاہوں سے دیکھتا ہوا اُٹھا اور تیزی سے باہر چلا گیا۔

کل رات کو

از جناب پروفیسر سیّد صفی حیدر دانش

جاگ اُٹھی تھی بہارِ جاوداں کل رات کو
حُسن لیتا تھا جہاں انگڑائیاں کل رات کو

شام سے چھپائی ہوئی تھیں عشق کی رنگینیاں
دل کے نغموں کا بنا تھا سائباں کل رات کو

اُن کی محفل ور ہیں دل کو نقیں آتا نہ تھا
تھیں تحیّر میں مری ناکامیاں کل رات کو

کاوشوں کی یادگاریں یعنی اُمیدیں مری
ہو گئی تھیں پھر نئے سر سے جواں کل رات کو

رفتہ جاناں کی قسم ڈھونڈے سے بھی ملتی نہ تھیں
کھو گئی تھیں حُسن میں تاریکیاں کل رات کو

دیکھ لیتے تھے وہ ہنس ہنس کر جو تاروں کی طرف
پھول برساتی تھی سلکِ کہکشاں کل رات کو

خونِ دل کی طرح رہ رہ کر اُبلتی تھی شراب
مے کے ہر ساغر پہ تھا دل کا گماں کل رات کو

کپکپا اُٹھتا تھا دل جب مُسکرا دیتے تھے وہ
دمبدم گرتی تھیں ٹھنڈی بجلیاں کل رات کو

ناز برداری کو تھیں میری نگاہیں ساتھ ساتھ
کھیلتی پھرتی تھیں اُن کی شوخیاں کل رات کو

وہ نوائے سازِ پُر دل کے دھڑکنے کی صدا
ہلکے ہلکے بج رہی تھیں تالیاں کل رات کو

دل ہی دل میں شمع جلتی تھی مگر خاموش تھی
جام و مینا میں بھی تھیں سرگوشیاں کل رات کو

سامنے وہ تھے تو بیہوشی بھی بے ہوشی نہ تھی
ہوش افزا تھی شرابِ ارغواں کل رات کو

شعر بنکر آ گیا تھا دل زبانِ شوق پر
سُن رہے تھے وہ جو میری داستاں کل رات کو

شرم باقی تھی نگاہوں میں نہ باتوں میں حجاب
توڑ دی تھی میں نے ہر رسمِ جہاں کل رات کو

کر رہا ہوں آج اے دانش دُعائیں شام سے
پھر نظر آئے جو دیکھا تھا سماں کل رات کو

مثالیہ شاعری

ادبی مقالہ

از جناب مولوی بشیر احمد صاحب ہاپوڑی

دنیا کے پردے پر مختلف اقسام کے شاعرانہ اصول قائم ہوئے۔ اور مرورِ ایام کے ساتھ گردش کرتے ہوئے دوسرے رنگ میں مبدل ہو گئے۔ زمانہ پیشین میں پبلک عموماً رزمیہ داستانوں اور بعید از قیاس قصے کہانیوں پر مٹتی ہوئی تھی۔ اس لئے انکی ضیافتِ طبع کیلئے رامائن، مہابھارت، ایلیئڈ، اڈیسی[1] اور شاہنامہ وسکندر نامہ جیسے شجاعانہ قصے بسط تحریر میں لائے گئے۔ اسکے بعد صرف مذہبی و اخلاقی دور آیا جس میں سنسکرت کے سبق آموز ڈراماؤں نے نیز مولانا روم کی مثنوی، حکیم سنائی کے حدیقے، عطار کی منطق الطیر اور سعدی کی اخلاق آموز کتابوں نے چار چاند لگا کر شائقین کے دلوں کو موہ لیا۔ سنسکرت لٹریچر پر اوس سی پڑ گئی اور فارسی علم ادب کی جولانیاں مشرق و مغرب پر ڈانڈے ملانے لگیں۔ اس دور میں غلو، مبالغہ، تشبیہ اور استعارے نے اپنا سکہ جما لیا جسمیں خاقانی، انوری، نظامی اور جلال اسیر نے گلکاریاں کیں اور جدت پسند طبائع انسانی کو متعجب و متحیر بنا دیا۔ دکن میں ظہوری نے بھی اسی قسم کی خیالی چمن بندی کی۔ آخر ٹھیٹھ ایرانی شعرا کی تعلیم و تفہیم کی بدولت اکبر نے ابوالفضل کو سلاستِ بیان کے اجرا پر مائل کیا۔ اور اکبر نامہ و آئین اکبری نے پرانی نثر نگاری پر پانی پھیر دیا۔ پہلے اکبری دور کے شعرا نے نظم کی تنسیخ و ترمیم اور اصلاح و ترتیب کی جانب اپنی طبع مبذول کی اور بعد ازاں نثر کی سلاست و روانی پر خیال آرائی کی گئی۔ شاہ اکبر اور اسکے نورتن بھاکا کے شلوکوں اور دوہوں کے رسیلے تھے۔ اور ان کے دماغ میں یہ خیال گشت لگا رہا تھا کہ دوہوں کی سی مثالیہ شاعری ہی صحیح معنوں میں نیچرل شاعری ہے۔ اس خیال کو عبدالرحیم خان خاناں نے زیادہ وسعت دی۔ چونکہ ہمارا موضوع مثالیہ شاعری ہے جو صحیح طور پر سنسکرت سے ماخوذ ہے اور بھاکا کی شاعری نے بھی اسی سے خوشہ چینی کی ہے اس لئے ہم اپنے مضمون کا آغاز سنسکرت کی مثالیہ شاعری سے کرتے ہیں۔

سنسکرت کی مثالیہ شاعری بلحاظ قدامت سنسکرت کی مثالیہ شاعری کو تقدم حاصل ہے اور اس نے اپنے زمانۂ عروج میں اسقدر ترقی کی تھی کہ کئی لاکھ اشلوکوں کی ایک کتاب مرتب کی گئی تھی جس کا انتخاب سبھاشیتم کے نام سے آج بھی کتب فروشوں کے ہاں پایا جاتا ہے۔ اس میں صرف نتیجہ آموز یا اخلاقی اشلوک مختلف عنوانات کے تحت میں درج کئے گئے ہیں۔ انتہائی حزن و ملال کے ساتھ ہم اس بات کی جرأت کرتے ہیں کہ عربی زبان میں اس پائے کی کتاب آجتک کسی کو لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اگرچہ ایک خدا کے بندے نے فارسی مثالیہ اشعار کا مختصر سا مجموعہ "الف نصائح" کے نام سے تیس چالیس سال قبل طبع کرایا تھا مگر وہ اسقدر ناقص اور غیر متعلق اشعار سے پر ہے کہ وہ سبھاشیتم کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ ہم قارئین کرام کی ضیافتِ طبع کے خیال سے چند سنسکرت اشلوکوں کا ترجمہ ذیل میں درج کئے دیتے ہیں:۔

(۱) جس شخص کا دل سبھاشیت (مثالیہ شعر) کے سننے سے یا موسیقی کے دلآویز ترانوں سے یا زاہد فریب حسنِ نمکین سے لذت یاب نہیں ہوتا وہ آدمی یا تو مردہ دل زاہد خشک ہوتا ہے یا چارپایوں کی طرح بے علم و لایعقل تصور کیا جاتا ہے۔

(۲) جو آدمی شائق سیر و سیاحت نہیں ہوتا۔ اور علما و فضلا کی صحبت سے محروم رہتا ہے اسکی عقل ایسی کوتاہ اور محدود رہتی ہے جیسے پانی میں ڈالا ہوا گھی کا قطرہ۔ اس کے برعکس اس شخص کی عقل و فراست ہوتی ہے جو شائق سیر سیاحت ہوتا ہے اور علما و فضلا کی صحبتوں سے متمتع ہوا کرتا ہے اسکی عقل ایسی وسیع ہوتی ہے جیسے پانی میں پھیلی ہوئی تیل کی بوند[1]۔

(۳) سجنوں[2] کے ساتھ خلط ملط رکھنے سے کم ظرف آدمی بھی معزز کہلاتا ہے جیسے پھولوں کی مالا کے ساتھ اس کا دھاگا بھی راجاؤں، بادشاہوں کے سر چڑھایا جاتا ہے۔

(۴) گن وان اور باکمال شخص کی دنیا بھر میں قدر و منزلت ہوتی ہے۔ وہ جنگل پہاڑ یا دشوار گذار مقام پر بھی رہتا ہو تو اس کے ماننے والے اسکی خدمت میں پہنچنے سے گریز نہیں کرتے۔ جیسے کیتکی کا پھول غار کی تہ میں بھی ہو تو وہاں بھنورے جا پہنچتے ہیں۔

(۵) جس طرح طلائے غیر مغشوش کی جانچ کوٹنے، توڑنے، تپانے اور محک پر کسنے سے ہوتی ہے اسی طرح آدمی اپنے برتاؤ، نیک چلنی، خوش مزاجی اور استبازی سے جانچا جاتا ہے۔

(۶) یوں تو بھڑ، مچھر اور پسوؤں کی شمولیت بھی تکلیف دہ حشرات میں

---

[1] الیئیڈ اڈیسی اہلِ یونان کی رزمیہ منظوم داستانیں ہیں۔

[1] خاصہ ہے کہ پانی میں گھی کی بوند اینٹھ جاتی ہے اور تیل کا قطرہ پھیل جاتا ہے۔

[2] سجن یعنی نیک آدمی۔

ہوتی ہے لیکن سب سے زیادہ موذی کھٹمل ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں دیبی دیوتا بھی لرزہ براندام ہوتے ہیں۔ کھٹملوں کے خوف سے شیوجی نے مرگھٹ کو شہروں پر ترجیح دی ہے۔ لکشمی دیبی شبکو کنول میں بسیرا لیتی ہے اور دشنوجی بحرِ عمیق میں شیشناگ کے کنڈل پر رات گزار دیتے ہیں۔[1]

ہندی مثالیہ شاعری مندرجہ بالا سنسکرت مثالیں مشتے نمونہ از خروارے کی حیثیت رکھتی ہیں سنسکرت زبان میں مثالیہ اشعار کا ذخیرہ وافر موجود ہے۔ چونکہ پراکرت یا ہندی شاعری سنسکرت کی پرتوگیر ہے۔ اِس لئے چند ہندی سبق آموز مثالیہ اشعار بھی بغرض تفننِ طبع نذرِ قارئین کئے جاتے ہیں:—

(۱) جیسے گھٹ پران نہ سنچرے وہ گھٹ جان مسان
جیسے مشک لہار کی سانس لیت، بن پران (سوداس)

(۲) نردھن گرا پہاڑ سے تو کوئی نہ دیوے سہار
دھنونتی کے کانٹا لگا تو دوڑیں لوگ ہزار (بہائی لال)

(۳) پانی سے پانی ملے اور ملے کیچ سے کیچ
اُتم سے اُتم ملے، ملے نیچ سے نیچ[2] (کبیر)

(۴) پیت تو ایسی کیجئے کہ جیسے لیٹا ڈور
اپنا گلا پھنسائیے دور سے لائے بور (بوزنا غے بھر) (رائے داس)

(۵) بیٹھی مدھ پر ماکھیا پنکھ لئے لپٹائے
ہاتھ ملے اور سر دھنے لالچ بُری بلائے (سبھو بائی)

(۶) جنگل جاٹ نہ چھیڑیئے، ہاٹ بیچ بقال
بھُوکا ترک نہ چھیڑیئے ہو جائے جنجال (کوی بھوشن)

(۷) تن اُجر من کوئلہ بگلا جیسا بھیس
تو سے تو کاگا بھلا کہ باہر بھیتر ایک (کوی گنگ)

(۸) سبھو جگ ملیوں رہیئے جیون جیھا مکھ مانھ
گھیو گھنا بھکشن کرے تو بھی چکنی نانھ (سبھو بائی)

یوں تو ہندی یا پراکرت مثالیہ شاعری زمانۂ قدیم سے تھی۔ مگر گرونانک، کبیر اور تلسی داس نے اسے زیادہ ترقی دی۔ کبیر اور گرو نانک بابر کے زمانے میں تھے۔ اور تلسی عبدالرحیم خان خاناں کا ہمعصر تھا۔ عبدالرحیم خان خاناں ہندی شاعری میں مہارت کامل رکھتا تھا۔ اس نے جس ندرت وخوبی سے دوہے لکھے ہیں، وہ نہایت بلیغ اور قابل تعریف ہیں ذیل میں خان خاناں کے چند دوہے درج ہیں پڑھئے اور سر دھنئے:—

(۱) ترور پھل نہیں کھات ہیں۔ سرور پیئے نہ پان
کہے رحیم پرکاج ہت سنپتی سنچن سجان

ترجمہ:— درخت پھل نہیں کھاتے، تالاب پانی نہیں پیتے۔ نیک بندے زر و مال دوسروں کے لئے خرچ کرتے ہیں۔

(۲) جال پرے جل جات ہے تج مینن کو موہ
رحمن مچھلی نیر کو تیو نہ چھاڑت چھوہ

ترجمہ:— مچھلی جب جال میں پھنستی ہے تو پانی اُسے تنہا چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے لیکن اے رحمن تعجب ہے کہ اس پر بھی مچھلی پانی کی محبت سے باز نہیں آتی۔

(۳) بگڑی بات بنے نہیں لاکھ کرے کن کوئے
رحمن بگڑے دودھ کو متھے نہ ماکھن ہوئے

ترجمہ:— بگڑی بات کسی تدبیر سے بنائی نہیں جاتی جس طرح بگڑے ہوئے دودھ کو کوئی لاکھ متھے مگر اُس سے مکھن برآمد نہ ہوگا۔

(۴) جو رحمن اوچھے بڑھے تو اُتے ہی اترائے
پیادا سے فرزین بھیو ٹیڑھو ٹیڑھو جائے

ترجمہ:— اے رحمن جب اوچھے آدمی درجہ اور مرتبہ پاکر بڑھ جاتے ہیں تو وہ کج مزاج اور بدچلن ہو جاتے ہیں جیسے شطرنج کا پیادہ جب فرزین ہو جاتا ہے تو وہ ٹیڑھی چال چلنے لگتا ہے۔

(۵) کھیرا کو مکھ کاٹ کر ملت لون لگائے
رحمن کڑوے مُکھن کو چاہیے یہی سجائے

ترجمہ:— جب کھیرے کے کڑوے ہونے کا احتمال ہوتا ہے تو اس کا مُنہ کاٹ کر اس پر کچھ کسار کے اس پر نمک چھڑک دیتے ہیں۔ اے رحمن تلخ زبان شخص کی واقعی یہی سزا ہے۔

(۶) جا رحیم اُتم پرکرتی کا کری سکت کسنگ
چندن وِش بیاپت نہیں لپٹے رہت بھجنگ

ترجمہ:— اے رحیم جس کی طینت پاک ہوتی ہے اُسکو بُری صحبت کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتی جیسے چندن کے درخت پر سانپ لپٹا رہے تو اُس کے زہر کا درخت پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

عربی شاعری قدیم عربی شاعری میں مثالوں کی خوبیاں اور تشبیہات کی ندرت کم پائی جاتی ہے۔ اگر تشبیہیں تو وہ کبوتروں کی غٹرغوں۔ ہرنوں کی کلیلیں۔ رات کا سکوت۔ ریگستانوں میں رات کا چمکنا۔ حدی خوانوں کے نغمے اور نوکیلی گول گول مینگنوں کا ریگ صحرا پر غالب کی چکنی ڈلی کا نظارہ پیش کرنا وغیرہ مثالوں سے پُر ہیں۔ یہ بات ضرور مسلم ہے کہ متنبی کی شاعری نے بہت کچھ یبوست و بدنمائی کو کم کرکے مثالیہ شاعری میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے

---

[1] فرقۂ ہنود کا عقیدہ ہے کہ شیوجی مرگھٹ میں رہتے ہیں لکشمی کنول میں براجتی ہے اور وشنوجی ہمیشہ ناگ کے کنڈل پر سکونت رکھتے ہیں۔

[2] صحبتِ صالح ترا صالح کند صحبتِ طالح ترا طالح کند (رومی)

مثلاً وہ کہتا ہے کہ:۔

(۱) اذا رایت نیوب اللیث بارزۃ
فلا تظنن ان اللیث متبسم

ترجمہ:۔ میری خندہ روئی سے میرے دشمن کو مطمئن نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ شیر کے غصے کی حالت میں دانت نکالنے کو ہنسنا نہیں کہتے۔

(۲) اتنکر وموتھموا نا سھیل
طلعت لموت اولاد الزناء

ترجمہ:۔ کیا تو دشمنوں کے میرے ہاتھ سے شکست کھانے سے انکار کرتا ہے جبکہ میں سہیل ہوں جسکے طلوع ہوتے ہی حشرات الارض کا صفایا ہو جاتا ہے[1]

(۳) کیف انسی جمیل شعر حبیبی
وھو کان الشفیع فی لدیہ
شعر الشعر واتہ رام قتلی
فرمی نفسہ علی قدمیہ (ابن الجوزی)

ترجمہ:۔ میں اپنی محبوبہ کی چوٹی کا احسان کس طرح فراموش کروں۔ حالانکہ چوٹی میری سفارشی ہے۔ وہ چوٹی اس کے سامنے جھک گئی اور اپنے آپکو اسکے قدموں میں ڈال لیا ہے۔ کیونکہ اس نے جان لیا ہے کہ محبوب نے میرے قتل کا ارادہ کر لیا ہے۔

کسی عربی شاعر کا شعر ہے ؎

شیآن عجیبان ھما ابرد من یخ   شیخ یتصبی وصبی یتشیخ[2]

ہمیں عربی شاعری کا ذکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ لیکن چونکہ فارسی شاعری پر ریویو کرنا ہے اس لئے ضمناً یا تیمناً و تبرکاً عربی شاعری کا ذکر چھیڑ دینا بھی ضروری معلوم ہوا۔ کیونکہ فارسی شاعری نے عربی سے خوشہ چینی کی ہے اور زمانہ دراز تک صرف عربی کے ترجموں سے گرمیٔ محفل پیدا کی ہے۔

فارسی تمثالیہ شاعری فارسی میں تمثالیہ شاعری کی مثالیں زمانہ فردوسی سے جستہ جستہ طور پر پائی جاتی ہیں۔ نظامی۔ خاقانی۔ سعدی۔ ناصر خسرو علوی۔ حکیم سنائی اور ابن یمین نے بھی تمثالیہ اشعار لکھے ہیں۔ ہندوستان میں امیر خسرو کے ہاں بھی تمثالیہ اشعار پائے جاتے ہیں لیکن یہ صنعت عبدالرحیم خانخاناں کے زمانے سے بہت مقبول ہوئی۔ خانخاناں سنسکرت اور بھاکا کی شاعری سے واقف ہونیکی وجہ سے انہوں نے اپنے دور کے تمام شعراء کو تمثالیہ اشعار لکھنے پر راغب کیا تھا۔ میرزا

---

[1] سہیل نامی ستارہ جب طلوع ہوتا ہے تو اس کے اثر سے حشرات الارض مر جاتے ہیں۔ عربی میں حشرات الارض کو ولد الزنا بھی کہتے ہیں۔

[2] دو چیزیں مجھے بہت تعجب خیز نظر آتی ہیں یعنی بوڑھے کا بچوں کی طرح حرکات کرنا اور بچوں کا بوڑھا بن جانا۔

غازالدین صوبہ دار قندھار اور ظفر خاں صوبہ دار کشمیر نے بھی صائب۔ غنی۔ محمد قلی سلیم۔ عرفی اور ابو طالب کلیم کی سرپرستی کر کے انہیں تمثالیہ شاعری کا شائق بنایا۔ خانخاناں اور ابو الفتح گیلانی نے شاعری کی ایک اکاڈیمی قائم کی تھی۔ اس اکاڈیمی نے بھی تمثالیہ شاعری کو زیادہ ترقی پہنچائی۔ اس دور کے تمام شعراء میں صائب کی تمثالیہ شاعری کی زیادہ وقعت کی جاتی تھی۔ طالب آملی نظیری نیشاپوری اور فیضی کے ہاں بھی تمثالیہ شعر پائے جاتے ہیں۔ ایک بار کشمیر میں صائب کے سامنے غنی کا یہ شعر پڑھا گیا ؎

حسن سبزے بخط سبز مرا کرد اسیر   دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدم

صائب کو یہ تشبیہ بہت پسند آئی اور کہا کہ غنی کا صرف یہ ایک شعر میرے مرتب کردہ دیوان سے زیادہ وقعت رکھتا ہے[1]۔ یہ محض صائب کی کسر نفسی اور دوست پرستی کی بنا پر کہا گیا ہوگا۔ ایسا ہمارا قیاس ہے۔ ذیل میں چند قدیم و جدید شعراء کے تمثالیہ اشعار بغرض ضیافت طبع درج کئے جاتے ہیں:۔

فردوسی:۔

بہ عنبر فروشاں اگر بگذری   شود جامۂ تو ہمہ عنبری
دگر عنبری سوئے انگشت گر   وزو جز سیاہی نیابی دگر
ز بد گوہراں بد نیاید عجب   نشاید ستردن سیاہی ز شب
ز ناپاک زادان مدارید امید   کہ زنگی بشستن نگردد سفید
منم شیر نر میش خوانی مرا   کہ بد دیں و بدکیش خوانی مرا
کف[3] شاہ محمود عالی تبار   نہ اندر نہ آمد سہ اندر چہار

نظامی:۔

چونکہ آب دیدہ داری از ضعیفی باک نیست   زانکہ مروارید را باریک بہتر ریسماں
سیم را رونق نخیزد تا برون ناید ز سنگ   لعل را قیمت نباشد تا برون ناید ز کاں
خمیدہ پشت از آن گشتند پیران جہاں دیدہ   کہ اندر خاک می جویند ایام جوانی را
کلاغان طبیعت از باغ آنس برون کن   بیابان سعادت را بدام امتحاں درکش
کلاغی تگ کبک را گوش کرد   تگ خویش را ہم فراموش کرد

خاقانی:۔

(۱) خود باش انیس خود و مطلب کس کہ پیل را
ہم گوش بہتر از پر طاؤس پشہ را

ترجمہ:۔ تو خود اپنا کام کر کسی سے کچھ نہ مانگ۔ کیونکہ ہاتھی کے لئے اپنا کان مورچھل سے بڑھکر مچھر دفع کرنے کے کام آتا ہے۔

---

[1] شعر العجم جلد سوم صفحہ ۱۱۔

[2] تذکرہ یوسفی صفحہ ۲۲۹ و نگارستان سخن از آزاد صفحہ ۱۸۳۔

[3] یعنی شاہ محمود عالی تبار کی انگلیوں نے باہم ملکر ایسی سخت مٹھی باندھی ہے کہ کسی کو کچھ نہیں دیتا۔ وہ ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے ملا دیتا ہے۔

(۲) تو غافل و تبر کشیدہ رقیب تو — فرزانہ خفتہ و سگ دیوانہ پاسبان

(۳) بگزیں در دونان کشوی صد قناعت — منگر بخشت چو بود ماہ جہاں تاب

ترجمہ:- سفلوں کا دروازہ مت کھٹکھٹا تاکہ تو قناعت میں مشہور ہو۔ اصلی چاند کے ہوتے ہوئے خشت کے جعلی چاند کی خواہش مت کر۔

(۴) با ایں ہمہ امید ز بیہودہ تواں داشت
کاں قطرہ تلخ است کہ شد لولوی خوش آب

ترجمہ:- انسان کی امیدیں یونہی بیکار نہیں ہوتیں۔ نتیجہ ضرور برآمد ہوتا ہے کیونکہ خوش رنگ موتی آخر کھاری پانی ہی سے بنتے ہیں۔

امیر خسرو:- امیر خسرو نے متعدد سلاطین کا عہد دیکھا اور دیوان بھی کئی لکھے ہیں۔ انہوں نے بھی صنعت تمثالیہ کا غزلیات میں کہیں کہیں استعمال کیا ہے غزلوں کے علاوہ قصائد میں بھی صنعت تمثالیہ سے کام لیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار خسرو کے ایک طویل قصیدہ سے ماخوذ ہیں:-

(۱) چو نیست خوئے تو شیریں تنکرہ سوت نام
کہ نیشکر بسمرقند و قندھار بود

ترجمہ:- اگر کسی میں شیریں کلامی کا جوہر نہیں ہے تو اسکے نام کے ساتھ شکر کا لاحقہ مفید نہیں ہو جاتا جیسے سمرقند اور قندھار میں لفظ قند کی وجہ سے کوئی خوبی اور شیرینی پیدا نہیں ہو سکتی۔

(۲) چو سنگ نیست ز طینت چہ معرفت خیزد
کجا ز خشت زر و نقرہ را عیار بود

ترجمہ:- اگرچہ پتھر اور اینٹ ایک ہی قسم کے اجزا سے مرکب ہیں مگر سونا چاندی کے پرکھنے میں جو کام کسوٹی دیتی ہے وہ اینٹ سے نہیں نکل سکتا۔

(۳) بملک دل نشد آں تن کہ او گراں جانست
سزائے محمل نشد اشتر کہ بردبار بود

ترجمہ:- سو وہ جسم کہ جو بوجھ ڈھونے کیلئے مخصوص ہو اُسپر کسی کا خیال نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ محمول کا مستحق وہی اونٹ ہوتا ہے جو لدو نہ ہو۔

(۴) کند فروزش شب لیک سوز شمع نکند
اگرچہ کرمک شب تاب چوں شرار بود

ترجمہ:- جگنو اگرچہ آگ کی چنگاری کے مشابہ ہوتا ہے لیکن وہ صرف رات کو چمکا دیتا ہے۔ اس میں شرارے کی طرح جلانے کی خاصیت نہیں ہوتی۔

سعدی:-

تواں از دانہائی بحہ دانست — کہ دلہا را بدلہا ہست راہی
مراعات دہقاں کن از بہر خویش — کہ مزدور خوش دل کند کار بیش
تا بیخ تحمل نہ کنی گنج نیابی — تا شب نرود صبح پدیدار نگردد

زکاہ بستہ میندیش چو دل شکستہ مدار — کہ آب چشمہ حیواں درون تاریکست
ہمہ فیلسوفان یونان و روم — نخواہند کرہ انگبیں از زقوم
سفلہ زرپوش را در مجلس مدہ جا مدہ — کفش زریں گر بود بر سر نمی باید گرفت

ترجمہ:- زرپوش کمینے کی اپنی مجلس میں عزت نہ کر۔ کیونکہ زریں جوتیوں کو کوئی سر پر نہیں رکھتا۔

حکیم سنائی:-

قرنہا باید کہ تا یک کودکے از لطف طبع — عاقلے کامل شود یا فاضلے صاحب سخن
سالہا باید کہ تا یک سنگ خارا ز آفتاب — لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن
ماہہا باید کہ تا یک شب پشم از پشت میش — صوفی را خرقہ گردد یا حمارے را رسن
ہفتہا باید کہ تا یک پنبہ از آب و گل — شاہدے را حلہ گردد یا شہیدے را کفن
روزہا باید کشیدن انتظار بے شمار — تا کہ در جوف صدف باراں شود در عدن

مندرجہ بالا اشعار کے علاوہ ابن یمین اور حکیم ناصر خسرو کے کلام میں بھی تمثالیہ اشعار پائے جاتے ہیں۔ اکبر کے زمانے میں بیربر کی وجہ سے کبت اور دوہوں کی بڑی قدر ہوتی تھی اس لئے ہندی یا پراکرت کی تمثالیہ شاعری نے اس دور کے شعرا کو بھی تمثالیہ شاعری کا شائق بنا دیا حتیٰ کہ دور جہانگیر میں عبدالرحیم خاں خاناں کی سعی بلیغ سے صائب۔ طالب علی کلیم۔ غنی۔ نظیری عرفی۔ علی علی سلیم وغیرہ شعرا اسی رنگ میں رنگے گئے۔ صائب تبریزی اس صنعت خاص کے مرد میدان تھے۔ اس لئے تمثالیہ فارسی شاعری کا جدید دور انہیں کے کلام سے شروع کیا گیا ہے۔[1]

صائب:-

(۱) دور دستاں را بہمت یاد کردن مردمی ست
ورنہ ہر نخلے بپائے خود ثمر می افگند

ترجمہ:- غیروں کا خیال رکھنا ہی جود و کرم کہلاتا ہے۔ ورنہ ہر درخت اپنے ہی پیروں پر پھل گراتا ہے۔

(۲) طاعت کند سرشک ندامت گناہ را
بارش سفید می کند ابر سیاہ را

ترجمہ:- جس طرح بارش ہونے سے کالا ابر برس کر سفید ہو جاتا ہے اسی طرح ندامت کے آنسو بہانے سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

(۳) دست سوال پیش کساں می کنی دراز
پل می نہی کہ بگذری از آبروئے خویش

ترجمہ:- کسی کے سامنے سوال کے لئے ہاتھ پھیلانا گویا اپنی عزت گنوانے کا پل باندھنا ہے۔

(۴) بلند نام نہ گردد کسیکہ در وطن است
ز نقش سادہ بود چوں عقیق در یمن است

---

[1] دربار اکبری از محمد حسین آزاد صفحہ ۴۵۔

(۵) زاہدِ ظالم ستمگر می شود   تیغ چوں بشکست خنجر می شود

(۶) از تعظیم و تواضع ہا ئے دشمن ایمن مشو غافل

کمر خم کردن صیاد تنہا ست مرغاں را

ترجمہ:۔ دشمن کی خوشامد اور چاپلوسی سے غافل نہ رہنا چاہئے۔ کیونکہ جب صیاد خم ہوتا ہے تو ساتھ ہی ساتھ شکار پر تیر بھی سر کرتا ہے۔

(۷) نیست سودے جز زیاں از صحبتِ تاونگراں

رشتہ از گوہر ندارد بہرہ جز لاغر شدن

ترجمہ:۔ مالداروں کی صحبت سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ اُلٹا نقصان ہوتا ہے۔ کیونکہ موتی کی مالا میں پڑا ہوا دھاگا سڑ گل جاتا ہے اور موتیوں کا کچھ نہیں بگڑتا۔

غنی کاشمیری:۔

(۱) نہ گردد شعر من مشہور تا جاں در تنم باشد

کہ بعد از مرگ آہو نافہ می آرد برول بو را

ترجمہ:۔ میری شاعری میرے جیتے جی سرسبز ہوتی نظر نہیں آتی۔ جس طرح ہرن کے مر جانیکے بعد نافہ مشک کی بو سے لوگ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

(۲) چوں استعداد نبود کار از اعجاز نکشاید

مسیحا کے تواند کرد بینا چشم سوزن را

ترجمہ:۔ کسی میں اگر استعداد نہ ہو تو اس کا کام اعجاز و کرامت سے بھی بن نہ سکیگا۔ جس طرح سوئی کی آنکھ (ناکے) کو مسیحا بھی نور بصارت سے نہیں بھر سکتے۔

(۳) سنگین دل است ہر کہ بظاہر ملائم است

پنہاں درون پنبہ نگر پنبہ دانہ را

ترجمہ:۔ سنگین دل عموماً نرم دل اور بھولے بھالے دکھائی دیتے ہیں جس طرح روئی میں بنولے مخفی ہوا کرتے ہیں۔

(۴) ہر کس بدرگہ کرمت برد تحفۂ

مارا ز دست خالیِ خود آستیں پر است

ترجمہ:۔ تیری لکھ لُٹ سرکار سے ہر ایک کو حصہ ملا۔ اور خالی ہاتھ کو صرف آستیوں نے پُر کر دیا۔ یعنی مجھے کچھ نہ ملا۔

(۵) نتواں بُرد ز دشمن بتواضع جاں را

قامتِ خم نہ رہاند ز اجل پیراں را

ترجمہ:۔ دشمن کے سامنے جھکنے اور عاجزی کرنے سے چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ کیونکہ بڑھاپے سے خم کمر ہو جانیکی وجہ سے اجل انسان پر رحم نہیں کرتی۔

ابو طالب کلیم:۔

(۱) حُسن اگر بے پردہ باشد عشق از دل رفتہ نیست

برچراغ روز بال افشاں پر پروانہ نیست

ترجمہ:۔ حُسن بے پردہ پر عاشق صبر و قرار نہیں کھوتا جس طرح دن کو چراغ جلانے سے اُس پر پروانہ نہیں آتا۔

(۲) سربلندی ہر کجا کمتر سلامت بیشتر

باد نتواند ستم بر سبزۂ نو خیز کرد

ترجمہ:۔ اگر انسان سربلندی نہ کرے تو امن و امان میں رہتا ہے۔ جس طرح نئی اُگی ہوئی چھوٹی نرم گھاس پر بادِ صرصر کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

(۳) بسکہ نا دیدنی از مردم عالم دیدم

روشنم گشت کہ آسائشِ نابینا چیست

ترجمہ:۔ اہلِ دُنیا کے ہاتھوں میں نے ایسی ایسی بدعنوانیاں اور بے پروائیاں دیکھیں جو دیکھنے کے لائق نہ تھیں۔ اس سے مجھ پر یہ بات روشن ہو گئی کہ نابینا آدمی غیر مطبوع چیزیں نہ دیکھنے کی وجہ سے بڑے آرام میں رہتا ہے۔

(۴) واصل ز حرفِ چون و چرا بستہ است لب

چوں رہ تمام گشت جرس بے زباں بود

ترجمہ:۔ خدا رسیدہ آدمی چُپ رہتا ہے کسی قسم کا اعتراض نہیں کرتا جس طرح سے کارواں کا جرس منزل پر پہنچکر خاموش ہو جاتا ہے یعنی عارف گویا منزل پر پہنچے ہوئے جرس سے مانند ہے۔

(۵) قطعِ امید کردہ نخواہد نعیم دہر

شاخ بریدہ را نظرے بر بہار نیست

ترجمہ:۔ دُنیا سے جس نے اُمید قطع کر لی ہے وہ عیش و عشرت کا خواہاں نہیں ہوتا جس طرح درخت سے جُدا کی ہوئی ڈالی کو موسم بہار سے سرسبز ہونیکی اُمید نہیں رہتی۔

شعرائے دورِ جہانگیری و شاہجہانی کے بعد مثالیہ شاعری کو اسقدر فروغ حاصل ہوا کہ مرزا بیدل۔ شیخ علی حزیں۔ واقف لاہوری۔ خانِ آرزو۔ آزاد بلگرامی تک کے تمام شعرا نے مثالیہ شاعری کے بہترین نمونے چھوڑے ہیں۔ آزاد بلگرامی نے تو عربی میں بھی مثالیہ شاعری کے نمونے ظاہر کئے ہیں جس کے نمونے ان کے عربی دیوان سبع سیارہ میں پائے جاتے ہیں۔

اُردو میں مثالیہ شاعری اُردو میں مثالیہ شاعری کا آغاز مصحفی کے زمانہ سے ہوا۔ اسیر اُستاد امیر نے صدہا اشعار قصائد کے رنگ میں اُردو میں تحریر کئے۔ ناسخ۔ آتش۔ برق۔ سحر اور امداد علی بحر نے بھی ذخیرہ وافر چھوڑا۔ ذوق نے بیسیوں مثالیہ اشعار لکھے اور قصائد میں بھی مثالیہ اشعار درج کئے۔ امیر، داغ۔ خواجہ وزیر۔ ظہیر دہلوی کے ہاں بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ شمشاد لکھنوی۔ راسخ دہلوی اور شاد عظیم آبادی کے دیوانوں میں بھی جستہ جستہ مثالیہ اشعار پائے جاتے ہیں۔ منشی امیر اللہ تسلیم نے بھی مثالیہ اشعار کا کافی حصہ چھوڑا ہے۔

ذیل میں بغرض تفننِ طبع چند شعرا کے اُردو مثالیہ اشعار درج کئے جاتے ہیں۔ پڑھئے اور لطف اُٹھائیے:—

خواجہ آتش ؎

پیری میں بھی دل سے نہ مٹے داغ محبت — گل صبح کو ہوا نہ چراغ اپنے مکاں کا
مالِ موذی سے تنفر آدمی کو چاہئے — سونگھ کر سگ چھوڑ دیتا ہے عسل زنبور کا
رفیق حال بُرے وقت میں نہیں کوئی — شریک جنگ میں شمشیر کا نیام نہیں
پاس دل رکھتا ہے منظورِ نظر ہر آئینہ — نیک و بد سے پیش آتا ہے برابر آئینہ
زبان کھلنے کا نقش مُنہ بھر آتی ہے — دہانِ غنچہ کو رکھتا ہے مشتِ زر خاموش
عزیزوں سے نہ رکھ امداد کی اُمید مشکل میں — نکالا ناخنِ پا نے کہاں خارِ کفِ پا کو
بشر کو بعد نعمت قدرِ نعمت ہوتی ہے اکثر — غنیمت جانتا ہے لنگ اپنے پائے چوبیں کو

شیخ ناسخ:—

یہ آدمی ہے کہ برسوں جمال رہتا ہے — وگرنہ ماہ کو یک شب کمال رہتا ہے
چوٹ دل کو جو لگے آہِ رسا پیدا ہو — صدمہ شیشے کو جو پہنچے تو صدا پیدا ہو
آنکھیں تو ملاتے ہو مگر دل نہیں ملتا — ساغر تو بہت خوب ہے مینا نہیں اچھا
جو دنی ہیں وہ بھی کرتے ہیں حسینوں پر سلوک — اس دنائت پر فلک دیتا ہے خرمن ماہ کو
جو خونریزی کی عادت رکھتے ہیں بے فیض ہوتے ہیں — کہیں ملتی ہے سائل کو کبھی کوڑی کٹاری کی ؎۱
سفلے کے گو کہ پر لگیں لیکن ہے نارسا — پہنچے کبھی ہوا سے نہ کاہ آسمان پر
دل سیہ ہے اپنا اور ہیں بال پیری میں سفید — گھر کے اندر ہے اندھیرا اور باہر چاندنی
تیرہ بختانِ ازل کو نور سے بہرہ نہیں — شور اکثر کرتے ہیں کوتے شبِ مہتاب میں

آفتاب الدولہ برق:—

خدا ہو مہرباں تو مہرباں ہوتا ہے دشمن بھی — ہمارے کام اکثر آسماں نے ہی نکالے ہیں
جو کنواں کھودیگا اوروں کیلئے وہ گریگا چاہ میں — گورکن کے واسطے اِک دن آخر گور ہے
کام جو اپنے نہ آئے مال وہ بیکار ہے — خاک سا ہوتا زمیں میں گوہر شہوار ہے
کبھی ادنیٰ کو نہیں رتبہ اعلیٰ ملتا — سر جگہ پھولوں کی ہے پاؤں جگہ خاروں کی
جھک جھک کے شیشہ کیوں نہ رکھے سر کو جام پر — حاجت روا جو ہو اُسے شکرانہ چاہئے
پیام موت ہے موذی سے دوستی رکھنا — اجل ہے سانپ اُسکی جو کوئی پالے سانپ

غضنفر علی اسیر:—

شرمگیں ہوں دلِ نالاں ہے مرا غرق عرق — جیسے گھڑیال رہے آٹھ پہر پانی میں
پُوچھا نہ جائیگا جو وطن سے نکل گیا — بیکار ہے جو دانت دہن سے نکل گیا
آشنا بھی نہیں آتے ہیں بُرے وقت میں کام — دفن ہوتی نہیں ہمراہ بدن خاک میں روح
نوجوانی جا چکی سب گر گئے پیری میں دانت — رات گزری دن ہوا پیدا ستارے ہوگئے
رفتہ رفتہ سلب ہوجاتی ہے طاقت پیر کی — کھنچتے کھنچتے زورِ بازو کی کماں رہتا نہیں

عدوئے جاں ہے کمال بشر جہاں میں اسیر — سوائے نافہ کوئی دشمنِ غزال نہیں
اسیر آیا یہ مضمون ہاتھ ہمکو ماہِ کامل سے — مقدر داغ سے خالی نہیں صاحب کمالوں کا

خواجہ وزیر:—

کچھ سبکساروں کو ہوتی احتیاج پر نہیں — طائرِ رنگِ حنا ہاتھوں سے بے پر اُڑ گیا
دلا ناجنس کی صحبت بھی طرفہ گل کھلاتی ہے — کرے نیرنگیاں تو الیس آگ پانی پر روغن کو
جو کہ قانع ہے وہ بچ جاتے فریبِ نفس سے — دام کب صیاد پھیلاتے ہما کے واسطے
جو خاص بندے ہیں وہ بندۂ عوام نہیں — ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں
قید سے آزاد ہیں رنگیں نوایانِ چمن — خار سے اُلجھا نہ دامن نکہت برباد کر
بے تعلق ستم دہر سے آزاد آیا — سنگِ طفلاں نہ کبھی تا سرِ شمشاد آیا
کر تواضع غم جو ہو پست و بلندِ دہر کا — جب ملیں جھک کر ہوئیں پانچوں برابر اُنگلیاں
زندگی تک ہی جہاں میں مقبلوں کی قدر ہے — بعد مردن ہے مگس رانی ہما کے واسطے

محمد ابراہیم ذوق:—

ذوق ہے ترکِ وطن میں صاف نقص آبرو — بجتا پھرتا ہے گہر ہو کر سمندر سے جدا
توڑا اگر کی شاخ کو کثرت نے ثمر کی — دُنیا میں گرانباری اولاد غضب ہے
لیتے ہیں ثمر شاخِ ثمر ور کو جھکا کر — جھکتے ہیں سخی وقتِ کرم اور زیادہ
ملے جوں شیشۂ ساعت بہم دل کدر دونوں — کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے
بے سیاہی نہ چلا کام قلم کا اے ذوق — رو سیاہی سر و ساماں ہے سیہ کاروں کا
صورتِ صافی دلوں سے تیرہ دل کب صاف ہیں — زنگ سے آلودہ ہو جاتا ہے آہن آب میں
ہنر شناس کو دکھلا ہنر کہ خوبیٔ زر — اگر کھلے ہو تو صراف کی نظر چڑھ کر

امداد علی بحر:—

استخوانِ خشک کتا بھی نہیں کرتا قبول — مرتبہ جچتا نہیں آنکھوں میں بے مقدور کا
بحر ثابت ہو گئی یہ بات جب ٹوٹا حباب — پائداری کچھ نہیں ہے سر کے اُٹھانے کیلئے
بے خرد جو ہیں وہ خوش ہوتے ہیں دنیا دیکھ کر — طفل رونا بھول جاتے ہیں تماشا دیکھ کر
کیا سلوک اپنے اقارب سے کریں آہن دل — آب پیکاں سے کہاں تر لبِ سوفار ہو
قدر کیا انساں کی ہو بے لباسِ ظاہری — لعبتِ خاکی کو بھی اے بحر روغن چاہئے
صدف اک بوند پھر پانی کو ترسے وائے محرومی — چُگائے ہنس کو موتی مقدر ہو تو ایسا ہو
سمجھائے نیک و بد کیا خاک کوئی بے سواد کو — اُسے عینک سے کیا حاصل ہو جسکی آنکھ نہ ہو

امان علی سحر:—

فائدہ کم ہے قریبوں کو زمانے میں سحر — دیکھ لو آب لبِ ساحلِ دریا کم ہے
نقصان دماغ کا بھی ہے موجود بدی میں — عادت نہیں کہ ایک بلا سے کمال دے
طمع زمانے میں کرتی ہے ظالموں کو خراب — گھرا ہے کانٹوں میں صیاد مشتِ پر کیلئے
سعی بے حد جب کرے انساں تو حاصل ہو کمال — ماہِ تاباں سب تاروں میں سریع السیر ہے
جسکی تقدیر میں جو ہے وہی ملتا ہے اُسے — چاند نے گردۂ ناں ؎۲ تاروں نے دانے پائے

؎۱ کٹاری کی کوڑی سے مُراد کٹار کی نوک ہے۔ فرہنگ آصفیہ۔

؎۲ گردۂ ناں۔ پھولی ہوئی ڈبل روٹی کو کہتے ہیں۔

دورۂ شمس و قمر سے ہو گیا ثابت نہیں
نام کو شہرت جہاں میں بے سفر ملتی نہیں

جھک کے ملتا ہے زمانے میں جو ہم چشموں سے
اس کو آنکھوں پہ جگہ ملتی ہے ابرو کی طرح

یوں سخی زمانہ کو باتوں میں کاٹئے
جس طور سے دانتوں میں گویا زباں رہے

مرزا داغ دہلوی:—

آئینہ منہ پہ بھلا اور بُرا کہتا ہے
سچ یہ ہے صاف جو ہوتا ہے صفا ہوتا ہے

دستِ گلچیں سے چھٹا آیا کفِ صیاد میں
میں گلِ غنچہ ہوں گلشنِ ایجاد میں

بچتے ہیں خاکسار سے سب اہلِ آبرو
دیکھا نہیں حباب کے سرپوشِ نقشِ پا میں

فلک پردہ بنا اہلِ زمیں کی پردہ پوشی کو
مگر اس دشمنِ جاں نے کسی کا پردہ کب ڈھانکا

برق گرتی ہے اسی پر جو نہال اچھا ہے
باغ عالم میں کوئی خاک پھلے پھولے گا

فلک دیتا ہے جنکو عیش انکو غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

مثالِ گنجِ قاروں اہلِ حاجت سے نہیں چھپتا
جو ہوتا ہے سخی خود ڈھونڈ کر سائل سے ملتا ہے

آنسو نہ پئے جائینگے اے ناصحِ ناداں
ہیرے کی کنی جان کے کھائی نہیں جاتی

منشی امیر احمد مینائی:—

دل کو کر دیتی ہے روشن صحبتِ اہلِ کمال
آئینے میں زنگ کب رہتا ہے روشنگر کے پاس

کنجِ عزلت میں مثالِ آسیا ہوں گوشہ گیر
رزق پہنچاتا ہے گھر بیٹھے خدا میرے لئے

دل کو کیا لطف جو معشوق نہیں گرما گرم
شمعِ خاموش کو کرتا نہیں پروانہ پسند

احساں کسی کا کب ہے گوارا برنگِ گل
ہے چاک پیرہن نہیں لیکن رفو پسند

سب کو سنجیدہ کیا خود نہ ہوا سنجیدہ
طالعِ بد نے کیا سنگِ ترازو مجھ کو

غضب ہے اپنے عیبوں کا خیال آئے نہ انساں کو
کیا ہے شرمِ عریانی نے خم شمشیرِ عریاں کو

جو نازک طبع ہیں محفوظ ہیں قہرِ الٰہی سے
کبھی چھالے حبابوں کے نہ پھوٹے خارِ ماہی سے

تیرہ دل چاہتے ہیں سارے جہاں میں اندھیر
شپرہ کو ہے سوادِ شبِ دیجور پسند

نیت بد ہو تو کارِ نیک سے حاصل ہو کیا
جاگتے ہیں دزد بھی مثلِ نگہباں رات بھر

منشی امیر اللہ تسلیم:—

سخت دل کو نرم کر دیتے ہیں اربابِ ضیا
مہر کے فیضِ نظر سے لعل پتھر ہو گیا

نیک و بد کا فرق اربابِ صفا کرتے نہیں
خار و گل دونوں سے ملتی ہے برابر چاندنی

سخت طینت کا اثر بیکار جا سکتا نہیں
بن گئی شیشے سے آخر جان پر فرہاد کی

ہوا کرتی ہے زینت عیب سے اہلِ توکل کی
سدا شبنم دھلا دیتی ہے منہ گلہائے خنداں کا

ثابت ہوا سکوتِ متاعِ صدف سے یہ
بھرتا ہے منہ گہر سے خدا بے سوال کا

دیکھے نہ رُو سیاہ زمانے میں باکمال
پیدا نہ شکلِ بدر ہلالِ[1] سپر کرے

اثر کرتی نہیں اعلیٰ کو صحبت پست فطرت کی
ہوا دامن نہ گرد آلود عکسِ ماہِ تاباں کا

رنج کے بعد نظر آتی ہے شکلِ آرام
عید دیکھو پسِ ماہِ رمضاں ہوتی ہے

ظہیر دہلوی:—

جاہلِ مغرور بارِ پند سے کیونکر جھکے
اونٹ کا کوہان محمل سے کبھی دبتا نہیں

عالم جو بے عمل ہیں فقط کہنے میں انکے آ
ہاتھی کے دانت ہیں وہ دکھانے کے واسطے

نگاہِ عفو پہ پھولے ہوئے ہیں بادہ پرست
بسانِ نامۂ اعمال روسیاہ رہے

نہ ہو غولِ بیاباں تربیت سے کفر کے انساں
ہوئے ناقص کہیں قابل کبھی صحبت سے کامل کی

ہیں فرشتے بھی جان کے خواہاں
کون ہے جس کو احتیاج نہیں

تھوڑی دولت پہ تنک ظرف اچھل پڑتے ہیں
دیکھ لو کرکے نظر غور سے فواروں کو

بحرِ جہاں میں خاک ہو سیراب تشنہ کام
اُلٹے ہوئے ہیں پہلے ہی ساغر حباب کے

مشقت اپنی اپنی اور قسمت اپنی اپنی
کہیں گوہر نکلتے ہیں کہیں پتھر نکلتے ہیں

جز سوزِ سینہ کون ہے دلسوزِ اہلِ سوز
گرتے ہیں پائے شمع پہ اشکِ روانِ شمع

انیس:—

سدا ہے فکرِ ترقی بلند بینوں کو
ہم آسماں سے لائے ہیں ان زمینوں کو

یہ جھریاں نہیں چہرے پہ ضعفِ پیری نے
چُنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

لحد میں سوتے ہیں چھوڑ اپنے نشینوں کو
قضا کہاں سے کہاں لے گئی مکینوں کو

انیس دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

تمام عمر جو کی سب سے بے رخی ہم نے
کفن میں ہم بھی عزیزوں سے منہ چھپا کے چلے

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس
عروجِ مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

ملا جنہیں اُنہیں افتادگی سے اوج ملا
انہیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اٹھا کے چلے

خیالِ خاطرِ احباب چاہئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

پرساں کوئی کب جوہرِ ذاتی کا ہے
ہر گل کو گلہ کم التفاتی کا ہے

شبنم سے جو وجہ گریہ پوچھی تو کہا
رونا فقط اپنی بے ثباتی کا ہے

زر سے گلِ کاغذ گلِ تر ہو نہیں سکتا
ہر قطرۂ ناچیز گہر ہو نہیں سکتا

تلعی سے کچھ آئینہ قمر ہو نہیں سکتا
مس پر جو ملمع ہو تو زر ہو نہیں سکتا

ہر ہاتھ کو عاقل یدِ بیضا نہیں کہتے
جس پاس عصا ہو اُسے موسیٰ نہیں کہتے

حضرت انیس کے سوا تمام شعرائے قدیم و جدید نے مثالیہ شاعری کا استعمال صرف غزل میں کیا ہے۔ ذوق مرحوم نے غزل کے علاوہ اپنے دیوان کے قصیدۂ چہارم میں متعدد مثالیہ اشعار بھی نظم کئے ہیں۔ حضرت انیس نے مثالیہ شاعری میں جدت سے کام لیکر ندرت و ملاحت سے مطبوعِ خاطر بنا دیا ہے۔ غزل کے علاوہ مسدس اور رباعیات میں بھی اسی صنعت کی مدد سے لمعانی و تابانی پیدا کی گئی ہے۔ ان کے نقشِ قدم پر بجز شاد عظیم آبادی کے بہت کم شعرا چل سکے ہیں۔

شاعری کی دیگر اصناف کی طرح مثالیہ شاعری میں بھی شعرائے لکھنؤ نے

[1] ہلالِ سپر یعنی ڈھال پر کا ہلال نما نقش۔

گرانقدر حصہ لیکر صحیح معنوں میں حق زبان ادا کیا ہے لیکن افسوس تو یہ ہے کہ اِس صنف میں دہلی اسکول نے سوائے شیخ ابراہیم ذوق کے دوسرا مقتدر مرد میدان پیدا نہیں کیا۔ فصیح الملک داغ۔ راسخ دہلوی اور حضرت ظہیر دہلوی نے بھی اِس میدان میں کام زنی کی ہے۔ مگر وہ حضرت ذوق یا متذکرہ بالا لکھنوی شعرا کو نہ پہنچ سکے۔ سخن سنجان لکھنؤ میں خاندان ناسخ کے شعرا نے بہترین مثالیہ اشعار پیش کئے ہیں۔ منشی امیر اللہ تسلیم گو دہلی اسکول سے فیض یاب ہوئے ہیں لیکن انہوں نے سکونت لکھنؤ کی وجہ سے دیگر شعرائے لکھنؤ کی طرح اِس صنف خاص میں بھی کمال ظاہر کیا ہے۔

کمترین کو مثالیہ شاعری پر خامہ فرسائی کی جرأت اِس لئے ہوئی کہ موجودہ اُردو کورس کی کتابیں عموماً غزلیات سے پُر ہوتی ہیں جو کم سن لڑکوں اور بھولی بھالی لڑکیوں کے گوش گزار کرنے کی غرض سے نصاب میں ٹھونسی جاتی ہیں۔ ان کا لڑکوں یا لڑکیوں کے سامنے مفصلاً تشریح کرنا سانڈے کا تیل بیچنے کے مُترادف ہوتا ہے اِس لئے کمترین کی شعرائے حال سے یہ استدعا ہے کہ اگر وہ اپنا کلام مدارس کی درسی کتابوں میں داخل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں مثالیہ شاعری یا اقبال کی طرح اخلاقی شاعری کے لئے آمادہ ہو جانا چاہیئے۔ حضرت صفی لکھنوی۔ مولانا نظم طبا طبائی اور چکبست لکھنوی کا تغزل اِس قابل ہے کہ وہ نصاب میں داخل ہونے کی اہلیت رکھتا ہے حضرت ظفر علی اور جوش ملیح آبادی سے بھی ہماری استدعا ہے کہ وہ اپنے رشحات قلم کو حضرت اقبال کے رنگ میں ڈھال دیں۔ یا کم سے کم ان میں مثالیہ شاعری کی شان پیدا کر دیں تاکہ ان کا نام ابد الآباد تک زیب نصاب رہے۔

پہلے پہل مضمون ہذا کیلئے مواد فراہم کرنے کا کام ہمیں جوئے شیر لانے کے مترادف معلوم ہوا لیکن چند ہی روز کی لگاتار کوشش نے ہمارے دامن مراد کو سبد گل فروش بنا دیا۔ اِس مقالے میں ہم نے صرف انہیں شعرا کے اشعار پیش کئے ہیں جنہوں نے صنف مثالیہ میں متعدد اشعار سپرد قلم کئے ہیں ایسے شعرائے قدیم کے جستہ جستہ اشعار کو خوفِ طوالت سے قلم زد کر دیا گیا ہے ورنہ مضمون کے بجائے بڑا بھاری طومار ہو جاتا ؎

در فکرِ آں مباش کہ مضموں نہ ماندہ است
صد سال می تواں سخن از زلفِ یار گفت

غزل

از جناب شوکت سکروڈھوی

پڑ گئی جب نگاہ قاتل کی
بے کلی دور ہو گئی دل کی

کیا بتاؤں کدھر ہو جاناں
جب خبر ہی نہیں ہے منزل کی

کوئی حسرت نہ کوئی ارماں ہے
اب تو دنیا ہی اور ہے دل کی

لوٹ لی تیری مست آنکھوں نے
جو بھی کچھ کائنات تھی دل کی

کوئی امید تو نہ تھی شوکت
بات قسمت سے بن گئی دل کی

فرزندانِ حرّیت

قاضی نذر الاسلام کی ایک نظم کا آزاد ترجمہ

از حضرت مولانا اظہر امرتسری

بپا ہے طوفاں مصیبتوں کا گھٹائیں نکبت کی چھا رہی ہیں
فضا میں بربادی و تباہی کی بجلیاں تلملا رہی ہیں

مگر ہمارا جنوں تو دیکھو نہیں دہلتا ہے پھر بھی سینہ
اندھیری شب میں ہے ڈالا دریا میں اپنا ٹوٹا ہوا سفینہ

وہ برق پیدا کر رہی ہے جو کالے بادل سے ہاتھا پائی
کرے گی اس خوفناک و دہشت فضا سیاہی میں رہنمائی

تپش زدہ دشت میں ہمارے قدم کے معجز نما اثر سے
بہار آئی شگوفے پھوٹے ہر ایک جانب سے پھول برسے

ہمارے جوش و خروش نے جس دم آگ سلگائی زندگی کی
شکستہ قبروں سے اُٹھے مُردے بھی لیکے انگڑائی زندگی کی

برنگِ نورِ چراغ گھر گھر ضیا ہماری پہنچ رہی ہے
کہ مُلک و ملت کی وادیوں میں ہماری مشعل سے روشنی ہے

ملا نہ اک بوند تک بھی پانی فراتِ تجدیدِ زندگی سے
زبانِ کربل میں کانٹے پڑنے لگے ہیں شدت کی تشنگی سے

جُھلس رہا ہے سروں کو خورشید زیرِ پا گرم ریت سی ہے
یزیدِ ثانی کی فوج چاروں طرف ہمارے لئے کھڑی ہے

مگر ہم اپنے عمل سے عباسؑ کی شجاعت دکھا رہے ہیں!
کہ توڑ کر اس محاصرے کو فرات سے پانی لا رہے ہیں!

مٹانا جب چاہتا ہے فرعون موسوی شرع کی صداقت
تو بن کے امواجِ نیل کرتی ہے غرق اس کو ہماری ہمت

جہاں کے نمرود چاہتے ہیں خلیلؑ کو آگ میں جلا دیں
مگر عجب کیا فرشتے آ کر اس آگ کو بھی چمن بنا دیں

رجز کی تانوں سے بزدلوں کو بھی مردِ میدان بنائیں گے ہم
شباب کا جوش دیکے بوڑھوں کو رزمگاہوں میں لائیں گے ہم

ہماری اُمّید کی سحر سے شبِ سیہ بخت کا ہر آنسو
برنگ شبنم کھلائیگا گُل جہاں کو بخشے گا کیفِ خوشبو

جہانِ تاریک میں چراغِ حیاتِ نو جب جلائینگے ہم
سیاہ و پُر ہول شب کو روشن سحر سے بڑھ کر بنائینگے ہم

نئے جہاں کے نئے مسافر چلیں گے جب راہِ زندگی پر
تو سب سے پہلے نگاہیں اُن کی پڑینگی اس تیز روشنی پر

اسی لئے آج ہی سے ہم روح و تن کا جھگڑا چکا رہے ہیں
کہ دامنِ زندگی کو راہِ حیاتِ نو میں بچھا رہے ہیں

جب آنے والے جہاں کا آزاد پرچم از راہ شان و شوکت
اُڑے گا فتح و ظفر کی چوٹی پر اور دیگا پیام نصرت

وہ دن جب "آزاد قوم زندہ رہے" کے نعرے لگائیں گے ہم
وہ نعرے جو پھاڑ کر فلک کی ردا کو چومیں گے عرشِ اعظم

اُسی دن احساس کامیابی سے ہو کے خوش مسکرائینگے ہم
اُسی دن اپنے وطن میں جشنِ بہارِ ملت منائینگے ہم

دارالصحت رجسٹرڈ حکیم مولوی محمد نذیر ایچ پی مئوناتھ بھنجن ضلع اعظم گڈھ کے بے نظیر تحفے

قدرتی تیل رجسٹرڈ قدرتی تیل رجسٹرڈ کی ایجاد ۱۹۰۳ء میں ہوئی ثلث ہی صدی میں اپنے بیش بہا فواید کیوجہ سے تمام دنیا میں مشہور ہو گیا ہے چنانچہ معزز ہندوستانی حکما ڈاکٹر اور وید صاحبان کے علاوہ ولایت کے کئی ڈاکٹروں نے بھی سرٹیفکیٹ دیئے ہیں اور اکثر اپنے مطب میں برتتے اور خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ تیل جڑی بوٹیوں سے تیار کیا جاتا ہے ہر قسم کے درد میں اکسیر ہے اور فوری فائدہ دکھاتا ہے۔ بدن پر مالش کرکے نہانا خراب پانی کے نقصان اور موسمی بخار سردی اور زکام سے محفوظ رکھتا ہے اور بدن کو چست اور توی بناتا ہے سر پر مالش کرنے سے بالوں کی سیاہی قائم رہتی ہے بال نرم اور چمکدار ہو جاتے ہیں اور قبل از وقت سفید نہیں ہوتے نزلہ زکام تر کھانسی سر آنکھ کان دانت کمر سینہ کے درد چوٹ خارش آگ سے جلنے مستورات کے قنج حمل اور کمر درد بچوں کیواسطے تریاق ہے۔ ہمارا قدرتی تیل رجسٹرڈ ہے اس لئے حریص نقال قدرتی تیل کا نام تو اپنے اشتہار میں لکھ نہیں سکتے۔ مگر ہر ممکن طریقہ سے پبلک کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمارا ہی مال بہتر ہے لہذا معزز پبلک سے درخواست ہے کہ قدرتی تیل کی خریداری میں بہت احتیاط سے کام لے اور جس قدر تیل کی ضرورت ہو براہ راست کارخانہ ہذا سے طلب کرے تاکہ دھوکہ نہ ہو۔
نوٹ:۔ ایک پاؤ سے کم قدرتی تیل رجسٹرڈ پارسل نہیں ہوگا۔ قدرتی تیل مختلف شیشیوں میں پیک بھی ملتا ہے قیمت فی سیر چار روپیہ علاوہ پیکنگ محصولڈاک وغیرہ

روغن بہار رجسٹرڈ جسمانی صحت کا دارومدار دماغی صحت پر ہے، کامیاب زندگی اور کام کو پوری توجہ سے کرنے کے لئے دماغی سکون کی نہایت ضرورت ہے اور دماغی سکون حاصل کرنے کیواسطے حکیموں اور ڈاکٹروں کا قول ہے کہ مقوی دماغ و مفرح طبع اور خوشبودار تیل استعمال کیا جائے۔ چنانچہ آجکل مختلف قسم کے خوشبودار تیل رائج ہیں مگر افسوس ہے کہ انکے استعمال سے فایدہ نہیں ہوتا جو دماغ کیلئے ضروری ہے۔ "روغن بہار" جو ان تمام خوبیوں کا حامل ہے جنکی بالوں کو ضرورت ہے اور تمام مضر اجزا سے پاک ہے خاص سفید تل کے تیل سے تیار کیا جاتا ہے اور ہم اعلان کرتے ہیں کہ اسمیں آمیزش ثابت کرنیوالے کو ایک سو روپیہ نقد انعام ملیگا۔ اسکے مستقل استعمال سے ہمیشہ کیواسطے امراض دماغی سے نجات مل جاتی ہے دماغی کام کرنیوالے حضرات اور خواتین کیلئے ایک بیش بہا اور نادر تحفہ ہے۔ بالوں کے بڑھانے میں لاجواب ہے انکے قدرتی رنگ کو قائم رکھتا ہے ملائم خوبصورت اور چمکدار بناتا ہے۔ آزمایش شرط ہے
قیمت فی سیر چھ روپے علاوہ محصولڈاک وغیرہ

معجون بے نظیر رجسٹرڈ ←موسم سرما کا بے نظیر تحفہ

ہندوستان کی شدید گرمی سے صحت کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کا بہترین موقع موسم سرما آ گیا ہے اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے جسمانی خرابیوں کو دور کرنے کیلئے دارالصحت رجسٹرڈ مئوناتھ بھنجن کا تیار کردہ معجون بے نظیر رجسٹرڈ استعمال فرمایئے جو صبح کا خوشگوار اور لذیذ ناشتہ بھی ہے اور دوا کی دوا ہے معجون سالہا سال تک ہزاروں آدمیوں پر تجربہ کرنے کے بعد دو برس سے پبلک میں پیش کیا جا رہا ہے یہ اعلیٰ درجہ کا مقوی اعصاب اور مقوی باہ ہے جملہ اعضائے رئیسہ کو قوت دیتا ہے، خون صالح پیدا کرتا ہے اور جسم کے وزن کو بڑھاتا ہے، حرارت غریزی کی حفاظت کرتا ہے اور عام جسمانی کمزوری و لاغری کو دور کرکے جسم کو فربہ اور چہرہ کی رنگت کو نکھارتا ہے، دل و دماغ میں عجیب فرحت اور قوت پیدا کرتا ہے طبیعت ہر وقت بشاش رہتی ہے۔ اس معجون میں ایسے اجزا شامل کئے گئے ہیں جو قبض کو دور کرکے معدہ کو قوت دیتا ہے جس سے ہاضمہ درست ہو جاتا ہے۔ زیادہ تعریف فضول ہے۔ تجربہ کیجئے آپ خود ہی اس کے فوائد کی تصدیق فرمائینگے۔

نوٹ:۔ آدھ سیر سے کم نہیں روانہ ہوگا۔

ملنے کا پتہ:۔ منیجر دارالصحت رجسٹرڈ مئوناتھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ

پھیکے خواب

افسانہ

از جناب شفیق الرحمٰن (میڈیکل کالج)

کرنل صاحب کی خوبصورت موٹر سٹارٹ ہوئی اور دھوئیں اور غبار کے چھوٹے چھوٹے بگولے چھوڑتی ہوئی چلدی۔ وہ آج خلاف معمول کلب سے بہت جلد گھر واپس جا رہے تھے۔ ایک بیرے نے دوسرے کو کہنی ماری دوسرے نے تیسرے کو تیسرے نے اور دور کھڑے ہوئے چپراسی کو آنکھ ماری۔

"آج کسے لے گیا ہے جالم؟" ایک نے للچائی ہوئی نگاہیں کار کے غبار پر گاڑتے ہوئے کہا۔

"ڈاک کھانوں کا جو بڑا صاحب ہے نا اس کی بٹیا کو، گجب کی کھوب صورت ہے۔" دوسرا بولا۔

"اس سیطان کے لئے تو سب برابر ہیں، آج اس کی بٹیا کل اس کی بہو، پرسوں اس کی بہن، سسر کوئی نہ کوئی تو اس کے سنگ ہوے ہی ہے اپنی آکبت کھراب کر رکھی ہے۔ کسی سے سادی وادی ہی نہیں کرتا۔ اور یہ بھی سب جاتی بوجھتی اس کے ساتھ چلی ہی جاں ہیں۔"

"ابے دیکھتا نہیں کیسا سجیلا جوان ہے؟ سارے کلب گھر میں ایسا گبرو نہیں ملنے کا۔ اسے دیکھ کر لڑکیوں کی تو یوں رال ٹپک پڑے ہے کہ بس۔"

"سچ پوچھو تو پیسہ ہے پیسہ سب ــــ!" دوسرے نے جواب دیا اور ادھر ادھر ہو گئے۔

کرنل صاحب آج خود موٹر نہیں چلا رہے تھے بلکہ بغل میں بیٹھی ہوئی حسین لڑکی یہ فرض سرانجام دے رہی تھی۔ مرمریں جسم پر چست بلاؤز، کسی ہوئی ساڑی کہ جو جسم کے زاویوں سے چمٹی ہوئی تھی ـــ لہراتی ہوئی گھنگھر والی زلفیں گداز بازو ـــ اور لمبی لمبی انگلیاں، آنکھوں میں دوشیزگی کا حجاب ـــ اور شباب کی شوخی دونوں ملی جلی۔

انھوں نے سگریٹ سلگایا اور باہر افق کی جانب دیکھنے لگے جہاں سورج ڈوب رہا تھا وہ کچھ رنجیدہ سے معلوم ہو رہے تھے۔

"پیارے کرنل! چپ کیوں ہو؟" لڑکی نے بڑے پیار سے پوچھا۔

انھوں نے کوئی جواب نہ دیا، بس کھوئی کھوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور ایک پھیکی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر کھیل گئی۔

کرنل صاحب شہر کی مشہور ہستیوں میں سے تھے، سوسائٹی کی جان ظرافت کی روح، جس جگہ بیٹھ جاتے وہ جگہ قہقہوں سے گونج اٹھتی ـــ کبھی کسی نے انہیں افسردہ نہیں دیکھا، ایک پیارا سا تبسم ان کے لبوں پر ہر وقت کھیلتا رہتا، باتیں کرنے کا انھیں ایسا ڈھنگ آتا تھا کہ جسے چاہتے پلوں میں رام کر لیتے۔ جنس لطیف کے حلقے میں تو وہ بڑے ممتاز تھے، عموماً لڑکیاں انھی کی باتیں کیا کرتیں، نہ معلوم ان سے باتیں کرتے وقت کیوں کرنل صاحب کی آنکھوں میں ایک خاص چمک آ جاتی، جس سے شاید ان کی خوبصورتی اور بھی دوبالا ہو جاتی، چند قیانوسی خیالات کے لوگ ایسے بھی تھے جو انھیں بالکل پسند نہیں کرتے تھے بلکہ انھیں بدچلن، عیاش، حسن کا ڈاکو، عصمت کا شکاری جیسے فضول ناموں سے پکارتے تھے۔ نہ جانے اس میں کتنی صداقت تھی، مگر ان میں خوبیاں اتنی تھیں کہ وہ ان تمام عیوب کو ڈھانپ لیتی تھیں۔ سب سے بڑی خوبی تو یہ تھی کہ وہ بڑے امیر تھے، کسی امیر میں برائیاں تو ہوتی ہی نہیں اگر ہوتی بھی ہیں تو یونہی برائے نام، اور لوگ انھیں دل بہلاوے کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ شہر کے بہترین سرجن تھے۔ ہر روز نہ معلوم کتنے مرے ہوؤں کو زندگی بخشتے تھے اور پھر وہ مردانہ حسن کی جیتی جاگتی تصویر بھی تھے۔ دراز قد، چوڑی چھاتی، ملبی گردن، مسکراتے ہوئے ہونٹ، اب تو ان کے چہرے پر جھریاں بھی پڑنے لگی تھیں لیکن اس عمر میں بھی انھوں نے اپنا بڑھاپا چھپا رکھا تھا، سرکار نے اعزازات کا ڈھیر ان کے قدموں پر لگا رکھا تھا۔ وہ "خانبہادر" بھی تھے اور اے۔ بی۔ سی سے لیکر ایکس، وائی، زیڈ تک نہ معلوم کیا کیا تھے، ان کی عمر ہو گی کوئی پچاس کے لگ بھگ، مگر وہ بالکل جوان ہی لگتے تھے ـــــ انھوں نے اب تک شادی نہ کی تھی۔

کار ایک ویران سڑک پر دوڑی جا رہی تھی۔

"آپ بولتے کیوں نہیں؟" لڑکی نے ایک انداز سے پوچھا۔

وہ بدستور ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری شعاعوں کو دیکھ رہے تھے۔

"آپ بتلاتے نہیں، اچھا تو یہ لیجئے۔" اس نے کار کو ٹھہراتے ہوئے کہا۔

وہ جیسے چونک پڑا ـــ "ایں! ارے یہ روک دی تم نے، ہاں ہاں کیا کہتی تھیں ـــ؟"

"آج کوئی خاص بات ہے، مجھے نہ بتلایئے گا۔" لڑکی کا بازو کرنل کے

چوڑے کندھے پر آ گیا۔

"میں نے ایک عجیب تماشہ دیکھا آج —" کرنل کی آنکھیں بدستور سورج کی سرخ شعاعوں پر گڑی ہوئی تھیں۔

"وہ کیا —؟" لڑکی کا ہاتھ اور آگے آ گیا۔

"آج میں نے ایک بڑا خونخوار ڈراما دیکھا۔ ایک بدقسمت نوجوان کو ٹھکرا دیا گیا، کلب کے پچھواڑے باغ میں، شاید لڑکے نے التجا کر کے لڑکی کو وہاں بلایا تھا، وہ اس کی منتیں کر رہا تھا، التجائیں کر رہا تھا، اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے، اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں، وہ اسے پرانی محبت کا واسطہ دے دے کر عمر بھر کے لئے اپنا بن جانے کو کہہ رہا تھا۔

لڑکی بولی۔ "مجھے بڑا افسوس ہے اور ساتھ ہی ہمدردی بھی ہے —!"

وہ بولا —" اور وہ محبت کے خواب کیا ہوئے —؟ وہ الفت کے پیمان کہاں گئے —؟"

لڑکی نے جواب دیا —" خواب پھیکے پڑ گئے — پیمان ٹوٹ گئے زمانہ سب کچھ کر دیتا ہے۔"

لڑکے نے ترکش کا آخری تیر لگانا چاہا — وہ بولا۔ "مگر تم تو کہا کرتی تھیں کہ —!" مگر لڑکی نے فوراً بات کاٹ دی اور تلخ لہجے میں بولی —" کہا کرتی ہونگی۔ جب مجھے اونچ نیچ کی سمجھ نہیں تھی — مگر اب وقت نے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔"

وہ ٹس سے مس نہ ہوئی، اس پر کوئی اثر نہ ہوا، اس کی التجاؤں کا، اس کے آنسوؤں کا — اس نے بڑی فرعونیت سے انکار کر دیا اور جلدی — لڑکے نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے مگر اس نے چھڑا لئے اور ایک تلخ سی ہنسی کے بعد چلی گئی، — بغیر پیچھے دیکھے، اور — وہ لڑکا —"

"تو لڑکیاں ٹھکرا بھی دیتی ہیں کسی کو، مگر اس لڑکی کو کرنل جیسا پیارا رفیق نہ ملا ہوگا، تب ہی تو یوں ہوا —" اس نے مسکرا کر کہا۔

"مگر وہ لڑکا — اس کے آنسو — اس کی ڈراونی آنکھیں سب کچھ میرے سامنے پھر رہا ہے۔"

"کیا باتیں لے بیٹھے آپ بھی، بھلا کوئی کسی کو ٹھکرا تا پھرے، ہماری بلا سے، ہمیں کیا ہے آپ کا دل اس قدر حساس ہے، یہ مجھے آج ہی پتہ چلا — پہلے میں سمجھی تھی کہ شاید آپ کی طبیعت اچھی نہیں۔" اس کا سر کرنل کے کندھے سے آ لگا،

"شاید تمہارے ننھے سے دل کو پتہ نہیں کہ ٹھکرائے جانے کا کس قدر صدمہ ہوتا ہے؟"

"ہوتا ہوگا، آپ تو ایسی اچھی شام کو خراب کرنے پر تلے ہوئے ہیں، کیا فضول سا قصہ لے بیٹھے — اچھا اب ہنسئے — ہنسئے بھی، —!"

کار پھر چلی اور ذرا سی دیر میں کرنل کی کوٹھی آ گئی، جو شہر سے دور تھی اور جسے ایک وسیع باغ نے گھیر رکھا تھا۔ دونوں اترے، وہ اپنی باریک چمکیلی ساڑھی اپنے گدرائے ہوئے جسم پر ٹھیک کرتی ہوئی کوٹھی میں داخل ہوئی۔

"بالکل خاموشی ہے یہاں، آپ کا دل نہیں گھبراتا کیا؟" وہ چہک کر بولی۔ "میں ہوں تو میرا جی ہی دہل جائے — اتنی بڑی کوٹھی پڑی بھائیں بھائیں کرتی ہے۔"

جلدی سے اس نے ریڈیو کا سوئچ دبا دیا اور کمرے کے تمام قمقمے روشن کر دیئے —،

"اخاہ، پنگ پانگ بھی ہے یہاں، آئیے ہو جائے ایک سٹ، اور شرط بھی لگے۔" وہ بولی، کرنل چپ تھا، وہ آہستہ سے ایک صوفے پر گر پڑا اور دھیمی آواز میں بولا۔ "میرے خیال میں بہتر یہی ہوگا کہ ہم ابھی ریڈیو ہی سنیں، میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

لڑکی نے بڑے پیار سے کرنل کی طرف دیکھا اور ٹھنک کر بولی۔ "آپ بڑا تنگ کرتے ہیں۔" مگر کرنل کا چہرہ بدستور سنجیدہ بنا ہوا تھا۔

"اگر تم چاہو تو میری مختصر سی آرٹ گیلری دیکھ سکتی ہو۔" وہ بولا،

"سچ مچ، پہلے تو کبھی بتایا ہی نہیں آپ نے۔ آیئے چلئے ابھی۔"

"نہیں، میری طبیعت اداس سی ہے۔ میں ذرا دیر آرام کروں گا، ایک کمرہ چھوڑ کر دوسرے کمرے میں تو ہے ہی — تم اکیلی ہی ہو آؤ۔"

"نہیں، میں نہیں جاؤنگی —" وہ مچل کر بولی۔

"ضدی ہو بالکل۔" کرنل نے پیار سے اس کے گال پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔ "ذرا سی دیر میں تو میں آ ہی جاؤنگا۔"

ذرا سی دیر مچلنے کے بعد لڑکی چلی گئی۔ وہ آہستہ سے اٹھا اور لڑکھڑاتی ہوئی چال سے دروازے کی طرف چلا۔ نہ معلوم آج اسے ہو کیا گیا تھا؟ اس کے دماغ پر دھواں سا چھا رہا تھا۔ اگر وہ اس ناکام آرزو کو کامیاب دیکھ لیتا تب اسے کون سی خوشی حاصل ہو جاتی، جو اس کی ناکامی پر رنج ہو رہا تھا، اس کے دل کے زنگ آلود تار مرتعش ہو رہے تھے، پرانی باتیں آہستہ آہستہ اسے یاد آ رہی تھیں جیسے اندھیری رات میں دور بانسری کی آواز سنائی دے جو نزدیک آتی جائے۔

ریڈیو پر کسی نے الاپا —" دیوانہ ہوں — دیوانہ ہوں، راحت سے میں بیگانہ ہوں —" وہ چونک پڑا، کتنا سوز تھا۔ کتنی تڑپ تھی۔ وہ ہر روز نغمے سنا کرتا، مگر جیسے اسے آج محسوس ہو رہا تھا، ایسا کبھی نہیں ہوا تھا،

آواز آئی —— "دیوانہ ہُوں دیوانہ ہوں — راحت سے میں بیگانہ ہوں" اسے ایسے لگا جیسے کسی نے اسے ہی مخاطب کیا ہو، گانے والا بڑی درد انگیز آواز میں گا رہا تھا۔

" دل کو کیسے بہلاؤں میں —— یہ زخم کیسے دکھلاؤں میں "

اس کے کانوں میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔

" دل کو کیسے بہلاؤں میں!

یہ زخم کیسے دکھلاؤں میں!

آنسو سُن سن کر ہنستے ہیں ——

کیا درد بھرا افسانہ ہوں ——

جسم کا سارا خون سمٹ کر اس کے کانوں میں آ گیا، وہ کواڑ کا سہارا لئے سُن رہا تھا، کیا سچ مچ کوئی اسے ہی کہہ رہا تھا،

" آئی نہ بہار خزاں ہی سہی ——

اُجڑے دل میں اَرماں ہی سہی ——

اس کا دل اس کی روح سے چپکے چپکے گیت کے یہی الفاظ دہرا رہا تھا

" آئی نہ بہار خزاں ہی سہی ——

اجڑے دل میں ارماں ہی سہی ——

حیراں ہُوں کہ آخر کیا ہُوں میں

آباد ہوں یا ویرانہ ہوں !

بالکل اس کے دل کا خاکہ —— اس کی روح کا نقشہ جیسے کسی نے اس کے سامنے کھینچ دیا ہو، اس کا جی بھر آیا، وہ زیادہ نہ سُن سکا اور باہر نکل گیا باغ میں اندھیرا تھا، وہ ایک پگڈنڈی پر جا رہا تھا، اس کے دماغ میں گیت کے الفاظ گونج رہے تھے۔ وہ دور ایک بنچ پر بیٹھ گیا، ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ فضا میں خنکی تھی، رات کی رانی مہک رہی تھی۔ دور اُفق پر ایک دھندلی سی روشنی چاند کے طلوع ہونے کا پتہ دے رہی تھی۔

اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا آج ہی اسے ایسے خیالات کیوں آ رہے تھے؟ کبھی اس کے نزدیک رنج پھٹکا تک نہیں کبھی ایسا نہیں ہوا اور پھر کسی کا ٹھکرا دیا جانا —— بالکل معمولی سی بات ہے۔ نہ معلوم ایک لمحے میں دنیا بھر میں کتنے ایسے کھیل کھیلے جاتے ہیں، اس کا پتھر سا دل اسی سے متاثر ہو گیا، اسے اپنی بھولی ہوئی باتیں یاد آنے لگی تھیں، مانا کہ وہ بھی کبھی ٹھکرایا گیا تھا مگر ان باتوں کو تو بیشمار سال گزر چکے تھے؛ اور بھلا اسے ٹھکرانے والی ہستیاں کون تھیں؟ اس کے سامنے ایک دھند سی چھانے لگی، وہ بڑا گھبرایا، اس لیے چاہا کہ تصور کی اس قید سے قلانچ مار کر رہا ہو جائے، مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا، اس کے تھکے ہوئے دماغ پر جالا سا تن گیا، دھند بڑھتی گئی،

اور وہ ہاتھ پیر مارنے لگا —— مگر کہر نے اُسے اچھی طرح ڈھانپ لیا، اس کے سامنے رنگوں کے چند بے قاعدہ سے دھبے ناچنے لگے، پھر دھبے سمٹ سمٹ کر مل کر تصویریں بن گئیں اور تصویریں حرکت کرنے لگیں، وہ اپنا لڑکپن دیکھ رہا تھا، چھریرا جسم، سرخ و سپید رنگ، شوخی، زندہ دلی —— بہترین طالبعلم اپنے ہم جماعتوں میں ہر دلعزیز، سکول کا ہیرو، اور پھر آغاز جوانی —— سڈول جسم، خوبصورتی چمک اٹھی تھی، دل پر پاکیزگی کا نور تھا، روح پر نیکی کی جلا تھی، وہ معصومیت کا مجسمہ تھا، لوگ فخر سے اس کا نام لیا کرتے،

اس کی پہلی محبت! —— اس کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ کس قدر پاگل ہو گیا تھا وہ، کتنی خوبصورت لڑکی تھی؛ ان پچاس سالوں میں اس نے اتنی حسین لڑکی نہ دیکھی ہو گی —— اس کا چہرہ نورانی تھا جو نہ معلوم کیسی پراسرار روشنی سے جگمگ جگمگ کیا کرتا، جس پر فرشتوں کا پاک تبسم کھیلا کرتا۔ وہ ان دنوں زمین پر نہیں رہتا تھا۔ آسمان کی بلندیوں میں اڑا کرتا، اور اس کی وہ بڑی بڑی کٹورے سی آنکھیں جن میں اسے ایک نئی کائنات نظر آیا کرتی —— جب وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ہنستی تو ان نینوں میں جل پریاں ناچنے لگتیں —— جب دونوں کی آنکھیں لڑ جاتیں تو وہ دیر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا، وہ ایسی دنیا میں چلا جاتا جہاں شراب کے دریا بہہ رہے ہوتے، جہاں مستی انگڑائیاں لے رہی ہوتی —— زندگی کی دھڑکن تیز ہو جاتی —— وہ دو آنکھیں جیسے کہا کرتیں "پگلے تو کہاں بھٹکتا پھر رہا ہے، ہماری گہرائیوں میں ڈوب جا اور پھر اُبھرنے کا نام تک نہ لے اور تجھے پتہ لگے گا کہ زندگی کہتے کسے ہیں؟" —— اسے محض محبت تھوڑی تھی —— وہ تو ایک ایسا جذبہ تھا جو محبت سے کہیں بلند تھا، وہ کھویا کھویا سا پھرا کرتا، —— کالج میں اس کا جی نہ لگتا —— کسی بات میں وہ دلچسپی نہ لیتا۔

"اگر وہ میری ہو گئی تو ——؟" یہ سوال اس کے دماغ میں گھڑی گھڑی آتا —— وہ سوچنے بیٹھ جاتا۔ اگر وہ واقعی اس کی ہو گئی تو وہ کیا کریگا؛ آسمان سے تارے نوچ لائیگا، بجلی کی تڑپ چھین لیگا۔ سمندروں کی تہ سے موتی نکال کر اس کے قدموں میں ڈال دیگا۔ قوس قزح کو پکڑ کر اس کے لیے گہنے بنا دیگا، اور پھر تھک کر ایک بڑا عالیشان مندر بنائے گا جس میں اپنے دل کے سنگھاسن پر اسے دیوی بنا کر بٹھائے گا اور خود اس کے قدموں میں بیٹھ کر اس کی پرستش کریگا، یہ پوجا جب تک ختم نہ ہو گی جب تک اس کے سینے کا آخری سانس بھی ختم نہیں ہو جاتا۔ کیسی ہو گی وہ زندگی؟ جیسے نقرئی گھنٹیوں کی ہلکی ہلکی آواز —— شراب کا ہلکا ہلکا خمار، —— شہد کی مٹھاس، —— آبشاروں کا ترنم، کلیوں کی پاکیزگی —— سب کچھ طلوع

سحر کی دھندلاہٹ میں ملا دیا جائے، اس کا دل ناچنے لگتا — چاند تارے ناچتے اور ساتھ ساتھ کائنات بھی ناچتی،

دن گزر رہے تھے اور محبت کا نشہ تیز ہوتا جا رہا تھا۔ یہ آنکھوں ہی آنکھوں میں محبت کا پیغام دیتا اور وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا جواب دے دیتی۔ آخر ایک روز اس نے اس جذبے کا اظہار کیا، کس قدر کٹھن لمحات تھے وہ، وہ الفاظ ڈھونڈ رہا تھا، وہ ہکلا رہا تھا، اس نے اپنی روح کی پوری طاقت صرف کر دی تھی — جب وہ سب کچھ کہہ چکا، اور اس کی طرف امید و بیم کی حالت میں دیکھنے لگا۔ پہلے وہ مسکرائی — اس کے سامنے پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں، — اس کی آنکھیں چندھیا گئیں، — کچھ دیر وہ مسکراتی رہی پھر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر پتلی سی انگلی اس کے سامنے کر دی، جس میں ایک سنہری انگوٹھی چمک رہی تھی — منگنی کی انگوٹھی! — جیسے کسی نے اس کی روح قبض کر لی، اس کا دل تلملا اٹھا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ "مجھے بڑا افسوس ہے اور ساتھ ہی ہمدردی بھی —" وہ دیوانہ ہو گیا، اس کا جی چاہتا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر روئے، چیخیں مارے، اس نظام ہستی کو درہم برہم کر دے، مگر باوجود انتہائی کوشش کے ایک آنسو بھی نہ نکال سکا، غم کے طوفان کی ایک ہچکی بھی اس کے دماغ سے باہر نہ نکل سکی، سارے کا سارا غم اس کے دماغ پر ہی چھا گیا، بار بار اس کے دماغ میں ایک سوال تڑپتا وہ یہ کہ — آخر اس نے دو سال تک کیوں نہ کہا؟ کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے، وہ اس کے جذبات سے کھیلتی رہی کیا؟ وہ اسے ایسی نگاہوں سے دیکھتی ہی کیوں تھی؟ کیوں اس نے اس کے دل میں امیدوں کے طوفان برپا کر دیئے؟ کیوں امنگوں کے تلاطم پیدا کئے؟ اور پھر سب کچھ بنا کر ایک ہی سی جنبش سے ڈھا دیا، یہ تھی اس کی سب سے پہلی شکست —،

اب وہ میڈیکل کالج میں آ چکا تھا، جہاں وہ پاگلوں کی طرح پھرا کرتا، اپنے شکستہ دل کو بہلانے کے لئے وہ وائلن لے بیٹھتا، اسے بھی رلاتا اور خود بھی روتا، سوسائٹی میں اس کی بڑی قدر کی جاتی، وہ نگاہوں کا مرکز تھا، اس کے پاس سب کچھ تھا۔ صحت، حسن، دولت سب کچھ ہی تو تھا، اگر کچھ نہیں تھا تو وہ سکون قلب نہیں تھا، اس نے یہی عہد کیا ہوا تھا کہ اب کسی لڑکی کی جانب دیکھے گا بھی نہیں، چنانچہ کئی لڑکیوں کا رجحان اس کی طرف ہوا بھی مگر اس نے کسی کی ذرا سی پروا بھی نہ کی، مگر انسان کا دل کتنا کمزور ہوتا ہے، پھر زندگی میں تبدیلی آگئی، ایک شوخ و شنگ لڑکی اس کی جانب ملتفت ہو گئی۔ وہ کہا کرتی۔ "جب میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں تو اپنے آپ کو کتنا مسرور پاتی ہوں، میری باچھیں کھل جاتی ہیں اور میرا [illegible] شدید تر ہوتا ہے"

ساتھ چل سکتی۔"

اس کے زخمی دل پر کسی نے پھاہا رکھ دیا، کسی نے اس کے آنسو خشک کر دیئے، یہ سوچا کرتا شاید یہی اس کا نعم البدل ثابت ہو سکے۔ اس کی بات بات میں پیار جھلکتا تھا، اس کی ہر ایک حرکت سے محبت ٹپکتی تھی، وہ اسے اس انداز سے دیکھتی جیسے یہی اس کا سب کچھ ہے۔

اس کے دل کو پھر کچھ تسکین ہوتی جا رہی تھی، یہ بھی اس کی جانب کھنچتا گیا۔ جب یہ کسی پارٹی میں وائلن بجا رہا ہوتا تو ان دونوں کی نظریں ایک دوسرے پر گڑی ہوئی ہوتیں، خون بڑی تیزی سے اس کی رگوں میں دوڑنے لگتا۔ اس کا دل بلیوں اچھلنے لگتا، وہ بالکل مدہوش ہو جاتا، نہ جانے اس کی انگلیاں کس طرح حرکت کر رہی ہوتیں، بس اسے صرف اتنا پتہ ہوتا کہ وہ کسی کو دیکھ رہا ہے اور کوئی اسے — اور نغمے خود بخود نکل رہے ہوتے۔ لوگ جھوم جھوم جاتے، جب وہ واپس لوٹتے تب وہ رات بھر اس کی تعریفیں کرتی رہتی، اور اس کا دماغ غرور سے پھٹنے لگتا۔ اسی طرح سال گزر گیا، اس میں کچھ کچھ تبدیلی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بے رخی سی برتنے لگی، یہ اس بے رخی کو پیار سے تعبیر کرتا رہا، آخر ایک منحوس اور اداس سی شام کو اسے پتہ چلا کہ وہ ایک کالے سے مریل لڑکے کو چاہتی ہے، اسے پہلے پہل بالکل یقین نہ آیا کیونکہ اس لڑکے میں کوئی خوبی بھی نہ تھی، اس کے بعد اس نے ان دونوں کو ساتھ پھرتے دیکھا، نہ معلوم عورت کی فطرت کس قسم کی ہوتی ہے اور اس کی پسند کیسی ہوتی ہے، پتہ نہیں اسے اس فضول سے لڑکے میں کیا بھا گیا؟ آخر ایک رات کو وہ ایک دعوت کے بعد وائلن بجا رہا تھا اس کی نظریں ایک جگہ جم کر رہ گئیں، اسی نے دیکھا کہ وہ لڑکا اور لڑکی دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھے تھے، اور جہاں اس کے نغموں کے طوفان میں سارا مجمع بہہ رہا تھا، وہاں وہ دونوں ایک جزیرے میں بیٹھے تھے، جس کے گرد اونچی اونچی آہنی دیواریں تھیں، جن سے اس کے نغمے ٹکرا ٹکرا کر واپس آ رہے تھے، اس کے ہاتھ کانپنے لگے — اس کی نگاہوں کے سامنے لوگوں کے چہرے تھرکنے لگے، پھر اس نے ایک درد بھرا نغمہ بجانا شروع کر دیا، ذرا سی دیر میں ہال پر ایک ہو کا عالم طاری تھا، لوگوں کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے مگر وہ دونوں — وہ دونوں اسی طرح مسرور و شاداں ایک دوسرے کی طرف تک رہے تھے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ — ایک طوفان آ گیا، اس کے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا — اس کے گرد بجلیاں کوند رہی تھیں — نہ جانے کیسی کیسی قیامتیں اس کے دل پر گزر گئیں، اس کی روح کو کیسے کیسے زخم لگے، اس نے گھر جا کر وائلن کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور پھر کبھی نہ بجایا۔

وہ بیحد سنجیدہ رہنے لگا، اکھڑ پن اور ترشی اب اس کے دماغ میں رچتی

یہ مسکرا دیتا، وہ اس کا ہاتھ دبا کر کہتی "تم … ہمیشہ تمہارے

جارہی تھی، اب وہ پہلا سا خوبصورت اور ہردلعزیز نوجوان نہیں تھا بلکہ ایک غصیل اور چڑچڑا انسان تھا، جس کی ہمیشہ مٹھیاں بھنچی رہتیں، ہر وقت تیوری چڑھی رہتی تھی، لوگ اب اس سے ڈرنے لگے، اس کے مداح اس سے کتراتے تھے، وہ آہستہ آہستہ مکمل حیوان بنتا جارہا تھا، اس کی شکل بھی درندے جیسی ہوتی جارہی تھی، مہینے اسی طرح گزر گئے، پھر ایک خاموش سی روح نے اپنی ہمدرد نگاہوں سے اس کے زخموں پر پھاہا رکھنا شروع کیا، پہلے پہل تو یہ جھنجلا اٹھا، اب اسے لڑکیوں سے نفرت تھی، ان کی محبت پر ذرّہ برابر یقین نہیں تھا، مگر اس لڑکی کی نگاہوں نے اس کے دل و دماغ میں ہلچل سی پیدا کردی، ایک عرصے تک وہ اسی کشمکش میں رہا، اور آخر وہ اس چپکی سی لڑکی سے ہار گیا، کیسی بھولی بھالی تھی وہ۔ سانولی سی، دبلی تپلی، ——— بالکل جیسے چغتائی کی تصویریں ہوا کرتی ہیں ——— اس کی نگاہوں سے خلوص ٹپکتا تھا ——— اس کے چہرے کے دونوں طرف گھنگھردار زلفیں لہرایا کرتیں ——— پتلے پتلے ہونٹ یوں لرزاں رہتے جیسے کچھ کہنے کو ہیں ——— نیچی نیچی سہمی ہوئی نگاہیں جیسے کوئی راز چھپائے ہوئے ہوں، نہ معلوم اسے اس درندہ صفت انسان میں کون سی خوبی نظر آگئی تھی، ——— دونوں ایک دوسرے کو گھنٹوں دیکھا کرتے، وہ پرانی وحشت پھر عود کر آئی، دل میں امنگیں پھر سے ناچنے لگیں، وہ سوچا کرتا شاید یہی اس کے درد کا درماں ہوجائے، وہ دیوانہ سا رہنے لگا کہ کبھی وہ ان ننھے ننھے ہونٹوں کی جنبش دیکھے اور اس کی آواز سنے ——— کبھی اس سہمے ہوئے چہرے کو مسکراتا دیکھے، ایک دن وہ مسکرائی، اسے ایسے لگا جیسے سورج کھلکھلا کر ہنس پڑا ——— خدائی ہنس دی، اس کا دل کھل گیا، اس کی باتوں سے شہد کی بوندیں ٹپکا کرتیں، اس کے دل کی سوکھی ہوئی پھلواری میں ایک مرتبہ پھر سے بہار آئی، اب سختی کی جگہ ملائمت نے لے لی، امید ہونے لگی کہ شاید زندگی سدھر جائے، اور یہ بڑھتا ہوا ناسور جو لاعلاج ہوچلا تھا پھر سے ٹھیک ہوجائے، مگر ایسا نہ ہونا تھا اور نہ ہی ہوا، اس نے اپنی روح کی پوری طاقتوں سے اسے محبت کا پیغام دیا، مگر نہ جانے اس کے نازک سے سینے میں دل تھا بھی یا نہیں، یا شاید کوئی برف کا تودا تھا یا پتھر کا ٹکڑا، ——— یا شاید وہ اسے کبھی بھی نہ سمجھ سکی، ——— اس پر کوئی اثر نہ ہوا، جن دنوں وہ پھنکا کرتا وہ مسکرایا کرتی، جب وہ تڑپا کرتا تو اسے خبر بھی نہ ہوتی، شاید اُسے ہی غلط فہمی ہوئی ہو، مگر آخر کیوں، اس نے اس قدر التفات ظاہر کیا؟ کیوں ایسی باتیں کیں؟ ایک ٹوٹے ہوئے دل کو کیوں جوڑنے کی کوشش کی؟ اس صورت میں جبکہ وہ چاہتی تھی کہ اسے جوڑ کر پھر پتھر سے دے مارے، بات بات پر کیوں اس کی نگاہیں اسے چھیڑ دیا کرتی تھیں، اور اس کا دل دھڑکتے دھڑکتے پاگل ہوجاتا، کون ذمہ دار تھا اس کا؟ آخر کس کا قصور تھا؟ یکلخت اسے خیالی جنت سے کیوں دوزخ میں پھینک دیا گیا، اس کے زخموں پر مرہم لگاتے لگاتے کیوں کچوکے دیئے گئے، اس قدر طویل عرصے تک ایک دوسرے کے نزدیک رہنے کے باوجود بھی وہ اس سے اتنی ہی دور تھی جتنے آسمان کے تارے، ہارنے کا غم، ٹھکرائے جانے کا غصہ، ——— اس کا دماغ جھلس گیا۔ جب اسنے آخری مرتبہ اسے خداحافظ کہا تب بھی وہ اتنی ہی سرد تھی جتنی پہلے دن ——— !

اب وہ ایک شیطان تھا، کہتے ہیں محبت کی ناکامی سے انسان کندن بن جاتا ہے، غلط، ——— بالکل غلط، محبت کی ناکامی تو دل و دماغ کو زنگ لگا دیتی ہے، اور روح کو ایک خوفناک بوجھ کے نیچے دبا دیتی ہے، جس کا سب کچھ چھین لیا جائے وہ کیسے مان لے کہ اس کے پاس سب کچھ ہے؟ ناکامی کا دیو وحشیانہ قہقہے لگاتا ہوا چیختا ہے ——— "بدبخت انسان تو ناکام ہے، تیرے لئے دنیا میں کوئی جگہ نہیں، تو ہارا ہوا ہے، تو شکست خوردہ ہے" جس کے پیالے سے آخری قطرہ تک انڈیل لیا جائے، کیوں نہ وہ اپنی روح کی پیاس بجھانے پر مجبور ہوجائے ——— وہ بھٹکنے لگا، دنیا اس پر ہنستی تھی تو ہنسا کرے، ——— اب اسے پرواہی کس کی تھی؟ جب ناکامیوں پر اس کا دل رویا تب تو کسی نے اس کا ساتھ نہ دیا اور اب ہنستی تھی تو پڑی ہنسے، وہ دوزخ میں رہا کرتا، چاروں طرف ویرانی ہی ویرانی تھی، وہ محبت بھرے بولوں کو ترستا تھا، دوست کا لفظ سنے ایک عرصہ ہوگیا تھا ——— اس نے ڈاکٹری کا آخری امتحان دیا اور پاس ہوگیا، اب اس کی زندگی بالکل بیکار تھی جس کا نہ تو کوئی مقصد تھا اور نہ کوئی اصول، اسی طرح کافی دن گزر گئے۔ تاریک آسمان پر پھر ایک تارا چمکا اور ایک سنہری صبح طلوع ہوئی، جس روز اس کی زندگی نے پھر پلٹا کھایا ——— امید کی کرنیں پھر سے پھوٹیں، کوئی پراسرار ہستی اسے غلاظت کے گڑھے سے رفعتوں کی طرف کھینچ رہی تھی، اس کے سیاہ دل کے ایک کونے میں پاکیزگی کی ایک رمق تڑپ رہی تھی، اسے یقین ہی نہ آتا تھا کہ ایسے ذلیل انسان سے بھی کوئی محبت کرسکتا ہے، مگر اس کے خطوط، اس کی گفتگو، اس کی ہر ایک بات اس کی شاہد تھی کہ وہ اس پر بری طرح فریفتہ ہے، پہلی ناکامیوں نے اس کا دل دہلا دیا تھا، اب اس کے قدم بڑے احتیاط سے پڑ رہے تھے اسے ایک عرصے تک یہی خیال رہا کہ وہ اس پر ہنس رہی ہے، اس کا منہ چڑھا رہی ہے، اس کا چہرہ اب تک اس کی دھندلی آنکھوں میں پھر رہا تھا ——— ایک رنگارنگ حسین چیز ——— لمبی لمبی پلکیں ——— پتلے پتلے شیریں ہونٹ ——— مسکراتے وقت رخساروں میں دو نہایت دلکش گڑھے پڑا کرتے۔

وہ کہا کرتی۔ "آپ کی رفیقہ حیات کتنی خوش قسمت ہوگی؟ مجھے

اُس پر رشک آتا ہے۔

یہ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح مسکرا دیتا،

وہ اس کی گود میں سر جھکا کر کہتی "کاش میں اس قدر خوش قسمت ہو سکتی"

یہ اس کا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیتا ۔۔۔ اس کی ٹھوڑی اٹھا کر ملائم اور شیریں ہونٹوں کو ایک طویل بوسے کے ساتھ بند کر دیتا۔

جوانی میں انسان کس قدر بیوقوف بن جاتا ہے؟ جوان دل کس قدر جلد خوش ہو جاتا ہے؟ ذرا سا سہارا ملا اور یہ بہل گیا، اب وہ پھر ایک شریف اور نیک نوجوان بنتا جا رہا تھا، جس میں روز بروز تبدیلیاں آتی جا رہی تھیں پریشان بال سنورنے لگے تھے۔ لڑکھڑاتی ہوئی مردہ چال میں اب مستی آ چلی تھی۔ بھٹکی ہوئی نگاہیں پھر سے باحیا ہوتی جا رہی تھیں ۔۔۔ مگر ایک خیال تھا جو اسے گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ اگر ایک دفعہ ناکامی ہوئی تو پھر کیا ہوگا؟ ۔۔۔ وہ یہی سوال اس سے آنکھوں ہی آنکھوں میں بارہا پوچھ چکا تھا، مگر ہر دفعہ جواب ایسا ملتا کہ ہمت بندھ جاتی۔

ایک روز وہ باتیں کرتے کرتے رک گئی اور بولی "ایک چھوٹی سی بات ہے ۔۔۔ اگر کہو، تو کہہ دوں"

اس کا دل کسی آنے والے خطرے کے اندیشے سے دھڑکنے لگا۔

"شاید آپ کو ناگوار ہو، مگر آبا جی اسی پر تلے ہوئے ہیں"

"کس پر؟" یہ چونک کر بولا،

"یہی کہ جب تک آپ کا مستقبل روشن نہ ہو وہ مجھے ۔۔۔ آپ سے ۔۔۔"

اس کی آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔

"پھر ۔۔۔؟" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"آپ کو اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ جانا ہوگا!"

"مگر مجھے تو کہیں جانے کی ضرورت نہیں، میری مالی حالت تو ایسی اچھی ہے کہ"

"آبا شہرت چاہتے ہیں ۔۔۔ ان کی یہی ضد ہے"

"بس یہی صورت ہے کیا؟" اس کے ہونٹ سوکھ گئے۔

"ہاں، بس یہی ایک صورت ہے"

اتنے سال کی جدائی ۔۔۔ وطن سے، عزیز و اقارب سے علیحدگی محبت انسان میں کس قدر ہمت پھونک دیتی ہے۔ وہ بازی مکمل طور پر ہار چکا تھا مگر اب بھی امید کا ایک ٹوٹا ہوا ٹکڑا تھا جو بچ رہا تھا، اسے اب بھی یہی خواہش تھی کہ وہ ایک ایسی ہستی کے قدموں میں زندگی گزار دے جس کی پتلیوں کی حرکت پر اس کا دل رقص کرنے لگے، جس کی روح کے ساتھ اس کی روح سرگوشیاں کرے، جس سے اس کے تمام زخم مندمل ہو جائیں، اس کا لمحہ لمحہ تعلیم پر صرف ہو رہا تھا، اسے نہیں معلوم تھا کہ دنیا میں سوائے کتابوں کے اور بھی کوئی دلچسپی تھی، ہندوستان سے اس کے خط ملا کرتے، اب اس کے سامنے محض ایک ہی منزل تھی اور وہ امتحان میں ممتاز کامیابی، تین سال کے طویل عرصے کے بعد وہ ایک کہر آمیز اور اداس سی صبح کو باہر کسی گاؤں میں بیٹھا اپنے نتیجے کا انتظار کر رہا تھا، اُسے دو تار ملے ۔۔۔ ایک تو امتحان میں اعلیٰ کامیابی کا اور دوسرا ۔۔۔ دوسرا ہندوستان سے آیا تھا، اس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے تار کھولا۔ اس میں ایک خون منجمد کر دینے والی خبر تھی ۔۔۔ اسی لڑکی کی شادی کی خبر، اندھیرا گھپ چھا گیا، زلزلے آئے، آندھیاں چلیں ۔۔۔ بجلیاں کڑکیں ۔۔۔ طوفان آئے اور سب امنگیں، آرزوئیں ولولے ۔۔۔ سب کچھ خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا، اس کا دل نہیں پھٹا، ورنہ اس کی روح کے ماؤف ہونے میں کوئی کسر باقی نہ رہی تھی۔ دنیا اسے کتنی تنگ اور اداس دکھائی دینے لگی ہر قہقہے پر اس کے آنسو نکل آتے تھے وہ واپس ہندوستان نہیں آیا بلکہ وہیں بھٹکتا رہا ۔۔۔ ایک عرصہ تک یونہی آوارہ پھرتا رہا، کئی دفعہ اس نے زندگی سے نجات حاصل کرنے کی کوشش بھی کی مگر ناکام رہا۔ انہی دنوں لڑائی شروع ہو گئی، وہ بھی شریک ہو گیا ۔۔۔ وہ جان بوجھ کر گولیوں کی بوچھاڑ میں پھرتا ۔۔۔ مگر دوست یا دشمن کسی کی بھی کوئی گولی اس قدر رحمدل ثابت نہ ہوئی جو اسے زندگی کی دائمی مصیبت سے نجات دلا دیتی، لڑائی کے اختتام پر اس کے کارناموں کو سراہا گیا، اس کے قدموں پر اعزازات کے ڈھیر لگا دیئے گئے، اس کا سینہ تمغوں سے سجا دیا گیا، وہ ہندوستان واپس لوٹا ۔۔۔ اب وہ کرنل تھا، اور ایک وسیع علاقے کا میڈیکل آفیسر، وہ پارٹیوں میں جاتا، اس کے گرد لوگ ہنستے اور اسے ہنسانے کی کوشش کرتے، آہستہ آہستہ وہ سب کچھ بھول رہا تھا۔ جگہ جگہ سے اُسے شادی کے پیغام آئے، بے شمار دوستوں نے اسے مجبور کیا، بہت سی حسین تتلیوں نے اسے پھانسنے کی کوشش کی، وہ اب بھی جاذب نگاہ تھا، نوجوان تھا، خوبصورت تھا، اس نے اپنے دل کو ٹٹولا تو نہ تو اس میں کسی کی محبت کے لئے اب کوئی جگہ تھی اور نہ ہی کسی رنج کے احساس کے لئے کوئی گوشہ تھا، وہ اپنی ناکامیوں پر کھلکھلا کر ہنسا، ایسا ہنسا کہ اس کے زخموں کے ٹانکے ٹوٹ گئے اور پھر سے خون بہنے لگا، مگر اس مرتبہ بھرے زخموں پر مرہم دوسری طرح کا لگنے لگا۔

ایک مرتبہ آدھی رات اسے کوئی مکروہ سا انسان بلانے آیا، پہلے تو اس نے انکار کیا مگر پھر اس شخص کی ملتجی نگاہوں اور دردناک داستان سے متاثر ہو کر ساتھ چل دیا، اس کی بیوی سخت بیمار تھی، اس نے جا کر دیکھا تو بستر پر وہی لڑکی دم توڑ رہی تھی جس نے اسے انگلینڈ بھیجا تھا، لڑکی کے لبوں پر غنودگی کی حالت میں چند الفاظ اس کے متعلق نکلے، اسی رات آپریشن ہوا، اس نے

اس کی جان بچالی، لڑکی اب بالکل تندرست ہو چکی تھی، جب وہ واپس آنے لگا تو اس کا بدصورت خاوند بولا "میری بیوی نے شاید کہیں آپ کو دیکھا ہے" اس نے بالکل لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے کہا "انھیں دھوکا ہوا ہوگا، بارہا ایسا ہو جاتا ہے کہ دنیا میں بہت سے انسانوں کی شکلیں تو ہو بہو ایک دوسرے سے ملتی ہیں لیکن ان کی شخصیت کہیں مختلف ہوتی ہے"

جب وہ واپس آرہا تھا تو اس کا دل سرد تھا بالکل، اسے ذرہ برابر غم نہیں تھا، نہ حسد، نہ ہی رشک تھا نہ غصہ، کچھ بھی نہیں!

اس کے دن اب قہقہوں میں گزرنے لگے، لوگ اسے اب تک شادی کرنے پر مجبور کر رہے تھے، کون کہتا تھا کہ وہ شادی شدہ نہیں! ہر ہفتے وہ سوسائٹی کی ایک حسین تتلی سے عارضی شادی کرتا اور پھر جی اکتا جانے پر چند دنوں میں اسے طلاق دے دیتا اور پھر کوئی اور شعلہ اس کے پہلو کو گرما رہا ہوتا، اب اسے کسی سے بھی شکوہ نہیں تھا، اس کے دل میں اتنا سا بھی انس نہیں تھا، نہ اسے کسی سے محبت تھی اور نہ نفرت، محبت کے لفظ کو تو وہ بھول ہی چکا تھا، وہ سوچا کرتا کہ محبت میں ہوتا ہی کیا ہے آخر؟ ایک دوسرے سے کیا چاہتے ہیں؟ ایک جنسی تصادم، جس کے لئے الفاظ تراشے جاتے ہیں، باتیں بنائی جاتی ہیں، عہد و پیمان ہوتے ہیں، اور جب وہ تصادم ہو چکتا ہے تو پھر باسی اور فضول سی زندگی شروع ہو جاتی ہے، دل سرد ہو جاتا ہے، امنگوں پر اوس سی پڑ جاتی ہے، رنگین خواب پھیکے پڑ جاتے ہیں، اور ——! اسے ہر روز نئی محبت میسر تھی، ایک نیا جسم، نئے رخسار، نئے ہونٹ، نئی باتیں نئی ادائیں، کون سی چیز پرانی تھی —— سب کچھ ہی تو نیا تھا۔

جب کوئی حسین مجسمہ اس کے بازوؤں میں ہوتا اور اس کی انگلیاں اس کی زلفوں سے کھیل رہی ہوتیں تب ایک کمزور سا خیال اس کے تاریک دماغ میں تلملاتا جیسے کوئی حقیر قیدی مضبوط بیڑیوں میں جکڑا ہوا آزادی کیلئے بے سود کوشش کرے، اور وہ خیال کیا ہوتا؟ —— وہ اسے پہلی محبتوں کا واسطہ دے کر گڑگڑاتا —— اور اس کی التجا کرتا کہ "او نابکار انسان! تو اپنی روح کو کچل رہا ہے، تو نے جی بہلانے کا غلط طریقہ اختیار کیا ہے، تو جہنم میں پڑا کراہ رہا ہے اور تیرے ہونٹوں پر بناوٹی تبسم ہے، وہ تیرے دل کی پاکیزگی کیا ہوئی؟ کہاں گئے وہ نیک خیالات؟ وہ تیری معصومیت؟" مگر وہ اس صدا کو بے پروائی سے سنتا اور سنی ان سنی کر دیتا، اب تو اس نے خود اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹ ڈالا تھا —— بجائے کچھ اثر ہونے کے اس میں حیوانیت عود کر آتی اور وہ اسے اپنی آغوش میں اس زور سے بھینچتا، جیسے اپنے سینے میں جذب کرنا چاہتا ہو، وہ اس کے ہونٹوں کو چوس ڈالتا، رخساروں کو مسل ڈالتا، اس کی آنکھوں میں شعلے ناچ رہے ہوتے اور اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکا پھیکا تبسم ہوتا —— شاید منتقمانہ تبسم! —— اور پھر وہ تھک کر گر پڑتا، کوئی رات اس نے اکیلے نہیں گزاری —— دن گزر رہے تھے —— ہفتے —— مہینے —— سال بیتے جا رہے تھے، اب اس کے بال سفید ہوتے جاتے تھے، چہرے کی خوبصورت اور چکنی کھال پر اب چھوٹی چھوٹی جھریاں پڑ گئی تھیں، بڑی بڑی روشن آنکھیں اندر کو دھنستی جا رہی تھیں، کئی بار اسے محسوس ہوتا کہ جب وہ کسی جسم کو گود میں لیکر چلتا تو اس کے قدم ڈگمگانے لگتے اس کی ٹانگیں کانپنے لگتیں، وہ شراب کا ایک جام اور چڑھا جاتا —— شاید بڑھاپا آگیا تھا —— آثار ہے، اب وہ مبہم سا خیال جو اس کے دماغ میں چیختا تھا، اس کی پکار بھی اب بند ہو گئی تھی، اس کے اعزازات اور شہرت میں کئی بار ترقی ہوئی اور ساتھ ہی اس کی حیوانیت میں بھی، شاید اسے پتہ چلا تھا کہ اب تھوڑے ہی دن رہ گئے ہیں، جب شمع بجھنے لگتی ہے تو ایک دفعہ چمک کر بھڑکتی ضرور ہے۔

اس نے اپنی جھریوں سے بھرے ہوئے چہرے پر رومال پھیرا جس سے چہرے پر لگا ہوا رنگ و روغن اتر آیا، سامنے سرو کے درختوں کے پیچھے آسمان پر روشنی موجیں لے رہی تھی، ایک درخت کی آڑ میں سے ایک نوکدار چیز جھانک رہی تھی —— نیا نیا چاند تھا، آج وہ اتنے دنوں کے بعد اسے ڈبڈبائی نظروں سے دیکھ رہا تھا، یا وہ کبھی جوانی کے شروع میں اس طرح دیکھا کرتا جب اس کے دل میں محبت کی امنگیں اور خوشیاں ناچا کرتیں، ورنہ باقی دنوں میں تو اس نے کبھی چاند کو دیکھا ہی نہیں، اسے کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی، مگر آج اسے ہو کیا گیا تھا؟ ایک ناکام محبت کو دیکھ کر اس کا دل کیوں بے چین تھا، ایسے خیالات تو اسے اس طویل وقفے میں کبھی نہیں آئے، اسے محسوس ہونے لگا کہ گناہ سے ملوث دل میں جو تقریباً سارا سیاہ ہو چکا تھا ایک گوشے میں پرانی یاد مدفون تھی، جو آہستہ آہستہ بیدار ہو رہی تھی، مگر اب اس بیداری کا فائدہ؟ اب تو بہت دیر ہو چکی تھی،

نیا نیا کانپتا ہوا چاند، ٹہنیوں سے جھانکتا ہوا آسمان میں تیر رہا تھا، کبھی اس کا دل تڑپا کرتا کہ کسی کا سر اس کے کندھوں پر ہو اور وہ دونوں چاند دیکھ رہے ہوں —— مگر ایسا کبھی نہ ہوا، شاید کبھی ایسا ہو جاتا تو آج اس کی زندگی اس قدر ویران نہ ہوتی، وہ قہقہوں میں رہ کر بھی اداس رہتا تھا، اتنی ہستیوں کو اپنے گرد پا کر بھی بالکل تنہا تھا، اس کا دل سکون سے بیگانہ تھا، ہر روز وہ نئی نئی لڑکیوں سے محبت جتلاتا تھا، انھیں سبز باغ دکھایا کرتا، جیسے کبھی کسی نے اسے دکھائے تھے، وہ جھوٹے عہد و پیمان کرتا، جیسے اس کے ساتھ کئے گئے تھے اور پھر جی اکتا جانے پر اس کے نازک دل کو پاش پاش کر ڈالتا، اور پھر قہقہے لگاتا، جیسے اس نے فطرت سے انتقام لے لیا ہو، مگر ہمیشہ اس کی روح میں

ایک خلا رہا، جو روز بروز بڑھتا چلا گیا، اب اس کی زندگی ایک ویران صحرا کے مانند تھی، جس میں تپتے ہوئے ذرات نے اڑ اڑ کر سورج کی کرنوں کو چھپا رکھا تھا، جہاں ہر وقت ایک کثیف سا غبار چھایا رہتا، جہاں بگولے اٹھتے، سیاہ آندھیاں چلتیں، ویرانی چیخیں مارتی، دہکتی ہوئی گرم ہوا کے جھکڑ آتے اور ریت کے تودوں کو اڑا کر لے جاتے ـــــ جہاں زندگی کی کوئی علامت نہیں تھی چاروں طرف ایک سکون تھا، ایک ناگوار سا جمود۔

کچھ بھی ہو مگر اب اتنی دیر کے بعد اسے ایسے خیالات کیوں آ رہے تھے؟ اس کا پتھر سے زیادہ سخت دل ملائم کیوں ہو رہا تھا؟ محض ایک ناکام آرزو کو دیکھ کر اسے اپنی پرانی باتیں یاد آ گئی تھیں۔ بھلا ان آنسوؤں میں نئی بات ہی کون سی تھی؟ نہ جانے وہ خود کس قدر رویا تھا؟ روتے روتے ہلکان ہو جایا کرتا ـــــ اس قدر روتا کہ اسے ڈر لگنے لگتا کہ کہیں اس کا دل آنسوؤں کے ساتھ باہر نہ نکل آئے۔ مگر اس کے ساتھ تو کسی نے ہمدردی نہیں جتلائی، اور جب سے اس نے فطرت سے انتقام لینا شروع کیا، اور گناہ کی زندگی شروع کی، وہ کبھی نہیں رویا، ـــــ اس نے دل میں حساب لگایا، پورے پچیس سال سے وہ کبھی نہیں رویا تھا، اس نے اتنے طویل عرصے تک ایک آنسو تک نہ بہایا تھا، اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے جھکے ہوئے سر کو تھام لیا، اس کا دل خود بخود بیٹھا جا رہا تھا، اس اداس نوجوان کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اس کے سامنے پھر رہی تھیں، جن میں سے چمکدار آنسوؤں کے قطرے ٹپ ٹپ گر رہے تھے ـــــ آہ، ناکام محبت کے آنسو، کتنے قیمتی ہوتے ہیں؛ روح کی بیقراری کے راز داں، دل کی جلن کے رفیق، ناکام آرزو کے پاس سوائے آنسوؤں کے اور رہتا ہی کیا ہے؟

"حضور ـــــ!" شوفر نے اسے چونکا دیا،

"کیا ہے ـــــ؟"

"حضور ـــــ! مس صاحبہ اتنی دیر سے کوٹھی میں آپ کا انتظار کر رہی ہیں ـــــ کہتی ہیں کہ ـــــ"

"ان سے کہدو، میں آج نہیں آؤنگا ـــــ تم انھیں ان کے گھر چھوڑ آؤ ـــــ"

"حضور اگر وہ تو ـــــ!"

"بس چلے جاؤ ـــــ"

تنہا ہو کر اس نے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ـــــ پھر رومال آنکھوں پر ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ـــــ جیسے کوئی پرانا آتش فشاں پہاڑ جو مدت سے ٹھنڈا رہا ہو یکلخت پھٹ پڑے۔ اس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں سے آنسوؤں کا دھارا بہہ رہا تھا؛ اس کے چہرے کی جھریوں پر آنسو پھسلتے ہوئے زمین میں جذب ہو رہے تھے۔ جب وہ ٹھہر ٹھہر کر سسکیاں لیتا تو اس کا سارا جسم کانپ اٹھتا، چاندنی، باغ کی پتی پتی پر ناچ رہی تھی، ہوا کے سرد جھونکوں سے ٹہنیاں جھوم رہی تھیں، دور کسی درخت پر بلبل اپنے محبوب سے شکوے کر رہی تھی، چکور چاند کی جانب اڑا جا رہا تھا۔ اور چاند اس کی اس حماقت پر مسکرا رہا تھا، ایک مرجھایا ہوا ـــــ تھکا ہوا تنہا انسان بیٹھا ہوا اپنی زندگی کا مرثیہ پڑھ رہا تھا ـــــ ہائے یہ امنگوں کے سبز باغ! ـــــ انسانی خیالات کے ہوائی قلعے، آہ یہ محبت کے پھیکے خواب! نہ معلوم اس نے وہ رات کس کرب میں گزاری؟ ـــــ وہ کتنی بار جہنم میں جھونکا گیا؟ کتنی مرتبہ اس کے دل کو مسلا گیا؟ ناکامی کا بھوت جو عمر بھر اس کے ساتھ رہا تھا اسے گھسیٹ کر کیسے کیسے محشرستانوں میں لے گیا ـــــ اس پر کیسی کیسی قیامتیں گزر گئیں؟ ـــــ اس کی روح کو کیسی کیسی ایذائیں پہنچائی گئیں ـــــ؟

جب وہ رات کے پچھلے پہر باغ سے اٹھ کر اپنے کمرے میں جانے لگا تو اس کا سر بھاری ہو گیا تھا ـــــ سوجی ہوئی آنکھیں دھندلی ہو گئی تھیں ـــــ جیسے کسی نے ان کا نور چھین لیا ہو ـــــ قدم لڑکھڑا رہے تھے، ہاتھ کانپ رہے تھے، ـــــ پژمردہ دل بڑی آہستگی سے دھڑک رہا تھا ـــــ جیسے اب تھک گیا ہو، ـــــ ایک نورانی تارا ٹوٹا ـــــ اور سارے آسمان کو طے کرتا ہوا ـــــ روشنی کی لکیر چھوڑتا ہوا، حد افق میں غایب ہو گیا ـــــ!

معشوقۂ فرنگ کا اردو ترجمہ
علامہ جرجی زیدان [illegible] تاریخی ناول [illegible]
[illegible]

پھول والی

نظم

جناب سید مقبول حسین احمدپوری

گئے کل جو بازار ہم ہاتھ خالی، — نظر آئی اک ماہوش پھول والی
بڑی شوخ چنچل، انوکھی نرالی — بڑے ٹھاٹھ ٹھسّے کی اور چاؤ والی
وہ بوٹا سا قد اور ہونٹوں پہ لالی — وہ کاندھے پہ بالوں کی لٹ کالی کالی
وہ گالوں پہ ہلکے سے ابرے کے ریزے — وہ سیندور کی مانگ جی لینے والی
وہ ماتھے پہ جگنو کا چھوٹا سا ٹیکہ — وہ کانوں میں کیلیں نہ بندے نہ بالی
وہ دو چندر ماں جھانکتے ڈوپٹے سے — ڈھلکے جن کو محرم کی اوندھی پیالی
پپوٹوں میں سرمہ نگاہوں میں جادو — کلائی پہ گدنا کمربند جالی
جڑاؤ دوپٹے کے سلمے ستارے — چمکتے تھے جیسے رچی ہو دوالی
کمر میں لچک اور ٹھمک ہر قدم پر — لئے اک ہتھیلی پہ پھولوں کی تھالی
کہا میری بہنی کرو پھول لے لو — یہ کہہ کر مری آنکھ میں آنکھ ڈالی
گیا میں جھجک جیسے چمکی ہو بجلی — مگر جلد ہی اپنی حالت سنبھالی
ٹٹولی بصد یاس جیب اپنی میں نے — نہ تھا اور کچھ اک چونّی نکالی
مگر گر پڑی چھوٹ کر انگلیوں سے — جھکی وہ بڑے ناز سے اور اٹھا لی
کہا لایئے مجھکو رومال دیجے — کروں اپنی تھالی کو میں آج خالی
کہا میں نے اتنے بہت کیا کرونگا — تو کہنے لگی ہنسکے یہ پھول والی
چونّی کا سودا چونّی برابر — مجھے آپ سمجھیں نہ بازار والی
مجھے اس سے لینے پڑے پھول سارے — خدا جانے کیوں بات اس کی نہ ٹالی
غریبوں کی جیبوں میں گنتی کہاں تھی — جو کرتے نچھاور یہ جذبات عالی
مگر میں نے چھوڑا نہ اس کو یہیں تک — نگاہوں سے ہر آن اس کی اڑا لی
تصوّر میں پھرتی ہے تصویر اب تک — یہ تصویر لفظوں کے سانچے میں ڈھالی
اسے نظم کے گچھے میں لگا کر — سجائی ہے ہم نے بھی پھولوں کی ڈالی

یہ شاعر کا سودا ہے شاعر خریدے
اگر ہو نہ شاعر تو بن جائے مالی

ابو قطیفہ

پہلی صدی ہجری کا ایک غیر معروف محبِ وطن عرب شاعر

از جناب طالوت

نزولِ قرآن نے عربی ادبیات میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ قرآن کی تحدی اور اس کے فصیحانہ اعجاز کے سامنے ادباءِ عرب کی تعلیاں سب ماند پڑ چکی تھیں۔ حضرت لبیدؓ جو عرب کے منتخب شعراء میں تیسرے یا چوتھے رتبہ کے مالک تھے مسلمان ہو کر قرآن مجید کے اعجاز کے شاہدِ مجسم بن چکے تھے حتیٰ کہ انکی باندانی نے قرآن کی معجزانہ بلاغت کے سامنے ان سے شاعری ترک کرا دی تھی۔ اسلامی انقلاب نے شاعری ایسے بیکار و بیکار انگیز مشغلہ سے دلوں کو اچاٹ کر کے عربوں کو سیاسی اہمیت کی مصروفیات ارزانی فرما دی تھیں۔ ایسے وقت میں حسان بن ثابت اور کعب بن زہیر ایسی مشہور مستثنیٰ ہستیوں کے علاوہ بہت کم ایسے لوگ تھے جن کا مشغلہ شاعری جاری ہو۔ ایسی ہی نادر و کمیاب ہستیوں میں سے ہمارا غیر معروف شاعر ابو قطیفہ بھی ہے۔

نام و نسب

عمرو بن الولید ان کا نام ہے اور بنو امیہ کے مشہور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ امیہ تک ان کا سلسلہ نسب یوں ہے۔ عمرو بن الولید بن عقبہ بن ابی معیط بن ابی عمرو بن امیہ۔ ان کے اجداد میں سے ابو عمرو کے متعلق اختلاف ہے کہ وہ امیہ کے لڑکے تھے یا غلام، دغفل اور دوسرے نسابین عرب کی رائے ہے کہ وہ ان کے غلام تھے اور ان کا نام ذکوان تھا۔ بعد میں امیہ نے عرب کے قاعدہ کے موافق ان کو اپنے خاندان سے ملحق کر لیا تھا مگر خود بنو امیہ کی رائے یہ ہے کہ وہ ان کا بیٹا تھا۔ چنانچہ اس معاملے میں دغفل اور حضرت امیر معاویہؓ کی گفتگو اغانی اور کتب تاریخ میں مذکور ہے۔

ابو معیط

ان کے پردادا ابو معیط کی والدہ ہوازن کی وہ مشہور عورت ہے جس کے متعلق عرب کے مشہور شاعر نابغہ نے یہ شعر کہے ہیں ؎

وَشَارَکْنَا قُرَیْشًا فِیْ تُقَاهَا ۔۔۔ وَفِیْ اَنْسَابِهَا شِرْكَ الْعِنَانِ

بِمَا وَلَدَتْ نِسَاءُ بَنِیْ هِلَالٍ ۔۔۔ وَمَا وَلَدَتْ نِسَاءُ بَنِیْ اَبَانٍ

ان کا نام آمنہ تھا۔ وہ جس طرح ابو معیط کی والدہ تھیں اسی طرح اس کے والد ابو عمرو کی بھی والدہ تھیں یعنی پہلے وہ امیہ کے نکاح میں تھیں اور انکی وفات کے بعد امیہ کے بیٹے ابو عمرو نے جاہلیت کے قانون کے مطابق اسکے ساتھ رشتہ ازدواج قائم کر لیا جس سے ہمارے شاعر کے پردادا ابو معیط عالمِ وجود میں آئے۔

عقبہ بن ابی معیط

ان کے دادا عقبہ بن ابی معیط وہ مشہور و معروف ہستی ہیں جن کی شقاوت کی داستانیں اسلامی تاریخ میں سب سے نمایاں ہیں۔ کعبۃ اللہ میں ایک دن نبی کریم صلعم نماز پڑھ رہے تھے کہ انہیں عقبہ صاحب نے حضورؐ کی گردن میں چادر ڈال کر گلا گھونٹ دینے کی کوشش کی تھی تاکہ خدا کا نور ہمیشہ کیلئے بجھ جائے۔ اتنے میں حضرت ابو بکرؓ تشریف لے آئے اور انہوں نے اسے دھکیل کر پیچھے ہٹایا اور فرمایا اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰهُ۔ تم ایسے آدمی کو قتل کرنا چاہتے ہو جو صرف اللہ کو اپنا رب کہتا ہے؟

بدر کی لڑائی میں دوسرے محبوسین بدر کے ساتھ ایک یہی عقبہ بھی تھا جن کو خدا کے حکم کے موافق قتل کر دیا گیا تھا۔

ولید بن عقبہ

ان کے والد ولید بن عقبہ حضرت عثمان بن عفان کے مادری بھائی تھے۔ اس لحاظ سے ابو قطیفہ حضرت عثمانؓ کے بھتیجے ہیں۔ ولید کی والدہ اروی ام حکیم البیضا کی لڑکی ہیں۔ یہ ام حکیم وہ لڑکی ہے جو حضور خواجہ دوسرا صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبداللہ کے ساتھ توام پیدا ہوئی تھی۔ اس نسبت سے ابو قطیفہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی کے لڑکے ہوتے ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت میں ان کا باپ ولید کوفہ کا گورنر تھا۔ اسکی شراب خواری، نماز میں زیادتی، پھر معزولی اور شراب خواری کی سزا تاریخ اسلامی کا مشہور ترین واقعہ ہے جو تاریخ سے ادنیٰ مس رکھنے والوں سے بھی پوشیدہ نہیں۔

عنابس و اعیاص

ابو قطیفہ نسباً بنو امیہ کے گروہ عنابس سے تعلق رکھتے ہیں۔ اصل میں امیہ کے گیارہ لڑکے تھے اور یہ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک کو اعیاص کا نام دیا گیا اور دوسرے کو عنابس کا۔

عاص، ابو العاص، عیص، ابو العیص اور عویص کو اور انکی اولاد کو اعیاص کہتے ہیں۔ اور حرب، ابو الحرب، سفیان، ابو سفیان، عمرو اور ابو عمرو کو اور انکی اولاد کو عنابس کہتے ہیں۔ عنابس عنبسۃ کی جمع ہے اور عنبسہ عربی میں شیر کو کہتے ہیں۔ چونکہ موخر الذکر لوگ عکاظ کی لڑائی میں اپنے بھائی حرب کی طرف سے ثابت قدمی سے شجاعانہ لڑے تھے اس واسطے عنابس کے نام سے مشہور ہوئے۔ بعض اوقات اعیاص کے مقابلہ میں انہیں آل حرب بھی کہدیا جاتا ہے۔ اسی زمانہ کے مشہور شاعر عبد اللہ بن فضالۃ الاسدی نے اپنے اس مشہور قصیدہ میں جس میں اس نے مسرفانہ عطایا سے نا امیدی کی بنا پر حضرت عبد اللہ ابن زبیر کی ہجو کی ہے ان دو گروہوں کا ذکر کیا ہے جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

اَقُولُ لِغِلْمَتِیْ شُدُّوْا رِکَابِیْ	اُجَاوِزُ بَطْنَ مَکَّۃَ فِیْ سَوَادٖ
فَمَالِیْ حِیْنَ اَقْطَعُ ذَاتَ عِرْقٍ	اِلَی ابْنِ الْکَاھِلِیَّۃِ مِنْ مَعَادٖ
سَیُبْعِدُ بَیْنَنَا نَصُّ الْمَطَایَا	وَتَعْلِیْقُ الْاَدَاوِیْ وَالْمَزَادٖ
وَکُلُّ مُعَبَّدٍ قَدْ اَعْلَمَتْہُ	مَنَاسِمُھُنَّ طَلَاعَ النِّجَادٖ
اَرَی الْحَاجَاتِ عِنْدَ اَبِیْ خُبَیْبٍ	نَکِدْنَ وَلَا اُمَیَّۃَ فِی الْبِلَادٖ
مِنَ الْاَعْیَاصِ اَوْ مِنْ آلِ حَرْبٍ	اَغَرُّ کَغُرَّۃِ الْفَرَسِ الْجَوَادٖ

جن کا مطلب یہ ہے کہ:- میں نے اپنے غلاموں کو تیاری کا حکم دیا کہ راتوں رات بطن مکہ کو عبور کر جاؤں۔ جب ابن الکاہلیۃ کی طرف جاتے ہوئے ذات عرق سے گذرتا ہوں تو میرا کوئی مرجع نہیں ہوتا۔ عنقریب سواریوں کی تیز رفتاری، سامان کی بندش اور راستے کی مسافت ہمیں ایک دوسرے سے دور کر دیگی۔ ابو خبیب کے پاس تو ضرورتیں پوری ہونیسے رہیں۔ افسوس کہ بنو امیہ (اعیاص اور آل حرب) میں نہیں جو بہترین گھوڑوں کی روشن پیشانی سے بھی زیادہ چمکدار ہیں۔

ع ۵ ابن الکاہلیۃ اور ابو خبیب سے مراد حضرت عبد اللہ ابن زبیر ہیں۔ ویسے تو ان کی کنیۃ ابو بکر تھی مگر ہجو میں ہمیشہ انکو ابو خبیب کہا گیا۔ اسی طرح ابن الکاہلیۃ بھی بطور گالی کے استعمال ہوا ہے۔ حضرت ابن زبیر کو جب شعر پہنچے تو فرمایا۔ اس نے سمجھا کاہلیۃ میری بدترین نانی ہے۔ اس واسطے مجھے اسکی طرف منسوب کیا حالانکہ وہ اسکی بہترین پھوپھی بھی ہے۔ سبحان اللہ کیا جامع و مانع جواب ہے۔ ۱۲ منہ

تاریخ ولادت، عمر اور وفات

تاریخ ولادت تو عموماً بہت کم لوگوں کی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ بوقت ولادت بچے کی آئندہ خوبیوں کے متعلق عدم علم کی بنا پر تاریخ کے تحفظ کا بہت کم رواج ہے۔ اس پر طرّہ ہماری پرانی ادبی اور تاریخی کتابوں کا عدم اعتنا ہے، اس لئے اگر ابو قطیفہ کی تاریخ ولادت نہ ہو تو جائے تعجب نہیں۔ مگر ان بیچارے کی تو تاریخ وفات کا بھی علم نہیں۔ حالانکہ عموماً کتابوں میں تاریخ وفات کے تذکرے مل جاتے ہیں۔ یہ تذکرہ نہ بھی ہو تب بھی عموماً یہ لکھا ہوا مل جاتا ہے کہ اسکی کل عمر اتنی تھی یا فلاں واقعے کے وقت وہ اتنے سال کے تھے۔ مگر ہمارے شاعر کے متعلق ایسے اشارات میں سے کوئی بھی اشارہ موجودہ کتب میں موجود نہیں۔ تاہم قیاس یہ کہتا ہے کہ ان کی وفات تقریباً سنہ ۷۱ یا سنہ ۷۲ھ میں ہوئی ہے۔ فتح عراق کے وقت (جیسا کہ آگے آئیگا) وہ عبد الملک بن مروان کے پاس موجود تھے۔ اس کے بعد حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ نے انہیں واپسی مدینہ کی اجازت عطا فرمادی تھی اور وہ واپسی پر راستے ہی میں لقمۂ اجل ہو گئے۔ عراق سنہ ۷۱ ہجری میں فتح ہوا۔ اور حضرت ابن زبیر سنہ ۷۳ھ میں شہادت پاتے ہیں تو ضروری طور پر انکی وفات سنہ ۷۱ یا سنہ ۷۲ھ میں ہوئی۔ عبد الملک اور انکی آپس میں چونکہ صفائی نہیں تھی اس واسطے قیاس چاہتا ہے کہ وہ فوراً وہاں سے چلے گئے ہونگے۔ اگر یہ قیاس صحیح ہو تو بالیقین یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ سنہ ۷۱ھ میں فوت ہوئے۔ جب تاریخ ولادت معلوم نہ ہو تو نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے کتنی عمر پائی۔ البتہ صرف قیاس کا دروازہ کھلا ہے۔ حضرت عثمانؓ سنہ ۲۴ھ میں خلیفہ مقرر ہوئے۔ اس کے ایک سال بعد سنہ ۲۵ھ میں انہوں نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو عراق کی ولایت سے معزول فرما کر ابو قطیفہ کے والد ولید بن عقبہ کو اپنا نائب مقرر فرمایا۔ ابو قطیفہ نے اپنی جوانی دیوانی کے متعلق جو شکایتی خط اپنے والد کو لکھا (جیسا کہ آگے آئیگا) اگر وہ اسی سال کا فرض کر لیا جائے اور انکی عنفوان شباب کی عمر بھی اس وقت بیس اکیس برس سمجھ لی جائے تو انکی عمر کا اندازہ تقریباً پینسٹھ چھیاسٹھ برس لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس قدر عمر میں ان کا سرمایۂ شاعری اتنا ہی تھوڑا ہو جو ہم تک پہنچا ہے۔ اس بات کو عقل تسلیم کرنے سے قاصر ہے۔

سوانح حیات اور شاعری

عرب شعراء (خصوصاً متقدمین) کی حیات و احساسات چونکہ علیحدہ نہیں تھے، اس واسطے انکی زندگی اور انکی شاعری کو علیحدہ علیحدہ بیان نہیں

کیا جا سکتا۔ روزمرہ جو واقعات پیش آتے ہیں وہ انہیں کے متعلق عموماً اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ متاخرین میں سے پیشہ ور مداحوں کو علیحدہ کر دیا جائے تو عرب شعراء کی یہ عمومی خصوصیت ہے۔ بلکہ جہاں تک واقعات کا تعلق ہے ہم قدیم عرب شعراء کے ان ہی واقعات سے باخبر ہیں جن کا ذکر انہوں نے خود اپنے کلام میں کیا ہے۔ اور اس کے علاوہ انکی حیات کے متعلق بہت کم واقعات ہماری کتابوں میں ملتے ہیں اور ایسی سوانح جو کسی شاعر کے اپنے کلام سے مرتب کیجائے جسقدر مستند ہو گی اس کا اندازہ ناظرین خود لگا سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کا درجہ تو تقریباً خود نوشت سوانح کا ہو گا چنانچہ ابو قطیفہ کی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ انکا کلام بھی ہم پیش کرتے جائیں گے۔ جن سے آپ ان کی شاعری کی نوعیت، ان کی حُبّ الوطنی اور ان کے کلام کے محاسن کے متعلق اندازہ کر سکیں گے۔ عرب شعراء میں سے بہت کم لوگوں کا دامن ہجو سے پاک ہے اور اس کی بھی وجہ وہی ہے کہ انکی شاعری "فن بحیثیت فن" کے لئے نہیں بلکہ واقعات زندگی کے ساتھ ملحق و متعلق ہے۔ اور ہر شخص کی زندگی میں بارہا ایسے مواقع آتے ہیں کہ وہ دوسروں سے رنجیدہ ہو یا اپنی رائے کو دوسروں کی رائے پر ترجیح دیتا ہو ایسے مواقع پر اگر دوسروں کے معائب کا ذکر ہو جائے یا انکی تنقیص کا بیان ہو جائے تو اسے اصطلاحی الفاظ میں ہجو ہی کہیں گے۔ چنانچہ ابو قطیفہ کا دامن بھی اس داغ سے پاک نہیں ہے۔ مگر ان کا لہجہ ہجو میں بھی فحاشی اور سبابی کی حد تک نہیں پہنچا۔ وہ صرف ناراض ہو جانے یا تھوڑی بہت تکلیف پہنچنے پر ہجو نہیں کہنے لگ جاتے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت ہی شریف النفس اور باحوصلہ تھے۔ وہ بنو امیہ میں سے تھے اور عبداللہ ابن زبیرؓ کے آدمیوں نے انہیں مدینہ سے دوسرے بنو امیہ کے ساتھ جلاوطن کر دیا تھا۔ مگر ان لوگوں یا عبداللہ ابن زبیرؓ کے متعلق ان کا ایک لفظ بھی ہجو کا منقول نہیں۔ البتہ انہوں نے عبدالملک بن مروان کی ہجو لکھی ہے اور وہ بھی مجبوراً اس وقت جبکہ ان کی نسب میں کیڑے نکالے گئے اور انکے متعلق نہایت صبر آزما باتیں کہی گئیں۔ غرض ابو قطیفہ ذاتی خصائل و شمائل کے لحاظ سے نہایت ہی شریف النفس، متین، محبّ وطن اور صابر و شاکر آدمی تھے۔ ان کا دامن قومی اور نسلی تعصب سے پاک تھا۔ حالانکہ اس وقت کے سیاسی حالات اس بات کے متقاضی تھے کہ ہر آدمی اموی اور علوی تفرقے کے علائق میں بندھا ہوا تھا۔ انہوں نے ہجو بھی لکھی تو اس میں بھی سوائے ایک آدھ لفظ کے ساتھ خفیف سے اشارے کے اور کوئی چیز قابل گرفت نہیں (جیسا کہ آگے آئیگا) سب سے زیادہ جس خصلت کو ان کی طبیعت اور شاعری میں دخل ہے وہ ان کی پرخلوص حبّ الوطنی ہے حجاز اور مدینہ طیبہ سے وہ والہانہ محبت رکھتے تھے، مدینہ سے علیحدگی پر وہ بہت متاثر ہوئے اور باوجودیکہ بنو امیہ کی سلطنت اور ان کے سب آدمی شام میں تھے لیکن وہ شام آکر خوش نہیں تھے اور بار بار اپنے اشعار میں مدینہ کے مقامات کو دیکھنے اور وہاں جانے کا اشتیاق ظاہر کرتے رہے چونکہ

ع دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

اس واسطے ان کا کلام جب حضرت ابن زبیرؓ تک پہنچا تو انہوں نے انہیں واپس آنے کی اجازت مرحمت فرما دی۔ یہ انکی شاعری کے اثر کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ ابن زبیرؓ شعر و شاعری کو اس قدر فضول سمجھتے تھے کہ ہجو کا حربہ بھی انہیں عطایا کے اجراء پر آمادہ نہ کر سکا۔ مگر ابو قطیفہ کے اشعار سنکر وہ بھی پگھل گئے۔ اور باوجودیکہ وہ بنو امیہ کے کسی آدمی کیلئے رواداری کا جذبہ نہیں رکھتے تھے مگر ابو قطیفہ کے لئے بطور خصوصیت یہ حکم صادر فرمایا کہ وہ واپس آجائے۔ کیونکہ یہاں جذبات میں خلوص تھا اور الفاظ میں اثر، احساسات میں جذب تھا اور نیت میں اخلاص، اور شاید اسی کا نام ہی حقیقی شاعری ہے۔ اب ہم اس مختصر مجموعی رائے کے بعد چند تفصیلی واقعات کا ذکر کرتے ہیں۔

درجوانی، چنانچہ افتد دانی

حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت میں جب ابو قطیفہ کے والد کوفہ کے گورنر تھے۔ ابو قطیفہ وادیٔ شباب سے گذر رہے تھے۔ اور ان پر جوانی کے کیف آور جذبات کا ہجوم تھا طبعی زہد کی وجہ سے گناہ سے خائف تھے۔ چنانچہ اپنے والد کو ان الفاظ کے ساتھ انجام کی برائی سے مطلع کرتے ہیں ؎

مَنْ مُبْلِغٌ عَنِّي الأَمِيرَ بِأَنَّنِي ... أَرِقٌ بِلَا دَاءٍ سِوَى الإِنْعَاظِ
إِنْ لَمْ تُغِثْنِي خِفْتُ إِثْمَكَ أَوْ أُرَى ... فِي الدَّارِ أُحْدَدُ وَابْنُ زُرْقِ لِحَاظِ

ترجمہ:- میری طرف سے امیر (ولید بن عقبہ) کو کوئی یہ پیغام پہنچا دے کہ میں بغیر کسی ظاہری بیماری کے علیل ہوں یعنی بیمار شباب ہوں اگر آپ نے فریاد رسی نہ کی تو مجھے گناہ کا خوف ہے یا پھر اپنے آپ کو حضرت عثمانؓ کے دار الحدود میں محبوس پاؤں گا۔

آپ ان کے حسن طلب اور ندرت بیان کی داد دیجئے کہ نکاح کی ضرورت کو کن شاندار الفاظ کے ساتھ ظاہر کیا۔ باپ ان الفاظ سے متاثر ہوا اور اس نے کوفہ ہی سے ان کے نکاح کا انتظام کر دیا۔

طلاق و فراق

اغانی کی روایت ہے۔ کہ ایک بار ابو قطیفہ کی اپنی عورت اُمّ عمرو سے کچھ ان بن ہو گئی۔ بغیر سوچے سمجھے غصے میں نوبت طلاق تک

پہنچ گئی۔ عورت چونکہ عراق کی تھی اس واسطے اس سے اہل عراق میں سے ایک آدمی نے نکاح کر لیا اور اُسے واپس عراق کی طرف لے گیا۔ ابو قطیفہ کا جب غصہ فرو ہوا تو اسے اپنے فعل پر بہت ندامت ہوئی۔ جوں جوں دن گذرتے گئے یہ اُس کے فراق میں گھلنے لگے ذیل کے الفاظ میں اس نے اپنی ناکام آرزوؤں کو جامۂ اظہار دیا ؎

فَیَا اَسَفَا لِفَرْ قَۃِ اُمِّ عَمْرٍو ۔۔۔ وَرِحْلَۃِ اَھْلِھَا نَحْوَ الْعِرَاقِ
فَلَیْسَ اِلٰی زِیَارَتِھَا سَبِیْلٌ ۔۔۔ وَلَا حَتَّی الْقِیَامَۃِ مِنْ تَلَاقِ
وَعَلَّ اللّٰہُ یَرْجِعُھَا اِلَیْنَا ۔۔۔ بِمَوْتِ حَلِیْلٍ اَوْ طَلَاقِ
فَاَرْجِعَ شَامِتًا وَتَقَرَّ عَیْنِیْ ۔۔۔ وَیَجْمَعَ شَمْلُنَا بَعْدَ افْتِرَاقِ

ترجمہ:۔ ام عمرو کے فراق اور عراق کی طرف اسکی رحلت پر انتہائی تأسف ہے۔ اب قیامت تک اسکی مُلاقات اور زیارت کی کوئی امید نہیں۔ خدا کرے شوہر کی موت یا طلاق کے سبب وہ واپس آ جائے تا کہ فراق کے بعد وصال کی نوبت آنے پر میری آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور میری گذشتہ مسرت عود کر آئے۔

سعید بن عثمان کا مرثیہ

سعید بن عثمان حضرت معاویہؓ کی جانب سے خراسان کے دیسرائے تھے۔ وہ وہاں سے واپسی پر سمرقند کے کچھ غلام بھی ساتھ لائے تھے، جو عموماً مدینہ سے باہر ایک باغ میں کام کیا کرتے تھے۔ ایکدن انہوں نے موقع پا کر سعید بن عثمان پر حملہ کر دیا اور انہیں شہید کر ڈالا۔ ابو قطیفہ انکی شہادت سے بہت متاثر ہوئے اور ان کا نہایت ہی زوردار مرثیہ لکھا جس کا مشہور مطلع یہ ہے ؎

یَا عَیْنُ جُوْدِیْ بِدَمْعٍ مِنْکَ تَھْتَانَا ۔۔۔ وَابْکِیْ سَعِیْدَ بْنَ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَا

ترجمہ:۔ اے آنکھ موسلادھار آنسوؤں کی سخاوت کر تا کہ میں سعید بن عثمان ابن عفان کو رووں۔

مطلع کے اُٹھان سے معلوم ہوتا ہے کہ مرثیہ نہایت ہی دردناک اور زوردار ہوگا۔ مگر افسوس کہ ہم تک اس کے بہت ہی تھوڑے شعر پہنچے۔

جلاوطنی، واپسی اور موت

سنہ ۶۱ھ میں جب شہادتِ حسینؓ کا واقعۂ ہائلہ ہو چکا تو حق کی علمبرداری حضرت عبداللہ ابن زبیر کے حصہ میں آئی۔ دو ایک سال تک تقریباً وہ حق کی تبلیغ، نشر و اشاعت اور تیاری میں مشغول رہے سنہ ۶۴ھ میں انہوں نے اپنی خلافت حقہ کا اعلان فرمایا، مکہ، مدینہ اور عراق و خراسان نے ان کی خلافت کو تسلیم کر لیا۔ اور مدینہ کے لوگوں نے تو بنو امیہ کے خلاف انتہائی مظاہرے بھی کئے حتیٰ کہ لوگ مسجد نبویؐ میں جمع ہو گئے اور ان میں کسی نے کہا کہ میں نے یزید کی بیعت کا جوا اپنی گردن سے ایسے اُتار ڈالا جیسے یہ پگڑی۔ اور پگڑی اُتار کر زمین پر دے ماری۔ بس پھر کیا تھا لوگوں نے پگڑیاں، کپڑے اور موزے وغیرہ اُتار اُتار کر پھینکنے شروع کر دیے اور ساتھ ہی یہ کہتے گئے کہ ہم نے اسکی بیعت کو یوں اُتار ڈالا جیسے یہ کپڑا، جیسے یہ موزا وغیرہ وغیرہ۔ غرض اس طرح سے کپڑوں، موزوں اور دوسری چیزوں کا ایک ڈھیر جمع ہو گیا۔ اور جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ گویا کپڑوں کے ساتھ بیعت کا کوئی خصوصی تعلق تھا اور اب یہ لوگ اس تعلق کو اپنے اجسام پر مجسم لعنت خیال کر کرکے اس کے اُتار پھینکنے میں مصر ہیں۔ اسی پُر جوش اجتماع نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ بنو امیہ کے جتنے آدمی ہیں اُن سب کو بلا استثناء اس بلدۂ طیبہ سے خارج کر دیا جائے چنانچہ ان سب کو جمع کیا گیا اور اس شرط پر انکی جان بخشی کی گئی کہ جاتے ہوئے اگر انہیں یزید کا کوئی لشکر مدینہ کی طرف آتا ہوا ملے تو وہ اسے واپس کر دیں، واپس نہ کر سکیں تو کم از کم اس کے ساتھ مل کر اہل مدینہ سے لڑنے کے لئے واپس نہ آئیں۔ حلف و تحلیف کے بعد ان سب کو وہاں سے روانہ کر دیا گیا۔ اسی قافلہ میں ہمارا شاعر ابو قطیفہ بھی تھا۔ مدینہ سے جدا ہوتے وقت اس نے اپنے یہ مشہور تاریخی شعر کہے ؎

بَکٰی اُحُدٌ لَمَّا تَحَمَّلَ اَھْلُہٗ ۔۔۔ فَکَیْفَ بِذِیْ وَجْدٍ مِنَ الْقَوْمِ آلِفِ
مِنْ اَجْلِ اَبِیْ بَکْرٍ جَلَتْ عَنْ بِلَادِھَا ۔۔۔ اُمَیَّۃُ وَالْاَیَّامُ ذَاتُ تَصَارُفِ

ترجمہ:۔ ہمارے کوچ پر غیر ذی حس پہاڑ (احد) بھی رو دیا۔ پھر محبت کرنے والے غمزدہ دل کس طرح نہ روتے۔ نیرنگیٔ زمانہ دیکھئے کہ ابو بکر (ابن زبیر) کی وجہ سے بنو امیہ اپنے گھروں سے جلاوطن کئے جا رہے ہیں۔

پھر اپنے غم کو کم کرنے کیلئے شام کی طرف اپنا شوق ظاہر کرتے ہیں مگر ان کا دلی اشتیاق الفاظ و اصوات کی تلخیوں سے ظاہر ہو رہا ہے ؎

بَکٰی اُحُدٌ لَمَّا تَحَمَّلَ اَھْلُہٗ ۔۔۔ فَسَلْعٌ، نَدَارٌ لِلنَّبَالِ الْمُصَنَّتِ تَصَدَّعُ
وَبِالشَّامِ اِخْوَانِیْ وَجُلُّ عَشِیْرَتِیْ ۔۔۔ فَقَدْ جَعَلَتْ نَفْسِیْ اِلَیْھِمْ تَطَلَّعُ

ترجمہ:۔ احد ہمارے کوچ پر رو دیا اور دوسرے امکنہ غم کے مارے پھٹ گئے۔ میرا سارا کنبہ اور بھائی بند شام میں ہیں اور میرا دل انکی طرف کھنچا جاتا ہے۔

جدائی واقعی ایسی سخت چیز ہے کہ پتھروں کی غلظت و سختی بھی اس کے سامنے ہیچ ہے۔ اِس حقیقت کو کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن پہ

بیتی ہو۔ کسی نے کیا اچھا کہا ہے ؎

از سنگ گریہ خیزد وقتِ وداعِ یاراں بگذار تا بگریم چوں ابرِ نو بہاراں
با ساربان بگوئید احوالِ اشکِ چشمم تا بر شتر نہ بندد محمل بروزِ باراں

شام میں پہنچکر ان کی حُبُّ الوطنی نے اور جوش مارا اور انہوں نے نہایت دردناک شعر کہنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ ان میں سے بعض پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱)

الا لیت شعری ہل تغیر بعدنا قباء وہل زال العقیق وحاضرہ؟
وہل برحت بطحاء قبر محمد اراہط غر من قریش تباکرہ؟
لہم منتہی حبی وصفو مودتی ومحض الہوی منی وللناس سائرہ

ترجمہ:۔ کاش میں جان سکتا کہ ہمارے بعد قبا اور عقیق وغیرہ میں کچھ تغیر تو نہیں آ گیا؟ کیا سویرے سویرے آنیوالے قریش کے روشن جبین گروہ قبر محمدؐ کو چھوڑ کر تو نہیں گئے؟ میری انتہائی محبت، پُرخلوص مودت اور والہانہ عشق صرف وہیں کے لوگوں کے لئے ہی مخصوص ہے۔

(۲)

لیت شعری واین منی لیت اعلی العہد یلبن فبرام
ام کعہدی العقیق ام غیرتہ بعدی الحادثات والایام
وباہلی بدلت عکا ولخما وجذاما واین منی الجذام
وتبدلت من مساکن قومی والقصور التی بہا الآطام
کل قصر مشید ذی اواش یتغنی علی ذراہ الحمام
اقر اسنی السلام ان جئت قومی وقلیل لہم لدی السلام

ترجمہ:۔ کاش میں جان سکتا اور اب تو جان سکنے کے لائق بھی نہیں ہوں) کہ یلبن، برام اور عقیق ویسے ہی ہیں جیسے پہلے تھے یا زمانے کے حوادث نے انہیں متغیر کر دیا۔ مجھے میرے اہل وعیال کے قبائل عک لخم اور جذام یہاں ملے ہیں۔ بھلا میرا جذام سے کیا کام؟ میرے قومی مساکن اور وسیع محلات کے بدلے یہاں مضبوط و منقوش ایوان ملے جنکی چوٹی پر کبوتر بیٹھے گا رہے ہیں۔ قاصد! اگر تو میری قوم کے پاس جائے تو مجھ غمزدہ کا سلام کہنا اور اب تو سلاموں کے لئے میرے پاس تھوڑا ہی وقت ہے۔

(۳)

اقطع اللیل کلہ باکتئاب وزفیر فما اکاد انام
نحو قومی اذ فرقت بیننا الدا ر وحادت عن قصدہا الاحلام
خشیۃ ان یصیبہم عنت الدہر وحرب یشیب منہا الغلام
فلقد خان ان یکون لہذا الدہر عنا تباعد وانصرام

ترجمہ:۔ میں قوم کے فراق کی وجہ سے ساری رات فریاد اور رنج میں کاٹتا ہوں اور لمحہ بھر بھی نہیں سو سکتا مجھے یہ خطرہ ہے کہ کہیں انہیں مصائبِ زمانہ تکلیف نہ پہنچائیں یا جنگ میں مبتلا نہ ہو جائیں جسکے زلازل و نوازل بچوں کو بوڑھا کر دیتے ہیں۔ اور اب تو زمانے سے دوری و جدائی کا وقت بھی قریب ہی ہے۔ دیکھئے ان کی حُبُّ الوطنی او خلوص قومی کہ جن لوگوں نے انہیں جلاوطن کیا ہے یہ انہیں کے فکر میں آٹوں کو بے چین اور بے آرام ہیں۔ اور اسی خلوص کا نتیجہ تھا کہ جب حضرت ابن زبیر کو ان کے یہ اشعار پہنچے تو انہوں نے فرمایا۔ "حن واللہ ابو قطیفۃ وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ من لقیہ فلیخبرہ انہ آمن فلیرجع" بخدا ابو قطیفہ نے بہت ہی شوق کا اظہار کیا ہے خدا کی اس پر رحمت ہو۔ جو شخص اُسے ملے اُسے بتا دے کہ اس کو امن دیدیا گیا ہے اور اب وہ واپس آ سکتا ہے۔ چنانچہ جونہی یہ خبر ابو قطیفہ کو ملی وہ انتہائی عجلت کے ساتھ مدینہ طیبہ کو روانہ ہو پڑے مگر قدرت کو یہ منظور نہیں تھا کہ وہ اپنے وطن کے منازل و آثار کو پھر دیکھ سکیں۔ چنانچہ راستے ہی میں اس جانبازِ وطن نے اپنی جانِ شیریں جان آفرین کے سپرد کر دی، ایسے ہی لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

(۴)

الا لیت شعری ہل تغیر بعدنا جنوب المصلی ام کعہدی القرائن؟
وہل ادور حول البلاط عوامر من الحی ام ہل بالمدینۃ ساکن؟
اذا برقت نحو الحجاز سحابۃ دعا الشوق منی برقہا المتیامن
فلم اترکنہا رغبۃ عن بلادہا ولکنہ ما قدر اللہ کائن

ترجمہ:۔ کاش میں جان سکتا کہ حجاز کے سنگلاخ پہلے کی طرح ہیں یا کچھ متغیر ہو گئے؟ کیا بلاط کے نواح میں گھر آباد ہیں اور مدینہ کے رہنے والے موجود ہیں؟ جب حجاز کی طرف سے کوئی بادل چمکتا ہے تو اس کی متبرک چمک میرے اشواق کو بے چین کر دیتی ہے۔ میں نے حجاز کو عمداً نہ سمجھنے کی وجہ سے نہیں چھوڑا بلکہ خدا کی تقدیر کا لکھا بہرحال ہو کر رہتا ہے۔

اغانی میں ان اشعار کے متعلق ایک عجیب قصہ بھی لکھا ہے وہ آپ بھی سُن لیں۔ اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ابو قطیفہ کے اشعار کیسے تو نہایت ہی مؤثر اور دلگداز ہیں اور دوسرے وہ ان کی زبان سے نکلتے ہی

سارے ملک میں مشہور ہو جاتے تھے۔ اور اُس وقت ان کا کلام خاصہ مقبول تھا یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم تک ان کے اشعار بہت تھوڑے اور انکے حالات بہت کم پہنچے ہیں۔ وہ قصہ یہ ہے کہ بنی زہرہ کی ایک عورت کو اس کے قبیلے والوں نے اسکی مرضی کے خلاف اہل شام کے ایک آدمی سے بیاہ دیا۔ شادی کے بعد وہ اپنے شوہر کے سپرد کر دی گئی اور وہ اسے ساتھ لیکر شام کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں کوئی شخص ابو قطیفہ کے مذکورہ بالا اشعار خوش الحانی سے گا رہا تھا۔ اس عورت نے جب یہ شعر سُنے تو ایک ٹھنڈا سانس لیکر وہیں ہمیشہ کیلئے ٹھنڈی ہو گئی۔ وہ عورت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف مشہور صحابی کی پوتی تھی اور اس کا نام حمیدہ تھا۔

فتح عراق وحجاز کی خبر

ایک موقع پر یہ عبدالملک کے پاس موجود تھے۔ عباد بن زیاد نے اپنے ماموں کی زبانی عراق وحجاز کی فتح کی خبر سنائی۔ انہوں نے سُنی اَن سُنی کر دی اور غیر متوجہ رہے۔ عبدالملک کو چونکہ ان کی حُب الوطنی کے احساسات کا علم تھا اس لئے اس نے انہیں متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ سُنتے ہو؟ عباد اپنے ماموں کی زبانی کیا کہتے ہیں؟ اب تم بغیر کسی کھٹکے کے مدینہ طیبہ کو جا سکتے ہو۔ انہوں نے فی البدیہہ یہ شعر کہے؎

إِنِّي لَأَحْمَقُ مَنْ تَمْشِي عَلَى قَدَمٍ　　إِنْ غَرَّنِي مِنْ حَيَاتِي خَالُ عَبَّادِ

أَنْشَا يَقُولُ لَنَا الْمِصْرَانِ قَدْ فُتِحَا　　وَدُونَ ذٰلِكَ يَوْمٌ شَرُّهُ بَادِي

ترجمہ:- اگر عباد کے ماموں کی روایت سے میں دھوکا کھا جاؤں تو دنیا میں مجھ سے بڑھکر احمق کون ہو سکتا ہے؟ سُبحان اللہ، عراق وحجاز دونوں فتح ہو گئے؟ حالانکہ اس سے پہلے صبر آزما دن کا ہونا ضروری ہے۔

اور واقعی ہمارے شاعر کا قیاس صحیح بھی تھا۔ اُس وقت صرف عراق ہی فتح ہوا تھا۔ حجاز میں ابن زبیر خود موجود تھے اور ان پر آسانی سے فتح پانے کا خیال ایک آن ہونی بات سے دِل بہلانے کے مترادف تھا۔ اِس واقعہ سے آپ کو یہ بھی اندازہ ہو گیا ہو گا۔ کہ ابو قطیفہ حق کہنے کے معاملہ میں بہت ہی نڈر اور بے خوف تھے۔ ورنہ شخصی حکومت کے مطلق العنان بادشاہ کے سامنے وہ اس جُرأت سے اپنے خیالات کا اظہار نہ کر سکتے۔

عبدالملک بن مروان کی ہجو

ابو قطیفہ کے متعلق (جیسے کہ معلوم ہو چکا ہے) اُس وقت بھی مشہور تھا کہ وہ حجاز اور اہل حجاز سے والہانہ محبت رکھتے ہیں اور گو وہ جلاوطن ہو کر زندگی کی آخری گھڑیاں شام میں گزار رہے تھے مگر ان کی محبت اور ان کا دل حجاز و اماکن حجاز کے ساتھ وابستہ تھا۔ اِس واسطے بنو امیہ کے اکثر صنادید ان سے متنفر رہتے۔ اشعار میں حجاز و اہل حجاز کی تعریف اور اظہارِ اشتیاق نے اس جلتی پر تیل کا کام کیا۔ بنو امیہ عموماً اور عبدالملک خصوصاً اپنی مجلسوں میں تنقیص کرنے لگے اور حتیٰ کہ اس کے نسب میں بھی شک کیا جانے لگا۔ چونکہ اب معاملہ حد سے گزرا جا رہا تھا اِس واسطے ابو قطیفہ سے بھی نہ رہا گیا اور انہوں نے جواباً "نثر خود گفتی حالا نظم من بشنو" کہکر ذیل کے ۲ قطعے کہہ ڈالے۔ مگر خدا اس کو کروٹ کروٹ راحت نصیب فرمائے کہ اپنی جبلی اور طبعی شرافت کی وجہ سے عبدالملک کے بخل کو ابو ذباب (مکھی کا باپ) کے لفظ سے تعبیر کرنے، اور بنی کندہ کی زرقاء (جو عبدالملک کی نانیوں میں سے ایک تھی) کے مشہور طعنہ کے سوا انہوں نے اپنی زبان کو آلودہ غلاظت نہیں ہونے دیا۔ اور دُوسرے قطعے میں صرف انہیں "بھیڑیئے کا بچہ" ہی کہکر سارا معاملہ ختم کر دیا۔ پھر ہجو کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ ابو ذباب اور ابن العملس کے الفاظ سے بڑھکر عبدالملک کی ہجو کہی ہی نہیں جا سکتی۔ قصیدے کے قصیدے ان دو لفظوں کا جواب نہیں ہو سکتے۔ قطعے مُلاحظہ فرمائیے:-

(۱)

أَنَا ابْنُ أَبِي مُعَيْطٍ حِينَ أُنْمَى　　لِأَكْرَمِ ضِئْضِئٍ وَأَعَزِّ جِيلِ

وَأُمِّي لِلْعَقَائِلِ مِنْ قُصَيٍّ　　وَمَخْزُومٍ فَمَا أَنَا بِالضَّئِيلِ

وَأَرْوَى مِنْ كَرِيزٍ قَدْ نَمَتْنِي　　وَأَرْوَى الْخَيْرِ بِنْتُ أَبِي عَقِيلِ

كِلَا الْحَيَّيْنِ مِنْ هٰذَا وَهٰذَا　　لَعَمْرُ أَبِيكَ فِي الشَّرَفِ الطَّوِيلِ

فَعَدِّدْ مِثْلَهُنَّ أَبَا ذُبَابٍ　　لِيَعْلَمَ مَا تَقُولُ ذَوُو الْعُقُولِ

فَمَا الزَّرْقَاءُ لِي أُمًّا فَأُخْزَى　　وَلَا لِي فِي الْأَزَارِقِ مِنْ سَبِيلِ

ترجمہ:- میں ابن ابی معیط ہوں، بہترین خاندان اور بزرگ ترین خانوادے کا فرد، میں قصی اور مخزوم کی شریف زادیوں کا بیٹا ہوں۔ کوئی ایسا ویسا فقیر آدمی نہیں۔ اروی جیسی شریف و پاکدامن نے مجھے پالا ہے۔ اور اروی کو جانتے ہو؟ ابو عقیل کی لڑکی ہے۔ بجانِ عزیز پدرت! یہ دونوں قبیلے بہت بڑا شرف رکھتے ہیں۔ او مکھی جو ہیں! اگر تو بھی شریف ہے تو ایسے قبیلوں کا نام لے تاکہ عقلمندوں کو تمہاری بات کا اندازہ ہو جائے۔ میں کوئی زرقاء زادہ تو نہیں کہ مجھے شرمندگی اُٹھانی پڑے۔ ازراق کے ساتھ ہمارا کیا سروکار؟

(۲)

نُبِّئْتُ اَنَّ ابْنَ الْعَمَلَّسِ عَابَنِیْ وَمَنْ ذَا مِنَ النَّاسِ الْبَرِیُّ الْمُسَلَّمُ؟
فَمَنْ اَنْتُمُ مَنْ اَنْتُمُ خَبِّرُوْنَا مَنْ اَنْتُمُ فَقَدْ جُعِلَتْ اَشْیَاءُ تُبْدَیْ وَتُکْتَمُ

ترجمہ:۔ مجھے معلوم ہوا کہ ایک گرگ زادہ مجھ میں عیب نکالتا ہے۔ مگر وہ خود کونسا عیوب سے پاک اور بری ہے؟ ارے تم خود کون ہو؟ کون ہو؟ آخر بتاؤ تو ہو کون؟ سچ چھپایا جاتا ہے اور جھوٹ ظاہر کیا جاتا ہے؟ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کے تو دیکھو۔

سُن لیا آپ نے اُن کی ہجو گوئی کا انداز بھی؟ ایک بادشاہ کی ہجو کہی جارہی ہے اور خطاب اِس طرح کیا جارہا ہے جیسے مخاطب ذلیل ترین شخصیت ہے اور خطاب کنندہ ایک جبّار بادشاہ۔ میرے نزدیک تو خطاب کے اِس طریقے میں سب وشتم اور گالیوں سے کہیں زیادہ مؤثر ہجو موجود ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ عبدالملک پر ان کی شخصیت کا رُعب بھی ضرور چھایا ہوا تھا ورنہ ایک مطلق العنان اپنی اس قدر ہجو سنکر صرف اتنا کہنے پر اکتفا نہ کرتا "اگر ہمیں ابو قطیفہ کی خاطرداری منظور نہ ہوتی تو ہم اس کی کھال اُدھیڑ لیتے"۔

وہ خاطرداری کیا تھی؟ یہ آج تک کسی کو معلوم نہیں۔ ہمارے نزدیک تو ابو قطیفہ کی بزرگی اور برتری کے لئے یہ کافی دلیل ہے کہ شاہانِ وقت اس کی خاطرداری اور دلدہی کرتے تھے۔

جذباتِ فضاؔ

از جناب سیّد دل محمد فضا جالندھری

تسلّی اب نہیں ممکن کہ دَورِ اضطراب آیا
کسی بے مہر پر شاید دلِ خانہ خراب آیا

ادا آئی۔ حیا آئی غضب آیا، شباب آیا
نگاہِ شوق پر گویا قیامت کا عذاب آیا

کسی نے جب نقاب اُلٹی بس اتنا یاد ہے ہمکو
تمنّا باریاب آئی، نظارہ کامیاب آیا

پھری اُس کی نگاہِ لطف محشر ہوگیا برپا
مری دنیائے دل میں کیا یکایک انقلاب آیا

قدم اُٹھتا ہے مشکل سے عجب حالت ہے قاصد کی
مقدّر کہہ رہا ہے جو مرے خط کا جواب آیا

یہ عالم ہے کہ جیسے میرے دل میں بجلیاں بھر دیں
عجب انگڑائیاں لیتا ترا عہدِ شباب آیا

کہاں تک مستیاں اے بادہ کش شب زندہ داری کی
ذرا تو آنکھ اُٹھا کر دیکھ سر پر آفتاب آیا

سرِ بالیں یہ کس نے مُسکرا کر پھول برسائے
کہ دُنیائے تمنّا میں نکھرتا پھر شباب آیا

مٹانے کو بڑھی موج ہوا بھی موجِ دریا بھی
اُبھرنے کے لیے جب سطح پر کوئی حباب آیا

گلہ کس سے کریں ناکامیِ تقدیر کا اے دل
نہ موت آئی شبِ وعدہ نہ وہ مستِ شباب آیا

بہاریں میکدہ بر دوش کلیاں مُسکراتی ہیں
فضائیں ہیں معطّر تم پہ کیا رنگِ شباب آیا

فضاؔ قرباں تری تقسیم کے اے بخشنے والے
جب آیا ترے در سے با دلِ پُر اضطراب آیا



شباب کی سمت آرہی ہے نکل کے ایوان کمسنی سے

صحرانورد کا دسواں خط

صحرائی داستان، جو اُس زمانہ سے تعلق رکھتی ہے جب درختوں کو مقدس خیال کر کے اُن کی پرستش کی جاتی تھی —

از جناب میرزا ادیب بی۔ اے (آنرز)

NATIONAL MUSEUM

حبیب صدق شعار ——————!

میں نے اپنے گزشتہ خط میں جس صحرائی داستان کا ذکر کیا تھا۔ اسے ابھی ابھی مکمل کر کے ارسال کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے کہ اس طویل رومان کا مطالعہ تم پر غور و فکر اور سوچ بچار کے نئے نئے دروازے کھولدے گا۔ کہا جاتا ہے کہ ظلم و مظلومیت کا تصادم کرۂ ارض کے انہی حصوں میں وقوع پذیر ہو سکتا ہے جہاں تمدن ہے، تہذیب ہے اور تہذیب و تمدن کو اجاگر کرنے والا ذریعہ یعنی سرمایہ ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ تہذیب و تمدن کے ہنگامہ زا آغوش ہی ہیں۔ ظلم اور مظلومیت —— انسانی زندگی کے دونوں تاریک اور بھیانک پہلو پرورش پاتے ہیں، پرورش پا کر بڑھتے اور پھیلتے ہیں اور ویران صحرائی وسعتیں اس لعنت سے یکسر منزہ ہیں۔ کیونکہ نہ تو یہاں دولت ہے جس کی غیر منصفانہ تقسیم انسانوں کو انسانوں کی خوں ریزی پر مجبور کر دے اور نہ یہاں جاہ و مرتبہ کی ہوس ہے، جس کے محل کی تعمیر ہی کچلی ہوئی انسانی زندگیوں کے سینے پر بروئے کار آتی ہے۔ اس حقیقت کو حقیقت ثابت کرنے کے لئے لاتعداد تاریخوں کے لاتعداد اوراق پیش کئے جاتے ہیں لیکن مطالعے اور مشاہدے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ظلم اور مظلومیت کا تصادم صرف شہری دنیا ہی تک محدود نہیں اسکا وجود ملعونہ بے آب و گیاہ زمین پر بھی پایا جاتا ہے اور بعض اوقات تو تہذیب و تمدن سے نا آشنائے محض ہستیاں ایسا ایسا ظلم کرتی ہیں۔ انسانوں کو ایسے ایسے بیرحمانہ طریقوں سے ہلاک کرتی ہیں کہ شہر کے ظالم ترین دل و دماغ بھی ان کا ذکر سنکر کانپ اٹھیں۔

اگر شہروں میں حصول مراتب کی ہوس، سوسائٹی کے نظام کی سخت گیری اور سرمایے کی سخت غیر منصفانہ تقسیم کے سایے میں انسانیت کی بوٹیاں نوچی جاتی ہیں تو لق و دق صحرا کے سینے پر مذہبی اوہام کے دامن میں انسانیت کی رگیں کاٹی جاتی ہیں بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ جو ظلم و مظلومیت کے باب میں تہذیب و تمدن کی بلندیوں پر ہوتا ہے وہی وحشت و بربریت کی گود میں بھی رونما ہوتا ہے۔ پھر جس طرح شہروں میں "طلسم سامری" توڑنے کے لئے کسی "موسیٰ" کی ذات مقدس کا ظہور ہوتا ہے اسی طرح ان وحشت و درندگی کی پرورش گاہوں یعنی صحراؤں میں ظلم کا خاتمہ کرنے کے لئے وحشی انسانوں میں ایک وحشی انسان میدان عمل میں کود پڑتا ہے اور اپنے مقصد پر اپنا سب کچھ لٹا دیتا ہے۔ یہ داستان میرے بیان کی تصدیق کریگی اور یقیناً تمہیں بھی اس کی صداقت کا قائل ہونا پڑے گا!

آجکل میں دن رات کا بیشتر حصہ خانہ بدوشوں کے یہاں گذارتا ہوں۔ یہ لوگ غیر معین مدت کیلئے یہاں رہینگے۔ کیونکہ زمین کا یہ ویران حصہ انہیں بے حد پسند ہے۔

منجو کا مختصراً ذکر میں نے اپنے گزشتہ خط میں کیا تھا۔ یہ شخص خانہ بدوشوں کے سردار کا چھوٹا بھائی ہے اور مجھ سے چند دن میں اتنا بے تکلف ہوگیا ہے جتنا بہرام۔ منجو بلا کا ذہین ہے۔ ہر چیز، ہر واقعے پر غور و خوض کرتا ہے اور بعض اوقات اپنے انفرادی مشاہدے سے جو نتائج اخذ کرتا ہے وہ لاریب ایک پختہ کار اور بیدار ذہن ہی کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں۔ دن بھر تو ہم تینوں یعنی میں، آغا بہرام اور منجو شوبان اور شوبان کے اردگرد پھرتے رہتے ہیں۔ اور جب شام کی تاریکی پھیلنے لگتی ہے تو منجو کے خیمے میں چلے جاتے ہیں پھر نصف رات تک اور بعض اوقات صبح کاذب تک طرح طرح کی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ خانہ بدوشوں کا سردار بھی بڑا ملنسار آدمی ہے اور وہ بھی ہماری گفتگو میں بڑی دلچسپی سے حصہ لیتا ہے۔

میرا معمول ہے کہ ہر رات کم از کم ایک داستان ضرور سنتا ہوں اور چونکہ ایک مہینے سے ان خانہ بدوشوں کے یہاں زندگی بسر کر رہا ہوں اسلئے اب تک کم و بیش تیس داستانیں سن چکا ہوں۔ ان داستانوں میں زیادہ تعداد ان واقعات کی ہے جو صرف حسن و عشق کے گرد گھومتے ہیں۔ اسکے سوا ان میں اور کچھ بھی نہیں۔ میں نے ان تیس داستانوں میں سے صرف پانچ منتخب کی ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً بھیجتا رہوں گا۔

یہاں میں یہ بھی بتا دوں کہ منجو بذات خود عشق کی پرخار وادی سے گذر چکا ہے۔ اور اس اولوالعزمی اور عالی ہمتی کے ساتھ گزر چکا ہے کہ جب تم اس کی داستان حیات سنو گے تو عش عش کر اٹھو گے۔

میرے نقطہ نظر سے خلوص اور قربانی ہی محبت کا دوسرا نام ہے اور اس نوجوان نے محبت کے لئے جو جو قربانیاں کی ہیں وہ ہر لحاظ سے قابل تحسین ہیں۔ میں کوشش کرونگا کہ منجو کا افسانہ جلد سے جلد تمہارے پاس پہنچ جائے مگر ابھی یہ افسانہ مکمل نہیں ہوا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس وحشی نوجوان کے سینے کی گہرائیوں میں محبت کی آگ سلگ رہی ہے —— اور محبت کی آگ سلگتی رہے تو تمام عمر سلگتی رہتی ہے مگر جب شعلوں میں تبدیل ہو جائے اسوقت انسان دیوانہ ہو جاتا ہے!

میں نے منو کو بہت پاکیزہ خصلت انسان پایا ہے لیکن اپنے بھائی کی حیثیت حاصل کرنے کیلئے اس کا دل بھی کبھی کبھی بے چین ہو جاتا ہے۔ خیر یہ ایک عام انسانی کمزوری ہے اور اس کمزوری کو مٹانا واقعی سیرتِ انسانی کی بلندی ہے۔

دوست! میرے پیارے دوست!! آج میں تمہیں ایک ایسی بات سنانے لگا ہوں جسے پڑھکر تم چند لمحوں کیلئے اپنی آنکھوں پر اعتبار کھو دوگے۔
سُنو ——— !

خانہ بدوشوں کی دُنیا میں ایک لانبی لانبی پلکوں والی عورت ادھر اُدھر دوڑتی پھرتی نظر آتی ہے۔ اس دلنواز ہستی کی ہر ادا نے میرے دل پر خاص اثر کیا ہے ——— اور کر رہی ہے۔ تم کہوگے۔ آج صحرانورد نے محبت کی دُنیا میں قدم رکھدیا ہے۔ یہ صحیح ہے (اگرچہ یہ تجربہ میرے لئے نیا نہیں) مگر میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میرا قدم اس دُنیا میں آگے نہیں بڑھے گا۔ یہیں رہے گا۔ مجھے ابھی دنیا کے گوشہ گوشہ میں جانا ہے۔ بہت کچھ دیکھنا ہے، بہت کچھ سیکھنا ہے اور محبت کی اسیری اس راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوگی۔ کیوں درست ہے نا!

دوست! مجھے اپنے دل پر پورا پورا قابو ہے اور میری یہ خود اعتمادی کسی چیز کو بھی فرض کے راستے میں حائل نہیں دیکھ سکتی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ جب تک یہاں رہوں گا۔ اس لڑکی سے گفتگو کرتا رہوں گا۔ آخر گفتگو کرنے میں کیا حرج ہے؟

مجھے تم سے ایک شکوہ ہے۔ میں باوجود گوناگوں رکاوٹوں کے تمہیں "تحریری طور" پر بھی یاد کرتا رہتا ہوں مگر تم اسقدر تساہل کیش ہو کہ افسانے کے مطالعے کے بعد ایک خط بھی نہیں بھیج سکتے۔ حالانکہ تم یہ کام بڑی آسانی کے ساتھ کر سکتے ہو۔ شہر میں کس چیز کی کمی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر ایک افسانے کے متعلق تمہارا نقطۂ نظر معلوم کروں۔ امید ہے تم اس سلسلے میں غفلت سے کام نہیں لوگے۔

بس اب رخصت ———

تمہارا ——— "صحرانورد"

(۱)

بوجھل رات ایک زخمی سانپ کی مانند جو مشکل تمام زمین پر رینگ رہا ہو، اندھیرے کی سیڑھیوں پر آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ فضائے بسیط میں ننھے ننھے ستارے کانپ کانپ کر، اپنی رہی سہی روشنی کا خزانہ لٹا لٹا کر تاریکی کے غار میں غائب ہو رہے تھے۔ ادھر ایک گوشے میں زرد رو خوفزدہ چاند خود کو بادل کے ایک ٹکڑے کے سینے میں چھپانے کی کوشش کر رہا تھا!

یکا یک مقدس درخت "راشے" کے نیچے ناقوس کی آواز گونج اٹھی اس کے ساتھ ہی نیم عریاں وحشی انسان، جو تین تین، چار چار کی ٹولیاں بنا کر نخلستان میں ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ اپنے ہاتھوں میں جلتی ہوئی جھاڑیاں اور لکڑیاں لئے اچھلتے کودتے، گاتے بجاتے آندھی کی سی تیزی کے ساتھ راشے کی طرف بڑھنے لگے۔ اور کچھ دیر کے بعد درخت کے اوپر اس طرح دھواں چھا گیا گویا درخت کی شاخیں دھواں اگل رہی ہیں۔ •

جیسے جیسے ناقوس کی آواز مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ صحرائی باشندوں کا شور بھی کم ہوتا جا رہا تھا یہاں تک کہ جب مقدس درخت کے پجاری "ہنوشی" نے ناقوس رکھکر اپنا دایاں ہاتھ اوپر اُٹھایا اور آنکھیں بند کرکے آہستہ آہستہ کچھ پڑھنے لگا تو ہر طرف سکوت وجمود کا عالم طاری ہوگیا۔ تمام لوگوں کے سر فرطِ عقیدت سے جھک گئے اور اُنہوں نے اس بات کا بھی خیال نہ کیا کہ جلتی ہوئی لکڑیوں کی آگ ان کے ہاتھوں کے بالکل قریب ہے یا کچھ دُور ہے۔

صحرائی لوگ اس درخت کو غموں اور خوشیوں کے تقسیم کرنے والا سمجھتے تھے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ وہ سال ڈیڑھ سال میں ایک مرتبہ خود اس کے گرد اکٹھے ہوکر، اپنی عقیدت اور فرماں برداری کا ثبوت دینے کے لئے ایک جوان اور حسین لڑکی کو اس پر قربان کر دیتے تھے۔ اس قربانی کے بعد سمجھتے تھے کہ دیوتا ان پر پہلے سے بڑھ کر مہربان ہوگیا ہے۔

یہ رسم مدت مدید سے جاری تھی اور اب تک بے شمار جوان لڑکیوں کا سُرخ خون اس درخت کے نیچے بہ کر سیاہ زمین کو سیراب کر چکا تھا جب کسی لڑکی کی آغشتہ بخوں نعش خاک پر تڑپنے لگتی اسوقت قربانی کے قبول ہو جانے کی خوشی میں ایک بہت بڑا جشن منایا جاتا جس میں ہر شخص کو حق حاصل تھا کہ جس طرح چاہے اپنے دل کو خوش کرے جس طرح چاہے خوشی منائے اور آج بھی یہ لوگ اپنی زندگی کا اہم ترین فرض ادا کرنے کیلئے جمع ہوگئے تھے۔

اب دیوتا کے حضور میں قربانی کے پیش کرنے کا وقت آپہنچا تھا اُٹھئے جن لوگوں کی لکڑیاں بالکل جل چکی تھیں وہ خاموشی کے ساتھ نئی جھاڑیاں یا لکڑیاں جلا جلا کر ہاتھوں میں پکڑنے لگے تھے۔ اور جن لوگوں کو اپنے عزیزوں کا انتظار تھا وہ اضطراب کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔

اسی اثنا میں، ایک جھاڑی کے عقب سے ایک شعلہ نمودار ہوا۔ اور دوسرے لمحے میں ایک پست قد لوزینہ نما انسان جھاڑی کے پاس رونما ہوگیا۔ تمام لوگ اسے دیکھ کر ہنس پڑے اور چند نوجوان تو اس پر طرح طرح کے آوازے

ں کسنے لگے۔

یہ پست قد انسان قبیلے میں بدصورت ترین انسان سمجھا جاتا تھا۔ سر نہایت چھوٹا۔ بال سرکنڈوں کی طرح اٹھے ہوئے، ایک آنکھ چھوٹی سی بدنما، اور دوسری ایک بھیانک گڑھا، آنکھوں کے گرد لمبے لمبے حلقے پڑے ہوئے، ناک چوڑی اور سخت بھدی، دائیں رخسار پر ایک بڑا سا سیاہ داغ جس نے چہرے کی بدصورتی میں اور اضافہ کر دیا تھا، ڈاڑھی اور مونچھیں دونوں غائب۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ اکیس بائیس کی ہوگی مگر اس کے چہرے کی جھریاں دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ اس کی عمر ساٹھ سال سے کم نہیں ہے۔ اس کا نام تو "راماہم" تھا مگر صحرائی لوگ اسے "غنو" کہتے تھے۔ ان کی زبان میں غنو کے معنی تھے، ذلیل و خبیث ہستی۔ جس شخص کو اپنا غصہ اتارنا ہوتا وہ تامل کئے بغیر غنو کو پیٹنے لگتا کیونکہ اس ذلیل و خبیث ہستی کا مقصد حیات اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا کہ وہ اپنی کمزوری کے باعث ہر چھوٹے بڑے کی مار پیٹ، طعن و تشنیع برداشت کرے، اور منہ سے اف تک نہ کرے اور اب تک وہ اس فرض کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے رہا تھا۔

صحرائی لوگ قہقہے پر قہقہہ لگا رہے تھے کہ یکایک "راشے" کے پجاری نے بلند آواز سے کہا: "شوہو، ہوہو غندی" یعنی دیوتا کی قربانی کے لئے تیار ہو جاؤ۔

قہقہے بند ہو گئے اور تمام لوگ مؤدبانہ کھڑے ہو گئے۔ راشے کے سامنے ناچنے والی عورت "حمارت" آگے آئی اور پاؤں میں گھنگرو ڈال کر ناچنے لگی۔

قریباً ایک گھنٹہ تک پجاری "ہنوشی" مختلف انداز سے راشے کی ہمہ گیر قوتوں کی تعریف کرتا رہا۔ پھر درخت کے تنے سے لگے ہوئے ایک لمبے سے کلہاڑے کے پھل پر دائیں ہاتھ کی انگلیاں رکھ کر کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا: "طلیتاہ تاہ ——" یعنی قربانی کا وقت آ پہنچا۔" جیسے ہی اس کی انگلیاں کلہاڑے کے پھل سے علیحدہ ہو کر، درخت کی ایک شاخ سے مس کرنے لگیں، چار جسیم و شحیم آدمی جن کے کندھوں پہ کلہاڑے اور تیغے چمک رہے تھے۔ تیزی کے ساتھ "نمرو" کی طرف بھاگنے لگے۔

حمارت کافی دیر تک ناچتی رہی پھر لوگوں میں شامل ہو گئی ——!

"نمرو" راشے سے قریباً دو سو گز کے فاصلے پر جھاڑیوں کی اوٹ میں ایک مضبوط جھونپڑی تھی جہاں لڑکی کو بھینٹ چڑھانے سے پیشتر نصف رات تک رکھا جاتا تھا۔

کافی دیر گزر گئی اور وہ چاروں آدمی لوٹ کر نہ آئے۔ ہر ایک شخص کے چہرے سے اضطراب کی علامتیں نمودار ہو گئیں۔ کچھ دیر کے بعد ان لوگوں میں سے ایک شخص بھاگتا ہوا آیا —— اور پجاری کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ سرخ تھا اور دم پھولا ہوا تھا۔

مزینہ وہاں نہیں ہے؟"

یہ الفاظ سنتے ہی تمام لوگوں پر بجلی سی گر پڑی۔ مدت مدید سے باقاعدگی کے ساتھ "راشے" پر لڑکیاں بھینٹ چڑھائی جا رہی تھیں۔ مگر آج تک کسی لڑکی کو بھی انکار کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ بھاگنے کا سوال تو کسی کے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔

مگر آج ——————؟

پجاری نے گرج کر پوچھا۔

"قربانی کہاں ہے؟"

"وہ "نمرہ" میں نہیں ہے۔ دونوں محافظ قتل کر دئے گئے ہیں ہم مزینہ کی تلاش میں دور تک بھاگتے رہے۔" وہی شخص بولا۔

پجاری نے لمبا سانس لیا۔ غم و غصہ سے اس کا جسم کانپنے لگا۔ وہ خود "نمرہ" کی طرف چلنے لگا۔ لوگ بھی اس کے پیچھے قدم اٹھانے لگے۔ نمرہ پہنچتے ہی ان کے قدم رک گئے۔ ان کے سامنے دونوں پہرہ داروں کی لاشیں زمین پر پڑی تھیں۔

پجاری جھونپڑی کے اندر داخل ہوا۔ اور قربانی کو تلاش کرنے لگا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف ایک گلہری گھاس کے چند تنکے منہ میں لئے ایک طرف بھاگ رہی تھی۔

(۲)

مقدس "راشے" کی قربانی کا رات کے ایک حقیر حصے میں، طاقتور پہرہ داروں کی موجودگی کے باوجود، اس حیرتناک طریقے پر مفقود الخبر ہو جانا ایک ایسا واقعہ تھا جو ان لوگوں کی صحرائی زندگی کے کسی دور میں بھی رونما نہیں ہوا تھا اور نہ رونما ہو سکتا تھا۔ وحشی قبیلے کا کوئی فرد ایسا نہیں تھا! جس کا دل راشے کی عظمت و جلال سے نہ لرز رہا ہو —— ہر شخص کو پورا پورا یقین تھا کہ راشے کی رضامندی اسے زندگی بخشتی ہے اور راشے کا غضب تباہی و بربادی لاتا ہے۔ جب یہ حالت ہو پھر مزینہ کا بھاگ جانا یا کسی شخص کا مزینہ کو بھگا کر لے جانا انتہائی حیرت انگیز اور انتہائی افسوسناک حادثہ تھا۔ سب لوگ حیرت و افسوس میں ڈوبے ہوئے تھے۔

ایک طرف صحرائی قبیلے کے دونوں سردار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر خالی جھونپڑی کو دیکھ رہے تھے اور دوسری طرف پجاری محافظوں کی نعشوں کو غضب آلود آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ باقی لوگ اس واقعے کے متعلق طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔

وہ لوگ جو صحرا میں مزینہ کو چاروں طرف ڈھونڈتے رہے تھے!
اب پجاری کے سامنے کھڑے ہانپ رہے تھے۔ پجاری نے اپنا دایاں پاؤں زور سے زمین پر مارا اور گرج کر کہا۔

"نہیں لائے اُسے؟"

"وہ کہیں بھی نہیں ہے ـــــ گم ہو گئی ہے" ایک شخص بولا۔

پجاری چپ چاپ راشے کی طرف چلنے لگا۔ تمام لوگوں نے بھی اس کی پیروی کی۔ کچھ دیر کے بعد تمام قبیلہ راشے کی قربانگاہ کے گرد جمع ہو گیا۔ پجاری نے اپنا دایاں ہاتھ کلہاڑے کے پھل پر رکھ دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ قربانی دی جائے گی۔

لڑکیوں کے حیران و ششدر چہروں پر مُردنی چھا گئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا گویا سکرات موت کے عالم میں آخری سانس لے رہی ہیں۔ ایک جان کش طویل عرصے کے بعد سرداروں نے قبیلے کی تمام جوان لڑکیوں کو راشے کے نیچے ایک دائرے کی صورت میں بٹھا دیا ـــــ ہر لڑکی کے ہاتھ میں ایک جلتی ہوئی لکڑی موجود تھی اور ہر ایک کا چہرہ فرطِ خوف سے زرد تھا۔

اب پجاری آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا لڑکیوں کے دائرے میں آ کھڑا ہوا۔ لڑکیاں ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر اپنا نام پکارنے لگیں۔ پجاری نے اپنی آنکھیں بند کر دیں۔ اور اس طرح کھڑا ہو گیا گویا سیاہ مٹی کا ایک بت ایستادہ ہے۔

تمام لڑکیاں ایک بار اپنا نام پکار چکی تھیں۔ اور پجاری بدستور بُت بنا کھڑا تھا۔ تمام صحرائی خاموشی سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ لڑکیاں دوبارہ اپنا اپنا نام پکارنے لگیں۔

"ممو" ـــ "بلام" ـــ "غونی" ـــ "باما" ـــ "سلطی" ـــ "تماچی" ـــ "درت" ـــــ پجاری نے ایکدم اپنی آنکھیں کھول دیں اور زور سے چیخ ماری۔

"راشے طلی" یعنی راشے کی بخشش۔

جس لڑکی نے اپنا نام درت بتایا تھا۔ اس کی آنکھوں کے ڈھیلے پھیل گئے۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ جلتی ہوئی لکڑی اس کے ہاتھ سے گر پڑی ایک سردار نے اس نیم مردہ لڑکی کو بازوؤں پر اُٹھا لیا اور راشے کے نیچے لے جا کر بٹھا دیا۔

لڑکی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور موت کا انتظار کرنے لگی ـــــ!
پجاری نے کلہاڑے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یکایک قریب سے آواز آئی۔

"مزینہ اور سمرم کھنڈر میں چھپے ہوئے ہیں!"

پجاری نے سامنے دیکھا۔ راشے کے سامنے ناچنے والی عورت حمارت کھڑی تھی۔ حمارت کے ان الفاظ نے لوگوں پر عجیب اثر کیا۔ یکلخت وہ جوش و خروش جاتا رہا۔ وہ عقیدت و فرماں برداری رخصت ہو گئی۔

ایک حیرت انگیز واقعے کے بعد ایک اور حیرت انگیز واقعہ ـــــ!
پجاری نے انتہائی غصے کے عالم میں حمارت کی طرف دیکھا۔

"میں نے خود اپنی آنکھوں سے سمرم کو دیکھا ہے۔ اس کی گود میں مزینہ تھی۔" رقاصہ نے بے جھجک کہا۔

"سمرم، میرا بیٹا؟" پجاری نے کڑک کر کہا۔

"ہاں راشے سو" (راشے کے بیٹے)

پجاری نے سب لوگوں پر ایک سرسری نظر ڈالی اور بلند آواز سے کہا "جاؤ"

دس بارہ آدمی تیزی کے ساتھ بھاگنے لگے۔ اب پجاری نے کلہاڑا اُٹھایا ـــــ لڑکی چیخ مار کر بیہوش ہو گئی تمام لوگ سجدے میں گر پڑے۔ چند منٹ تک یہ عالم رہا۔ پھر جب اُنہوں نے ناقوس کی آواز سنی تو سر اُٹھایا اور دیکھا کہ لڑکی کی بجائے اب ایک نعش خاک و خون میں تڑپ رہی ہے۔

تمام لوگ خوشی سے ناچنے لگے ـــــ!

پجاری نے اپنا ہاتھ نعش کے سینے پر رکھا اور پھر اس خون میں شرابور ہاتھ کو "راشے" سے لگا دیا۔

زندگی کی خوشیاں اور دکھ دینے والا دیوتا اس قربانی سے ان پر مہربان ہو گیا تھا ـــــ!

جشن ہوتا رہا، وحشی لوگ وحشیانہ انداز سے اپنی دلی مسرت کا اظہار کرتے رہے۔ دو پونے دو گھنٹے کے بعد وہ لوگ جو مزینہ اور سمرم کو پکڑنے کے لئے گئے تھے، واپس آ گئے۔ انہیں دیکھتے ہی مجمع دم بخود ہو گیا۔

قبیلہ کا سردار آگے بڑھا اور بولا۔ "ہم کھنڈر کے قریب پہنچے تو چیخ کی آواز سنی، فوراً ادھر بھاگے۔ جھاڑیوں کے پاس کوئی انسان تڑپ رہا تھا سب سے پہلے میں وہاں پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ غنو سخت زخمی حالت میں پڑا ہے اس کے بعد ہم کھنڈر میں گئے۔ وہاں نہ مزینہ اور نہ سمرم۔"

اب دوسرا آدمی آگے بڑھا۔ اس نے دم توڑتے ہوئے غنو کو زمین پر رکھ دیا۔
پجاری نے غنو پر ایک سرسری نگاہ ڈالی اور پھر راشے کی تعریف کرنے لگا۔

درت کی نعش کو حسبِ معمول زمین کھود کر دفن کر دیا گیا۔ اس کے بعد جشن ہونے لگا اور صبح تک ہوتا رہا۔

جب سورج طلوع ہوا تو راشے کے نیچے سوائے غنو کی نعش کے اور کچھ بھی نہ تھا ـــــ!

(۲۲)

رات نصف کے قریب گذر چکی تھی۔ مقدس راشے کا پجاری اپنے دونوں

ہاتھوں میں لمبی لمبی جلتی ہوئی لکڑیاں لئے درخت کے نیچے سر جھکائے کسی خیال میں غرق کھڑا تھا۔ اس کے سامنے چند قدموں کے فاصلے پر، جھاڑیوں کے ایک انبار کے پاس، رقاصہ "حمارت" افسردگی کے ساتھ ناچ رہی تھی کبھی تو وہ ناچتے ناچتے لکڑیوں کی کمزور اور ضعیف روشنی سے اسقدر دور چلی جاتی کہ معلوم ہوتا تاریکی میں ایک سایہ کانپ رہا ہے۔ اور کبھی اسقدر قریب آجاتی کہ اس کا افسردہ چہرہ صاف طور پر نظر آنے لگتا۔

رقاصہ ناچتی رہی۔ کافی دیر تک ناچتی رہی پھر جب اس نے دیکھا کہ پجاری اس کی طرف متوجہ نہیں ہے تو اس نے جھنجلا کر پاؤں زمین پر مارا۔ گھونگروؤں کی جھنکار فضا میں گونجی۔ پجاری نے نیم باز آنکھوں سے حمارت کو دیکھا اور دائیں ہاتھ کی لکڑی منہ میں رکھ کر اپنا شانہ کھجلانے لگا پھر لکڑی منہ سے ہٹا کر بائیں طرف لٹکتے ہوئے کلہاڑے کے پھل کو دیکھنے لگا۔

یکایک کلہاڑے کا پھل زیادہ چمکنے لگا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ رقاصہ اس کے پاس کھڑی تھی۔

"حمارت! ناچتی کیوں نہیں۔ کس کے حکم سے یہاں آگئی ہے۔ ناچ۔ اسوقت تک ناچتی رہ جب تک میں تجھے چلے جانے کا حکم نہ دوں۔"

"آپ تو کسی خیال میں غرق ہیں۔ جب کوئی دیکھنے والا ہی نہ ہو اس وقت ناچ کی کیا ضرورت ہے؟" رقاصہ نے بے خوف ہو کر کہا۔

"لعنت ہو راشے کی تم پر ——— ملعون عورت! تو میرے لئے ناچتی ہے یا راشے کیلئے؟"

"دونوں کے لئے۔ کیونکہ راشے ہمیں زندگی کی خوشیاں اور دکھ دیتا ہے اور آپ راشے کے بیٹے ہیں۔ دونوں کا وجود ہمارے لئے قابل احترام ہے ——— مگر راشے سو! میرے دل میں اک آگ سی لگی ہے ——— میرے سینے میں کانٹے سے چبھ رہے ہیں!"

"کیوں ——— ؟ سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے۔ راشے کے پجاری سے کوئی بات چھپانا اپنی زندگی سے دشمنی کرنے کے برابر ہے۔ جو کثافت تمہارے دل میں ہے اسے باہر نکال دو۔ میں تجھے عزیز سمجھتا ہوں اسلئے تمہاری مدد کرونگا۔"

رقاصہ خاموشی کے ساتھ پجاری کے دائیں ہاتھ کی لکڑی دیکھنے لگی۔ جسے ایک چٹختا ہوا شعلہ تیزی کے ساتھ نگل رہا تھا!

"آپ کی لکڑی بجھ گئی ——— اور جھاڑی لاؤں آپ کیلئے راشے سو!"

یہ کہہ کر حمارت اندھیرے میں گم ہوگئی۔ یکایک ایک چیخ گونجی اور اس سے پیشتر کہ پجاری ادھر جائے رقاصہ ایک پُرخار لکڑی لئے ہوئے وہاں پہنچ گئی۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔" رقاصہ ہنس پڑی۔ جب میں عنتو کی نعش کے قریب پہنچی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی میرے پاؤں کو کھینچ رہا ہے ——— ایک گیدڑ تھا صرف ———"

"گیدڑ ——— تم گیدڑ سے ڈر گئیں یا نعش سے؟"

"میں کسی سے بھی نہیں ڈرتی۔ میں جانتی ہی نہیں ڈر کیا چیز ہے۔ اسوقت کسی نے میرا پاؤں پکڑ لیا تھا۔ بے اختیار چیخ نکل گئی۔ یقیناً گیدڑ نے میرے پاؤں کو کاٹ کھایا ہے۔"

رقاصہ نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا۔ اس کا ایک پاؤں لہولہان تھا۔

"حمارت! میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ صاف صاف بتاؤ۔ تم جانتی ہو راشے کے پجاری سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔"

پجاری نے یہ کہہ کر دوسری لکڑی جلائی اور رقاصہ کے بالکل قریب کھڑا ہو گیا۔

میرے قبیلے میں تم سب سے زیادہ چالاک عورت ہو۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ مزینہ اور سمرم کے درمیان کس قسم کے تعلقات پیدا ہو گئے تھے؟"

"راشے سو! میں اس سوال کا کیا جواب دوں؟ وہ دونوں مقدس راشے کی عظمت سے غافل ہو گئے تھے۔ وہ نہیں سمجھتے تھے کہ جہاں جائیں گے راشے کے غضب کی آندھی ان کے ساتھ ساتھ جائیگی۔"

لیکن جب تم نے انہیں بھاگتے ہوئے دیکھا تو ہمیں کیوں نہ بتایا۔ راشے کا قہر و غضب تمہیں جلا کر خاک سیاہ کر دے گا۔"

"راشے سو! میں نے ہی بتایا تھا کہ وہ بھاگ رہے ہیں اور ———"

رقاصہ کی آنکھیں سُرخ ہو گیا۔

"میں راشے کے نیچے کھڑے ہو کر وعدہ کرتی ہوں کہ جب تک انہیں تلاش نہیں کر لوں گی۔ چین سے نہیں بیٹھوں گی۔"

پجاری کے دائیں ہاتھ کی لکڑی ابھی نصف کے قریب بھی نہیں جلی تھی کہ اس نے فرط جوش میں اسے دور پھینک دیا۔ رقاصہ نئی لکڑی لانے کے لئے چلی گئی!۔

جھاڑیوں کے انبار میں ہاتھ ڈالکر رقاصہ نے ایک خاردار لکڑی اُٹھائی اور چلنے لگی۔

اچانک فضا میں آواز گونجی۔ "حمارت!"

یہ آواز پجاری کی تھی۔ حمارت بھاگ کر راشے کے نیچے پہنچی۔ پجاری اب بیٹھا ہوا تھا۔ چند لمحوں تک رقاصہ کو کچھ بھی نظر نہ آیا۔ مگر جب اس نے جلتی ہوئی لکڑی زمین سے اٹھا کر پجاری کے سر سے خون بہ رہا تھا۔

رقاصہ چیختی ہوئی بھاگی۔ چند منٹ کے بعد بے شمار لوگ پجاری

کے گرد جمع ہو گئے۔ اُنہوں نے اس کے زخم کا جائزہ لیا۔ زخم بہت گہرا تھا اور وہ خون زیادہ بہ جانے کی وجہ سے بیہوش ہو چکا تھا۔

پہلے تو "قربانی" کا فرار ہو جانا اور پھر مقدس راشے کے بیٹے پر بیرحمانہ حملہ —— قبیلے کا ہر شخص خوف سے کانپنے لگا۔ ہر شخص کو یقین ہو گیا کہ عنقریب راشے کا قہر و غضب تمام قبیلے کو محیط ہو جائیگا۔

چونکہ حادثے کے وقت سوائے رقاصہ کے پجاری کے پاس اور کوئی بھی نہ تھا۔ اسلئے قاتل کے متعلق اُسی سے استفسار ہونے لگا۔

اس نے سب سے پہلے تمام باتوں کو دہرایا پھر ایک سردار کے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی۔

"میں نے اس کی صورت اندھیرے میں دیکھی تھی"۔

سردار نے زخمی پجاری کے سینے پر ہاتھ رکھکر کہا "میں راشے ——"

مگر اس سے پیشتر کہ وہ قسم کھائے اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا۔

مقتول سردار کی صرف ایک لڑکی تھی استہ۔ اس لڑکی کو اپنے باپ سے اسقدر محبت تھی کہ تمام قبیلے میں ضرب المثل ہو کر رہ گئی تھی۔ استہ اپنے باپ کے بے رحمانہ قتل پر روتے روتے بیہوش سی ہو گئی!

(۴)

مکمل ایک دن اور ایک رات سفر کرنے کے بعد سمرم اور مزینہ ایک چشمے کے کنارے پہنچ گئے۔ ایک تو تھکاوٹ اور دوسرے بھوک اور پیاس کی شدّت، یہ حال تھا کہ گفتگو کرنے کی سکت بھی ان کے اندر موجود نہ تھی۔ پانی پینے کے بعد جب ان کے ہوش ٹھکانے آئے تو سمرم نے اپنی محبوبہ کا سر زانو پر رکھا اور پیار بھرے لہجے میں بولا۔

"مزینہ! تھکاوٹ سے ہمارا بُرا حال ہے مگر کیا کیا جائے۔ وہ لوگ بھاگ رہے ہونگے۔ اگر ان میں سے کسی نے ہمیں دیکھ لیا تو ہماری جان کی خیر نہیں"۔

"میں تو ایک قدم بھی نہیں چل سکتی۔ مجھے بہرحال مرنا ہے۔ خواہ راشے کی بھینٹ چڑھ جاؤں یا سرداروں کے تیغے میرے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ تم نے سخت غلطی کی کہ پہرہ داروں کو قتل کر کے مجھے لے آئے"۔

"کیا کرتا۔ مجبور تھا —— اندھا تھا۔ محبّت اندھا کر دیتی ہے"۔

"اب تم بھی ہلاک ہو جاؤ گے ——"

"اگر ہم ان کے علاقہ میں چلے گئے تو یقیناً ہمارا یہی حال ہوگا"۔

"سمرم! اب بھی وقت ہے چلو واپس چلیں"۔

"نہیں۔ ہرگز نہیں، ہم ان ظالموں کے قریب بھی نہیں جائینگے زمین بہت وسیع ہے، کسی گوشے میں جا کر راحت کے ساتھ زندگی بسر کرینگے۔ یہ لوگ ہمارا نشان تک بھی نہ پا سکیں گے"۔

"کیا تمہارا خیال ہے اُنہوں نے ہمیں اس طرف بھاگتے ہوئے نہیں دیکھا؟" مزینہ نے اپنا سر اپنے محب کے زانو سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"نہیں —— ہم ان سب کی نگاہوں سے اوجھل تھے"۔

"تم نہیں جانتے، جب ہم کھنڈر میں داخل ہوئے تو غتو کچھ دور کھڑا تھا"۔

"وہ مکروہ انسان کیا کر سکتا ہے" سمرم ہنس پڑا۔

غتو قبیلے سے کہدیگا اور وہ ہمارے پیچھے بھاگیں گے۔ بلکہ بھاگ رہے ہونگے۔ اور ہمیں جہاں بھی دیکھیں گے، ہماری بوٹیاں اڑا دینگے —— میری مانو چلو واپس چلیں۔ پجاری تمہیں معاف کر دے گا —— آخر تم اس کے بیٹے ہو!"

"پھر زندہ رہ کر کیا کرونگا —— زندہ رہیں گے تو دونوں اور مریں گے تو دونوں —— چلو مزینہ آگے چلیں"۔

"آگے کہاں؟"

"آگے —— کافی دور —— مزینہ، ایک مرتبہ میں پہلے بھی یہاں آ چکا ہوں۔ یوق کو جانتی ہو۔ اس نے ایک سردار کو قتل کر دیا تھا اور پھر بھاگ گیا تھا۔ ہم نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ جب میں یہاں سے دور، اس کے قریب پہنچا تو وہ بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر رحم طلب آواز میں کہا۔

"تم مجھے قتل کر کے میرا سر آسانی کے ساتھ لے جا سکتے ہو۔ مگر کیا تم مجھے معاف نہیں کر دو گے؟"

اسوقت اس کا لہجہ اتنا دردناک تھا کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا اور وعدہ کر لیا کہ لوگوں سے کہدونگا۔ یوق صحرا سے نکل کر کہیں چلا گیا ہے یا مر گیا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا —— یوق اسی صحرا میں رہتا ہے۔ ہم اس کی جھونپڑی میں رہیں گے"۔

"یوق قبیلے کو خبر کر دے گا!"

"کیوں اسے اپنی جان کی ضرورت نہیں"۔

مزینہ اُٹھ بیٹھی —— سمرم نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دونوں گرم ریت پر چلنے لگے۔

(۵)

رقاصہ شام کی تاریکی میں کھنڈر کے قریب گذر رہی تھی کہ اس کے کانوں میں سسکیوں کی سی آواز آئی۔ اس کے قدم رک گئے، اور وہ پلٹ کر کھنڈر کو دیکھنے لگی۔ اور پھر ادھر اُدھر نظر دوڑانے لگی۔ کسی طرف بھی کوئی سایہ موجود نہیں تھا۔ وہ اپنے وہم پر مسکرائی اور پھر جلدی جلدی

قدم اُٹھانے لگی۔

ابھی اس نے چند قدم ہی اُٹھائے ہوں گے کہ پھر سسکیوں کی آواز آنے لگی ——— !

رقاصہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اور آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگی۔

آواز بند ہو گئی ——— !

مگر اب رقاصہ کے دل میں یقین پیدا ہو چکا تھا کہ اس کے قریب کوئی نہ کوئی ہستی موجود ہے۔

اب سسکیوں کی بجائے رونے کی آواز آرہی تھی ——— !

وہ دیوار کے ساتھ لگ کر آہستہ آہستہ قدم اُٹھانے لگی۔ دیوار کے آخری سرے پر پہنچ کر اسے محسوس ہوا کہ یہ آواز اندر سے آرہی ہے۔ اس نے شگاف میں سے جھانک کر اندر دیکھا۔ تاریکی میں کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا، ہاں آخری گوشے میں ایک سایہ حرکت کر رہا تھا۔ اس نے وہاں پہنچ کر، سانس روک کر اندر قدم رکھا اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی وہ اس گوشے میں پہنچ گئی۔

اب چاند کی مدھم روشنی میں اس کے سامنے ایک عجیب منظر تھا ———

استہ اپنے مرحوم باپ کا لٹا ہوا سر اپنے زانو پر رکھے زار و قطار رو رہی تھی۔

رقاصہ کا دل بھر آیا۔ اس نے چاہا کہ اس مظلوم عورت کو تسلی دے کہ استہ بڑے جوش و خروش کے عالم میں کہنے لگی۔

"میرے مقدس باپ! تیرے قاتل پر راشٹے کی لاکھ لاکھ لعنتیں۔ میرے باپ تو بے گناہ ہے تو نے راشٹے سو کو ہرگز قتل نہیں کیا۔ ناچنے والی عورت نے تیرے ساتھ دشمنی کر کے تجھے ہلاک کروا دیا ہے لیکن اب وہ بھی زندہ نہیں رہے گی۔ میں تیرے قابلِ احترام سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتی ہوں کہ جب تک حمارت کو قتل نہیں کرواؤں گی۔ اپنے اکلوتے بچے کی صورت نہیں دیکھوں گی ———"

"میرے باپ! تیری پھٹی ہوئی آنکھیں انتقام چاہتی ہیں اور میں انتقام لے کر چھوڑوں گی! خواہ اس میں میری زندگی ختم ہو جائے۔ میرا سب کچھ لُٹ جائے۔" استہ پھر کہنے لگی۔

"میرے مقدس باپ! میں صرف چند گھنٹوں میں تیرا انتقام لونگی۔ میرا تیغہ حمارت کے جسم کی بوٹی بوٹی اڑا دے گا۔ اسوقت تو کسقدر خوش ہوگا!" استہ نے فرطِ عقیدت و محبت سے مجبور ہو کر اپنے ہونٹ، اپنے مردہ باپ کی بائیں بھیانک آنکھ سے لگا دئے ——— !

رقاصہ چپ چاپ یہ منظر دیکھتی رہی۔ اسے کبھی خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کی زندگی اتنے خطرے میں ہے۔ اس کے اور استہ کے درمیان گہری محبت تھی اور دونوں کو ایک دوسرے پر پورا پورا اعتماد تھا اسے

رقاصہ چپ چاپ یہ منظر دیکھتی رہی۔ اسے کبھی خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کی زندگی اتنے خطرے میں ہے۔ اس کے اور استہ کے درمیان گہری محبت تھی اور دونوں کو ایک دوسرے پر پورا پورا اعتماد تھا۔ اس لئے استہ کو اپنا ارادہ پورا کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی!

بے اختیاری کے عالم میں حمارت نے اپنے سینے کے پاس چھپا ہوا خنجر نکالا ——— اور دوسرے لمحے میں استہ کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکل کر فضا میں گم ہو گئی۔

"مجھے قتل کرنا چاہتی تھی ملعون!" رقاصہ نے اپنا خنجر استہ کی پشت سے نکالتے ہوئے کہا۔

"حمارت ——— تو" تڑپتی ہوئی عورت نے کہا۔

"ہاں میں ہوں بزدل لڑکی!"

"لیکن تو بھی زندہ نہیں رہے گی"

یہ کہہ کر استہ کھڑی ہو گئی۔ اور آگے بڑھ کر رقاصہ کی کلائی پکڑ لی۔ رقاصہ کو [illegible] محسوس ہوا [illegible] پہنچ گئی ہے۔ اُس نے پورے زور کے [illegible] اگر پڑی۔ حمارت باہر آئی اور بھاگنے لگی۔

~~~ (۶) ~~~

دوسرے دن دوپہر کے وقت سمرم کو کہیں جا کر یوق کی جھونپڑی ملی۔ یوق جھونپڑی میں نہیں تھا اسلئے سمرم نے اپنی محبوبہ کو تو اندر بھیج دیا اور خود جھونپڑی سے کچھ دور جا کر ٹہلنے لگا۔

یوق نے جیسے ہی اپنی جھونپڑی کے پاس کسی انسان کو دیکھا۔ فرار ہونے کی تیاری کرنے لگا۔ اگر سمرم اُسے جلدی سے واپس آنے کا اشارہ نہ کرتا تو وہ بھاگ کر نہ معلوم کہاں پہنچ چکا ہوتا۔

جھونپڑی کے پاس آکر اس نے اپنے محسن کے ساتھ بڑی کشادہ دلی سے ملاقات کی۔ مگر جب اس کی داستانِ مصیبت سُنی تو خوف اور ڈر سے اس کی تمام خوشی جاتی رہی۔ سمرم نے اُسے یقین دلایا کہ دشمنوں کو اس کے یہاں پہنچنے کی قطعاً خبر نہیں ہے اور نہ وہ اُسے تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ اطمینان بخش بات سُن کر یوق کی جان میں جان آئی ——— !

جھونپڑی کے اندر جا کر یوق سمرم کی محبوبہ کو بڑی حیرت سے دیکھنے لگا۔ گیارہ سال سے اس نے عورت کی شکل نہیں دیکھی تھی اسلئے اب عورت کو دیکھ کر جتنی حیرت کا اظہار کرتا کم تھا ——— !
~~~

مزینہ پہلے پہل تو اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں کو دیکھ کر ڈر گئی مگر جب سمرم نے اسے ہر طرح تسلی دی، اور یموق کو ایک نہایت شریف انسان بتایا۔ تو اس نے خوشی خوشی وہاں رہنا منظور کر لیا!

اس طرح تینوں مجرم ہستیاں اس جھونپڑی میں زندگی بسر کرنے لگیں ۔۔!

ایک دن جبکہ محب اور محبوبہ، دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ یموق گھبرایا ہوا اندر آیا اور آتے ہی کہنے لگا۔

"اب یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں ۔۔۔۔ دشمنوں کو ہماری اطلاع مل چکی ہے اور وہ یہاں پہنچ چکے ہیں ۔۔۔۔!"

سمرم جانتا تھا کہ طویل عزلت گزینی نے یموق کو وہمی انسان بنا دیا ہے اس لئے اس نے ہنس کر کہا۔

"تو تم نے ان کا مقابلہ کر کے انہیں بھگا دیا ہو گا؟"

"یہ ہنسی کی بات نہیں سمرم! میں نے اپنی آنکھوں سے ایک عورت کو دیکھا ہے"

"عورت یہاں؟"

"ہاں ۔۔ میری آنکھوں نے مجھے دھوکا نہیں دیا۔ میں نے اسے دو بار دیکھا ہے۔ پرسوں جب میں علی الصباح جھونپڑی سے باہر نکلا تو کوئی شخص مجھے دیکھ کر بھاگ گیا، اسوقت تو میں نے اسے صرف واہمے پر محمول کیا، مگر رات کو تو یہ واہمہ حقیقت میں بدل گیا۔ سچ کہتا ہوں وہ عورت ہے"

"کہاں کھڑی تھی وہ؟" مزینہ نے پوچھا۔ اسکے چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا۔

"ٹیلے کے پاس!"

"تو تم نے اس کا تعاقب نہیں کیا؟" سمرم نے پوچھا۔ اسکے لہجے میں طنزیہ رنگ غالب تھا۔

"وہ فی الفور غائب ہو گئی ۔۔۔ نہ معلوم کہاں چھپ گئی۔ تعاقب کیا کرتا؟"

"یموق! اگر تم کہتے کہ کوئی مرد دیکھا ہے تو ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت پیش آتی مگر عورت ۔۔۔۔ میں بھی نہیں مان سکتا کہ کوئی عورت یہاں پہنچ سکتی ہے! کسی عورت کو کیا پڑی ہے کہ اپنے شوہر کی آغوش چھوڑ کر یہاں بھٹکتی پھرے؟ تم عورت کے بھوکے ہو اور کئی بار کہہ چکے ہو۔ میرے لئے عورت لاؤ۔ اسلئے اگر یہاں واقعی عورت کی گئی ہے تو تمہیں مسرور ہونا چاہیئے نہ کہ خوفزدہ تمہاری دیرینہ آرزو پوری ہو گئی ہے!"

یہ کہکر سمرم نے قہقہہ لگایا۔ اور یموق بڑبڑاتا ہوا باہر چلا گیا ۔۔۔!

اس کے جانے کے بعد مزینہ کہنے لگی۔

"اب ہمیں یہاں نہیں رہنا چاہیئے!"

"کیوں؟ یہ شخص تو بالکل وہمی ہے۔ کوئی عورت وورت یہاں نہیں آسکتی۔ یہ جھونپڑی تو ایسی جگہ ہے کہ کسی کو اسکا نشان تک نہیں مل سکتا!"

"مجھے کسی عورت کے آنے کا خطرہ نہیں ۔۔۔؟" مزینہ نے جھونپڑی کے دروازے پر نظر ڈال کر کہا۔

"تو پھر خطرہ کس کا ہے؟"

"یہ شخص مجھے ہر وقت گھور گھور کر دیکھتا رہتا ہے ۔۔۔۔ اور جب یہ گھور کر دیکھتا ہے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابھی مجھ سے چمٹ جائیگا۔ میں اس سے ڈرتی ہوں ۔۔۔!"

سمرم نے بلند قہقہہ لگایا۔

"یہ آدمی بالکل بے ضرر ہے۔ میں اسے سختی کے ساتھ منع کر دونگا کہ تمہاری طرف گھور گھور کر نہ دیکھے۔ اس پر بھی وہ باز نہ آیا تو میں اسے ہلاک کر دونگا"

مزینہ مطمئن ہو گئی ۔۔۔۔!

(۷)

صحرائی قبیلے میں یہ خبر کہ پجاری کو اپنی زندگی کی امید نہیں اور مقدس راشے کے نیچے نئے پجاری کا حکم سننے کیلئے راتدن لیٹا رہتا ہے۔ باد صرصر کے جھونکوں کی مانند مشہور ہو گئی تھی۔ تمام وحشی ہر روز پجاری کے گرد جمع ہو جاتے تاکہ نئے پجاری کا نام معلوم کریں مگر پجاری انہیں یہ کہکر مایوس کر دیتا کہ ابھی تک راشے نے کوئی اطلاع نہیں دی۔

ایک دن اتنی تند اور خوفناک باد صرصر چلی کہ دو تین جھونپڑیاں گر پڑیں۔ اور ایک آدمی بھی مر گیا۔ لوگوں نے یقین کر لیا کہ راشے نے غضبناک ہو کر ہمیں تباہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ کیونکہ پے در پے اس کی سخت توہین کی گئی ہے۔

اس وقت تمام صحرائی لوگ خوفزدہ ہو کر راشے کی پناہ مانگنے کے لئے درخت کے گرد اکٹھے ہو گئے ۔۔۔!

پجاری نے ناقوس بجانے کا حکم دیا۔ اس کے بعد لوگ کافی دیر تک سر بسجدے رہے۔ پھر جب پجاری کا اشارہ پا کر کھڑے ہوئے تو پجاری نے راشے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"نئے پجاری کا فیصلہ ہو گیا ہے!"

لوگ پجاری کے پاس پہنچنے کے لئے ایک دوسرے پر گرنے لگے۔

"مجھے راشے نے بتا دیا ہے کہ اس کا بیٹا کون ہے؟"

"کون ہے ہمارا مالک؟" کئی لوگ چلائے۔

پجاری تھوڑی دیر تک کھانستا رہا۔ پھر بولا۔

"راشے کا پجاری سمرم ہے!"

"سمرم" ۔۔۔۔ ہر شخص حیرت میں ڈوب گیا۔

سمرم نے راشے کی توہین کی ہے، مگر راشے نے اس کا قصور معاف

کر دیا ہے۔ یہ بات راشنے نے مجھے بتادی ہے، وہ جہاں کہیں بھی ملے لے آؤ۔ اور راشنے کا پجاری بنادو ـــــ!"

"مگر وہ مجرم ہے!" ایک سردار بولا۔

"تم کون ہو راشنے کے معاملات میں دخل دینے والے" پجاری نے غضب ناک ہو کر کہا۔

"میں نے جو کچھ کہہ دیا ہے، راشنے کا حکم ہے"

تمام لوگ دم بخود ہو گئے ـــــ!

(۸)

مزینہ غنودگی کے عالم میں، سوکھے ہوئے گھاس کے اوپر لیٹی ہوئی تھی کہ معاً ایک وہم سا اس کے دل و دماغ میں رینگنے لگا۔

نہ تو اس کا محب جھونپڑی میں تھا اور نہ یوق ـــــ اگر اس حالت میں کوئی دشمن آئے اور اُسے اُٹھا کر لے جائے تو وہ کیا کر سکتی ہے؟ اس کے اندر نہ تو تاب مقاومت ہے اور نہ وہ کہیں چھپ سکتی ہے۔

وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ اور دروازے کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔

سامنے ایک ٹنڈ منڈ درخت کی ایک ٹہنی پر ایک گدھ بیٹھا پر پھڑپھڑا رہا تھا ـــــ دیکھتے ہی دیکھتے گدھ نے ایک چیخ ماری اور اڑ گیا اور اس کے ساتھ ہی مزینہ خوفزدہ ہو کر بے اختیاری کے عالم میں پیچھے ہٹ گئی۔

درخت کے عین نیچے ایک عورت کھڑی تھی ـــــ جو دائیں طرف دیکھ رہی تھی۔

مزینہ بے حس و حرکت اسے دیکھنے لگی۔ اس عورت کا چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ مزینہ کا دل بے اختیار چاہا کہ بھاگ جائے مگر اب جھونپڑی کے دروازے سے باہر نکلنا سخت خطرناک تھا۔

اس عورت کے ہاتھ میں کوئی چیز چمک رہی تھی ـــــ ایک خنجر۔

مزینہ پیچھے ہٹتی گئی ـــــ اور پھر زمین پر لیٹ گئی!

وہ عورت چند لمحے کھڑی دائیں طرف دیکھتی رہی ـــــ پھر مزینہ نے دیکھا کہ اس کے پاؤں جھونپڑی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یکایک جھونپڑی میں ایک آواز گونجی۔

"ذلیل عورت تو کہاں بھاگ کر جا سکتی ہے؟"

مزینہ سانپ کی طرح رینگتی ہوئی جھونپڑی کے آخری گوشے میں پہنچ گئی۔ یہاں گھاس کے پیچھے ایک سوراخ تھا۔ مزینہ گھاس ہٹانے لگی۔ اسے محسوس ہوا کہ دھوئیں سے اس کا دم رُکنے لگا ہے ـــــ!

(۹)

سمرم نے چشمے کے کنارے پہنچ کر خون آلود ہاتھوں کو صاف کیا اور غیر ارادی طور پر دیکھنے لگا۔

فضا میں دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ایک دوسرے کے پیچھے اڑے چلے جارہے تھے۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑا رہا پھر پتوں اور گھاس سے بندھی ہوئی ہرن کی خونچکاں نعش کو اُٹھایا اور جھونپڑی کی طرف چلنے لگا۔

جھونپڑی کے قریب پہنچتے ہی اس کی رگوں میں بجلیاں سی دوڑنے لگیں ـــــ اس سے کچھ فاصلے پر جھونپڑی دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔ اس نے ہرن کو زمین پر رکھدیا۔ بے تحاشا بھاگ کر وہاں پہنچا اور شعلوں میں چھلانگ لگادی۔

مزینہ کو بلند آواز سے پکارا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ اسی اثنا میں ایک طرف ایک ہاتھ دکھائی دیا۔ سمرم شعلوں کو چیر کر وہاں پہنچا اور ہاتھ کو اپنی طرف کھینچا۔ اور ایک دم توڑتی ہوئی عورت کو بازوؤں پر اٹھا کر شعلوں سے باہر نکل آیا۔

اس کا اپنا منہ جھلس چکا تھا۔ سر کے بال نصف کے قریب جل چکے تھے اس کے علاوہ بدن کے اکثر حصوں پر چھالے پڑ گئے تھے۔

وہ بوجھ کو بازوؤں پر اُٹھائے چشمے کے پاس آیا اور اسی عالم میں پانی کے اندر اتر گیا۔

عورت کا چہرہ بالکل جھلس چکا تھا اور وہ آخری سانس لے رہی تھی!

سمرم نے مضطربانہ اس کے ہاتھوں کو ملایا۔ عورت نے اپنی زبان باہر نکالی، بولنے کی کوشش کی مگر بول نہ سکی اور ہمیشہ کیلئے سرد ہو گئی۔ سمرم نے نعش کو کنارے پر رکھدیا۔ اور خود بے حس و حرکت کھڑا۔ زندگی سے محروم جسم کو دیکھنے لگا۔

محبت نے اس کے سینے ایک طوفان برپا کردیا۔ وہ بیقرار ہو کر اپنی محبوبہ سے لپٹ گیا، اور بلک بلک کر رونے لگا۔ جب طوفان اشک تھما تو اس نے اپنے چہرے کو محبوبہ کے بھیانک چہرے سے لگا دیا اور سوچنے لگا کہ اسی ہستی کیلئے اس نے تمام قبیلے کی دشمنی مول لی، اس ہستی کی خاطر زندگی کی خوشیاں اور دکھ دینے والے مقدس راشنے کو خود پر ناراض کر لیا اور اس ہستی کی محبت پر سر دھڑ کی بازی لگادی!

اور اب یہ ہستی ـــــ!

وہ بیقرار ہو گیا۔ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا، پھر بیٹھ کر اپنی محبوبہ کے چہرہ کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔

یکایک ایک شبہ کانٹے کی طرح اس کے سینے میں چبھا۔

"یہ تو کوئی اور عورت ہے ـــــ مزینہ کا دایاں کان ایک حادثے میں اُڑ گیا تھا مگر اس عورت کے دونوں کان موجود ہیں، یہ مزینہ نہیں کوئی اور عورت ہے"

اس کا دل قدرے مطمئن ہو گیا۔ اور وہ کافی دیر تک اس مردہ عورت

کا چہرہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا ــــــ!

اب اس کے دل میں یقین پیدا ہوگیا کہ یہ مزینہ نہیں کوئی اور عورت ہے ــــ مگر اس لمحے میں ایک خوفناک خیال نے اس کی تمام امیدوں کا گلا گھونٹ دیا۔

"کہیں میری محبوبہ جل تو نہیں گئی"

اس خیال کے آتے ہی اس نے اجنبی عورت کا سر اپنے زانو سے ہٹایا اور بھاگا بھاگا وہاں پہنچا۔

اب جھونپڑی کی بجائے خاکستر کا ایک تودہ پڑا تھا ــــــ!

اس نے گرم گرم خاکستر پہ پاؤں رکھ دیئے اور اپنی محبوبہ کی نعش ٹٹولنے لگا۔ مگر بے سود۔ وہاں لوہے کے تپتے ہوئے اوزاروں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

اس کا دل پوری طرح مطمئن ہوگیا کہ اسکی محبوبہ زندہ ہے۔

اس کے بعد وہ چشمے کی طرف چلا۔ اسکی عدم موجودگی میں گدھوں کے غول کے غول نعش نصف سے زائد چٹ کر چکے تھے۔ اس نے چاہا کہ ایک مرتبہ اور اس عورت کے چہرے کو غور سے دیکھ لے مگر جب وہ نعش کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ عورت کے چہرے پر جگہ جگہ سے ہڈیاں نکلی ہوئی ہیں۔

گدھ کسی نعش پہ بیٹھیں اور پھر وہاں گوشت رہ جائے یہ کیوں کر ممکن ہوسکتا ہے؟

وہ نعش سے دُور جاکر بیٹھ گیا اور اپنے زخموں کو دیکھنے لگا اور گھاس سے خون پونچھنے لگا۔ کافی دیر تک وہ اسی کام میں مصروف رہا۔ کہ اس نے یموق کو دیکھا جو آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا چلا جارہا تھا۔

سمرم دوڑ کر اس کے قریب پہنچا اور پہنچتے ہی اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"یہ کیا معاملہ ہے ــ کہاں ہے مزینہ!" سمرم نے پوچھا۔

یموق نے اس کے جواب میں کہا۔ "جھونپڑی کیسے جل گئی؟"

سمرم نے دوبارہ اپنے سوال کو دہرایا۔

"میں کیا جانوں ــــ یہاں تھا ہی نہیں ــــ"

"یہ سب تمہاری شرارت ہے۔ مزینہ کہاں ہے؟" سمرم نے گرج کر کہا اور یموق کی گردن دبوچ لی۔

یموق انتہائی زور لگا کر گردن چھڑانے لگا۔ سمرم کے جلے ہوئے ہاتھ سے خون نکلنے لگا مگر اس کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔

یموق نے اس کی پیشانی پر زور سے گھونسہ مارا۔ اس پر بھی سمرم نے اس کی گردن کو نہ چھوڑا۔

"بتاؤ سمرم کہاں ہے!"

یموق اپنی گردن چھڑانے لگا۔ سمرم کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔

آخر یموق نے اپنا ہاتھ اُٹھایا جس کا مطلب یہ تھا۔ "مجھے چھوڑ دو۔ تمہارے سوال کا جواب دیتا ہوں"۔ سمرم نے گرفت ڈھیلی کر دی یموق بیٹھ گیا اور جھٹ اپنے دونوں ہاتھ سمرم کی گردن کی طرف بڑھائے۔ سمرم نے پھرتی سے اس کی گردن کو پکڑ لیا اور اسوقت چھوڑا جب وہ مردہ ہوگیا!

(۱۰)

اعلان ہوتے ہی تمام صحرائی لوگ بڑے جوش و خروش کے عالم میں مقدس درخت کے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔ پھر ان تمام افراد نے جو قبیلے میں اہل الرائے سمجھے جاتے تھے۔ نئے پجاری کے انتخاب اور مرحوم پجاری کی وصیت کے متعلق گذشتہ تجربات کی روشنی میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ مرحوم پجاری مقدس راشے کو بہت عزیز تھا اور اس نے تمام عمر قبیلے کی خدمت کی تھی اسلئے اسکی وصیت پر عمل کرنا ازحد ضروری ہے!

مگر اب سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ سمرم کہیں غائب ہوگیا تھا۔ اور کسی شخص کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے؟

جب یہ مجلس شوریٰ منتشر ہوگئی تو چند تیز رفتار نوجوان سمرم کی تلاش میں روانہ ہوگئے! ان نوجوانوں کے علاوہ باقی لوگوں کو بھی حکم دے دیا گیا کہ سمرم کو جہاں کہیں دیکھیں اسے بصد احترام سرداروں کے پاس لے آئیں

شام کے قریب، جب تمام لوگ اپنی اپنی جھونپڑیوں میں چلے گئے تو حمارت راشے کی ایک شاخ پکڑ کر کچھ سوچنے لگی۔ یک بیک اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور وہ اندھیرے میں تیز تیز قدم اُٹھانے لگی۔

کھنڈر کے قریب پہنچتے ہی اس کے دل میں ایک وہم سا پیدا ہوگیا اور اس نے اپنی رفتار میں اور تیزی پیدا کرلی۔ وہ ابھی کھنڈر سے کچھ دُور ہی گئی ہوگی کہ اس کے کان میں آواز آئی۔

"حمارت! ٹھہر جاؤ!"

حمارت کے قدم رُک گئے۔ چند منٹ میں بدشکل بونا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"حمارت! میں نے تجھے آواز پر آواز دی"

"تم زندہ ہو ــــ؟"

"میں مرا کب تھا۔ زخمی ضرور ہوا۔ دیکھو میری پیٹھ"

غنو نے اپنی پیٹھ دکھائی۔ ایک گہرے زخم سے خون بہ رہا تھا۔

"سینے میں بھی زخم ہے اور سر میں بھی زخم ــــ میں تو زخموں سے بھرپور ہوں۔ اس دن سردار کو ہلاک کرتے وقت لوگوں نے میری نعش"

یہ دو تین وار کر دیئے "۔

"اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ ـــــ تو تمہاری بوٹی بھی یہاں نظر نہ آئے سخت جان ہو۔"

"میں دوسروں کی طرح مرنا نہیں چاہتا۔ کوئی بہت بڑا کام کر کے مرنا چاہتا ہوں۔"

حمارت ہنسنے لگی۔

"اب تم کہاں جا رہی ہو؟ ـــــ صاف صاف بتا دو۔ انہیں ڈھونڈنے جا رہی ہو نا ـــــ وہاں کہاں ہیں دونوں؟"

"مجھے کیا معلوم ـــــ ڈھونڈنے جا رہی ہوں!"

"حمارت! میرے سامنے بھی جھوٹ ـــــ اسوقت تمام صحرا میں میں ہی تمہارا راز دان ہوں اور تم میری ہمراز ـــــ ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد کرنا چاہیئے۔ ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیئے ـــــ"

"کس قسم کی مدد؟"

"تم سمجھتی ہو میں صرف ایک مکروہ لونا ہوں ـــــ"

"تو اور کیا ہو؟" حمارت نے مسکرا کر کہا۔

"میں تمہیں ہر طرح مدد دے سکتا ہوں۔ یاد ہے تم نے اسدن اسی کھنڈر میں اپنی دشمن پر حملہ کیا تھا۔ تم سمجھتی ہو گی وہ مر چکی ہے۔ حالانکہ وہ مُردہ نہیں ہے۔"

"تو اور کیا ہے؟"

"وہ زندہ ہے ـــــ اور تمہارا تعاقب کر رہی ہے!"

حمارت کچھ سوچنے لگی۔

"تم نے اس دن اپنی دشمن پر نرمی سے وار کیا تھا ـــــ یہ تمہاری کمزوری تھی۔ اگر میرے پاس کوئی ہتھیار ہوتا تو میں اسے ہلاک کر دیتا ـــــ وہ تمہارے جانے کے تھوڑی دیر بعد کھنڈر سے نکل گئی ـــــ"

حمارت بغیر کچھ کہے چلنے لگی اور اندھیرے میں غائب ہو گئی ـــــ!

جب سمرم چشمے کے کنارے پہنچا تو شام کی تاریکی پھیل چکی تھی اور اردگرد کی چیزیں اس تاریکی میں غائب ہو رہی تھیں۔

وہ ایک جگہ بیٹھ گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا ـــــ!

اسی اثنا میں اس نے چشمے سے کچھ دور، ایک سایے کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ بھاگ کر وہاں پہنچا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ البتہ کوئی چیز اس کے پاؤں کے قریب گذر رہی تھی۔ اس نے جھک کر دیکھا۔ ایک گیدڑ پنجر کو گھسیٹے لئے جا رہا تھا۔

اپنی آرزو کو اس طرح خاک میں ملتے دیکھ کر صحرا کا یہ تنومند نوجوان غضبناک ہو گیا۔ اس نے تیغے سے گیدڑ پر وار کیا۔ ایک چیخ بلند ہوئی۔ اور پھر پنجر پر سیاہ دھبے نظر آنے لگے۔

وہ آگے قدم اٹھانے لگا۔ دفعتہً ایک جھاڑی کے پاس ایک سایہ نظر آیا۔ وہ اس طرف بھاگا۔ سایہ بھی بھاگنے لگا۔ گنجان جھاڑیوں کے پاس پہنچکر سایہ غائب ہو گیا۔

سمرم کے ہاتھ زخمی تھے، اب وہ ان زخمی ہاتھوں سے خاردار جھاڑیوں کو ہٹا کر آگے بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ آخری جھاڑی کے پاس سے بھی گذر گیا۔ وہاں وہ حیران کھڑا تھا کہ دائیں طرف سے آواز آئی۔

"کون ہے؟ سمرم؟؟"

سمرم کی باچھیں کھل گئیں اور وہ دائیں طرف بھاگنے لگا۔

آواز دوبارہ آئی۔ "سمرم! سمرم!!"

سمرم بہت آگے بڑھ گیا۔ وہ مڑا اور اسطرف جانے لگا جس طرف سے آواز آئی تھی۔

"کون ہے۔ مزینہ میری!"

"ہاں ـــــ میں یہاں ہوں، ادھر آؤ۔"

اب چاند کی مدہم روشنی میں سمرم کے پہلو میں مزینہ کھڑی تھی۔

"تم ـــــ مزینہ زندہ ہو۔" سمرم کے منہ سے نکلا۔

مزینہ کے نتھنے پھولے ہوئے تھے ـــــ اور وہ سمرم کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی!

"یموق نے تجھے چھپا دیا تھا ـــــ!"

"نہیں، ہرگز نہیں ـــــ میں حیران ہوں کہ اب تک زندگی کیونکر رہی!"

"جھونپڑی کو جب آگ لگی۔ اسوقت تم کہاں تھیں؟"

"جھونپڑی کو آگ لگی تھی؟" مزینہ نے حیرت سے کہا۔

"ہاں ـــــ وہ جل کر راکھ ہو چکی ہے ـــــ بلکہ اب اس کی راکھ بھی وہاں نہیں ہو گی۔"

"عجیب ماجرا ہے ـــــ میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ میں تنہا جھونپڑی میں لیٹی ہوئی تھی کہ میں نے دور ایک عورت کو ہاتھ میں خنجر لئے جھونپڑی کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ میں نے سمجھ لیا دشمنوں کو ہماری اطلاع مل چکی ہے۔ اسوقت جھونپڑی کے دروازے سے باہر نکل کر بھاگنا سخت خطرناک تھا اسلئے میں جھونپڑی کے ایک گوشے میں جا کر لیٹ گئی۔

وہ عورت جھونپڑی میں آئی اور کڑک کر بولی۔

"ذلیل عورت تو کہاں بھاگ کر جا سکتی ہے؟"

"مجھے گھاس کے پیچھے راستہ مل گیا ـــــ اور میں دوڑنے لگی۔ ہاں

یہ بھی بتا دوں کہ جھونپڑی ہی میں دھوئیں سے میرا دم رُکنے لگا تھا ــــ بھاگتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ کوئی شخص میرا تعاقب کر رہا ہے ــــ میں پوری تیزی کے ساتھ بھاگنے لگی۔ آخر تھک کر اور مایوس ہو کر ان جھاڑیوں میں گھس کر یہاں پہنچ گئی اور اس طرح اپنے دشمن سے محفوظ رہی ــــ میں تمہیں روز رات کے وقت ڈھونڈتی رہتی تھی ــــ آج تم مل گئے!"

سمرم نے غور سے اپنی محبوبہ کا چہرہ دیکھا اور پھر کہنے لگا۔

"میں جب جھونپڑی کے پاس پہنچا تو وہ دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔ میں آگ میں کود پڑا اور ایک قریب الموت عورت کو آگ سے نکالا"

"ایک قریب الموت عورت!"

"ہاں ــــ"

"وہ کون ہوگی ــــ"

"معلوم نہیں"

"عجب راز ہے!"

دونوں سوچنے لگے۔

(۱۲)

ایک صبح کو سمرم اور مزینہ کسی بعید ترین مقام پر پہنچنے کا ارادہ دل میں لئے چلے جا رہے تھے کہ فضا میں ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ ابھی وہ اس ہنگامہ کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ سامنے حمارت مسکراتی ہوئی آئی۔

مزینہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس کے قدم رُک گئے۔ سمرم بیخوف و خطر آگے بڑھنے لگا۔ حمارت کے قریب پہنچ کر اس نے وار کرنے کے لئے تیغہ اُٹھایا۔ حمارت پیچھے ہٹ گئی۔

"راشئے سو!"

سمرم حیرت سے ہنستی ہوئی عورت کو دیکھنے لگا۔

"راشئے سو ــــ تم اپنے باپ کی وصیت کے مطابق ہمارے مالک ہو"

پھر شور بلند ہوا۔ اور آناً فاناً کئی لوگ سمرم اور مزینہ کے گرد ناچنے لگے۔

سمرم بُت بنا کھڑا تھا۔ اور مزینہ کی بھی عجیب کیفیت تھی!

شور تھم گیا۔ قبیلے کے دونوں سردار آگے بڑھے۔ پہلے ایک سردار نے قبیلے کی رسم کے مطابق اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"سمرم! تمہارا باپ مر چکا ہے۔ اس کی وصیت یہ ہے کہ میرے بعد میرا بیٹا پجاری بنے۔ ہم اپنے پجاری کی بات کیونکر رد کر سکتے ہیں۔ تم ہمارے سردار ہو، مقدس راشئے کے پجاری ہو"

اب دوسرے سردار نے اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

سمرم کی مسرت کا یہ عالم تھا کہ اس کی زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکلتا تھا۔ اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

"میں راشئے ــــ مقدس کی خدمت کرونگا"

تمام لوگ ان دونوں کے گرد ناچنے لگے۔

(۱۳)

سمرم مقدس راشئے کا پجاری یا دوسرے لفظوں میں اس کا قابل صد احترام بیٹا بن گیا۔

جس دن یہ واقعہ رونما ہوا۔ اس دن صحرائی قبیلہ صبح سے لیکر رات کے ابتدائی حصے تک ناچتا گاتا رہا۔ سمرم حیران تھا کہ ایک تو وہ وقت تھا کہ اسے اپنی جان بچانے کیلئے ان درندوں سے دور بھاگنا پڑا تھا اور ایک وقت یہ ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے اور تمام لوگ فرط عقیدت سے اس کے سامنے سجدے کر رہے ہیں ــــ!

ایک رات، جب صحرائی وسعتوں میں چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور سمرم مقدس راشئے کی پرستش کر رہا تھا، مزینہ اپنی جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھی، فرط مسرت میں جھوم جھوم کر ایک صحرائی گیت گا رہی تھی۔ اسی اثنا میں کریہہ المنظر بونا غنو آیا اور چپ چاپ اس کے پاس بیٹھ گیا۔

چند لمحوں تک تو مزینہ کی نظر اس پر نہ پڑی اور جب اس نے دیکھا تو غصے سے اس کی بھویں تن گئیں۔ وہ اس عالم کیف و وجد میں غنو کی مکروہ صورت دیکھنے کے لئے تیار نہ تھی!

غنو نے قہقہہ لگایا اور اس کے سر کے زخم سے پیپ نکل کر ایک لکیر کی صورت میں پیشانی سے گذرتی ہوئی۔ اس کی بھدی ناک کے ایک کنارے پر بہنے لگی۔ اس چیز نے اس کی مکروہ صورت کو اور مکروہ بنا دیا۔

مزینہ نے منہ پھیر لیا۔ بونا اس کے سامنے آ بیٹھا۔

"یہاں تمہارا کیا کام ہے؟" مزینہ نے غصہ سے کہا۔

غنو نے جواب دینے کی بجائے قہقہہ لگایا اور بغیر کسی وجہ کے اپنا سر ہلانے لگا۔

"چلے جاؤ یہاں سے۔ مجھے تمہاری مکروہ اور ذلیل صورت سے سخت نفرت ہے۔"

غنو کا چہرہ قدرے افسردہ ہو گیا مگر افسردگی صرف چند لمحوں کے لئے قائم رہی اور پھر دور ہو گئی۔

"میں تمہارا دل بہلانے کیلئے آیا ہوں۔ تم تنہا بیٹھی ہو"

"تم ــــ تم میرا دل بہلاؤ گے؟" یہ کہتے ہوئے مزینہ ہنس پڑی۔

"میں واقعی مکروہ ترین انسان ہوں" غنو نے کہا۔ پیپ اس کے ہونٹوں تک پہنچ چکی تھی۔

"تم انسان ہو ــــ؟"

"تو میں کیا ہوں"

"تمہارے جیسا ذلیل عورت حیوان آجتک پیدا نہیں ہوا۔ تمہیں چاہئے کہ فی الفور اپنے آپ کو ہلاک کر دو۔ یہ ذلت انگیز زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔"

"میری زندگی ذلت انگیز ہے ——— ذلت انگیز؟"

"ہاں ——— مر جاؤ ——— ہر شخص تم سے نفرت کرتا ہے۔"

"اسی طرح مر جاؤں ——— بے فائدہ ———"

"تمہاری زندگی ——— اور فائدہ ———؟" مزینہ ہنس پڑی۔

"یہ تمہاری بھول ہے۔"

مزینہ نے غصے سے بونے کے منہ پر لات ماری۔ بونا دونوں ہاتھ ٹیک کر بیٹھا تھا۔ اس حملے سے گر پڑا۔ وہ پھر کہنیاں ٹیک کر بیٹھ گیا اور گھور گھور کر مزینہ کو دیکھنے لگا۔

مزینہ سوکھے ہوئے گھاس سے پاؤں سے لگی ہوئی پیپ کو پونچھنے لگی۔

"مزینہ! تم میری زندگی سے نفرت کرتی ہو، مجھے کہتی ہوئی اپنے آپ کو ہلاک کر لو۔ مگر مغرور عورت! میں نے ہی تمہاری جان بچائی تھی، جانتی ہو کیونکر، میں جانتا تھا کہ تم سمرم کے ساتھ ہمزہ سے بھاگ رہی ہو مگر میں خاموش رہا۔ حمارت نے قبیلے کو بتا دیا کہ تم کھنڈر میں ہو۔ میں اسی وقت کھنڈر میں پہنچا۔ لوگ بھی آ رہے تھے۔ جب میں نے دیکھا کہ ابھی وہیں ہو تو میں نے اپنے تیشے سے خود کو زخمی کر لیا اور ایکطرف لیٹ کر کراہنے لگا۔ لوگ آئے اور میری طرف متوجہ ہو گئے۔ تمہیں بھاگنے کا موقعہ مل گیا۔"

مزینہ کھڑی ہو گئی۔ اس نے دوبارہ لات بونے کے سر پر ماری۔ بونے کا زخم اور پھٹ گیا۔ وہ گر پڑا۔ پھر بیٹھ گیا۔

مزینہ بعجلت وہاں سے چلی گئی۔

بونے نے غصے کے عالم میں گھاس اکھیڑ ڈالا۔ اور پھر نہ معلوم کس خیال میں، ایک ایک تنکے کو گرانے لگا۔

(۱۴)

اس دن اتنی شدید، تند اور خوفناک آندھی چلی کہ ہر ایک صحرائی باشندہ گھبرا کر اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر آندھی تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

متعدد جھونپڑیاں گر پڑیں۔ چند ننھے بچے بانسوں کے نیچے دب کر مر گئے۔

صحرائی نصف سے زیادہ آبادی ایک غار میں جا چھپی اور باقی لوگ بھی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر، اوندھے منہ زمین پر لیٹ گئے۔

سمرم اور مزینہ کی جھونپڑی سب سے مضبوط تھی اسلئے اپنی جھونپڑی کے ایک گوشے میں جا کر ایک دوسرے سے لپٹ کر بیٹھ گئے۔ ابھی آندھی پورے زور پر تھی کہ سمرم کو محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کی پشت پر زور سے ہاتھ مارا ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔

اس کے پاس گرد و غبار میں اٹا ہوا بونا کھڑا اپنی آنکھوں کو مل رہا تھا۔

"غنو" سمرم نے حیرت کے عالم میں کہا۔

"سمرم! حمارت نے سرداروں سے کہا ہے کہ راشے ہم پہ ناراض ہو گیا ہے۔ اور ناراض ہو کر ہم کو تباہ کر رہا ہے۔"

"ہاں راشے غضبناک ہے!"

"مگر حمارت نے اسکی وجہ یہ بتائی ہے کہ مزینہ اسکی "قربانی" تھی اور بھینٹ نہیں چڑھائی گئی۔"

سمرم سر سے لیکر پاؤں تک کانپ گیا۔

"سردار اور تمام لوگ مزینہ کو بھینٹ چڑھانے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔"

"جھوٹ بکتا ہے۔ ذلیل، خبیث بونا، مزینہ نے کہا اور ایک بھاری لکڑی اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری" راشے کی قسم یہ جھوٹ کہتا ہے۔"

غنو کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

"میں سچ کہتا ہوں۔ مجھے تمہاری قسم ہے۔"

"مقدس راشے کی تم پر لعنت ہو ———" سمرم نے کہا۔

"سمرم، مزینہ بھاگ جاؤ ——— وہ خونخوار درخت ———"

"اُف ——— خونخوار" سمرم نے گھونسہ بونے کے بازو پر مارا۔

"وہ خونخوار درخت ہے" بونے نے اپنے پھیپھڑوں کا تمام زور لگا کر کہا۔ "اس نے قبیلے کی بے شمار لڑکیوں کا خون پی لیا ہے۔"

سمرم نے اسے بازوؤں پر اٹھایا اور جھونپڑی کے باہر آ کر اس طرح پھینک دیا جس طرح ایک وحشی انسان جلی ہوئی لکڑی کو جھنجلا کر پرے پھینک دیتا ہے۔

بونے نے چلا کر کہا۔

"بھاگ جاؤ ——— بھا۔"

سمرم نے نفرت سے اس پر تھوکا اور جھونپڑی کے اندر چلا گیا۔

آندھی کچھ دیر تھم کر پھر شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔

غنو اٹھا اور جھونپڑی کی طرف قدم اٹھایا ——— مگر لڑکھڑا کر گر پڑا۔

(۱۵)

دوسرے دن ہر ایک صحرائی کی زبان پر تھا کہ مزینہ مقدس راشے کی بھینٹ چڑھائی جائے گی۔ کیونکہ یہ اسی کی قربانی ہے۔

سمرم اور مزینہ کے کانوں میں بھی یہ خبر پہنچی۔ اب وہ پچھتائے کہ کیوں نہ بونے کی بات پر اعتبار کر کے اسی وقت بھاگ گئے۔ اب نہ وہ بھاگ سکتے تھے اور نہ کسی اور طرح اس بلا سے محفوظ ہو سکتے تھے!

سمرم نے اعلان کیا۔ مجھے مقدس راشے نے کہا ہے کہ مزینہ کو زندہ رکھا جائے اور اسکی بجائے کسی اور کو قربان کیا جائے۔ مگر قبیلے نے کہا کہ مزینہ

ہی قربانی ہے۔ جب تک وہ زندہ ہے مقدس راشے ہم پر ناراض رہیگا۔

سمرم نے یہ بھی کہا کہ ابھی قربانی کا وقت نہیں آیا لیکن لوگوں نے جواب دیا۔ راشے مزینہ کا خون جلد مانگتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ غضبناک آندھی کیوں چلتی۔

چنانچہ اسی دن قبیلے نے مزینہ پر کڑی نگرانی شروع کر دی اور اس کے ہاتھ پاؤں بھیڑیے اور دوسرے جنگلی جانوروں کی کھالوں سے باندھ دیئے تاکہ وہ حرکت بھی نہ کر سکے۔ یہی نہیں بلکہ کئی مسلح نوجوان اسکے گرد پہرہ دینے لگے۔

سمرم نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور لہو کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

اسی شام حمارت تنہا گذر رہی تھی۔ سمرم نے اسے بلایا۔ حمارت کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ فوراً سمرم کے پاس آئی۔ سمرم اٹھا اور چپ چاپ چلنے لگا۔ حمارت بھی اس کے پیچھے قدم اٹھانے لگے۔

کافی دور جا کر سمرم کھڑا ہو گیا ۔۔۔۔ اور مزینہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کیوں سمرم!"

سمرم نے اس کے ہاتھ کو زور سے گھسیٹا اور اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا۔ حمارت دھم سے زمین پر گر پڑی۔ اس کے سینے سے خون کا فوارہ نکلا اور وہ تڑپنے لگی۔

"ذلیل عورت! یہ ہے مزا تیری شرارت کا"

حمارت نے خنجر سینے سے نکالا۔ اور اپنے زخم پر ہاتھ رکھ دیا۔

"سمرم! تو نے مجھے ہلاک کر دیا۔ مگر میں تجھ پر لعنت نہیں بھیجونگی ۔۔۔ میں تجھے حاصل نہیں کر سکی لیکن کوئی اور عورت بھی تجھے حاصل نہیں کر سکتی"

سمرم خاموش کھڑا رہا۔

"سمرم اب میں تیرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی۔ میرے پاس بیٹھ جا۔ میں مر رہی ہوں"

سمرم اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"میں جانتی تھی اگر میری تجویز کامیاب نہ ہوئی تو میرا یہی حال ہوگا مگر میری تجویز کامیاب ہو گئی ۔۔۔ پھر میں بھی دم توڑ رہی ہوں ۔۔۔ سمرم! تو جانتا تھا میں تجھ سے محبت کرتی ہوں اور اس محبت کیلئے سب کچھ کر گذرونگی۔ لیکن تو نے میری طرف توجہ نہ دی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ یہ میرے آخری سانس ہیں ۔۔۔ میں تجھے سب کچھ بتا دینا چاہتی ہوں ۔۔۔"

حمارت نے دوسرا ہاتھ بھی زخم پر رکھ دیا ۔۔۔

"سمرم! میں نے قبیلے کو تمہاری فراری کے متعلق بتایا تھا ۔۔ میں نے ہی تعاقب کر کے تجھے ڈھونڈ نکالا تھا۔ اور میں نے ہی اس جھونپڑی کو آگ لگا دی تھی۔

"تو نے آگ لگائی تھی؟" سمرم نے انتہائی حیرت سے کہا۔

"ہاں ۔۔۔ جب میں نے دیکھا کہ مزینہ جھونپڑی میں تنہا ہے تو میں نے اسے ہلاک کرنے کا ارادہ کر لیا۔ مگر ابھی جھونپڑی میں داخل بھی نہ ہوئی تھی کہ میری نظر استہ پر پڑی جو ادھر ہی آ رہی تھی۔ وہ میری دشمن تھی اور مجھے ہلاک کرنے لئے آ رہی تھی۔ میں ایک طرف ہٹ گئی۔ استہ نے سمجھا میں جھونپڑی کے اندر چلی گئی ہوں۔ وہ جھونپڑی میں داخل ہو گئی۔

"میرے ذہن میں ایک تجویز آئی کہ جھونپڑی کو آگ لگا دوں تاکہ دونوں دشمن ہلاک ہو جائیں۔ چنانچہ میں نے جھونپڑی کو چاروں طرف سے آگ لگا دی اور خود دروازے پر کھڑی ہو گئی کہ کسی کو باہر نہ نکلنے دوں۔

جھونپڑی دھڑا دھڑ جل رہی تھی کہ میری نظر تم پر پڑی۔ میں دروازے سے ہٹ کر ایک طرف چلنے لگی۔

"سمرم! میں سمجھتی تھی کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی ہوں مگر اسوقت میری نظر بھاگتی ہوئی مزینہ پر پڑی۔ میں نے اس کا تعاقب کیا لیکن وہ کہیں چھپ گئی ۔۔۔ آخر مایوس ہو کر میں قبیلے میں آ گئی ۔۔۔ اب میرے دماغ میں ایک اور تجویز تھی ۔۔۔ لیکن جب نے سنا کہ تمہارے باپ نے وصیت کی ہے کہ تمہیں پجاری بنایا جائے تو میں نے اس تجویز پر عمل کرنا مناسب سمجھا

"اب قبیلے کے لوگ تمہارے دشمن نہیں تھے اور نہ مزینہ کے دشمن تھے۔ میں نے لوگوں کو ساتھ لے کر تمہیں ڈھونڈ لیا۔

"میرا ارادہ تھا کہ جب قربانی کا وقت آئے تو مشہور کر دوں کہ مزینہ راشے کی قربانی ہے، لوگ اسے بھینٹ چڑھا دیں گے یا دو تین جھونپڑیوں کو آگ لگا دوں اور کہدوں کہ راشے خفا ہو کر یہ سزا دے رہا ہے کہ اس کی "قربانی" زندہ ہے ۔۔ اتفاقاً آندھی چلنے لگی۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور سرداروں سے یہ بات کہدی۔ وہ جھٹ مان گئے ۔۔۔ اوہ میرے سمرم!! آہ تو نے مجھے ہلاک کر دیا۔ میری امیدیں خاک میں مل گئیں ۔۔۔"

حمارت رک رک کر سانس لینے لگی۔

"سمرم! آخری بات ۔۔۔ تمہیں کس نے ۔۔۔ میں ۔۔۔ یا کہ قربانی ۔۔۔ سرداروں ۔۔۔ میں نے"

"مجھے یہ بات بونے غنو نے بتائی تھی کہ حمارت نے سرداروں کو مزینہ کی ہلاکت پر آمادہ کیا ہے ۔۔۔ میں نے اس وقت اس کی بات پر اعتبار نہ کیا اور اسے ہلاک کر دیا!"

"اسے ہلاک کر دیا ۔۔۔ سمرم! وہ ۔۔۔ ہلاک ہونے ۔۔۔ والی جنس ۔۔۔ نہیں۔ وہ اسوقت بھی ۔۔۔ مردہ تھا ۔۔ جب ۔۔ اس نے ۔۔۔ تمہارے باپ کو قتل کر دیا تھا ۔۔۔"

"اس ذلیل بونے نے میرے ۔۔۔"

"ہاں سمرم! یہ بونا ــــ سخت خطرناک ــــ یہ مقدس راشتے کو کچھ بھی نہیں سمجھتا ــــ اور مزینہ سے ــــ"

حمارت نے آخری ہچکی لی اور مردہ ہوگئی ــــ!

~~~~~~~~(۱۶)~~~~~~~~

شام کی سیاہی پھیل رہی تھی ــــ!

صحرائی لوگ جلدی جلدی کھا پی رہے تھے کیونکہ اس رات انہوں نے قربانی دے کر راشتے کو خوش کرنا تھا۔

یکایک فضا میں ایک شور برپا ہوگیا۔ کہ بونے غنو نے پجاری کو زخمی کر دیا ہے۔ لوگ بھاگے بھاگے راشتے کے نیچے پہنچے۔ اور یک لخت ان کے جسم تھر تھر کانپنے لگے۔

بونا غنو کلہاڑے سے مقدس راشتے کو کاٹ رہا تھا ــــ!

فضا میں اتنا بلند شور پیدا ہوا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

چند آدمی ہتھیار لے کر ادھر بھاگے ــــ غنو تیزی سے درخت کاٹنے لگا۔

درخت جھکتا جا رہا تھا۔

ایک شخص نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے کلہاڑا چھین لیا۔ غنو درخت سے چمٹ گیا۔

ان لوگوں نے پورے زور سے اس کی پشت پر کلہاڑے مارے۔ دو کلہاڑوں کے پھل بونے کی پشت کو چیرتے ہوئے درخت پر لگے۔ اس کا بقیہ حصہ بھی کٹ گیا۔

اور اسی لمحے میں مقدس راشتے زمین پر پڑا تھا۔

~~~~~~~~(۱۷)~~~~~~~~

چند دن کے بعد ــــــــ!

راشتے دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ صحرائی لوگ خوش ہو ہو کر اس کے گرد ناچ رہے تھے۔ قبیلے کی لڑکیاں تو اسقدر مسرور تھیں کہ ان کی مسرتوں کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔

درخت کی جڑ کے پاس گوشت کے چند لوتھڑے پڑے تھے ــــ!

قطعاتِ امجد

از حضرت امجد حیدر آبادی

دستِ صبا و پنجۂ گلچیں سے بچ گیا
اچھا ہوا کہ غنچۂ دل، گل نہیں ہوا
ہر اک کو فکر ہے کہ ترقی نہیں ہوئی
میں خوش اسی میں ہوں کہ تنزل نہیں ہوا

جانے بھی دے اگر گئی دنیا
رنج ہی کیا متاع کاسد کا
جمع سے تجھ کو کیا غرض امجد
تو ہے بندہ خدائے واحد کا

دو قسم کا ہم لوگ پہنتے ہیں لباس
اک جسم کی خاطر، اک جہاں کی خاطر
کھانا بھی اسی طرح کا ہم کھاتے ہیں
اک پیٹ کی خاطر، اک زباں کی خاطر

باطن میں ہے ایک، سارا عالم
ظاہر میں تو ایک اک کی ضد ہے
"کیا ہوں"؟ میں ہے اختلاف امجد
"میں ہوں" میں ہر ایک متحد ہے

اصلاح اساتذہ پر ایک نظر

انتقادی مقالہ

از الحاج مولانا پروفیسر حامد حسن قادری

شاگردوں کے کلام پر استادوں کی اصلاح کا رواج و سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے لیکن صحیح تبصرہ اور با اصول انتقاد اگلے زمانے میں تقریباً مفقود تھا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں بعض شاعروں اور ادیبوں نے بعض تصانیف پر تنقید کی ہے۔ لیکن اس میں علم و ادب کی اصلاح و ترقی کے ساتھ بلکہ اس سے کچھ زیادہ بحث و جدل اور تردید و تنقیص کی شان نمایاں ہے اور افسوس ہے کہ بیسویں صدی کے دور ترقی، عہد تحقیق اور عصر آزادی میں بھی ہندوستانی ذہنیت اس تنگ نظری سے آزاد نہیں ہے۔

اصل میں روح شاعری اور جان سخنوری شعر کہنے سے زیادہ شعر سمجھنا ہے۔ محض شعر کہہ لینا کوئی کمال نہیں۔ فیاض حقیقی نے موزونی طبع اور استعداد شعر گوئی ہندوستان میں بھی ایسی بے تحاشا ئی ہے کہ بقول ظریف لکھنوی کے

"شاعر اسّی فی صدی، تعلیم سَو میں سات کی"

اس فطری استعداد کی تربیت و تکمیل کے لئے استادوں نے اصلاح اور تنقید کا طریقہ جاری کیا تھا۔ بعض اساتذہ اپنی اصلاح و ترمیم کی توجیہ غزل کے کاغذ پر ہر شعر کے سامنے لکھ دیتے تھے۔ بعض بزرگ خطوط میں بیان کر دیتے تھے۔ کبھی ایسا بھی کرتے تھے کہ قابل اصلاح اشعار کے الفاظ و محاورات پر نشان لگا کر واپس کر دیتے تھے کہ ان شعروں کو پھر کہہ کر بھیجو۔ اور یہ تاکید بھی ہوتی تھی کہ بغیر اصلاح کے کوئی غزل مشاعرے میں نہ پڑھی جائے یا گلدستہ میں نہ چھپوائی جائے۔ جو شاگرد مکمل ہو جاتے تھے۔ ان کو سند تکمیل دیدی جاتی تھی یعنی ان کو لکھدیا جاتا تھا کہ اب تم کو اصلاح کے لئے غزل بھیجنے کی ضرورت نہیں بلکہ اپنے اوسط و ادنیٰ درجے کے شاگردوں کو ان تکمیل یافتہ تلامذہ کے سپرد کر دیتے تھے۔ میں نے حضرت امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک ایسے ہی تکمیل شاگرد منشی امتیاز احمد خاں صاحب رازؔ عرف پیارے خاں رامپوری مرحوم (متوفی سنہ ۱۹۱۷ء) کی ایک غزل اور اس پر حضرت امیر کی تحریر دیکھی ہے۔ پیارے خاں صاحب نے غزل کے ایک گوشہ پر استاد کو لکھا تھا۔

"قبلہ، اس غزل کو پری بنا دیجئے"۔

امیر صاحب نے اسی کاغذ پر تحریر فرمایا تھا۔

"پیارے، غزل خود پری ہے۔ اسکو پری کیا بناؤں۔ امیر فقیر"

اور بغیر اصلاح کے واپس فرما دی تھی۔ اس تذکرہ کے سچے قدردان اور لطف حاصل کرنے والے اب غالباً ایک ہی بزرگ باقی ہیں۔ یعنی جناب پیارے خاں صاحب مرحوم کے قدیم رفیق کار او رخواجہ تاش نواب فصاحت جنگ حضرت جلیل جانشین حضرت امیر مینائی۔

غرض قدیم زمانے میں اس طرح شاعری کی تعلیم و تربیت کے باقاعدہ مدرسے اور مستقل محکمے قائم تھے اور انہی کا نتیجہ تھا کہ ایسے ماہر فن، استاد اور نقاد پیدا ہوئے جن پر زبان و ادب کو ناز ہے اور جن سے شعر و سخن کی لاج باقی ہے ہمارے موجودہ زمانے میں یہ سلسلہ بہت کم ہو گیا ہے۔ لیکن بالکل مفقود نہیں ہوا ہے۔ کہیں کہیں اسی اہتمام کے ساتھ جاری ہے جب کبھی تھا اور ہونا چاہیئے لیکن نوجوان طبائع کا عام رجحان آزادی و خود رائی کی طرف ہے اور ان کی نظر اس نکتے اور اس حقیقت پر نہیں کہ زبان و ادب بھی مثل انسانوں کے جاندار چیزیں ہیں جس طرح مطلق بے قیدی و آزادی سے جسم و روح تباہ ہو جاتے ہیں اسی طرح بے اصولی و بے راہ روی سے زبان و ادب کی بربادی یقینی ہے جس طرح بے دینی و بد اخلاقی کی زندگی میں روح جسم کے اندر موجود ہوتی ہے لیکن بصداقت و دیانت کے عالم میں اس روح پر موت وارد ہو چکی ہے۔ اسی طرح بے قاعدہ اور خلاف معیار انشا پردازی میں زبان و ادب موجود ہوتے ہیں لیکن ذوق سلیم کے نزدیک ان کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

جب تک اہل زبان اور استادوں کے باندھے ہوئے قاعدوں پر عمل نہ کیا جائے گا۔ زبان کا معیار صحیح نہیں رہ سکتا۔ زبان کو گھر بار بولنے کی اور بات ہے اور مضمون و نظم میں لکھنے کی اور بات۔ جو چیز زبان سے نکل کر کاغذ پر۔ اور گھر کی چار دیواری سے نکل کر پلیٹ فارم پر آئے گی۔ وہ

سے مجھے حضرت پیارے خانصاحب راز رامپوری مرحوم کی خدمت میں شرف تلمذ حاصل تھا۔ میرے پاس استاد مرحوم کے حالات، مجموعہ کلام غیر مطبوعہ اور ان کی تصویر موجود ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اسوقت اس نوٹ میں حضرت مغفور کا مختصر تذکرہ اور نمونہ کلام لکھدوں۔ لیکن پھر مفصل مضمون کا لطف کم ہو جاتا۔

(احقر حامد حسن قادری)

ادب و شاعری کا جزو بنے گی۔ وہی کلچر پیدا کریگی یعنی حسن تہذیب اور ذہنی شائستگی اور وہی آیندہ نسلوں کی رہنمائی کرے گی۔ اسلئے یہ کہنا صحیح نہیں کہ زبان و شاعری کے لئے کسی قاعدے کی پابندی لازم نہیں ہے۔ بے قاعدگی اور بے راہ روی سے ہمواری اور یکسانیت پیدا نہیں ہو سکتی اور اس کے بغیر تناسب و موزونیت قائم نہیں رہ سکتی۔ اسی دور کا دوسرا نام حسن و لطافت ہے۔ شعور حسن اور احساس لطافت ہی وہ چیز ہے جس پر ذہنی تربیت، صحت ذوق، نفاست طبع اور سلامت فکر پر منحصر ہے۔ ان ہی سب چیزوں کو کلچر کہتے ہیں۔ جب اس کی فضا اور ماحول پیدا ہو جاتا ہے تو یہی قومی و ادبی کلچر کہلاتا ہے۔

اس لطافت و موزونیت کی ضرورت زبان و ادب کے ہر عنصر میں ہے۔ الفاظ، بندش، روزمرہ، محاورہ، طرز بیان، تخئیل، غرض کوئی چیز شستگی و شائستگی سے خالی نہیں ہونی چاہئے۔ استادوں کی اصلاح اور نقادوں کا تبصرہ اسی معیار شعر و ادب کو قائم رکھنے کے ذریعے ہیں۔ اساتذہ قدیم کی اصلاحات اور ان کی توجیہات یا ناقدین کی تنقید اور اس پر نقد و نظر شائع کرنا بھی اسی مقصد کا طریق کار ہے اور اس زمانے میں مکرر مفید و ضروری۔

میں اس مضمون میں اصلاح و تنقید کے چند نمونے پیش کرتا ہوں۔ کہیں ان کی توجیہہ بیان کرتا ہوں۔ کہیں اصلاح یا توجیہہ یا تنقید پر اپنا تبصرہ پیش کرتا ہوں۔ لیکن یہ عرض کئے دیتا ہوں کہ میری نظر تنقید کے تعمیری پہلو پر ہے۔ تخریب و تنقیص کی نیت نہیں ہے۔ اگر انسان خطا و نسیان کا مرکب ہی تو میں اوروں سے زیادہ خطاکار و نسیاں شعار ہوں۔ اسلئے اگر میری غلطی ہو تو دعا کرتا ہوں کہ رَحِمَ اللّٰہُ مَن ھَدَانی اِلیٰ عُیُوبِی۔

مرزا غالب کی اصلاح

غالب مولوی عبدالرزاق شاکر کو خط لکھتے ہیں اور ان کی غزل پر اصلاح دیتے ہیں۔

کوئی آتا نہیں آگے ترے ہمت ہو کر ٭ آئنہ جب نظر آیا ہے تو اندھا ہو کر

"یہ مطلع دلنشیں ہے، مگر اتنا تامل ہے کہ آئینہ کو اندھا کہنا چاہئے یا نہیں

شعر۔ مردم چشم سیہ جب نظر آتا ہے ترا ٭ بیٹھ جاتا ہے مرے دل میں سویدا ہو کر

اصلاح۔ مردم، آنکھ کی پتلی مذکر نہیں۔ معشوق کی قید کیا ضرور؟ دعویٰ حسن پرستی ہے عموماً یہ خوب ہے ؎

نظر آتی ہے جہاں مردمک چشم سیاہ　　بیٹھ جاتی ہے مرے دل میں سویدا ہو کر

شعر۔ حرمت مے کیلئے پیر مغاں کا یہ حکم　　ریش قاضی کی ہے پنبہ مینا ہو کر

اصلاح۔ یہ شعر بے لطف ہو گیا۔ کس واسطے کہ جب قاضی کی ریش کہا تو وہ ابہام "ریش قاضی" کہاں رہا۔

غالب کا یہ نکتہ شاعروں اور ادیبوں کے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ محاورۂ فارسی جو کسی خاص معنی کیلئے مستعمل ہو، بجنسہ لینا چاہیئے۔ اس میں تغیر کرنا، مثلاً اردو میں ترجمہ کر لینا جائز نہیں۔ شراب چھاننے کے کپڑے کو فارسی میں ریش قاضی کہتے ہیں۔ لیکن اردو میں اس کو قاضی کی ریش نہیں کہتے۔ اس لئے شاگرد کے شعر میں وہ ابہام نہیں رہتا۔ اردو کے شعر میں اس کی مثال ناسخ کا یہ شعر ہے۔

نہ پائی ریش قاضی، تو لیا عمامۂ مفتی
مزاج ان میفروشوں کا بھی کیا ہی لاابالی ہے

امیر مینائی کی اصلاح

خیام لاہور مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۳۹ء میں نواب خلد آشیاں کلب علیخاں رئیس رامپور کی غزل پر امیر مینائی کی اصلاح شائع ہوئی ہے۔ وہاں کوئی توجیہ نہیں بیان کی گئی۔ میں بعض اصلاحوں کے وجوہ عرض کرتا ہوں۔

(۱) شعر نواب۔

کچھ کم تو نہ تھا قتل کو وہ حسن پر افسوس　　کیوں تجھکو دیا چرخ نے بیساختہ پن بھی

اصلاح امیر۔

کچھ کم تو نہ تھا قتل کو وہ حسن پر افسوس　　کیوں اسکو دیا چرخ نے بیساختہ پن بھی

یہ اصلاح بہت دلچسپ ہے۔ صرف ایک لفظ بدلا ہے یعنی دوسرے مصرع میں (تجھ) کی جگہ (اس) کر دیا ہے۔ لیکن اس ذراسی ترمیم سے بڑی خامی رفع کر دی۔ جب دوسرے مصرع میں خطاب ہے تو پہلے مصرع میں (وہ) بے محل تھا۔ اسلئے دوسرے　　مصرع میں بھی ضمیر غائب رکھدی اور شعر کو با معنی بنا دیا　اب اس بات پر غور کیجئے کہ اس شعر میں اصلاح کی ایک اور صورت بھی تھی۔ یعنی دوسرا مصرع بجنسہ رہتا، اور پہلے مصرع میں (وہ) کو (یہ) کر دیا جاتا۔ اور شعر یوں ہو جاتا۔

کچھ کم تو نہ تھا قتل کو یہ حسن پر افسوس　　کیوں تجھکو دیا چرخ نے بیساختہ پن بھی

ممکن ہے حضرت امیر مینائی نے پہلی نظر میں مصرع ثانی کی ترمیم کر دی ہو، یا دونوں صورتوں کو دیکھ کر ایک کو ترجیح دی ہو۔ بہر حال کوئی خاص وجہ ترجیح نہیں ہے۔ دونوں صورتیں یکساں ہیں۔

اس شعر میں ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔ خیام میں یہ شعر اسی طرح چھپتا ہے۔ اسلئے میں نے اس کو بجنسہ رکھ کر یہ بحث کی ہے۔ لیکن میرے نزدیک پہلے مصرع میں (پر) بے موقع ہے۔ ممکن ہے اس کی جگہ (پھر) ہو اور سہو کاتب سے یہ صورت شائع ہو گئی ہو گی۔ یعنی شعر اسطرح زیادہ موزوں تھا۔

کچھ کم تو نہ تھا قتل کو وہ حسن، پھر افسوس   کیوں اسکو دیا چرخ نے بیساختہ پن بھی

(پر) کا موقع بھی نہیں ہے اور یہ لفظ (لیکن) کے معنی میں امیر صاحب کے بعد کلام میں متروک بھی ہے۔

(۲) شعر نواب :—

ہر وقت عبث گرمیاں کرتے ہو عدو سے   کافی ہے جلانیکو مرے دل کی جلن بھی

اصلاحِ امیر :—

بھڑکاؤ نہ دوزخ نہ کرو غیر سے گرمی   کافی ہے جلانیکو مرے دل کی جلن بھی

یہاں حضرت امیر نے (گرمیاں کرنے) کو (گرمی کرنے) سے بدلا ہے۔ اس کا یہ سبب نہیں ہے کہ "گرمیاں کرنا" غلط ہے۔ دونوں محاورے درست ہیں۔ لیکن اس غزل کے وزن و بحر میں (گرمیاں) کا لفظ صاف اور پورے تلفظ کے ساتھ نظم نہیں ہو سکتا۔ نون غنہ تو گرا ہی کرتا ہے۔ یہاں (الف) بھی گرتا ہے اور اس سے بندش سست ہو جاتی ہے۔ اگرچہ (گرمیاں) میں (الف و نون) اردو جمع کی علامت ہے، اور اردو الفاظ میں حروف علت کا گرنا یا دبنا فصاحت کے خلاف نہیں مانا گیا۔ لیکن اسی وقت جب وہ حروف علت لفظ کے بالکل آخر میں ہوں اور ان میں بھی الف میں نہیں بلکہ (ی) اور (واؤ) کیلئے یہ جواز ہے۔ نون غنہ سے پہلے کسی حرف علت کا گرنا فصیح نہیں ہے۔ امیر صاحب نے نواب صاحب کی اس بندش کو درست کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے نواب صاحب کے ذہن میں اس محاورے (گرمیاں کرنا) کی دوسری صورت (گرمی کرنا) نہ تھی۔ ورنہ بندش کا عیب ان کو بھی محسوس ہوا ہوگا۔ وہ خود ہی دوسرا محاورہ لکھ کر درست کر دیتے اور اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دو محاوروں میں سے دہلی میں صرف (گرمیاں کرنا) بولتے ہیں۔ (گرمی کرنا) اہل دہلی کی زبان نہیں ہے اور امیر نواب میں دہلی کی زبان کا اتباع زیادہ تھا۔ اسی کی نواب صاحب کو عادت تھی۔ لکھنؤ میں تپاک اور گرمجوشی کیلئے (گرمیاں کرنا) اور (گرمی کرنا) دونوں مستعمل ہیں۔

اس شعر میں دوسری اصلاح یہ ہے کہ حضرت امیر نے اسلوب ادا بدل دیا۔ اور (بھڑکاؤ نہ دوزخ) کا اضافہ کر دیا۔ ممکن تھا کہ صرف محاورے کی بندش کو درست کر دیا جاتا۔ اور انداز بیان نواب صاحب ہی کا قائم رہتا یعنی شعر یوں بنایا جاتا۔

ہر وقت عبث کرتے ہو تم غیر سے گرمی   کافی ہے جلانیکو مرے دل کی جلن بھی

لیکن رعایت الفاظ لکھنوی طرز بیان کا خاصہ اور امیر کا کمال فن ہے۔ اس لئے عادۃً ان کا ذہن اس طرف منتقل ہوا، اور مصرع کو اس طرح بنا دیا ——— "بھڑکاؤ نہ دوزخ نہ کرو غیر سے گرمی" کوئی دہلوی استاد اصلاح دیتا تو نواب صاحب کے اسلوب بیان کو قائم رکھتا۔ اور اس محاورے سے قطع نظر مصرع کو اس طرح بناتا جیسا میں نے اوپر لکھا ہے۔ یعنی

"ہر وقت عبث کرتے ہو تم غیر سے گرمی"

یہاں لکھنو اسکول اور دہلی اسکول کا فرق نظر آتا ہے۔ لکھنؤ میں رعایت الفاظ کو مقدم سمجھا جاتا ہے جس کے سبب سے کبھی کبھی شاعر کے جذبے اور شعر کی تاثیر کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ دہلی میں ایہام اور مراعاۃ النظیر کو صرف شعر سازی کی خاطر نہیں لاتے بلکہ اس حد تک استعمال کرتے ہیں کہ جذبہ تاثر میں فرق نہ آئے نواب صاحب کے مضمون میں ایک التجا اور سوز و گداز تھا، جو "بھڑکاؤ نہ دوزخ" کے مبالغہ اور طعن سے جاتا رہا۔

(۳) شعر نواب :—

غصے کا اثر صرف نہیں چہرے سے ظاہر   منہ پر کبھی دیتے تھے وہ ابرو کی شکن بھی

اصلاحِ امیر :—

غصے کا اثر صرف نہیں چہرے سے ظاہر   منہ پر کبھی دیتی ہے وہ ابرو کی شکن بھی

نواب صاحب کا دوسرا مصرع ناقص تھا۔ "شکن دینا" ان معنوں میں روزمرہ کے خلاف ہے۔ پھر ابرو کی شکن کیلئے منہ کے لفظ کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ پہلے مصرع میں صرف چہرے سے غصے کے ظاہر ہونے سے انکار ہے۔ اس لئے دوسرے مصرع میں (منہ) کا ذکر غلط تھا۔ حضرت امیر کو اپنی اصلاح نواب صاحب کے الفاظ ہی سے ذہن میں آئی ہوگی لیکن اس طرف ذہن کا منتقل ہونا اور یہ مضمون پیدا کر دینا صرف اہل لکھنو اور امیر صاحب کے حسن تخیل کا کمال ہے۔ دہلی والوں کو یہ بات کبھی نہ سوجھتی۔

اس غزل کے اور شعر چھوڑتا ہوں۔ دوسری غزل کا ایک شعر اور اس کی اصلاح لکھتا ہوں :—

(۴) شعر نواب ———

تم نے جو پوچھا کہ دل میں ہے ترے کیا ارماں   نہ رہا بس کوئی اب حسرت و ارماں مجھکو

اصلاحِ امیر ———

تم نے ارمان مرے دل کے جو مجھ سے پوچھے   کیا بتاؤں نہ رہا اب کوئی ارماں مجھکو

نواب صاحب کے پہلے مصرع میں (جو) کے واؤ کا اعلان اور (پوچھا) کے الف کا گرنا، دونوں فصاحت کے خلاف ہیں۔ دوسرے مصرع میں (حسرت و ارماں) دو چیزوں کا ذکر غیر ضروری بلکہ ناموزوں تھا جب پہلے صرف "ارماں" کہا ہے اور دو چیزوں کیلئے فعل واحد (نہ رہا) بھی غلط تھا۔ امیر صاحب کی اصلاح سے سب خامیاں اور خرابیاں رفع ہو گئیں۔ لیکن (کیا بتاؤں) کی مضمون کیلئے ضرورت نہ تھی اور اس واقعہ اور جذبہ کے موقع پر یوں کہا بھی نہیں کرتے۔ بیساختگی نواب صاحب ہی کے طرز ادا میں تھی۔ اس محل پر بے اختیار منہ سے یہی نکلتا ہے کہ "بس اب کوئی ارمان نہیں رہا"

داغ دہلوی کی اصلاح

اس سے پہلے دو قسم کی مثالیں لکھی گئیں۔ یعنی مرزا غالب نے خود توجیہہ اصلاح بیان کی تھی۔ امیر مینائی کی اصلاح کی توجیہات میں نے بیان کی ہیں۔ اب تیسری صورت دیکھیے کہ شاگرد اپنے کلام پر استاد کی اصلاح کے وجوہ خود بیان کرتا ہے۔ خیام لاہور کے دو پرچوں میں (مورخہ ۱۶ مارچ وکیم اپریل ۱۹۳۸ء) پروفیسر سید منظور علی صاحب ارشاد بی اے نے اپنے مختلف اشعار پر اپنے استاد حضرت داغ دہلوی کی اصلاح شائع کی ہے اور استاد کی اصلاح کے وجوہ خود بیان کئے ہیں۔ میں جناب ارشاد کی توجیہات پر نظر ڈالتا ہوں۔

(۱) شعر ارشاد ———

اے دوستو دل لیکے وہ چٹکی میں ہمارا　　پھر اس طرح ملتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

اصلاح داغ ———

کیا ظلم ہے چٹکی میں وہ لیتے ہی مرا دل　　اسطرح سے ملتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

توجیہہ ارشاد۔ "پہلے مصرع کی اصلاح نے مخاطبہ کو وسیع اور مفید اور دُنیائے تخیل و تحیر کو آباد کر دیا۔ "لیکے" کے بعد "پھر" کی کوئی ضرورت رہی نہ تھی۔ لہٰذا اس کے اخراج اور "سے" کے اضافے نے شعر کو رواں اور پُر تاثیر بنا دیا۔"

اس شعر سے ارشاد صاحب کی شاعری کا اندازہ نہ کیا جائے۔ ممکن ہے یہ ان کی بہت ابتدائی مشق کا شعر ہو۔ ورنہ وہ اچھے شاعر ہیں لیکن انہوں نے یہ توجیہہ عجیب و غریب بیان کی ہے۔ اس میں بس یہ بات تو درست ہے کہ لیکے کے بعد پھر کی ضرورت نہ تھی۔ باقی، ان کا یہ ارشاد کہ اصلاح نے مخاطبہ کو وسیع اور دُنیائے تخیل و تحیر کو آباد کر دیا۔ یا سے کے اضافے نے شعر کو رواں اور پُر تاثیر بنا دیا۔ محض زیب داستان کیلئے ہے۔ ان میں سے کسی توجیہہ کی کوئی حقیقت نہیں۔ نہ کچھ توسیع و افادہ ہوا ہے نہ کوئی آبادی بڑھی ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ارشاد صاحب اصلاح کے اصلی وجوہ کو نہیں سمجھے۔ یہی کہا جائیگا کہ انہوں نے کسی مصلحت سے بیان کرنا نہ چاہا۔

بات یہ ہے کہ پہلے مصرع میں "اے دوستو" کا خطاب عامیانہ اور متروک ہے۔ اور اس سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ (دوستو) کا (واؤ) گر رہا ہے۔ اسی طرح دوسرے مصرع میں (طرح) کی (ح) ساقط ہوتی ہے۔ ان دونوں وجوہ سے دونوں مصرعے نہایت سُست ہو گئے تھے۔ اصل میں یہ عیب رفع کیا گیا ہے۔ (اسطرح) کے بعد (سے) کے اضافے کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ ہو یا نہ ہو۔ بالکل یکساں ہے۔ اصل چیز لفظ (طرح) کا صحیح تلفظ ہے۔ وہ استاد نے بتایا ہے۔

(۲) شعر ارشاد

رنج نے ساتھ مسرت میں بھی چھوڑا نہ کبھی　　وصل کی شب میں مجھے ہجر کا غم یاد آیا

اصلاحِ داغ ———

رنج نے ساتھ خوشی میں بھی نہ چھوڑا افسوس　　کہ شب وصل مجھے ہجر کا غم یاد آیا

توجیہہ ارشاد۔ "وصل کی شب" میں اسقدر تناسب و توافق نہ تھا جسقدر کہ "شب وصل" میں ہے۔ بقول علامہ شبلی مرحوم :۔ کلام کی فصاحت میں لفظ کا صحیح ہونا ہی کافی نہیں۔ بلکہ یہ ضروری ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے ہیں۔ ان کی ساخت، ہیئت، نشست، سُبکی اور گرانی کے ساتھ اس کو خاص تناسب اور توازن ہو، ورنہ فصاحت کا خون ہوگا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ارشاد صاحب کو خاص شوق و ملکہ ہے کہ بات کو چکر دیکر خلط مبحث کر دیتے ہیں۔ یہاں بھی اصلاح کا اصلی سبب بیان نہ کیا۔ (وصل کی شب) اور (شب وصل) کا تناسب و توافق کیا چیز ہے اور علامہ شبلی کا قول یہاں کیونکر صادق آتا ہے۔ اس کو ارشاد صاحب نے ارشاد نہیں فرمایا۔ اور جو کچھ لکھا اس سے دھوکا ہوتا ہے کہ شب وصل اور وصل کی شب میں فارسی و اردو ترکیب اور اضافت سے کوئی فرق پیدا ہو رہا ہے۔ دوسرے اگر یہی بات تھی تو صرف دوسرے مصرع کی اصلاح کی جاتی۔ پہلے مصرع کی ترمیم کا کوئی سبب بیان نہیں فرمایا۔

اصل توجیہہ یہ ہے کہ رنج کا مقابلہ مسرت سے نہیں بلکہ خوشی سے ہے۔ دوسرے مصرع کی اصلاح کا سبب ہے کہ اول تو (وصل کی شب) کے بعد (میں) کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ دوسرے (میں مجھے) تنافر حروف پیدا کر رہا ہے۔

(۳) شعر ارشاد ———

بننے سنورنے سے اُنہیں فرصت نہیں ملی　　ہم لے چلے جنازہ شہیدِ نگاہ کا

اصلاح داغ ———

سرمہ لگانے سے اُنہیں فرصت نہیں ملی　　ہم لے چلے جنازہ شہیدِ نگاہ کا

توجیہہ ارشاد ——— "محض ایک لفظ کی درستی نے قافیہ کو کسقدر مضبوط اور موزوں بنا دیا۔ سبحان اللہ" حضرت داغ کی اصلاح کے متعلق ارشاد صاحب کی تو یہ رائے ہے، اور میری یہ رائے ہے کہ اس اصلاح کی حضرت داغ سے توقع نہ تھی۔ یہ بات نہیں کہ غلط ہے بلکہ یہ رعایت لفظی اس عامیانہ حد تک ہے جو اہل لکھنؤ ہی سے مخصوص ہے۔ مرزا داغ نے شاید اپنے تمام کلام میں اس طرح سے سرمہ لگانے کا ذکر نہ کیا ہوگا۔ سرمہ، مستی، پان کا ذکر اہل دہلی کے ہاں شاذ و نادر ہوگا۔ وہ بھی صرف مناسب الفاظ پیدا

کرنے کی خاطر شاید ایک جگہ بھی نہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ارشاد صاحب کا مصرع شستہ و فصیح نہیں ہے۔ اسلئے بدلنے کی ضرورت یقینی تھی۔ لیکن صرف " آرائش جمال " کا ذکر اور بننے سنورنے کے ہم معنی لفظ کا ہونا کافی تھا۔

(۴) شعر ارشاد ——

اندھیر دیکھئے یہ نسیم بہار کا گُل کردیا چراغ ہمارے مزار کا

اصلاح داغ ——

اچھا سلوک ہے یہ نسیم بہار کا گُل کردیا چراغ ہمارے مزار کا

توجیہہ ارشاد —— " اوّل تو استاذی مرحوم نے " گُل کردیا " کو دو معنی پہنانے کا خیال قائم کیا۔ پھر اپنی فطری ودیعت سے " سلوک " کا لفظ تلاش کیا جو ایسا لفظ ہے کہ اس سے بھی دو کام لئے۔ یعنی نسیم بہار کے ظلم کو کتنی خوبی کے ساتھ کرم سے بدل دیا اور اس طرح زمینِ شعر کو آسمان پر پہونچا دیا "۔

جناب ارشاد صاحب نے یہ توجیہہ بھی عجیب فرمائی ہے جس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ یعنی استاد داغ مرحوم نے نہ " گُل کردیا " کو دو معنی پہنائے ہیں۔ نہ " سلوک " کے لفظ سے دو کام لئے ہیں۔ نہ نسیم بہار کے ظلم کو کرم سے بدلا ہے۔ ارشاد صاحب نے " اندھیر " کی جگہ " اچھا سلوک " دیکھکر وہ باتیں سمجھی ہیں۔ حالانکہ (گُل کردیا) کا دوسرا مفہوم (پھول بنادیا) یہاں بالکل بے معنی ہے۔ دوسرے یہ کہ اگرچہ " سلوک " کا لفظ اچھے بُرے دونو برتاؤ کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن (اچھا سلوک) ایسے موقع پر جیسا یہاں ہے۔ ہمیشہ بُرے معاملے کیلئے آتا ہے۔ " آپ نے یہ اچھا سلوک کیا "" یہ ان کا اچھا سلوک ہے "۔ یہ فقرے ہمیشہ طعنہ کے طور پر بدسلوکی کیلئے بولتے ہیں۔

ارشاد صاحب کے شعر میں جہاں استاد مرزا داغ مرحوم نے جس وجہ سے " اندھیر " کا لفظ بدلا ہے۔ اس کی لائق شاگرد نے قدر نہ کی اور داد نہ دی۔ اصل میں " اندھیر " کا لفظ چراغ اور گل کرنے کی مناسبت سے نہایت پامال، عامیانہ اور لکھنوی تخئیل کا لفظ تھا۔ اس کے مقابلے میں " اچھا سلوک " بھی مفہوم وہی رکھتا ہے۔ لیکن اس میں لطیف طنز اور ہجو ملیح بھی ہے۔

یہاں حضرت داغ مرحوم کی فکر و پسند کا بھی دلچسپ تلوّن نظر آتا ہے کہ ایک جگہ سہرہ لگانے کا عامیانہ مضمون خود تلاش کرکے رکھدیا اور دوسری جگہ ویسا ہی عامیانہ لفظ " اندھیر " نکال دیا۔

(۵) شعر ارشاد ——

جادو ہوا ہے دل پہ کسی چشم یار کا شکوہ عبث ہے گردش لیل و نہار کا

اصلاحِ داغ ——

ایمائے سے ہوا ہے مگر چشم یار کا شکوہ عبث ہے گردش لیل و نہار کا

توجیہہ ارشاد —— " چشم یار کو دل کی جانب سے لیل و نہار کی گردش کی طرف کس نزاکت اور تکلف سے پھیر دیا۔ اور ایماء کی تلاش جس انتہائی بلند پرواز سے کی گئی ہے۔ وہ کسی اور استاد کی قوت متخیلہ سے کہیں بلند تر ہے "۔

یہاں بھی ارشاد صاحب نے اصلی سبب اصلاح بیان نہیں کیا اور اور باتیں بڑے تکلف اور بلند پروازی کے ساتھ لکھدیں۔ اصلاح کی اصلی وجہ یہ تھی کہ ارشاد صاحب کے پہلے مصرع میں (کسی) کا لفظ زبان اور گرامر کے لحاظ سے بالکل غلط تھا۔ (کسی چشم یار) کے یہ معنی ہیں کہ داہنی آنکھ یا بائیں آنکھ۔ ارشاد صاحب کی مراد (کسی یار کی آنکھ) ہے۔ لیکن اس مفہوم کیلئے وہ الفاظ درست نہیں ہیں۔ استاد داغ کو یہ عیب دور کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اصل شعر کے مضمون سے بہتر مضمون ان کے ذہن میں آگیا۔ ارشاد صاحب کا مضمون یہ تھا کہ دل کی موجودہ حالت گردش لیل و نہار کے سبب سے نہیں بلکہ چشم یار کے جادو سے ہے۔ گردش لیل و نہار کا کوئی قصور نہیں۔ اس لئے اس کا شکوہ عبث ہے۔ استاد نے بلاشبہ اس سے لطیف تر مضمون پیدا کردیا کہ ہماری اس حالت کا سبب بظاہر تو گردش لیل و نہار ہی ہے لیکن اس میں گردش لیل و نہار کا اپنا اختیار شامل نہیں ہے بلکہ اس کو چشم یار کے اشارے سے اس کا ایما ہوا ہے۔ اور ہماری گردش تقدیر چشم یار کی رضا و پسند سے ہے۔

(۶) شعر ارشاد ——

ان کی حیا ہے میرے لئے اور بھی ستم عالم نہ پوچھئے نگہ شرمسار کا

اصلاح داغ ——

تھی وہ ادائے عذر ستم اور بھی ستم عالم نہ پوچھئے نگہ شرمسار کا

توجیہہ ارشاد —— " محبوب کی جس شرمیلی ادا کو سامنے رکھکر شعر کہا گیا تھا۔ وہ بولتی ہوئی تصویر استاد نے " ادائے عذر ستم " سے کھینچی، اور شعر کے اصلی معنی کو پورا کردیا "۔

ارشاد صاحب کی یہ توجیہہ بھی پُر لطف ہے یعنی استاد کی نازک خیالی کو بھی اپنے ہی فکر و تخئیل سے منسوب کرلیا۔ ارشاد صاحب تو صرف اتنا کہتے ہیں کہ " نگہ شرمسار کا عالم نہ پوچھئے، یہ حیا اور بھی ستم کرتی ہے "۔ اس میں " ادائے عذر ستم " کا مضمون کدھر سے نکلتا ہے۔ " نگہ شرمسار " کے بہت سے سبب ہو سکتے ہیں۔

ارشاد صاحب کے اور اشعار ترک کرتا ہوں۔ اُنہوں نے اسی طرح اور بھی کہیں اصلاح کی خوبیاں صاف طور پر بیان نہیں کیں۔ ہر جگہ مہمل اور پیچدار عبارت لکھی ہے۔

سیماب اکبرآبادی کی غزل پر اصلاح

یہ چوتھی قسم کی اصلاح پیش کرتا ہوں۔ جو مذکورہ صورتوں سے الگ

اور اپنی نوعیت میں بالکل نئی اور میرے علم میں اپنی وضع کی پہلی اصلاح ہے یعنی ایک مشہور شاعر جو خود استاد ہے اور سیکڑوں شاگرد رکھتا ہے، اس کی غزل پر بغیر اس کی فرمائش کے کوئی دوسرا استاد بطور خود اصلاح دیتا ہے۔ اور شائع کرتا ہے۔ یہ صورت نادر الوجود ہے۔ لیکن شاعری کے طالب علموں کیلئے بصیرت آموز اور سخن سنجوں کیلئے لطف انگیز ہے۔ اس لئے کہ ایک کہنہ مشق شاعر کا غلطی کرنا مشکل ہے۔ پھر اس کے صحیح و درست شعر میں کوئی کیا اصلاح دیگا۔ لامحالہ اس مضمون کو بہتر بنانے کی کوشش کریگا۔ اسلئے کہ صحیح کہنا اور بات ہے اور درجہ و معیار کا تفاوت الگ چیز ہے۔ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ۔

رسالہ "شباب اردو آگرہ" بابت دسمبر ۱۹۳۹ء میں جناب سیماب اکبرآبادی کی ایک غزل پر جناب سیف اجمیری کی اصلاح "مشورہ" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے چند اشعار پر اپنی رائے لکھتا ہوں۔

(۱) مطلع سیماب ــــــ

گراں سمجھ کے جسے سب نے یہ کہا کہ نہیں　　وہ بار دوش پہ میں نے اٹھا لیا کہ نہیں

اصلاح سیف ــــــ

وہ بار جس پہ اک عالم پکار اٹھا کہ نہیں　　اٹھاتے وقت مجھے سر کا ہوش تھا کہ نہیں

تبصرہ ــــ سیماب صاحب کا مطلع بالکل درست تھا، لیکن مضمون معمولی تھا، کوئی لطف و جدت نہ تھی۔ سیف صاحب کی اصلاح نے مضمون کو بہت بلند کردیا۔ اب اس مطلع کا جواب نہیں۔ "سر کا ہوش تھا کہ نہیں" کیا خوب کہا ہے۔ لیکن پہلے مصرع میں ایک عیب پیدا ہوگیا جو بغیر احاطہ فن کے نظر نہیں آیا کرتا۔ یعنی (عالم) کا عین گر رہا ہے اسکو اسطرح کہہ سکتے تھے۔

وہ بار جس پہ زمانہ پکار اٹھا کہ نہیں　　اٹھاتے وقت مجھے سر کا ہوش تھا کہ نہیں

(۲) شعر سیماب ــــــ

نہ مدعی زمانہ ہو، میں نہ کہتا تھا　　زمانہ اب ہے ترے حسب مدعا کہ نہیں

اصلاح سیف ــــــ

اٹھا ہے تو جو زمانے کا مدعی بن کر　　زمانہ بھی ہے ترے حسب مدعا کہ نہیں

تبصرہ ــــ سیماب صاحب کا شعر اپنے مفہوم میں پورا ہے۔ اس مضمون کو پیش نظر رکھ کر کسی ترمیم کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن سیف صاحب نے اسی مضمون میں جو بات نکالی وہ بھی خوب ہے اور جس اسلوب سے کہی ہے اس میں بڑی ندرت ہے۔ حقیقت میں خوب سوجھی۔ سیف صاحب کے شعر میں پہلے "زمانے" سے مراد "عالم" ہے اور دوسرے "زمانہ" سے بخت و تقدیر۔ کہتے ہیں کہ تو جو زمانے کا مدعی بنکر اٹھا ہے تو تیرا زمانہ بھی حسب مدعا ہے۔ تیری تقدیر بھی موافق ہے یا نہیں۔ بخت کی سازگاری کے بغیر تو زمانے کا کیا کرسکتا ہے۔

سیماب صاحب کے پہلے مصرع میں (مدعی زمانہ) سے ثقل پیدا ہوگیا۔ ایک تشدید مدعی میں پہلے سے تھی۔ دوسری اضافت سے پیدا ہوگئی۔ اگر اس کے بغیر چارہ کار نہ ہو تو بیشک جائز ہے۔ لیکن یہاں ناگزیر نہ تھا۔ یوں کہہ سکتے تھے۔ "نہ مدعی ہو زمانے کا میں نہ کہتا تھا"

(۳) شعر سیماب ــــــ

فضا خموش، اعزہ نڈھال، تم محتاط　　کوئی ہمارا جنازہ اٹھائے گا کہ نہیں

اصلاح سیف ــــــ

انہیں حجاب، عدو شادماں، عزیز نڈھال　　مرا جنازہ بھی کوئی اٹھائے گا کہ نہیں

تبصرہ ــــ یہاں سیماب صاحب کے شعر میں بلاشبہ اصلاح کی ضرورت تھی۔ فضا کے سکوت و تکلم یا سکون و حرکت کو جنازہ اٹھانے نہ اٹھانے سے کوئی تعلق نہیں۔ خدا جانے سیماب صاحب کو یہ کیا سوجھی۔ سیف صاحب نے تینوں متعلق باتیں جمع کردیں۔ اس کے علاوہ سیماب صاحب کے شعر میں "تم محتاط" کی احتیاط و اہتمام کی کیا ضرورت تھی۔ "حجاب" نہایت موزوں، حسب موقع اور صحیح جذبہ کا لفظ ہے۔ (ہمارا جنازہ) کے مقابلہ میں (مرا جنازہ) میں جو اثر ہے، اور (بھی) میں جو درد ہے، وہ بھی اہل ذوق سے پوشیدہ نہیں۔

(۴) شعر سیماب ــــــ

جب آنکھ ملتی ہے ان سے، تو غور کرتا ہوں　　نظر کے ساتھ ہے دل کا معاملا کہ نہیں

اصلاح سیف ــــــ

نگاہ ملتے ہی ہوتی ہے جستجو مجھ کو　　نظر کے ساتھ ہے دل کا معاملا کہ نہیں

تبصرہ ــــ سیف صاحب کی اصلاح نے شعر کو نہایت خوبصورت اور دلکش بنادیا۔ ساری غزل میں صحیح تغزل کا شعر اس سے بہتر کوئی نہیں ہے اس مضمون کا سہرا سیماب صاحب ہی کے سر سہرا ہے۔ لیکن انہوں نے غور نہیں فرمایا۔ ورنہ (غور کرتا ہوں) نہ لکھتے۔ "جستجو ہونا" اصلی اور صحیح جذبہ ہے۔ "غور کرنا" علم و فلسفہ کا نتیجہ ہے۔ "جستجو" عشق و اضطراب کا۔ (آنکھ ملنا) اور (نگاہ ملنا) دونوں صحیح محاورے ہیں۔ لیکن "نگاہ ملنا" چونکہ واقعہ ہوتا ہے۔ اسلئے زیادہ لطیف و نازک ہے۔ اسی وجہ سے اساتذہ نے "آنکھ ملنا" کم لکھا ہے، اور "نگاہ ملنا" بہت زیادہ۔ استادوں کے کلام پر نظر ڈالنے سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

(۵) شعر سیماب ــــــ

معاملہ نفس واپسیں تک آپہنچا　　ابھی ہوئی ہے محبت کی ابتدا کہ نہیں

اصلاح سیف ــــــ

معاملہ نفس واپسیں پہ اٹکا ہے　　ابھی ہوئی ہے محبت کی ابتدا کہ نہیں

تبصرہ —— یہاں سیف صاحب کی ترمیم بے جا ہے بلکہ غلط۔ (اٹکا ہے) کہنے کا محل نہیں ہے۔ اٹکنے سے انتظار پایا جاتا ہے یا آئندہ جاری رہنے کا اشارہ ہوتا ہے کہ اٹکاؤ جاتا رہے تو آگے بڑھے۔ لیکن یہاں معاملہ کی انتہا بیان کرنی ہے کہ ہمارا معاملۂ عشق و وفا تو نفس واپسیں تک آ پہنچا ہے اور تمہارے نزدیک ابھی محبت کی ابتدا بھی نہیں ہوئی۔ اٹکنا ان معنوں میں درست ہوتا کہ یہاں معاملہ نفس واپسیں پر اٹکا ہوا ہے۔ تم بتا دو کہ محبت کی ابتدا اب بھی ہوئی یا نہ ہوئی تو ہم رخصت ہوں اور یہ معاملہ ختم ہو لیکن یہاں سوال اور انتظار جواب کا موقع نہیں۔ سیماب صاحب کا یہ شعر عجیب ہے، اور اس غزل میں صحیح تغزل کا دوسرا شعر ہے۔

(۴) شعر سیماب ——

فغان نیم شب و آہ صبح گاہی میں — تجھے پکار رہا ہوں تجھے، سنا کہ نہیں

اصلاح سیف ——

فغان نیم شبی ہو کہ نالۂ شبگیر — تجھے پکار رہا ہے کوئی سنا کہ نہیں

تبصرہ —— یہ اصلاح غور طلب ہے۔ اس سے پہلے کے اشعار میں سیف صاحب نے مضمون میں کچھ نہ کچھ ترقی و اضافہ کیا ہے۔ یہاں دونوں شعروں کا مضمون بالکل یکساں ہے۔ پھر ترمیم کی کیا ضرورت تھی؟ اس کے فیصلے کے لئے ذوق سلیم شاہد ہے کہ پہلا مصرع سیماب صاحب کے مقابلے میں سیف صاحب کا نہایت ڈھلا، سبک و لطیف ہے۔ سیماب صاحب کا پہلا مصرع پورا جملہ نہیں بلکہ جملہ کا جزو ہے۔ اور سیف صاحب کا مصرع پورا جملہ ہے۔ اس طرز ادا نے پڑھنے اور سننے دونوں میں حسن اور لطافت پیدا کر دی۔ سیماب صاحب کے دوسرے مصرع پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ (تجھے) کی تکرار کبھی تہدید کے طور پر ہوتی ہے۔ اس کا یہ محل نہیں۔ کبھی یہ تکرار غایت شوق کے سبب سے ہوتی ہے۔ وہی مقصود ہے لیکن سیف صاحب کے مصرع میں (کوئی) سے ایک خاص لطف پیدا ہو گیا۔ بات یہ ہے کہ کنایہ صراحت سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ ضمیر شخصی یا ضمیر متعین کی جگہ غیر متعین لانے سے بڑا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ خواہ شاعر اپنے لئے استعمال کرے۔ جیسے مرزا داغ فرماتے ہیں۔

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی — بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

یا محبوب کیلئے جیسے کسی کا مشہور شعر ہے:—

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے — کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

پہلے شعر میں (کوئی) کی جگہ (عاشق) اور دوسرے شعر میں (وہ بت) یا ان کے ہم معنی کوئی اور اسم یا ضمیر رکھ کر پڑھنے سے وہ تاثیر باقی نہیں رہتی۔ باقی اشعار کی اصلاح و تبصرہ حذف کرتا ہوں۔

عیش بھوپالی کا شوقِ اصلاح

یہ پانچویں قسم کی اصلاح کا نمونہ ہے، جو ایک حد تک چوتھی قسم سے مشابہ ہے، یعنی یہاں بھی ایک استاد دوسرے استاد کی غزل پر اصلاح دیتا ہے، لیکن خود ہی اپنی اصلاح کے وجوہ بھی بیان کرتا ہے، اور اشعار پر اعتراض کرنے کے بعد ان کو درست کرتا ہے۔ میں نے سیماب صاحب کی غزل پر سیف صاحب کی اصلاح کو نادر الوجود کہا ہے۔ اس سے پہلے میں نے اس طرح کی کوئی اصلاح نہیں دیکھی۔ وہ میری نظر میں پہلی بدعت تھی (حسنہ تھی یا سیئہ، اس کا فیصلہ ناظرین کریں) لیکن اس کے بعد آجکل تقریباً ہر ہفتہ اس طرح کی اصلاحات کا سلسلہ جناب عیش بھوپالی کی کرامت سخن سنجی کی صورت میں جاری ہے۔

جناب عیش بھوپالی حضرت داغ دہلوی کے قدیم تلامذہ میں ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ۷۰ سال کے قریب ہوگی۔ اور غالباً جناب بیخود دہلوی اور جناب سائل دہلوی کو چھوڑ کر آج جناب عیش بھوپالی داغ کے تمام زندہ شاگردوں میں سب سے سن رسیدہ اور کہنہ مشق ہونگے۔ لیکن اس بڑھاپے میں ان کو یہ نیا شوق پیدا ہوا ہے کہ اپنے ہم عصروں اور اپنے سے بلند پایہ تلامذۂ داغ کے کلام پر اعتراض اور اپنی اصلاح شائع فرما رہے ہیں —

آگرہ اخبار آگرہ میں ۲۱ ستمبر ۱۹۴۰ء سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ جناب احسن مارہروی مرحوم، جناب بیخود دہلوی، جناب سائل دہلوی، جناب نوح ناروی اور سلسلۂ داغ کے شعرائے جدید میں جناب جگر مرادآبادی کے کلام پر اعتراض و اصلاح فرما چکے ہیں۔

عیش صاحب کا یہ شوق بہر حالت میں نہایت عجیب تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ اپنی اصلاح سے شعر کو غارت کر دیتے ہیں اور ان کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ پر لطف بات یہ ہے کہ حضرت داغ کا شاگرد اور "طرز دہلی" کا متبع ہو کر بھی عیش صاحب کو لکھنوی رعایت لفظی کی اسقدر دھن ہے کہ لطف و اثر اور شعریت و تغزل کو بے تکلف قربان کر دیتے ہیں۔ اور اس کا نام انہوں نے "ادب اردو کی بہترین خدمات" رکھا ہے۔

اس شوق اصلاح سے پہلے عیش صاحب نے اپنے شعر و ادب کی فیض رسانی کی یہ صورت تجویز فرمائی تھی کہ حضرت امیر مینائی، جناب جلیل، جناب اختر مینائی مرحوم، اعلیٰحضرت نظام دکن وغیرہ کے کلام کی شرح شائع فرماتے تھے۔ میں سب سے پہلے امیر مینائی کے ایک شعر کی شرح درج کرتا ہوں، جو اس سلسلے میں جناب عیش بھوپالی کا سب سے پہلا فیضان تھا۔ اس سے ان کی نکتہ سنجی اور مضمون آفرینی کا اندازہ ہوگا کہ جو معنی فی بطن الشاعر

نہیں ہوتے۔ وہ بہ خلاق معانی پیدا کر دیتا ہے۔ آگرہ اخبار مورخہ ۲۸ جولائی ۱۹۴۰ء میں عیش صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

شرح کلام جناب امیر مینائی مرحوم:۔

ہے نماز ان زاہدوں کی ضعفِ ایماں پر دلیل
سامنے اللہ کے جاتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے (امیر مینائی)

"سامنے اللہ کے جانے سے مراد مسجد میں جانے سے ہے مطلب یہ ہے کہ ان زاہدوں کی نماز ضعفِ ایمان پر دلالت کرتی ہے۔ جب مسجد کو جاتے ہیں تو اُٹھتے بیٹھتے جاتے ہیں رستہ میں لوگوں سے ملاقات کرتے ہیں۔ دُنیا کا تماشہ دیکھتے ہیں۔ اسی طرح مسجد کو بھی پہونچ جاتے ہیں۔ اور نماز پڑھتے ہیں۔ اگر ایمان ضعیف نہ ہوتا تو اذان سُنکر فوراً مسجد میں پہونچ جاتے۔ رستہ کی سیر میں مصروف نہ رہتے۔"

اس شرح کے متعلق آگرہ اخبار میں مہینے ڈیڑھ مہینے تک عیش صاحب سے مباحثہ چھپتا رہا۔ لیکن وہ برابر سخن پروری فرماتے رہے اور کسی طرح یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آئی کہ حضرت امیر مینائی نے طنزیہ طور پر زاہدوں کی نماز کے قیام و قعود کو اُٹھتے بیٹھتے اللہ کے سامنے جانے سے تعبیر کیا ہے اور ضعفِ ایمان کی دلیل گردانا ہے۔

عیش صاحب کی یہ ادا بھی دلچسپ ہے کہ ان کو جانشینیٔ داغ کا دعویٰ ہے اور اس اہتمام کے ساتھ کہ جس مضمون، غزل یا تحریر کے ساتھ اپنا نام لکھتے ہیں۔ ہمیشہ "عیش بھوپالی جانشین داغ دہلوی" لکھتے ہیں۔ کبھی اس اعلان کو نہ خود بھولتے ہیں، نہ دوسروں کو بھولنے دیتے ہیں۔ اب میں اساتذہ کے کلام پر عیش صاحب کی اصلاح کے مختصر نمونے دکھاتا ہوں۔ ان کا اعتراض و اصلاح بجنسہٖ نقل کر کے اپنا تبصرہ لکھتا ہوں۔

(۱) مطلع جناب بیخود دہلوی تلمیذ حضرت داغ دہلوی:۔

جہاں دل ہے وہیں اس شوخ کا ارمان پیدا کر
میرے سینے میں یارب اور بھی اک جان پیدا کر

اعتراض عیش ـــــ جہاں دل ہے وہیں ارمان پیدا کرنے کا ارمان پیدا کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ دل کی جگہ ارمان لے لے۔ شعر مہمل ہے۔ دوسری جان پیدا کرنے سے کیا مراد ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا جبکہ آخر مصرع میں دوسری جان کی خواہش ہے تو ایسی خواہش پر یہ اصلاح ہے:۔

یونہی اس سنگدل کی چاہ کا امکان پیدا کر
مرے قالب میں یارب اور بھی اک جان پیدا کر

تبصرہ ـــــ بیخود صاحب کا مطلع بالکل صحیح اور بہت خوب ہے، اُن کا یہی مطلب ہے کہ دل کی جگہ ارمان لیلے، دل سراپا ارمان بن جائے، دل نہ ہو، اسکی جگہ ارمان ہو، اور یہی ارمان دوسری جان بن جائے۔ حیرت ہے کہ شعر میں جو خوبیاں ہیں اُنہی کی بنا پر عیش صاحب شعر کو مہمل بتاتے ہیں۔ انہوں نے خود جو مطلع بیخود صاحب کو عنایت فرمایا ہے، اس میں سرے سے جان ہی نہیں۔ نہایت عامیانہ و پامال بات کہدی ہے۔

(۲) شعر بیخود دہلوی ـــــ

حیا غمّاز ہے، رازِ محبت کھول دیتی ہے
نگاہِ شرم میں شوخی ترے قربان پیدا کر

اعتراض عیش ـــــ نگاہِ شرم میں شوخی پیدا ہونے کا مطلب تو یہ ہوا کہ شرم میں شوخی بھی ہو۔ غمّاز بھی بیکار ہے۔ اصلاح:۔

نگاہِ شرم تیری ساری چاہت کھولے دیتی ہے
نظر میں اب تو شوخی، میں ترے قربان پیدا کر

تبصرہ ـــــ کیسے اچھے شعر کو عیش صاحب نے کیسا بھدّا کر دیا۔ دونوں مصرعے نظم میں پست ہو گئے۔ دوسرے مصرع میں (اب تو) بیکار ہے۔ بیخود صاحب کا لفظ (غمّاز) جس کو عیش صاحب بیکار کہتے ہیں، نہایت باکار ہے۔ پہلے مجمل طور پر کہا "حیا غمّاز ہے" پھر اسی کی تفسیر کی "رازِ محبت کھول دیتی ہے" اس طرز ادا سے زور، اثر اور لطف پیدا ہو گیا۔ نگاہِ شرم میں شوخی پیدا ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ شرم میں شوخی بھی ہو، بلکہ یہ مطلب ہے کہ شرم کی جگہ شوخی آجائے۔ تعجب ہے کہ عیش صاحب اس روزمرہ کو نہ سمجھیں

(۳) نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی شاگرد و داماد نواب فصیح الملک داغ دہلوی کی غزل پر بھی جناب عیش بھوپالی نے اصلاح کا کرم فرمایا ہے۔ سائل صاحب کا شعر ہے:۔

مٹے جاتا ہے کیوں تو حورِ جنت پر عبث زاہد
حسینوں کی پرکھ، معشوق کی پہچان پیدا کر

اعتراض عیش ـــــ "مٹا جاتا ہے" صحیح ہے۔ آخر مصرع حسینوں کی پرکھ پر مبنی ہے، اسلئے اوّل مصرع سے ربط نہیں رکھتا۔ اصلاح:۔

یہ کیا زاہد، کہ بے دیکھے ہوئے حوروں پہ مرتا ہے
انہیں تو دیکھ لے پہلے تو پھر ارمان پیدا کر

تبصرہ ـــــ یہاں بھی عیش صاحب کی استادی اور جانشینیٔ داغ لائق دید اور قابلِ داد ہے کہ مضمون ہی بدل دیا، اور بدلا بھی تو اچھے کو بُرے سے۔ عیش صاحب کا مضمون نہایت مبتذل و عامیانہ ہے۔ سائل صاحب کا دوسرا مصرع بہت خوبصورت ہے اور مضمون بھی نیا اور دلکش۔ دونوں مصرعے نہایت مربوط ہیں۔ ان کے ربط میں کسی عامی و ناشاعر کو بھی

شبہ نہیں ہوسکتا۔ کہتے ہیں کہ حسینوں کی پرکھ اور معشوق کی پہچان ہوتی تو حسین انسانوں کو چھوڑ کر حورِ جنت پر نہ مٹتا۔ باقی رہا "مٹے جاتا ہے" کا روزمرہ، تو یہ دہلی کی زبان ہے۔ لکھنؤ میں اس کی جگہ "مٹا جاتا ہے" بولتے ہیں۔ عیش صاحب کو یہ امتیاز معلوم ہونا چاہیئے تھا۔ ورنہ "جانشینِ داغ" کا ادعا کیا۔

(۴) جناب نوح ناروی کی غزل پر بھی عیش صاحب نے اپنی استادی کی زور آزمائی فرمائی ہے۔ جناب نوح کا شعر ہے:۔

لطف جب تھا ہر گھڑی پھرتے وہ چشمِ شوق میں
دیکھتا میں جلوۂ دیدار اُٹھتے بیٹھتے

اعتراض عیش ـــــ چشم شوق میں پھرنے سے مطلب کیا۔ اس سے تو مراد یاد آنے سے ہے۔ اصلاح:۔

لطف جب تھا ہر گھڑی رہتا وہ میرے سامنے
دیکھتا میں جلوۂ دیدار اُٹھتے بیٹھتے

تبصرہ ـــــ عیش صاحب شاعرانہ نزاکتوں اور لطافتوں کو نہ سمجھ سکیں تو کوئی ذریعہ ان کو سمجھانے کا نہیں ہوسکتا۔ اسلئے کہ یہ چیز محض ذوقی و وجدانی ہے۔ معلوم ہوتا ہے عیش صاحب کے نزدیک "سپاٹ" کہنے کا نام شاعری ہے۔ عیش صاحب نے جہاں جہاں اصلاح دی ہے، اشعار کے استعارے، کنایے، جدّتِ ادا، ندرتِ خیال کے نقش و نگار کو مٹا کر "سلیٹ" بنا دیا ہے۔ "چشم شوق میں پھرنے" سے مطلب صرف یاد آنا نہیں، بلکہ یاد رہنا اور ہر وقت تصور رہنا ہے اور چونکہ محاورے میں "پھرنے" کا لفظ ہے اس سے نوح صاحب نے وہ مضمون پیدا کر دیا۔

(۵) جناب جگر مراد آبادی کو بھی عیش صاحب نے فیضان سے محروم نہیں رکھا۔ جگر صاحب جذباتی شاعر ہیں۔ اور اپنے جوشِ جذبات اور والہانہ انداز میں آج وہ ہندوستان میں تنہا غزل گو ہیں۔ اُنہوں نے ایک سادہ جذباتی غزل لکھی ہے۔ جس پر عیش صاحب نے اصلاح دی ہے۔ جگر صاحب کا مطلع ہے:۔

بے تاب ہے، بے خواب ہے، معلوم نہیں کیوں
دل ماہیِ بے آب ہے، معلوم نہیں کیوں

اعتراض عیش ـــــ دل ماہیِ بے آب ہے تو اس کی رعایت بھی لازمی ہے۔ اساتذہ کا یہی قانون ہے۔ لفظ بے خواب بھی بیکار، بیتاب کافی ہے۔ اصلاح:۔

دریا پہ بھی بیتاب ہے، معلوم نہیں کیوں
دل ماہیِ بے آب ہے، معلوم نہیں کیوں

تبصرہ ـــــ یہاں عیش صاحب کی استادی معراج ہوگئی۔ ماہیِ بے آب کی رعایت سے یہ کہنا کہ "دریا پہ بھی بیتاب ہے"۔ شاید خواجہ وزیر اور آغا امانت کو بھی نہ سوجھتا۔ یہ عیش صاحب کے تغزل و شعریت کا کمال ہے۔

(۶) شعر جگر مراد آبادی ـــــ

دل آج بھی سینے میں دھڑکتا تو ہے، لیکن
کشتی سی تہِ آب ہے معلوم نہیں کیوں

اعتراض عیش ـــــ "آج بھی" بے رعایت ہے، کشتی سی تہِ آب اس وقت موزوں ہوگی جب سینہ غرق ہوگا۔ اور ربط بھی دونوں مصرعوں کا حسب اصلاح ہوگا۔ اصلاح:۔

کیوں سینہ لئے دل کو ہے اس بحرِ بدن میں
کشتی سی تہِ آب ہے، معلوم نہیں کیوں

تبصرہ ـــــ جگر صاحب کا کیسا نازک، نادر، لطیف اور پُر تاثیر شعر تھا جس کو عیش صاحب نے اپنے گرداب استادی میں ڈبو دیا۔ کشتی سی تہِ آب ثابت کرنے کے لئے سینہ کو بحرِ بدن میں غرق کرنا، داد اور فریاد دونوں سے بالاتر ہے۔ عیش صاحب نے ان شاعروں کی پوری غزلوں پر اصلاح دی ہے۔ میں نے صرف نمونہ دکھایا ہے۔

تبرکات

نواب نصیر حسین خیال
عظیم آبادی
مرحوم

خط لکھا اُس کو بہ اُمیدِ جواب ـــ ہائے قسمت کا لکھا بھول گیا
میری توبہ کو زمانہ گزرا ـــ ساقیا! مے کا مزا بھول گیا
یوں مصیبت سے نہ کٹتی شبِ ہجر ـــ پرسشِ تیغِ ادا بھول گیا
آہ اس دردسے کی میں نے خیالؔ ـــ وہ ستمگار جفا بھول گیا

طوفانِ نوح

یہ دین و ایماں ترے حوالے ہماری نیت بہک رہی ہے

ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی

ہمارے ہی دل کو ہر مصیبت فضائے عالم میں تک رہی ہے
ستم کا بادل گھرا ہوا ہے جفا کی بجلی چمک رہی ہے

نہ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے نشانِ منزل نظر سے غائب
مری تمنا رہِ طلب میں اِدھر اُدھر سر پٹک رہی ہے

جگہ ملی شوخیوں کو دل میں شباب کیا آ گیا کسی کا
نظر بچا کر نظر چرا کر حیا نظر سے کھسک رہی ہے

نکل گیا دل میں تیر آ کر مگر خلش تیر کی نہ نکلی
جو اول اول ہوئی تھی پیدا وہ آخری وقت تک رہی ہے

خدا ہی جانے مآل کیا ہو ستم اٹھاؤں کہ لطف اٹھاؤں
ابھی محبت کسی سے کرتے ذرا طبیعت جھجک رہی ہے

مشامِ جاں دے مجھے سہارا ہوائے الفت مری مدد کر
اگر وہ گذرے نہیں اِدھر سے گلی گلی کیوں مہک رہی ہے

ہزار کی فکر میرے دل نے مگر نہ حسرت نے ساتھ چھوڑا
کھٹکنے والی یہ پھانس پیہم کھٹک رہی تھی کھٹک رہی ہے

لحاظ ہوتا ہو دور جیسے ٹھہر ٹھہر کر کسی کے دل سے
اُسی طرح رُخ سے رفتہ رفتہ نقاب اُن کی سرک رہی ہے

کدھر گئے مے کشانِ عرفاں بجھائیں پیاس اپنی اپنی آ کر
کہ پتی پتی سے فصلِ گُل میں شرابِ فطرت ٹپک رہی ہے

نکل کر آنکھوں سے اِن کا بہنا الگ الگ دُور دُور رہنا
اُسے نہ آنسو بجھا سکیں گے جو آگ دل میں دہک رہی ہے

ہوائیں بدلیں گھٹائیں اُٹھیں بہار آئی پلا دے ساقی
کہ سبز پتوں کے دامنوں سے گلوں کی سُرخی جھلک رہی ہے

نگاہ روشن، دماغ روشن، مکان روشن، جہان روشن
وہ اپنا جلوہ دکھا رہے ہیں ہماری قسمت چمک رہی ہے

گذشتہ عیش و نشاط کے دن کسی طرح اب نہ پھر سکیں گے
خوشی نکل کر ہمارے دل سے جہانِ غم میں بھٹک رہی ہے

مری گراں باری حوادث کہیں جھکا کر نہ توڑ ڈالے
بندھا تھا جس شاخ پر نشیمن وہ سو جگہ سے لچک رہی ہے

ہمارے پہلو میں آپ آ کر لہو کے قطروں کا جوش دیکھیں
یہ وہ پیالہ ہے دل کہ جس سے شرابِ رنگیں چھلک رہی ہے

گھڑی گھڑی ہیں خیال اُس کا گھڑی گھڑی ہیں طبیعت اُس کی
بدل رہا ہے پلٹ رہا ہے اُلجھ رہی ہے اٹک رہی ہے

بہارِ تقویٰ شکن پھر آئی الٰہی توبہ کی آبرو رکھ
یہ دین و ایماں ترے حوالے ہماری نیت بہک رہی ہے

دکھائے کیا آتشِ محبت خبر نہیں دل کا حال کیا ہو
بجھا رہے ہیں ہم اِس کو جتنا اُسی قدر یہ بھڑک رہی ہے

نگاہِ قہر آفریں کی شوخی دل و جگر ہی نے خوب سمجھی
پلٹ گئی جلد برق گر کر جلن بڑی دیر تک رہی ہے

جنابِ نوح اور بحرِ حسرت بچے گی طوفانِ غم سے کیوں کر
تلاشِ ساحل میں کشتیِ دل فضول ہر سو بھٹک رہی ہے

گورکن کی لڑکی

فیلڈنگ ہال کا برمی افسانہ

ترجمہ جناب سالک لکھنوی

"وزیر اعظم حضوری کی اجازت چاہتا ہے، جہاں پناہ!" مانگ سن نے کہا، وہ بادشاہ کا خاص ملازم تھا اور ہمیشہ ہم رکاب رہتا تھا۔

"اچھی بات ہے" بادشاہ نے کہا "اطلاع دو کہ بارہ بجے دربار میں حاضر ہو"۔

"لیکن وہ کہتے ہیں کہ ایک بہت ہی اہم اور پوشیدہ معاملہ ہے جہاں پناہ!"

"اُف!" بادشاہ نے کہا۔ وہ اس وقت اپنی خاص ملکہ کے ساتھ آم کھانے میں مشغول تھا۔ اسکے سامنے صرف پندرہ آم تھے فصل کے چنے ہوئے پندرہ آم۔ اور اسلئے وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس لمحۂ طمانیت میں اسے پریشان کیا جائے۔

"کیا وہ انتظار نہیں کر سکتا؟"

"ان کا خیال ہے کہ معاملہ زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتا۔ جہاں پناہ!"

"نہیں ٹھہر سکتا تو نہ ٹھہرے" بادشاہ جھنجلا گیا۔ "اس محل میں آرام نہیں، ہر وقت کام، ہر وقت کام، کوئی اطمینان سے ایک آم بھی نہیں کھا سکتا۔ جاؤ اسے فوارہ کے قریب آنے کا حکم دو!"

مانگ سن چلا گیا۔ ایک حسین کنیز ہاتھوں میں سونے کا طشت لئے آگے بڑھی، بادشاہ ہاتھ دھونے لگا۔

"کیوں، یہ آخر وزیر کو کونسا ایسا ضروری کام پڑ گیا ہے جو اس قدر گھبرایا ہوا ہے؟" ملکہ نے پوچھا۔

"کیا معلوم!" بادشاہ نے ریشمی تولیہ سے انگلیاں پونچھتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے خزانہ خالی ہو چکا ہو۔ کیونکہ ہیرے بہت ہی قیمتی ہوتے ہیں!" یہ کہتے ہوئے بادشاہ نے ملکہ کے گلے میں پڑے ہوئے بیش قیمت ہار کی جانب اشارہ کیا۔

ملکہ ہنسنے لگی، بادشاہ چلا گیا۔

بادشاہ نے وزیر کو فوارہ کے قریب تنہا پایا۔ مانگ سن دروازہ کے باہر پردے سے لگا کھڑا تھا، اتنی دور کہ بمشکل کچھ سن سکتا۔

"خیر" بادشاہ نے وزیر سے سوال کیا جب وہ کورنش بجا لا چکا۔ "بتاؤ کیا معاملہ ہے؟"

"بہت باریک معاملہ ہے، جہاں پناہ!"

"کیا بغاوت ——؟" بادشاہ نے پوچھا۔

وزیر نے شانوں کو حرکت دی —— "بغاوت؟ جبکہ پوری رعایا جہاں پناہ کو جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے"۔

"تو کیا سرحد پر کوئی آفت ——؟"

"جہاں پناہ کی فوج میں ایسے قابل اور بہادر افسر ہیں کہ سرحد پر آفت کا امکان نہیں۔ آج بھی جہاں پناہ کی بے پناہ فوجیں دائرۂ مملکت کو بڑھانے میں مشغول ہیں"۔

"تو پھر آخر کیا ہے؟" بادشاہ نے پوچھا۔ اسکے چہرہ پر سختی کے آثار نمودار ہو چلے تھے۔

"یہ جہاں پناہ کے چھوٹے بھائی کے بارہ میں ہے" وزیر نے جواب دیا۔

بادشاہ مطمئن ہو گیا "تو یہ بات ہے؟" اس نے کرسی پر زیادہ آرام دہ پہلو سے بیٹھتے ہوئے پوچھا "شاہزادے کے بارہ میں، کس شاہزادے کے بارہ میں؟"

"شاہزادہ کالن، جہاں پناہ!"

"شاہزادہ کالن؟ ہوں! اور ایک لڑکی، کیوں؟ اس مرتبہ کون ہے؟ گذشتہ مرتبہ تو وہ ایک ناظم کی دختر تھی، اس مرتبہ کسی وزیر کی بیوی ہوگی!"

"وزیر نے اپنی بھاری گردن ہلائی —— "اس سے بدتر جہاں پناہ!"

"کوئی ملکہ تو نہیں؟" بادشاہ نے جلدی سے پوچھا۔

"اس سے بھی بدتر جہاں پناہ!"

"اس سے بھی بدتر؟" بادشاہ چلایا "اس سے بھی بدتر؟ آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟ کیا کسی نوالہ یا چچی پر عاشق ہو گیا ہے؟ یا مرکزی کسی دیوی کو غائب کر دیگا؟"

"اس مرتبہ ایک گورکن کی لڑکی ہے!" وزیر نے ٹھہر ٹھہر کر جملہ پورا کیا۔

بادشاہ اچھل پڑا "کیا کہا، ذرا پھر تو کہنا!"

"وہ ایک گورکن کی لڑکی ہے جہاں پناہ! کوہ منڈالے کے قریب رہتا"

قبرستان ہے وہ اپنے باپ کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ بہت حسین ہے لوگ کہتے ہیں کہ محل کی کُل بیگموں سے زیادہ حسین۔ سارے شہر میں اس کا چرچا ہے بعض ہمارے نوجوان وہاں جاتے ہیں اور اُسے پانی بھرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ سارا شہر اس کے پیچھے ہے!"

بادشاہ ایک لمحہ تک سوچتا رہا ــ "یہ یقیناً ایک غیر ممکن بات ہے!" اس نے کہا "ایک گورکن کی لڑکی! میرے خاندان میں کوئی آج تک پست نہیں ہوا۔ آہ! اس خاندان کو ایک گورکن کے خاندان سے ملا دیا جائے؟ ایک گورکن، ازلی غلام، نہیں تمہیں دھوکا ہوا ہے میرے وزیر!"

لیکن وزیر آسانی سے مرعوب نہ ہو سکا ــ "افسوس کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہ حقیقت ہے، جہاں پناہ! آپ کے بھائی شاہزادہ کالن کی نگرانی کیگئی۔ تین بار وہ اُس کنویں پر گئے جہاں ہر شام کو وہ پانی بھرتی ہے شاہزادہ بلاخوف و خطر خود کو وہاں ظاہر کر دیتا ہے اور یہ ارادہ رکھتا ہے کہ اُسے بھگا لیجائے!"

"کب ــ ؟" بادشاہ نے پوچھا۔

"بہت جلد، جہاں پناہ!"

"اور لوگ کہتے ہیں کہ وہ بہت حسین ہے؟"

"لوگ یہی کہتے ہیں ــ"

"لوگوں کے خیال میں وہ کیسی ہے؟"

"وہ کشیدہ قامت ہے، جہاں پناہ!"

بادشاہ نے سر ہلایا۔

"اور نازک بھی!"

"نازک تو ضرور ہی ہوگی ــ" بادشاہ نے تائید کی۔

"اور اس کے بال طویل ہیں!"

"گھونگروالے؟" بادشاہ نے جلدی سے پوچھا۔

"نہیں جہاں پناہ! لوگ کہتے ہیں کہ اس کے بال سیدھے ہیں اور گھٹنوں سے نیچے لٹک رہے ہیں، اور شب تار کے مانند سیاہ! اسکی آنکھیں بڑی بڑی اور سرمئی ہیں اور بھنویں گھنی اور کسی قدر جھکی ہوئی ــ"

"خوب!" بادشاہ بولا ــ "اور اس کی رنگت کیا ہے؟"

"ہمیں ہوشیاری سے کام لینا ہے" بادشاہ نے کہا ــ "اور جلد بازی نہیں کرنا چاہتے" پھر وہ ذرا دیر تک سوچتا رہا ــ "کیا تمہارے خیال میں شاہزادہ آج ہی کوئی کارروائی کریگا؟"

"مجھے تو اُمید نہیں، جہاں پناہ!"

"کل بھی نہیں ــ؟"

"شاید ابھی ایک دو دن نہیں!"

"پھر تو ہمارے پاس کچھ وقت ہے کسی فوری کارروائی کے معنی یہ ہیں کہ جو بدنامی نہ بھی ہوتی ہو وہ بھی ہو جائے۔ اور عوام یہ سمجھیں کہ سب کچھ سچ تھا۔ حالانکہ ہمیں تو یہی اُمید کرنا چاہئے کہ یہ سب جھوٹ ہے میں کوشش کرونگا کہ شام کے وقت شاہزادہ کو محل میں روک لیا کروں۔ کیا تم لڑکی کی نگرانی کر کے مجھے صحیح اطلاع دو گے؟"

"جہاں پناہ کے حکم کی تعمیل ہوگی" وزیر نے کہا۔

"اور" بادشاہ نے کہا جبکہ وزیر رخصت ہو رہا تھا ــ "کیوں کیا تمہارے خیال میں لڑکی اتنی حسین ہوگی؟"

"ناممکن!" وزیر نے کہا۔

"محل میں اتنی حسین عورتیں موجود ہیں" بادشاہ نے کہا "اگر وہ ان سب سے زیادہ حسین ہے تو بیشک تعجب کی چیز ہے۔ میں وثوق سے جاننا چاہتا ہوں!"

"تو کیا میں خود جاؤں اور اُسے دیکھوں، حضور کو اطلاع دوں؟" وزیر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"ممکن ہو تو یہی کرو" بادشاہ نے کہا "میں جاننا چاہتا ہوں۔ اگر وہ درحقیقت اتنی ہی حسین ہے تو وہ آگ سے زیادہ خوفناک ہے۔ ہمیں اپنے نوجوانوں کی حفاظت کرنا پڑے گی۔ کیا تم دو ایک دن میں اطلاع بہم پہنچا سکتے ہو؟"

"میں کوشش کروں گا، جہاں پناہ!"

اسکے بعد دو تین دن تک ہر شام کو کنویں کے تماشائیوں میں ایک سادہ لباس بُڈھے کا اضافہ ہو گیا جو کسی گروہ یا جماعت میں شامل نہ تھا۔ بلکہ سب سے الگ ہٹکر ایک درخت کی آڑ سے سب کچھ دیکھا رہتا تھا معلوم ہوتا تھا کہ اسے لوگوں کے جوش سے گہری دلچسپی ہے ــ تین دن بعد بادشاہ کو اطلاع دیگئی۔

"ہاں تو تم کہتے ہو کہ وہ صرف ایک صاف رنگ قبول صورت لڑکی ہے؟" بادشاہ نے پوچھا۔

"بس جہاں پناہ، ایک دیہاتی دوشیزہ!"

"اور آنکھیں؟"

"اوسط درجہ کی ــ"

"اور جسم کا انداز ــ؟"

"بھدا" وزیر نے جوابدیا ــ "گٹھا ہوا، دیہاتی عورتوں کے مانند۔

"ہوں —" بادشاہ نے زیر لب کہا۔

"اور اسکے بال —" وزیر بیان کرتا رہا — "گھونگروالے اور مختصر ہیں۔ اور اُسکے ہاتھ بڑے بڑے۔"

"اور جلد —؟"

"بہت مدھم ہے جہاں پناہ!"

بادشاہ سوچتا رہا — "یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے کہ نوجوان ایک ایسی لڑکی کے پیچھے دیوانے ہو جائیں؟"

"جی —" وزیر نے اعتراف کرتے ہوئے کہا — "اسمیں کوئی شک نہیں کہ وہ بھلی ضرور معلوم ہوتی ہے لیکن محل کی کسی بیگم کے مقابلہ میں اس کو پیش نہیں کیا جا سکتا۔"

"لیکن شاہزادہ اس سے مسحور ہو چکا ہے، تم کہتے ہو؟"

"اور یہ حقیقت ہے، جہاں پناہ!"

"اور کیا وہ اب بھی کنوئیں پر جاتا ہے؟"

"اکثر، جہاں پناہ۔ ممکن ہے اس پر جادو کر دیا گیا ہو۔ میری رائے میں یہ بہتر ہوگا کہ شاہزادے کو منع کر دیا جائے کہ وہاں نہ جائے۔ یہ ان کی پستی کا باعث ہے!"

"کیا تمہارا خیال ہے کہ وہ مان جائیگا؟" بادشاہ نے پوچھا۔

"جہاں پناہ کے حکم کی تعمیل کے لئے ہر شخص مجبور ہے۔" وزیر نے نیم قدرہ ہوتے ہوئے جواب دیا — "لیکن اگر تنگ کی گنجائش ہو تو بہتر ہے کہ شاہزادے کو ایک مختصر عرصہ کیلئے شہر سے باہر بھیجدیا جائے، اس سے ان کا جوش قدرتاً کم ہو جائیگا۔ یہ ایک بہترین ترکیب ہوگی جہاں پناہ!"

"خیر میں اس پر غور کر دونگا" بادشاہ نے کہا۔

بادشاہ بیوقوف نہ تھا سو وزیر کے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک سوچتا رہا۔

"آخر یہ کیا بات ہے؟ جبکہ اور تمام آدمی تو لڑکی کو حسن کا پتلا بتلاتے ہیں، ہمارے وزیر کی نگاہیں اسے صرف معمولی سمجھتی ہیں۔ اور آخر وہ شاہزادے کے باہر بھیجنے پر کیوں مُصر ہے؟ اگر وہ صرف ایک حسن سادہ کی مالک ہے تو پھر اتنی فکر کیوں؟" جتنا اس نے غور کیا اتنا ہی اسے معلوم ہوا کہ ان تمام باتوں کے پیچھے کوئی ایسا راز ہے جسنے وہ ابتک نہ سمجھ سکا۔ "ممکن ہے وزیر نے کوئی دوسری لڑکی دیکھی ہو؟" بادشاہ نے خیال کیا۔ "لیکن نہیں، یہ خیال تسلی نہیں دیتا۔ ممکن ہے شاہزادے نے رشوت ستانی سے کام لیکر وزیر کو خلاف حقیقت بولنے پر مجبور کیا ہو؟ لیکن نہیں، یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وزیر تو چاہتا ہے کہ شاہزادہ کچھ عرصہ کیلئے باہر بھیجدیا جائے۔ اس میں کوئی راز ہے۔"

"اچھی بات ہے۔" بادشاہ نے دل میں فیصلہ کیا۔ "اب صرف ایک ہی ترکیب ہے۔ میں خود جاؤں اور اُسے دیکھوں۔ اپنی نگاہوں سے بڑھکر کوئی چیز نہیں۔" اور اس نے مُسکراتے ہوئے آئینہ پر ایک نظر ڈالی۔ اسکی نگاہیں صاف تھیں اور روشن! بالکل ایک نوجوان کے مانند! اور پچاس شاہزادیاں روزانہ اسکی تصدیق کرتی تھیں۔ لیکن پھر بھی ایک آئینہ کا فیصلہ پچاس عورتوں کے فیصلہ سے زیادہ معتبر اور پُر حقیقت تھا۔

اسی شام کو بادشاہ محل سے خاموشی سے نکل گیا اور حسب معمول منادی کرا دی گئی کہ چونکہ بادشاہ کی داڑھ میں درد ہے اس لئے دربار نہیں ہوگا۔ محل کے باہر اس کا وفادار خادم مانگ سن مع دو صبا رفتار گھوڑوں کے موجود تھا، بادشاہ فوراً ایک گھوڑے پر سوار ہو گیا — دونوں سرپٹ جا رہے تھے۔

گورکن کا گاؤں قریب ہی تھا۔ بہت جلد دونوں وہاں پہنچ گئے۔ دونوں سادے لباس میں تھے تاکہ کسی کو شُبہ نہ ہونے پائے۔

"ہم اپنے گھوڑے درختوں کے اس جھنڈ سے باندھ دیں گے۔" بادشاہ نے کہا۔

دونوں جھنڈ کی جانب بڑھے جہاں پہنچکر انہیں پتہ چلا کہ انہوں نے وہاں پہنچنے میں سبقت نہیں لی تھی۔ دو خوبصورت گھوڑے پہلے ہی سے وہاں بندھے ہوئے تھے، دو خوبصورت چمکیلی رکاب دار گھوڑے!

"ہوں" بادشاہ نے کہا — "ہمیں دوسری جگہ تلاش کرنا چاہئیے۔"

لیکن دوسرے جھنڈ میں بھی وہی بات تھی۔ دو بہت ہی خوبصورت اور منہ زور گھوڑے وہاں موجود تھے۔ بادشاہ نے دلچسپی کیساتھ انہیں دیکھا۔

"یہ تو عجیب بات ہے۔" اس نے کہا۔

وہ تیسرے جھنڈ کے قریب پہنچے جو خوش قسمتی سے غیر آباد تھا۔ دونوں نے ایک درخت سے اپنے گھوڑے باندھ دیئے اور چلے کنوئیں کی طرف — سورج غروب ہونے کو تھا۔

"ہوشیاری کے ساتھ!" بادشاہ نے تاکید کی — "میں نہیں چاہتا کہ کوئی ہمیں دیکھ لے۔"

دونوں ایک ٹوٹے ہوئے مندر کے پیچھے چھپ گئے جو ایک طوفانی زلزلہ کی زد میں آکر مسمار ہو چکا تھا۔ یہ ایک بڑی مناسب اور موقعہ کے لحاظ سے عمدہ جگہ تھی۔ نہ کنوئیں کے اتنی قریب کہ لوگ آسانی سے اسے استعمال کر سکیں اور نہ اتنی دور کہ اگر کوئی وہاں سے کچھ دیکھنا چاہے تو نہ دیکھ سکے۔

"کیا تم نے اس لڑکی کو دیکھا ہے؟" بادشاہ نے پوچھا۔

"میں نے دیکھا ہے جہاں پناہ!" مانگ سن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تو پھر جب لڑکی ادھر سے گذرے تو تم مجھے اشارہ سے بتا دینا۔"

"اس کے بارہ میں غلطی نہیں ہو سکتی، جہاں پناہ!"

"ہائیں؟ تو کیا وہ اتنی حسین ہے؟" بادشاہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

مانگ سن ہنسنے لگا ــــ لڑکی سامنے سے آ رہی تھی۔

سورج ڈوبنے کو تھا۔ ایک آخری کرن کھلی ہوئی سڑک کو تابان کئے ہوئے تھی۔ اسی کرن نے آنے والی الّڑھ دوشیزہ کی خوبصورتی کو وہ رنگ دیدیا تھا جو شاید آج سے قبل اسکے حصہ میں نہ آیا ہوگا۔ وہ آ رہی تھی، آہستہ آہستہ، کاندھے پر ایک چھوٹی سی گاگر لئے ہوئے۔ اپنے حسن کی کیفیتوں سے آشنا لیکن اسکے اثر سے بے خبر ــــ بادشاہ کو محسوس ہوا کہ کسی رنگین محبت کا مجسم خواب خواب بیداری کی حالت میں اس کے قریب سے گذر گیا۔

بادشاہ نے ایک طویل سانس لی، اس کا سر دیوار کے باہر نمودار ہو گیا، اسکی نگاہیں دُور تک لڑکی کا تعاقب کرتی رہیں۔ "خدایا!" اس کے مُنہ سے نکلا۔

جب وہ کنویں پر پہنچی تو اپنی ہمجولیوں میں گھر گئی جو وہاں پانی بھر رہی تھیں، لیکن بادشاہ جھانکتا ہی رہا۔

"جہاں پناہ کا سر ــــ" پیش خدمت نے دبی زبان سے کہا۔

"کیا ــــ؟" بادشاہ نے غصہ سے پوچھا۔

"ممکن تھا کہ کوئی دیکھ لیتا اس لئے میں نے خیال کیا کہ ــــ"

"ٹھیک ٹھیک"۔ بادشاہ نے کہا اور اپنا سر اندر کھینچ لیا۔

"درحقیقت وہ بہت حسین ہے"۔ بادشاہ نے کہا۔

"بہت حسین ہے جہاں پناہ!"

"محل کی کل بیگموں سے زیادہ حسین و خوبصورت!" بادشاہ نے جوش سے کہا۔

مانگ سن عمداً خاموش رہا۔

"اگر اسے نفیس لباس پہنا دیا جائے"۔ بادشاہ نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔ "اگر اسے نفیس لباس پہنا دیا جائے تو اس کا حُسن حیرت انگیز ہوگا، حیرت انگیز، ایک حقیقی ملکہ کے مانند!"

"لیکن وہ ایک گورکن کی لڑکی ہے!" مانگ سن نے دبی زبان سے کہا۔

"گورکن کی لڑکی! افسوس کہ یہ سچ ہے!" بادشاہ نے اس طرح کہا گویا اسے کچھ یاد آ گیا تھا۔

لڑکی کنویں پر اپنی ہمجولیوں کے ساتھ ہنس رہی تھی، غُل مچا رہی تھی اور اس کے ہنسنے اور غل مچانے کی آوازیں بادشاہ تک آ رہی تھیں۔

"اس کے بال دیکھتے ہو؟" بادشاہ نے کہا۔

"دیکھتا ہوں جہاں پناہ!"

"گھونگریالے تو نہیں معلوم ہوتے، کیوں؟"

"بالکل نہیں ــــ"

"کاش وہ بڈھا احمق وزیر یہاں ہوتا"۔ بادشاہ بڑبڑایا۔ "اس کا تو سر قلم کر دینا چاہیئے"۔

"آپ چاہتے ہیں کہ وزیر یہاں ہوتا اور میرا خیال ہے کہ وزیر یہاں موجود ہے جہاں پناہ!"

"کیا ــــ؟ بادشاہ گھبرا گیا۔

"وہاں، وہ اس درخت کے پاس ــ" مانگ سن نے سڑک کی دوسری جانب ایک آم کے درخت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ــــ "اگر یہ اس کا سفید سر نہ تھا جو اس درخت کی آڑ سے جھانک رہا تھا تو میں نے سخت غلطی کی"۔

بادشاہ کشمکش میں پڑ گیا۔

"کیا تمہارا خیال ہے کہ اس نے مجھے دیکھ لیا ہوگا؟"

"میں ایسا خیال نہیں کرتا جہاں پناہ!" مانگ سن نے جواب دیا ــــ "لیکن میں آسانی کے ساتھ اسے پکار سکتا ہوں"۔

"نہیں کوئی ضرورت نہیں"۔ بادشاہ نے ایک پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

سورج پہاڑیوں کی دوسری جانب غروب ہو گیا۔ آسمان پر کچھ دیر کیلئے ارغوانی روشنی چھا گئی جس کا سایہ ان درختوں پر پڑنے لگا جنکے نیچے وہ تماشائی کھڑے تھے جو ایک گورکن کی لڑکی کو دیکھنے کے لئے بیچین تھے شاہزادے، وزیر، بادشاہ!

"لڑکی تو بہت دیر سے وہاں ــــ"

"میں قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں، جہاں پناہ!"

"کیا ــــ؟"

"یہاں وزیر کے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہے"۔

"کون ــــ؟"

"میرا خیال ہے کہ کوئی شاہزادہ ــ وہاں اس مندر کے قریب ــــ"

"یہ وہی معلوم ہوتا ہے۔ بادشاہ نے کہا۔

شاہزادہ آہستہ آہستہ سرکتے گیا۔ عقب میں اس کا ایک آدمی تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے اپنے ظاہر ہونے کا کوئی خوف نہیں ہے۔ وہ اپنے

آدمی سے بآزادی گفتگو کرتا ہوا آرہا تھا۔

جب شاہزادہ وہاں سے گذرا تو بادشاہ مندر کی دیوار کے پیچھے چھپ گیا۔

"مجھے یقین ہے کہ یہ وہی تھا" شاہزادہ نے اپنے ہمراہی سے کہا۔ "میں نے خود اس کا سفید گنجا سر دیکھا ہے۔ تمہارے خیال میں وہ یہاں کیا کرنے آیا ہے؟"

"شاید حضور کی سراغرسانی — نگرانی —"

"یا لڑکی کی سراغرسانی اور نگرانی کیلئے؟" شاہزادہ نے بلند آواز سے کہا۔ "یہ بڈھے آدمی میں کہتا ہوں کہ آخر —"

شاہزادہ کہتے کہتے رُک گیا۔

"یہاں کوئی اور بھی موجود ہے۔"

"کون ہے؟" اس کے ساتھی نے پوچھا۔

"یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا۔" شاہزادہ نے کہا۔ "لیکن میں نے ایک شخص کو گھومتے دیکھا ہے اور میں اسکی چال سے آشنا معلوم ہوتا ہوں۔ ممکن ہے کوئی اور وزیر ہو، کمبخت!"

"لڑکی آرہی ہے۔" ساتھی نے کہا۔

شاہزادہ سڑک سے ہٹ آیا اور وہاں کھڑا ہو گیا جہاں سے بہت قریب بادشاہ پوشیدہ تھا۔ خوش قسمتی سے ایک پتلی دیوار ان دونوں کے درمیان حائل تھی — "سانس مت لے کمبخت!" — بادشاہ نے مانگ سن سے کہا۔

لڑکی سڑک پر آگئی۔ اسکی گاگر اسکے سر پر تھی اور وہ ایک انداز شاہانہ سے خراماں خراماں آرہی تھی۔ شام بہت گرم تھی اور اب تک کنوئیں پر نہاتی رہی تھی۔ اس کے گھنے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور گھٹنوں سے نیچے لٹک رہے تھے اور اسکے بھیگے ہوئے کپڑے اسکے جسم سے چپکے ہوئے — باریک اور بھیگے ہوئے کپڑوں سے شاہزادہ نے اسکی اُٹھتی جوانی کے لطیف نشیب و فراز کا اندازہ کیا۔ اسکی سڈول رانیں، اس کا اُبھرا ہوا سینہ جس پر پانی کے قطرے ٹھہرنا چاہتے تھے لیکن پھسل جاتے تھے، اسکے وہ مرمریں ہاتھ جو کنگن سے مزین تھے اور اپنی گرفت میں اس گگری کو لئے ہوئے تھے جو سر پر رکھی تھی، سب نے مل کر شاہزادہ پر ایک عجیب کیفیت طاری کر دی — ایک زندہ مرقع حسن، مرکزی بیج کی ایک نئی دیوی — شاہزادہ نے خیال کیا۔

"تو پچاس شاہزادیوں سے بہتر ہے!" شاہزادہ نے زیر لب کہا جب وہ اس کے قریب سے گذری۔

بادشاہ دیوار کے پیچھے چھپا ہوا تھا، کچھ دیکھ نہ سکا۔

"خیر" شاہزادہ نے اپنے ساتھی سے کہا — "اب ہمیں تیار ہو جانا چاہئے۔ کون سا وقت مناسب ہوگا؟"

"میری صلاح تو یہ ہے کہ آدھی رات کے بعد —"

"کیا کہا؟ آدھی رات کے بعد؟ تاکہ ان بڈھے وزیروں کو موقعہ ملجائے کہ وہ اسے لے اُڑیں؟ نہیں اسی ایک گھنٹہ میں!"

"اسی ایک گھنٹہ میں؟" ساتھی نے بے چینی سے کہا۔ "لیکن ابھی تو تاریکی بھی نہیں پھیلی۔"

"جو کچھ بھی ہو" شاہزادہ بولا — "میں ناکامی کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ ہمیں ہمت سے کام لینا چاہئے!"

بادشاہ نے دیوار کے پیچھے سے جھانکا، لیکن بے سود، لڑکی جا چکی تھی۔ وہ مانگ سن کی جانب متوجہ ہوا۔

"اب کیا کیا جائے؟" اس نے کہا۔

"شاہزادہ تو اسے ایک گھنٹہ میں لیجائیگا۔" مانگ سن نے کہا۔

"نہیں، شاہزادہ اسے نہیں لیجانے پائیگا۔" بادشاہ نے تند لہجہ میں کہا۔

"تو پھر مجھے کیا حکم ہے؟"

بادشاہ سوچنے لگا۔

"اچھی بات ہے تم فوراً گاؤں کے چودھری کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ ایک اعلیٰ افسر یہاں اس کا منتظر ہے اس حکم کے ساتھ کہ لڑکی کو لیجائے۔ اس لئے چودھری اور لڑکی اور لڑکی کے باپ کو فوراً یہاں آنا چاہئے۔ جاؤ، میں تمہارا منتظر ہوں!"

"اور اگر پوچھا گیا تو میں کس افسر کا نام لونگا، جہاں پناہ؟" مانگ سن نے پوچھا۔

"ہوں۔ تم وزیر اعظم کا نام لے لینا۔ اس سے اسکے نام پر حرف نہیں آسکتا۔"

"جب ہم لڑکی کو پا جائیں گے تو کیا کرینگے، جہاں پناہ؟"

"تم جاؤ۔ میں اس عرصہ میں غور کر دونگا۔"

بادشاہ غور کرنے بیٹھ گیا۔ روشنی مدھم ہو چکی تھی اور تارے نظر آنے لگے تھے۔ کنوئیں پر لڑکیاں ایک ایک کر کے کم ہو گئیں، یہانتک کہ سڑک بالکل سنسان ہو گئی — دُور سے کسی مندر کے گھنٹہ بجنے کی آواز آرہی تھی۔

بادشاہ سوچتا رہا — وہ حسین تھی، خلاف معمول حسین۔ اس لئے اس کو قتل کرنا تو تقریباً غیر ممکن تھا۔ اسے اس طرح چھوڑا بھی نہیں جا سکتا تھا ورنہ نوجوان گمراہ ہو جاتے۔ پھر شاہزادہ اور ایک گورکن کی لڑکی؟ کتنا خوفناک خیال، کتنی بھیانک حقیقت! پھر اسکے دماغ میں ایک اور خیال آیا جسے فوراً رد کر دیا گیا — محل کی کل شاہزادیاں پاگل ہو جائیں، پچاس پاگل شاہزادیاں!

اگر وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنا تا — نہیں نہیں ہو سکتا اگرچہ میں بادشاہ ہوں!"

رات تاریک تر اور سنسان ہو چکی تھی۔ مانک سن کو گئے ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ بادشاہ کسی قدر فکر مند ہو گیا اور دیوار سے جھانکنا شروع کیا۔ آخر اسکی نگاہوں نے چند آدمیوں کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔

"لڑکی کا باپ کون ہے؟" بادشاہ نے پوچھا۔

"وہ باوجود تلاش کے نہ مل سکا، جہاں پناہ!" مانک سن نے کہا۔

"اور اس چودھری نے بھی کچھ کم پریشان نہیں کیا میرا اعتبار ہی نہیں کرتا تھا اور قریب تھا کہ میں اسے قتل کر دوں کہ خوش قسمتی سے ایک آدمی درمیان میں آ گیا جو مجھے جانتا تھا۔"

"اسے کل پھانسی دی جائیگی۔" بادشاہ نے کہا۔

چودھری قدموں پر گر پڑا — "رحم جہاں پناہ رحم!" — اس نے کہا۔

"اچھی بات ہے۔ اب آگے بڑھو۔ تم لڑکی کے آگے رہو، میں پیچھے ہونگا اور دیکھ —" بادشاہ لڑکی سے مخاطب ہوا — "بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔"

"میں بھاگوں گی نہیں۔" لڑکی بولی۔

"اچھا یہ بتاؤ۔" بادشاہ نے مانک سن سے کہا، "گاؤں کے جس آدمی نے تمہیں پہچانا تھا کیا وہ مجھے بھی جانتا ہے؟"

"وہ جانتا ہے کہ آپ وزیر اعظم ہیں، جہاں پناہ!"

"ٹھیک، بالکل ٹھیک۔" بادشاہ نے کہا۔

اور وہ سب چلے۔ آگے آگے مانک سن، بیچ میں لڑکی اور اسکے بعد بادشاہ اپنی نگاہیں لڑکی پر جمائے ہوئے۔

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔" بادشاہ نے لڑکی سے کہا۔ "تمہیں کوئی تکلیف نہیں دی جائیگی۔ صرف بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔"

گاؤں میں ایک ہلڑ مچ گیا۔ ہر طرف غل تھا، مرد چلا رہے تھے عورتیں چیخ رہی تھیں۔

"کہاں ہے وہ؟" ایک گرجدار آواز نے پوچھا اور جواب میں سیکڑوں آوازیں گونج اٹھیں۔

بادشاہ نے مانک سن پر ایک معنی خیز نگاہ ڈالی۔ وہ راستے سے کترا کے درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھے مگر دیر ہو چکی تھی اور عام تعاقب شروع ہو گیا تھا۔ ایک سوار جو سرپٹ آ رہا تھا اس نے انہیں دیکھ لیا اور چیخ اٹھا اور ایک لمحہ میں سب نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔

شاہزادہ گھوڑے سے کود پڑا اور ان کے قریب آیا۔

"بدمعاش —!" شاہزادہ نے اپنے بڑے بھائی کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔ "تو میری لڑکی کو لے اڑا تھا! میں نے تجھے کنوئیں کے قریب کہیں ضرور دیکھا تھا۔ آخر تو ہے کون؟"

بادشاہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاہزادہ اور قریب آیا اور اسکے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

"خدایا —!" اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔

بادشاہ تذبذب میں پڑ گیا۔ "اگر تم اپنے آدمیوں کو واپس کر دو تو بہتر ہے۔" اس نے کہا۔

"جاؤ، جلد واپس جاؤ —" بادشاہ اپنے آدمیوں پر غرایا۔ "فوراً جاؤ، ایک لمحہ کی دیر نہیں ورنہ —"

لیکن اس کے آدمی جا چکے تھے۔

"دیکھا تم نے؟" بادشاہ نے شاہزادے کو پُر ملامت نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری ان ناشائستہ حرکتوں نے مجھے کہاں تک مجبور کر دیا۔ قریب تھا کہ تم اس لڑکی کو لے اڑتے، اس گورکن کی لڑکی کو، اور اپنے محل میں داخل کر لیتے، اُف! کس قدر ننگ کی بات! خیال تو کرو میں نے تمہیں کتنی پستی سے بچا لیا ہے۔"

"اور خود آپ اسے لئے جا رہے تھے، بڑی مہربانی آپکی"، شاہزادہ بڑبڑایا۔

"نہیں۔ بلکہ میں فوراً اسے یہاں سے دور بھیج دیتا، مانک سن کے ساتھ۔" بادشاہ نے کہا۔

"مانک سن کے ساتھ؟" شاہزادہ نے پوچھا۔

"میرے ساتھ؟"

"ہاں تمہارے ساتھ۔" بادشاہ نے مانک سن سے کہا۔ وہ سخت حیران تھا۔

"میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔" شاہزادہ نے کہا۔

"اور میں بھی —" مانک سن بولا۔

"اور تم دونوں کو ہونا بھی چاہئے۔" بادشاہ نے کہا۔

"آج تم اسے اپنے گھر لیجاؤ!" بادشاہ مانک سن سے مخاطب ہوا۔ "پھر اس جہاز پر سوار ہو جانا جو کل شیبی برما کو جا رہا ہے۔ تمہاری اقامت اب سرحد پر ہوگی۔ رہائش وغیرہ کیلئے کل تمہارے گھر کافی روپیہ پہنچ جائیگا۔ مجھے افسوس ہے کہ لڑکی کا باپ موجود نہیں۔"

"میں کوشش کرونگا کہ اسکے بغیر کام چل جائے۔" مانک سن نے جلدی سے کہا۔

"اور میں بھی یہی کوشش کروں گی۔" لڑکی بولی۔

"پھر تم واپس آنا اور حالات سے اطلاع دینا!"

"حکم کی تعمیل ہوگی، جہاں پناہ!"

"اور اگر اس کے ساتھ تو واپس آئی۔" بادشاہ نے لڑکی سے کہا۔ "تو تجھے زندہ گاڑ دیا جائیگا۔ لیکن یہ آواز کیسی ہے؟"

اور دراصل ٹاپوں کی آواز آ رہی تھی۔ ایک سوار گھوڑا اڑائے چلا آ رہا

تھا، عقب میں دو اور آدمی تھے، تینوں بے تحاشا آ رہے تھے۔
"اب یہ کون ہے؟" بادشاہ نے پوچھا۔
سوار قریب آ گیا اور گھوڑے سے کود کر اس نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"لڑکی میری ہے!" اس نے کہا۔
"غلط ــ" بادشاہ نے کہا "لڑکی میری ہے!"
"بلکہ میری ــ" شاہزادہ بولا۔
"میرا خیال ہے کہ میری ہے!" مانگ سن نے فکر انگیز لہجہ میں کہا۔
لڑکی کچھ نہ بولی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔
نووارد اس عام مخالفت سے آگ بگولا ہو گیا۔ قریب تر آ کر چلایا۔
"تم لوگ ہو کون؟"
"میں شاہزادہ ہوں!" شاہزادہ بولا۔
"اور میں بادشاہ ہوں!" بادشاہ نے کہا۔
"اور تم تو وزیر ہو!" مانگ سن نے نووارد سے خطاب کیا۔
وزیر فوراً دو زانو ہو گیا۔
"میں اس لئے آیا تھا!" اس نے کہا "کہ لڑکی کو لے جاؤں تاکہ شاہزادہ
بدنامی سے بچ جائے اور وقت نہ تھا جو جہاں پناہ سے صلاح لی جاتی!"
"میں خوب سمجھتا ہوں!" بادشاہ مسکرایا۔
"لیکن جہاں پناہ پہلے ہی یہاں پہنچ چکے تھے!" شاہزادہ بولا۔
"اور وقت نہ تھا جو تم سے صلاح لی جاتی!" بادشاہ نے وزیر سے کہا۔
اور پھر بادشاہ اور شاہزادہ اور وزیر محل کی جانب روانہ ہو گئے۔
مانگ سن لڑکی کو گھر کی جانب لے چلا۔

دس دن بعد شہر برہم کے خوش وضع نوواردوں میں ایک رئیس تاجر اور اس کی حسین بیوی بھی تھی۔ تاجر نے لوگوں کو بتایا کہ وہ ہاتھیوں کی تجارت کے لئے وہاں آیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے پاس دولت پھٹی پڑتی تھی۔ اور بہتوں کا خیال تھا کہ وہ کوئی اہمیت کا آدمی ہے کیونکہ لوگوں نے شاید اسے شاہی محل میں دیکھا تھا۔ اس کا نام مانگ سن تھا اور اس کی بیوی خلال دیہات کے زمیندار کی اکلوتی لڑکی تھی۔

(ترجمہ) م

نالہ و نوا

از مولینا اظہر امرتسری

طلب کرتے ہیں جو ظالم سے انصاف التجاؤں سے
خس و خاشاک کی تنظیم کرتے ہیں ہواؤں سے

زمانے بھر میں ہوتی شیخ و ملا ہی کی سلطانی
اگر ہوتا شکوہ سلطنت حاصل دعاؤں سے

نہیں مردہ دلوں کو خوف آشوب و حوادث سے
جو شعلہ بجھ گیا ہو اُس کو کیا خطرہ ہواؤں سے

مری کشتی کی حافظ بن گئی ہر موج طوفاں بھی
خدا کا ہو گیا جب میں بگڑ کر ناخداؤں سے

فقیہہ و شیخ و واعظ اور جاسوسی معاذ اللہ
ہمیں پالا پڑا کن قابل عزت بلاؤں سے

بڑا ہے تو رحیمی میں، بڑا ہوں میں معاصی میں
لگا تو لے مجھے رحمت کا اندازہ خطاؤں سے

تبسم زیر لب سے پرسش درد جگر اظہر
لگانے آئے ہو نالوں کا اندازہ نواؤں سے؟

تجلّیات

سرشارِ ناز ہیں وہ مستِ نیاز ہیں ہم

از حضرت اثر صہبائی ایم اے، ایل ایل بی

در پر ترے پہنچ کر کیا سرفراز ہیں ہم
ہر ایک آستاں سے اب بے نیاز ہیں ہم

سوز و گدازِ اُلفت ہی روح زندگی کی
خوش بخت ہیں سراپا سوز و گداز ہیں ہم

دونوں پہ ایک عالم طاری ہے بیخودی کا
سرشارِ ناز ہیں وہ مستِ نیاز ہیں ہم

نغموں کی ایک دنیا ہم میں ہی ہو ئی ہے
خود تار ساز ہیں ہم، خود نغمہ ساز ہیں ہم

اپنی ہی جستجو میں سرگشتہ ہیں ازل سے
سربستہ راز ہیں ہم، جویائے راز ہیں ہم

رونق ہے اس جہاں کی دونوں کے دم سے یا رب
کچھ کارساز ہے تو، کچھ کارساز ہیں ہم

بے مے ہجومِ مستی بے نے سرورِ نغمہ
وہ میگسار ہیں ہم، وہ نے نواز ہیں ہم

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو سٹیشن لاہور)

زرتشت اعظم کا رومان

تاریخی افسانہ

جناب سید احسان علی شاہ بی۔اے

دانیال نبی پیرانہ سالی کے عالم میں مادیا کے قصبے اکبا تانا میں سکونت پذیر تھے۔ انھوں نے اپنی رہائش کے لئے قلعہ کی سات دیواروں کے قلب میں ایک بلند چٹان پر ایک مینار بنوایا تھا، جس کے شمال میں گھنے جنگلات سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں، جنوب میں میدان، مشرق میں دریا اور مغرب میں کوہ زاغراز کی فلک رس چوٹیاں نظر آتی تھیں، دہ سو سال کے لگ بھگ تھے اور عمر طبعی کی آخری منزلوں سے گزر رہے تھے۔ آج سے سترہ سال قبل معمر نبی نے بابل میں کمرۂ طعام میں کندہ شدہ آتشیں حروف کا مطلب بیان کیا تھا اسی رات کو مغرور بنو نانذ بیلشزار موت کے گھاٹ اتار اگیا اور اسیریا والوں کی سلطنت آخری ہچکی لے کر ہمیشہ کے لئے ماضی کے خوفناک دھندلکوں میں روپوش ہوگئی۔ شہنشاہ سیرس اور کیمبیس کے عہد حکومت میں انھیں متعدد دفعہ صوبائی حکومتوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھانا پڑا تھا اور راعی اور رعایا کے مفاد کے لئے اپنی جان لڑانا پڑی تھی، لیکن اتنی جسمانی اور دماغی شقت اور اتنی ضعیف العمری کے باوجود ان کا ذہن آئینے کی طرح صاف تھا اور آنکھوں میں وہی روحانی چمک نظر آتی تھی جس سے دیکھنے والا مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا البتہ طویل العمری نے ان کے وسیع جسم پر کافی اثر کیا تھا تنا ور جسم قدرے جھک گیا تھا اور چال بھی کچھ سست پڑ گئی تھی۔

قلعہ کے رہائشی محلات کے عین قلب میں اس نے اس مینار کی بنیادیں استوار کی تھیں۔ منزل پر منزل بنائی گئی، ستونوں کی لاتعداد قطاریں قائم کی گئیں رنگ برنگی کے لاتعداد چھجے تعمیر کیے گئے اور مینار کو بنیاد سے لیکر اس کی بلند ترین چوٹی تک نقش و نگار سے اس طرح مرصع کیا گیا کہ اس سخت و شفاف عظیم الشان عمارت کا ہر پہلو کالے رنگ کے جواہر سے ٹنکا ہوا معلوم ہوتا تھا، دوپہر کے وقت سورج کی شعلہ زا کرنیں اسے بیش قیمت ہیرو ں کی [illegible] جگمگا دیتیں اور رات کے وقت چاند کی روپہلی روشنی میں اس [illegible] ہی مائل چمک پیدا ہونے لگتی۔ معمر نبی اس عمارت میں اپنی زندگی کے آخری ایام بسر کر رہے تھے۔

قلعے کے مختلف عالیشان محلات میں معمر نبی کے خاندان کے معزز افراد متمکن تھے ان کے ہمراہ دو اور خاندان بھی تھے [illegible] یروشلم کی تعمیر نو کے وقت [illegible] کی اجازت سیزر کی طرف سے ہوئی تھی، بیت المقدس میں رہنے کی بجائے معمر نبی کے ہمرکاب رہے تھے اور ان کے ساتھ مادیا چلے آئے تھے۔ انھیں کے ساتھ نوجوان زرتشت بھی تھا، اس کی عمر اکتیس سال کے لگ بھگ تھی اور وہ قلعہ کی فوجوں کا اعلیٰ کمانڈار تھا۔ انہی محلات کے ایک علیٰحدہ حصے میں جو شاداب باغ اور باصرہ نواز مینا کاری کے باعث قلعے بھر میں حسین ترین تھا خاندان جوہیاکیم کی شہزادی نیشتہ رہتی تھی۔ نیشتہ مسلمہ طور پر مادیا کی حسین ترین عورت تھی۔ اس کی رگوں میں شاہی خون تھا لیکن صورت شکل کے حسین تناسب کے اعتبار سے شاہی خاندان میں اور کوئی اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔

نیشتہ بابل کی تباہی کے دن پیدا ہوئی تھی۔ دانیال نبی نے اُسے منہ بولی بیٹی بنالیا تھا اور اپنے ساتھ پہلے شوشان اور پھر اکبا تانا میں لے آئے تھے مقدس نبی کے خاندان کی معزز خواتین نے اس غنچے کو پال پوس کر ایک شاداب پھول بنا دیا اب اس کی آنکھوں میں بچپن کے معصومیت پرور تعجب کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ ان کالی کالی آنکھوں میں غرور و تمکنت کا جلال نظر آتا تھا جب وہ آنکھیں جھکاتی تو اس کی لمبی لمبی پلکیں جو اس کے سرخ پپوٹوں پر نیزہ برداروں کی باوقار قطار کی طرح کھڑی تھیں اس کے گندم گوں گالوں کو چھونے لگتیں۔ اس کے حسین خدوخال پر شاہانہ وقار کا پتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ناک کی جڑ کے قریب ایک خفیف جھکاؤ، قدرے گولائی لئے ہوئے نتھنے اور موٹے موٹے ہونٹ جن میں خون کا مدوجزر نمایاں طور پر نظر آتا تھا اس کے یہودی النسل ہونے کا ناقابل تردید ثبوت تھا۔ یہودا کی تمکنت مآب شہزادی اپنے اعضا کی ہر حرکت، اپنے افعال کے ہر پہلو اور اپنے الفاظ کے ہر حرف سے شہزادی معلوم ہوتی تھی جب وہ اپنے مغرور سر کی جنبش سے کسی خیال کی تائید یا تردید کرتی تو اس کی ہر جنبش سے شاہانہ جلال ٹپکتا تھا۔ یہاں تک کہ خود زرتشت اس کے ہاتھوں کے ہر اشارے پر اس طرح سر تسلیم خم کر دیتا گویا خود بادشاہ کے احکام کی فرمانبرداری کر رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ خود معمر نبی جو اپنے رہائشی مینار کی بلندیوں پر بیٹھے ابھی آنے والی غیر معین زندگی کے مختلف پہلوؤں پہ تدبر

فرمایا کرتے تھے نیشتہ کے مقناطیسی اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ اور جب نیشتہ ان کے حجرے میں آتی تو وہ مسکرا کر اپنا جھریوں سے بھرا ہاتھ پھیلا کر اس کا استقبال کرتے۔ نیشتہ دانیال نبی کے سارے خاندان میں عمر کے اعتبار سے چھوٹی تھی۔ وہ شاہی خاندان سے متعلق تھی اور خود غایت درجہ کی حسین تھی۔ ان وجوہ کی بنا پر اکباتانا کا والی اور فوجوں کا کماندار اس کی عزت و احترام میں سر مو کوتاہی نہ کرتے تھے۔ اس پر مستزاد یہ بات تھی کہ دانیال نبی اسیریا میں تعلیم حاصل کرنے اور اپنے خیالات میں اسیریا کے تصورات کا رنگ رکھنے پارس کی فتحمند قوم کی فاتحانہ یلغاروں میں شریک ہونے اور پارسی بادشاہوں کی زیر ہدایت مختلف صوبوں پر حکومت کرنے کے باوجود یہودہ کے ایک سپوت تھے انہیں اپنی قوم کی تاریخی عظمت پر ناز تھا اور وہ یہودی قوم کی چھوٹی چھوٹی غیر اہم شاخوں کے ساتھ دلی لگاؤ رکھتے تھے یہی وجہ تھی کہ وہ ایک غیر بادشاہ کے ماتحت ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اپنی قوم کا بزرگ اور اکباتانا کی رعایا کا خود مختار حاکم تصور کرتے تھے۔

شام کی سرخی آہستہ آہستہ زاغراز کی سیاہ پہاڑیوں کے دامن میں سمٹ کر چھپ گئی۔ آسمان سرد مہر اور سفید نظر آنے لگا تھا اور میدانوں پر ایک سمجھ میں نہ آنے والی افسردگی مسلط ہو گئی تھی۔ آہستہ آہستہ دھندلکے نے اپنا تسلط جمایا اور دھیرے دھیرے شام کی افسردہ روشنی میں تاریکی کے قمقمے چھپکنے لگے۔ بازار کے ملحقہ باغ میں مشرقی پرندوں نے اپنا مخصوص گانا شروع کیا یہاں تک کہ باغ کی فضا میں نغمہ و ترنم کا ایسا دریا ٹھاٹھیں مارنے لگا جس میں دنیا بھر کے سارے تنکے ایک ایک کر کے بہہ جاتے ہیں۔

نیشتہ باغ کی کشادہ روش پر یکہ و تنہا ٹہل رہی تھی، شام گرما کی خشک اور گرم ہوا میں برودت نام کو نہ تھی اس لئے سرنیگر کی بنی ہوئی خوبصورت شال اس کے کندھوں پر ڈھلکی ہوئی تھی۔ اس کی نازک سی پتلی کمر پر سونے کی جڑاؤ پیٹی تھی جو اس کے بالائی لباس کی نازک چنٹوں کو سنبھالے ہوئے تھی۔ یہ چنٹیں پھولوں کے ڈھیر کی طرح اس کے گھٹنوں کے ارگرد جمع ہو گئی تھیں لمبی آستینوں کو جواہرات کے حسین ٹکڑوں نے کلائیوں پر تھام لیا تھا لیکن وہ پھر بھی بڑھ کر اس کے ہاتھوں کو اپنی آغوش میں چھپائے لیتی تھی۔ گھٹنوں سے نیچے بیش قیمت فیتے تھے جو اس کی ساق سیمیں پر بل کھاتے ہوئے ایک حسین سینڈل کی صورت میں متشکل ہو جاتے تھے جس کی اونچی ایڑی اور خوبصورت فیتے نیشتہ کے نازک پاؤں کی لطافتوں میں نشہ خیز اضافہ کر رہے تھے۔ سر پر مل کا ایک حسین و جمیل تاج تھا جس کے پیچوں کو ایک خیرہ کن جواہر پارے نے قابو میں کر رکھا تھا۔ اس تاج کے پہلوؤں میں سے

نیشتہ کی فقید المثال لانبی لانبی سیاہ زلفیں بحر ظلمات کی لہروں کی طرح نکل کر اس کی کمر تک لہرا رہی تھیں۔

اس باغ میں جہاں حسن و لطافت کی یہ شہزادی محو گلگشت تھی ایک چھوٹی سی بارہ دری استادہ تھی جس میں سے مشرقی میدانوں کا سکوت افزا نظارہ صاف نظر آتا تھا۔ نیشتہ کسی گہرے خیال میں ڈوبی ہوئی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اسی بارہ دری میں چلی گئی اور مرمر کی ایک چوکی پر بیٹھ کر مشرقی میدانوں کی ساکن وسعتوں کا نظارہ کرنے لگی۔ شام کے بڑھتے ہوئے دھندلکوں کی سکوت افزا خاموشی آہستہ آہستہ کائنات کے ہر ذرے پر اپنا جادو پھونک رہی تھی۔ پرندوں کا سحر آفریں ترنم جو پہلے بڑھتے ہوئے طوفان کی شوکت لئے ہوئے تھا آہستہ آہستہ ایک اٹھکیلیاں کرتی ہوئی ندی کی نرم موسیقی میں بدل گیا۔ اور پھر مہ گیر خاموشی میں ڈوب گیا دور وسیع میدانوں کے انتہائی گوشوں میں سے چاند ایک طلسمی گیند کی طرح ابھرا اور سیمابی سانپ کی طرح چمکتا، بل کھاتا ہوا دریا طلسمی رنگوں میں ڈوب گیا۔ گلاب کے تختوں سے بلبل تنہا کا دم بدم بڑھتا ہوا، کانپتا ہوا، گھٹتا ہوا اور پھر ملکوتی شان سے بڑھتا ہوا مترنم نغمہ باغ کی معطر فضا میں رقص کرنے لگا۔ باغ کی نرم رو ہوائیں نیشتہ کے چہرے میں گدگدی سی پیدا کر رہی تھیں۔ موتیے، گلاب اور نسرین کی مدہوش کن خوشبوؤں نے اس کے حواس پر نشہ سا چھڑک دیا اور جب طلسماتی چاند کے شاندار قرص نے افق سے ابھر کر اپنی سحر آفریں شعاعوں سے نیشتہ کی حسین آنکھوں میں بوسہ ثبت کیا تو نیشتہ کی رگ رگ میں ایک نغمہ انگڑائیاں سا لیتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ شہزادی کے ہونٹوں سے ایک نغمہ خود بخود گویا ابل پڑا اور وہ اپنی قومی زبان کا ایک پرانا گیت دھیمے سروں میں گنگنانے لگی ——— ایک ایسا گیت جس کا لطیف زیر و بم مشرقی میدانوں کی دبی گھٹی آہوں کے مشابہ تھا۔

"اے میرے محبوب! جب رات کی تاریکی میں حرارت پیدا ہو جائے

میرے پاس آ ——— آ ———،

اٹھ اور رات کے وقت میرے پاس جلدی سے چلا آ ——— آ ———

میں رات کی تاریکی میں اس کا انتظار کر رہی ہوں ——— اور صحرا

کی ریت اڑ اڑ کر میرے خیمے کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی آتی ہے جو صحرا کی طرف ہے۔

میرے کان اس کے قریب آتے ہوئے قدموں کی چاپ سننے کے متمنی ہیں

میری آنکھیں اس کا رستہ تک رہی ہیں۔

میں پلک سے پلک نہیں جھپکاتی تاکہ وہ جب بھی آئے مجھے محو انتظار پائے

جب میرا محبوب آئیگا تو ایسا معلوم ہوگا کہ سورج کی پہلی کرن پھوٹی ہے
ہاں ہاں! میرا محبوب آسمان سے گرتی ہوئی شبنم کی طرح آتا ہے۔
شبنم کو گرتے کس نے دیکھا ہے لیکن اس کا ہر قطرہ ابر باراں کے
فرحت ناک چھینٹوں کی طرح ہر ذرے میں زندگی بھر دیتا ہے۔

وہ اپنے ہاتھوں میں نرگس کے پھول لاتا ہے اس کے داہنے ہاتھ
میں لالے اور بنفشے ہوتے ہیں۔

اس کی پیشانی پر گلاب کے بڑے بڑے پھول ہوتے۔ شہنار کے گلاب
کا تاج اس کے سر پر ہوتا ہے۔

شام کی ہوائیں اس کے لئے بربط بجاتی ہیں۔ تاریکی گانا گاتی ہے۔
جہاں بھی وہ جاتا ہے شیریں نزاکت اس کے ساتھ ہوتی ہے۔

اس کی نغمہ بار آواز آہستہ آہستہ ہلکی پڑ گئی اور آخر ایک لطیف گنگناہٹ میں تبدیل ہو کر خاموش ہو گئی لیکن بلبل تنہا اب بھی بوڑھے چاند کو محبت بھرا گیت سنا رہی تھی نیشتہ مرمر کی سل پر ساکت و جامد بیٹھی تھی کہ قریب کی جھاڑیوں میں سرسر کی آواز پیدا ہوئی اور بارہ دری کی طرف آنے والی سڑک پر تیز تیز قدموں کی چاپ سنائی دی۔ گندمی رنگ کی حسینہ آواز سن کر کچھ چونک سی پڑی لیکن پھر ایک فوری پر لطف خیال نے اس کے سرخ ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پیدا کر دی۔ اس نے اپنے عقب میں دیکھے بغیر اپنا ہاتھ مرمر کی سل پر رکھ دیا اُسے یقین تھا کہ اس کے محبوب کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے آ لگے گا۔ ہاتھ کی ہر جنبش میں ذاتی غرور اور محبت کی سرگوشی پوشیدہ تھی۔ پارسی شہزادہ جلدی جلدی آیا اور آہستہ سے محبوبہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے کے لئے قدرے آگے جھک گیا۔ شہزادی چند لمحوں تک اسی طرح بیٹھی میدانوں کی طرف تکتی رہی پھر دفعتہ پلٹی اور آنکھوں کی ساری کائنات زرتشت کی حسین نگاہوں میں جذب کر دی۔

"آپ کو تو نہیں بلایا تھا میں نے۔" نیشتہ نے زرتشت کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔ اور جب زرتشت نے اسے اپنے ہاتھوں، بازوؤں اور آنکھوں کے مقناطیسی ثقل سے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی تو نیشتہ سرک کر کچھ پرے ہٹ گئی۔

"اس کے باوجود مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میرے دل کی ملکہ مجھے حاضر ہونے کا حکم دے رہی ہے۔" زرتشت نے جواب دیا۔ "میں نے تمہیں اپنی مادری زبان میں میٹھے میٹھے گیت گاتے سنا اور چلا آیا ـــ کیونکہ تم ان گیتوں کے ذریعہ مجھے بلا رہی تھیں۔"

"اچھا! تو آپ کو یہ گمان بھی ہونے لگا کہ سب کچھ آپ ہی کیلئے گایا جا رہا ہے

خوب!" نیشتہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لیکن میرے گیت میں تو صحرا کا، خیموں کے کھلے دروازوں کا اور اڑتی ہوئی ریت کا ذکر تھا ـــ یہ سب یہاں کہاں ہے؟"

"تم نے کہا تھا کہ تمہارا محبوب تمہارے لئے گلاب کے پھول لایا ہے یہ دیکھو گلاب کے پھول، ان میں سے میں تمہارے حسین سر کے لئے تاج بناؤں گا، لیکن نہیں ـــ ! اس طرح یہ خوبصورت تاج خراب ہو جائیگا۔ اچھا تو یہ پھول تمہیں لے لو اور جس طرح چاہو ان کا استعمال کرو۔"

"لئے لیتی ہوں اور ـــ اور ـــ تم جانتے ہی ہو، میں نے ہمیشہ اپنی مرضی برتی ہے۔"

"تو پھر یہ پھول دینے والے کو قبول فرمایئے ملکہ!" زرتشت نے اپنا بازو اس کی نازک کمر میں ڈالتے ہوئے کہا۔ نیشتہ نے زرتشت کے چہرے کی طرف پسندیدہ نظروں سے دیکھا۔ وہ شاید اس سے اس لئے محبت کرتی تھی کیونکہ زرتشت کا رنگ آٹے میں گندھے ہوئے سیندور کی مانند سرخ و سفید تھا۔ اور اس کے خلاف نیشتہ گندمی رنگ کی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ میں بہت دنوں سے اُسے اپنا بنا چکی ہوں ـــ" اُس نے جواب دیا۔

"ابھی نہیں ـــ ملکۂ عالیہ نے اسے ابھی تک پوری طرح سے شرف قبولیت نہیں بخشا!" زرتشت نے ہلکی آواز میں کہا اور اس کے چہرے پر جو چاندنی میں مرمر کی طرح سفید معلوم ہوتا تھا غم و اندوہ کی ایک خفیف جھریری سی چھا گئی۔ نیشتہ نے ایک ہلکی سی آہ بھری اور اپنا حسین سر اس کے کندھے پر ٹیک دیا جس پر زرتشت کے سرخ لبادے کی سمٹی ہوئی چنٹیں نیشتہ کے سر اور زرتشت کے سینہ پر بندھے ہوئے طلائی سینہ بند پر ایک نرم تکئے کا کام دے رہی تھیں۔

"میرے دل کی ملکہ! مجھے آج تمہیں ایک عجیب خبر سنانا ہے۔" زرتشت نے کہا۔ اس کی آواز میں رنج و غم کروٹیں لیتا ہوا محسوس ہوتا تھا اس لئے نیشتہ چونک سی پڑی اور ہراساں نظروں سے اپنے محبوب کا چہرہ دیکھنے لگی۔ "نہیں نہیں! ڈرو نہیں میری رانی! اس خبر میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر متفکر ہوا جائے۔ تم جانو سلطنت میں بڑے بڑے تغیرات ہو رہے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ابھی اور ہونگے۔ سات شہزادوں نے مل کر ثمروتس کو قتل کر دیا ہے اور اس کی جگہ شاہ گستاسب کے بیٹے دارا کو تخت شاہی پر بٹھا دیا ہے۔"

"وہی دارا جو پچھلے سال یہاں بھی آیا تھا؟" نیشتہ نے جلدی سے پوچھا۔ "وہ تو کچھ اچھا نہیں ہے۔"

"ہاں شکل صورت کے اعتبار سے تو واقعی ایسا پسندیدہ نہیں۔" زرتشت نے جواب دیا۔ "لیکن وہ بہادر اور انصاف پسند حاکم ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے اس نے مجھے شوشان میں حاضر ہونے کا حکم...."

"تمہیں ---؟" نیشتہ نے یکلخت زرتشت کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر اس کی آنکھوں کے عمق میں ٹٹولتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔ زرتشت کا چہرہ چاند کے عین سامنے تھا اور نیشتہ اس طرف پیٹھ کئے کھڑی تھی اس لئے زرتشت کے خدوخال کا خفیف ترین تغیر صاف نظر آجاتا تھا۔ اس وقت زرتشت کے چہرے پر مسکراہٹ سی کانپ رہی تھی ---،

"تم ہنستے ہو---؟" نیشتہ نے گرج کر کہا۔ "تم میرا مذاق اڑاتے ہو، مجھ سے جدا ہونے میں تمہیں خوشی محسوس ہوتی ہے۔"

وہ پلٹ کر منہ دوسری طرف پھیرنے ہی کو تھی کہ زرتشت نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

"مجھے اکیلا نہیں جانا ہے" اس نے جواب دیا۔ "شاہ معظم کے احکام یہ ہیں کہ میں مقدس نبی کے علاوہ خاندان جو ہیا کیم کے تمام افراد کو شوشان لیکر حاضر ہوں۔ حضور لوکرم کا خیال ہے کہ محترم نبی عمر کے اعتبار سے بہت کمزور ہو گئے ہیں اور سفر کی صعوبتیں برداشت نہیں کر سکتے اس لئے وہ یہیں رہیں گے اور ہم سب یہودا کی حسین ترین اور محبوب ترین شہزادی کو ساتھ لے کر شہنشاہ دارا کی خسروانہ عنایات کے سایہ تلے شوشان میں حاضر ہو جائیں گے۔"

نیشتہ خاموش ہوگئی۔ اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ زرتشت کی گرفت سے آزاد ہو کر نیچے ڈھلک گیا۔ اس نے مڑ کر خواب آلود نیم باز آنکھوں سے دریا کی طرف جس پر پورے چاند کی سحر زا شعاعیں اس طرح رقص کر رہی تھیں گویا روپہلی سانپ کے جالوں پر ناچ رہی ہوں، دیکھا،

"تم خوش ہو نا؟" وہ مرمریں محل کی طرف پیٹھ کئے اپنی کہنی کا سہارا لئے کھڑا تھا اور اس کا داہنا ہاتھ بے پروایانہ انداز میں اس کی کمر کے گرد لپٹی ہوئی طلائی پیٹی کے بھاری پھندنوں سے کھیل رہا تھا۔ وہ نیشتہ اور دانیال نبی کو یہ خبر سنانے آیا تھا اس لئے سرتاپا فوجی لباس میں ملبوس تھا۔ اس کا سنہرے حاشئے والا زرہ بکتر سرخ رنگ کے بھاری لبادے میں نصف کے قریب چھپا ہوا تھا۔ اس کی تلوار اس کے پہلو میں لٹک رہی تھی اور نوکدار خود سر پر رکھا تھا جس کی پیشانی پر پروں والے پہیئے کا نشان تھا جو شاہان فارس نے اسیریا کی فتح کے بعد اپنے قومی نشان میں شامل کر لیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا سرو قد و قیع جسم اس طریقے سے بنایا گیا ہے جس میں بے پناہ قوت اور بے انتہا تیزی جمع کی جا سکتی ہے اس کے سراپا میں ایک لحظہ از قوت کا احساس ہوتا تھا ایک ایسی قوت اور تیزی کا احساس جو کسی فولادی چلہ چڑھی کمان کو دیکھ کر ہوتا ہے وہ بیک حرکات جن کی قوت و نزاکت بیان نہیں کی جا سکتی اور وہ بے مثال تیزی جو اس وقت کے لوگوں میں تھی جبکہ دنیا جوان تھی، سب کی سب سمٹ کر اس میں جمع ہو گئی تھی۔ اس کے اعضا میں مکمل اور یکساں مناسبت موجود تھی جو آرام میں حسن اور کاہلی میں حرکت کی نرالی شان پیدا کر دیتی ہے۔

یہودا کی شہزادی اور حسین پارسی اکٹھے کھڑے تھے۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ حسین تھے لیکن اس کے باوجود شکل و شباہت میں بالکل مختلف تھے۔ ان دونوں میں عمرانی اور نسبی فرق صاف ظاہر تھا--- سامی اور ایرین نسل کا وہ اختلاف جو پہلی نظر میں معلوم ہو جاتا ہے جنوبی علاقوں کی رہنے والی نسل کو فراعنہ مصر نے ہزاروں سال تک طوق و سلاسل میں مقید رکھا اور صحرائی ہواؤں کو ان پر اپنا رنگ جمانے کا پورا موقع دیا۔ یہاں تک کہ یہ لوگ شاہ خاور کی دستی کتاب بن کر رہ گئے جن کے ہر عضو پر اس کے کبھی نہ مٹنے والے نشان پیدا ہو کر رہ گئے تھے، اس کے مقابلے میں شمالی برفانی علاقوں کی سفید فام نسل تھی جن کی بیڑنی جلد پر برفانی ہواؤں نے اپنا غازہ چھڑکا تھا۔ یہاں تک کہ یہ قومیں برف کی طرح سفید اور فولاد کی طرح قوی ہو گئی تھیں۔

"تم یہ سن کر خوش ہوئی ہو نا؟" زرتشت نے نیشتہ کے چہرے کی طرف دیکھ کر شہزادی کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ نیشتہ خاموشی سے کھڑی خوابناک آنکھوں سے دریا کی طرف تکتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بولنا چاہتی ہے لیکن پھر خاموش ہو گئی۔ کچھ جھجکی اور جواب دینے کے بجائے زرتشت پر ایک اور سوال کر دیا۔

"زرتشت --- کیا تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو؟" وہ کہتے کہتے پھر رک گئی اور جب زرتشت نے اس کا نرم و ملائم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی مخملیں جلد پر ایک پر حسرت بوسہ ثبت کیا تو نیشتہ نے دوسری طرف منہ پھیر کر پوچھا۔ "محبت کے کیا معنی ہیں؟"

زرتشت جواب دینے سے پہلے چند لمحوں تک خاموش رہا۔ پھر شاہانہ جسم سیدھا کر کے نیشتہ کے سر کو اپنے سینے سے لگا کر مشرق کی طرف تکتے ہوئے بولا۔

"سنو، میرے دل کی ملکہ! میں جو تمہاری محبت کے نشے میں چور ہو رہا ہوں تمہیں محبت کے معنی سمجھاتا ہوں۔ یہاں سے بہت دور،

افق کی اس رنگین منزل میں جہاں روحیں بستی ہیں، بیرونی آسمان کے اثیری بُعد میں جہاں ستاروں کے ذرّات مل کر دھندلکا بناتے ہیں ہم دونوں کی روحیں خدائے پاک کے حکم سے زندگی سے آشنا ہوئیں اور ایک دوسرے سے مل گئیں۔ اس سے پہلے کہ زمیں ہمارے لئے مقدر ہو، ہم ایک ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ ہماری زندگی امروز فردا کے پیمانے کی محتاج ہو ہم ایک تھے اور اس وقت تک ایک رہیں گے جب وقت کی قیدیں مٹ جائیں گی۔ پھر عقل کُل نے ہم دونوں کی روحوں کو ستاروں سے لیا اور کچھ مدت کے لئے فانی جسم میں مقید کر کے اس دنیا میں بھیج دیا باوجودیکہ اس خاکی پیرہن نے ہم دونوں کی آنکھوں کو دھندلا کر دیا ہے اور ہم صاف طور پر ایک دوسرے کو پہچاننے سے قاصر ہیں پھر بھی ہم جانتے ہیں کہ ہم صبح ازل سے ایک تھے اور شام ابد تک ایک رہیں گے ہماری محبت کسی طرح بھی کم نہیں ہوتی بلکہ روز افزوں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے فانی جسم ہماری غیر فانی روح کی طرح رنج و راحت کا احساس رکھتے ہیں۔ میں اسی جسم کی بدولت تمھارے لئے رنج و مصایب برداشت کرنے کے قابل ہوا ہوں اور اس میں مسرت محسوس کرتا ہوں میری سب سے بڑی تمنا یہی ہے کہ تمھارے قدموں پر زندگی قربان کر دینے کے لئے میرا انتخاب عمل میں آئے تاکہ میں تمھیں اپنی محبت کی گہرائی بتا سکوں تم کبھی میری محبت پر بے اعتمادی کا اظہار کرتی ہو اور کبھی اپنی ذات پر شبہات محبت کے لئے زہر ہلاہل سے کم نہیں ہوتے نیشتہ!

محبت آغاز سے لیکر انتہا تک ہے بلکہ انتہا سے بھی ماوراء محبت اتنی غیر فانی، اس قدر عظیم اور اتنی مکمل ہے کہ اس کے مقابلے میں ہماری یہ دنیاوی زندگی ایک معمولی واقعے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ یوں سمجھ لو کہ ہمیں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ستاروں کی ایک دنیا سے تجلی کے لامتناہی راستے پر چل کر دوسری دنیا میں جانا ہے اور یہ خاکی دنیا صرف ستانے کی جگہ ہے —— ہماری یہ دنیاوی زندگی کچھ بھی تو نہیں۔ اس سے پہلے کہ ہماری محبت کی عمر کچھ دن ہو یہ زمین جس پر ہم پیر جمائے کھڑے ہیں۔ یہ چیزیں جن کی موجودگی ہماری قوت احساس کی رہین ہے، ہمارے یہ جسم جن کو ہم اتنا قوی اور حسین تصور کرتے ہیں مٹ جائیں گے ان کے اجزا منتشر ہو کر موت کے ان بے نشان ڈھیروں میں مدغم ہو جائیں گے جن کا پتہ ماضی کے کسی کونے میں نہ ملے گا لیکن ہم اس وقت بھی جوان ہونگے ہمارا حسن اس وقت بھی بے مثال ہوگا اور ہم اس وقت بھی اپنے غیر فانی عشق میں سرشار ہونگے

نیشتہ نے حیران نظروں سے اپنے محب کی طرف دیکھا۔ اور پھر اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔ زرتشت کے بیباک خیالات ہمیشہ فلک پیمائی کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور وہ ہمیشہ اپنے بے خوف تخیلات کی مدد سے نیشتہ کو حسن اور روح کی کسی پُراسرار وادی میں لیجانا چاہتا تھا، وہ لمحہ کے کچھ حصے کے لئے خوفزدہ سی ہو گئی۔ پھر اپنے مخصوص انداز میں بولی:

"مجھے اس زندگی سے محبت ہے، میں تم سے اس لئے محبت کرتی ہوں کیونکہ تم زندہ ہو نہ اس لئے کہ تم ایک بیکس روح ہو۔ جسے چند دنوں کے لئے ہاتھ پیر باندھ کر زبردستی اس دنیا کے قید خانے میں ڈال دیا گیا ہے۔ میں اس نرم شیریں زمین سے محبت کرتی ہوں۔ مجھے اس آفتاب سے محبت ہے جو اپنے طلوع و غروب میں یکساں طور پر حسین و شاندار ہے مجھے چاند سے محبت ہے، اس کے گھٹتے اور بڑھتے ہوئے پیکر سے محبت ہے، مجھے ریحان و نسرین، چمپا اور گلاب کی مست خوشبوؤں سے عشق ہے۔ ان کی رفیع الشان روشنی، حرارت کی جاں پروری اور سبزے کا تجمل، ہوا کے پرندوں کی موسیقی آفرینیاں اور میدانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی نغمہ باریاں، ٹڈی دل کی گنگناہٹ اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ کتنی پیاری ہوتی، سونے کی چمک دمک اور سُرخ مخمل کی آب و تاب تمھارے حیرت انگیز محافظوں کے قدموں کی چاپ اور صبحدم ان کے لرزہ خیز طنبوروں کی صدائیں کتنی موہنی ہوتی ہیں تاریک رات کا مخملیں گداز، ہاتھی دانت جیسی اجلی چاندنی میں بلبل کا ترنم۔ گلاب کی جھاڑیوں میں سرسراتی ہوئی ہوائیں اور میرے باغوں میں سوتے ہوئے پھولوں کی معطر سانسیں کس قدر جاذب ہوتی ہیں۔ مجھے تو الو کی اس سمع خراش چیخ سے بھی محبت ہے جو مقدس نبی کے مینار پر بیٹھ کر بولتا ہے اور میں تو چمگادڑوں کی اس پھڑپھڑاہٹ پر بھی جان دیتی ہوں جو دیوانہ وار میرے دروازوں کے پردوں سے سر پھوڑتی ہیں۔ میں دنیا کے ہر ذرّے سے محبت کرتی ہوں کیونکہ ہر ذرہ جوان ہے اور ہمارے لمس کو محسوس کر کے لپک جاتا ہے۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں زرتشت کیونکہ تم دوسرے مردوں سے کہیں زیادہ خوبصورت، کہیں زیادہ توانا اور کہیں زیادہ بہادر ہو اس لئے کیونکہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو اور میرے لئے اپنی زندگی تک کو قربان کر دینے پر تیار ہو۔ میرے محبوب! کاش مجھ سے سارے دنیا کے ترنم سما جائیں۔ کاش ہوائیں مجھے اپنی نغمہ باریاں چند لمحوں کے لئے دے دیں اور میں ان مترنم الفاظ میں اپنے دل کی کہانی تمھیں سناؤں —— تمھیں بتاؤں کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے؟"

"میری شہزادی! شیرینی اور فصاحت کی تو اب بھی کمی نہیں" زرتشت نے کہا۔ "تمھاری آواز سے زیادہ مترنم آواز اور تمھاری زبان سے زیادہ فصیح زبان کی ضرورت نہیں۔ تمھاری محبت اپنے رنگ میں

خاص ہے اور میری محبت اپنے رنگ میں۔ یہ دونوں مل کر ایک ایسی محبت میں بدل جائیں جس کا جواب دنیا کی تاریخ پیش نہ کر سکے گی۔ آؤ اپنے عہد ناموں پر دوبارہ اخلاص کی مہریں ثبت کریں۔ "محبت موت سے قوی ہے" یہ تمہارے استاد کا قول ہے۔"

"اور رقابت قبر سے زیادہ سنگدل ہے یہ بھی تو انھیں کا ارشاد ہے" نیشتہ نے کہا۔ اور ان دونوں کے ہونٹ ایک بیقرار تڑپ کے ساتھ ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے۔ اس وقت نیشتہ کی آنکھوں میں شعلے سے رقص کر رہے تھے۔ "زرتشت! مجھے حسد و رقابت کی طرف لے جانے کی کوشش نہ کرنا، کبھی نہ کرنا یہ کوشش، ورنہ میں سراپا ظلم بن جاؤنگی، اتنے ظلم ڈھاؤں گی کہ تم ان کا قیاس نہیں کر سکتے۔"

زرتشت اپنی ریشمی داڑھی کی اوٹ میں ایک گہری ہنسی ہنسا، قلبی مسرت کی گدگداتی ہوئی سی ہنسی جس نے چاند کی ہمہ گیر خاموشی کو تڑپا دیا ——،

"ہُرمزد اور ہرال کی قسم! اس دنیا میں تمھیں حسد کرنے کی ضرورت نہیں ——" اس نے کہا۔

"اپنے جھوٹے دیوتاؤں کی قسم مت کھاؤ۔ تمھیں معلوم ہے میں چھوٹی سی بات پر بگڑ جایا کرتی ہوں۔" نیشتہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں چھوٹی سی بات بھی نہ ہونے دونگا کبھی۔" پارسی نے جواب دیا "اور جہاں تک ان جھوٹے دیوتاؤں کا تعلق ہے وہ فی زمانہ کم از کم قسمیں اٹھانے کے کام آسکتے ہیں۔ لیکن اگر تمھیں اس سوگند پر یقین نہیں آتا تو میں ہر اس دیوتا اور ہر اس قوت کی قسم کھانے کو تیار ہوں جس کا تم مجھکو حکم دوگی۔"

"قسم کھاؤ ہی مت! ورنہ تمھیں اس پر بھی مُہر ثبت کرنے کی سُوجھ جائیگی" نیشتہ نے اپنا نصف چہرہ چادر میں چھپاتے ہوئے کہا۔ "اور یہ بتاؤ کہ سفر کب شروع کرنا ہے؟ اب فوراً ہی چل دینا ہے یا دوسرے حکم کا انتظار کرنا ہے؟ کیا شاہ دارا محفوظ ہیں؟ دربار میں کون سا امیر سب سے زیادہ قوی ہوگا؟ ان سات شہزادوں میں سے کوئی ایک یا ان کا بوڑھا باپ؟ "کیا تمھیں ان تمام تغیرات کے متعلق کچھ معلوم ہے؟ تم ایک معزز امیر ہو، اعلیٰ عہدہ دار ہو، اور تمھیں ان سب باتوں کا علم ہوگا پھر تم نے مجھے اتنی دیر بتایا کیوں نہیں ——؟"

"تمھارے سوالات مجھ پر اس طرح جھپٹ پڑے ہیں جس طرح کبوتر اس نازنین پر جھپٹ پڑتے ہیں جو انھیں اپنے ہاتھ سے دانا دُنکا کھلاتی ہے۔" زرتشت نے مسکرا کر کہا۔ "میں حیران ہوں کہ کس کا جواب پہلے دوں، بادشاہ سے تو مجھے پوری امید ہے کہ وہ سلطنت کو بڑے مضبوط ہاتھوں سے تھامے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بادشاہ بننے سے پہلے ہی وہ مشرقی سمندر سے لیکر مغرب کی ہولناک پہاڑیوں تک کی رعایا کو بڑی عزت اور محبت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا لیکن اس خبر سے پہلے ایسا شبہ گزرتا تھا کہ ساتوں شہزادے سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے آپس میں بانٹ لینگے اس لئے میرا خیال ہے کہ اگر بادشاہ سلامت تمھاری قوم کے کسی آدمی کو مصاحبت کیلئے تجویز فرمائیں تو بہتر رہے گا اب یہاں سے چلنے کے متعلق یہ بات ہے کہ ہمیں جلد از جلد چل دینا چاہیئے ورنہ شاہ معظم ہمارے شوشان پہنچنے سے پہلے ہی جنوبی صوبہ ستاخر میں تشریف لے جائینگے جہاں وہ سرما کے لئے محل بنانا چاہتے ہیں اس لئے میری شہزادی سفر کے سامان سے جلد از جلد لیس ہو جائے تبھی اچھا ہے تاکہ ضرورت کی کوئی چیز یہاں نہ رہ جائے اور وقت پڑنے پر تمھیں کسی چیز کی ضرورت پریشان نہ کرے۔"

"مجھے آج تک کسی چیز کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔" نیشتہ نے قدرے غرور سے اور مذاق سے کہا

"اور جب تک میری محبوبہ میرے ساتھ ہے مجھے بھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوگی" پارسی نے جواب دیا۔ "اب چاند کافی بلند ہو چکا ہے اور مجھے یہ خبر آقائے محترم مقدس نبی کی خدمت میں جلد از جلد پہنچانا چاہیئے۔"

"اتنی جلدی!" نیشتہ نے طنز آمیز لہجے میں کہا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ہم ایک لمحہ کے لئے بھی جدا نہ ہوں۔" زرتشت نے نیشتہ کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ لیکن نیشتہ پرے ہٹ گئی۔

"الوداع! شب بخیر، میری شہزادی، میری روح کی روشنی شب بخیر" زرتشت نے اس کے گندمی گالوں پر محبت بھرا بوسہ ثبت کرتے ہوئے کہا۔ "شب بخیر" اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

"زرتشت! —— شہزادہ زرتشت!" نیشتہ نے اسے بلند آواز سے پکارا۔ وہ واپس آگیا۔ نیشتہ نے دونوں باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں اور بے جگر ہو کر اس پر بوسوں کی بارش شروع کر دی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے آہستہ سے اُسے پرے ہٹا دیا۔

"جاؤ! —— میرے دل، —— بس یہی کام تھا" اس نے زیر لب کہا اور زرتشت اسے سنگ مرمر کی بارہ دری میں اکیلی چھوڑ کر چلا گیا۔ چاند آہستہ آہستہ آسمان کی بلندیوں پر چڑھتا رہا اور اس کی تیز روشنی زردی میں بدل گئی۔ بلبل شوریدہ سر کا محبت بھرا نغمہ، سوز عشق کے طویل اور میٹھے نالوں اور رنج و راحت کی ملی جلی دھیمی شکایتوں کی صورت میں پھولوں کی ٹہنیوں اور مرمریں بارہ دری کے سفید دیواروں پر سے سنائی دیتا رہا۔



ملکۂ حبش کا نامۂ شوق



شیریں فرہاد

بے جوڑ شادی

معاشرتی افسانہ

از جناب آسی امنگری

سومترا نے بڑی بوڑھیوں کو کہتے سنا تھا — "دوہے کی بیوی اور بادشاہ کی گھوڑی جتنا ہی کودے اتنی تھوڑی!!" لیکن دوہے کی بیوی بنکر بھی کودنا تو دور کی بات رہی سومترا کیلئے چلنا پھرنا دوبھر ہو رہا تھا — وہ بالکل بوڑھے کی بیوی ہو — یہ بات نہ تھی۔ برج موہن کو دیکھکر کوئی انہیں بوڑھا نہیں کہہ سکتا تھا۔ اڑتیس سال کا مرد اگر تندرست و توانا ہو تو اُسے بوڑھا نہیں کہا جاسکتا۔ ہاں اسے زیادہ سے زیادہ ادھیڑ کہہ سکتے ہیں۔ برج موہن بابو کی عمر زیادہ سے زیادہ سینتیس اڑتیس کے درمیان تھی۔

میانہ قد، سانولے رنگ اور گداز جسم برج بابو کی پہلی بیوی جب انہیں اور بچوں کو تنہا چھوڑ کر چل بسی تو انہوں نے اسکی تیرھویں کے دن آنکھوں میں آنسو بھر کر اپنے رشتے ناتے کے چچا ماموں اور بڑے بھائیوں سے کہا — "اب میں پنشن لے لونگا۔ پربھا تیرہ برس کی ہو گئی ایک دو سال میں اپنے گھر بار کی ہو جائیگی۔ لڑکے جب بڑے ہونے لگے تو دیکھا جائیگا۔ اب کس کے لئے دفتر کی چکی پیسوں؟"

برج بابو کی باتیں سنکر لوگوں نے انہیں سمجھایا اور کہا — "پاگل ہوئے ہو کل کے لڑکے ہو کر ہمارے سامنے ایسی باتیں کرتے ہو؟ پربھا تو دو برس میں پرائی ہو جائے گی۔ پھر تینوں لڑکوں کیلئے تم چولھا پھونکو گے؟ ارے عورت کا کیا ایک گئی دوسری تیار، اور پہلی سے کہیں اچھی۔ تم نے بھی اچھی فکر مول لی۔ سو روپے ماہوار پاتے ہو۔ بھلا تمہیں اور لڑکی کی کمی۔ ذرا بیٹھے رہو۔ لڑکی والے خود آکر تمہارے قدم نہ چومیں تو ہمارا نام بدل دینا۔"

بات بھی یوں ہی ہوئی۔ برج بابو کی بیوی کے مرنے کی خبر پھیلتے ہی "لڑکا" دیکھنے کے لئے آنیوالوں کا تانتا بندھ گیا۔ اور چار ہی مہینے جاتے جاتے بیساکھ کی پہلی ہی لگن میں سترہ برس کی حسین اور تندرست سومترا آپکی آغوش کی زینت بن گئی۔ اور آپ اس کے دل دماغ اور جسم و روح کے قانونی مالک بن بیٹھے۔

سومترا کی ساری سہیلیاں اور تینوں بڑی بہنیں اس سے پہلے بیاہی جاچکی تھیں۔ لیلا اور بملا تو ایک ایک بچے کی مائیں بھی بن چکی تھیں۔ ان میں سومترا کے سوا سب کی سب کنوارے نوجوانوں سے بیاہی گئی تھیں۔ اور ساس سسر، دیور اور جیٹھ سے بھرے پورے گھروں میں گئی تھیں۔ صرف سومترا ہی ایسی تھی جسے دیور اور نندوں کے عوض چار چھوٹے بڑے بچے اور ساس سسر کی کمی پورا کرنے کے لئے اڑتیس سالہ دولھا برج بابو ملے تھے۔

اس کے ان بدنصیبوں پر اسکی ماں چپکے چپکے بہت روئی۔ بہنوں نے آنسو پونچھے۔ بہنوئیوں نے چہ میگوئیاں کیں اور اس کی ہمجولیوں نے بھی پھیروں کی رات تک اسے تسلی و تشفی دی، گلے میں بانہیں ڈالکر سسکیاں بھریں۔ لیکن وہ خود روئی تو کیا رخصتی کے وقت بھی بڑی مشکل سے چار آنسو گرا سکی تھی۔

کسی کو یقین ہی ہوگا نہ کوئی کہہ ہی سکتا ہے کہ سومترا کو اپنی شادی سے خوشی ہوگی۔ لیکن وہ بہت حد تک مطمئن اور کسی قدر مسرور بھی تھی۔ دو سال کی سخت کھینچا تانی کے بعد وہ ایک ٹھکانے تو لگ گئی۔ اب اس کی ماں کو اس کے لئے گھر باہر سر نیچا کرنا ہوگا نہ چچا کو جگہ جگہ تھوکنا پڑیگا۔ بہنیں بھی رات دن کی کوفت سے آزاد ہو گئیں۔ یہی کیا کچھ کم تھا؟

یہی وجہ تھی کہ جب سومترا کے چچا نے یہ رشتہ پکا کر کے اس کی ماں سے کہا تو سومترا نے اطمینان کی سانس لی۔ اور اس روز ایک روٹی زیادہ کھائی۔

وہ تھوڑا بہت پڑھی لکھی بھی تھی، اس کے باپ بابو لکھہ پرکاش عورتوں کی تعلیم کے زبردست حامی تھے۔ اور وہ لڑکیوں کو بھی مالک کی دین سمجھتے تھے۔ انہیں بیٹا نہ ہونے کا کبھی افسوس نہ ہوا۔ سو بھدرا، سوشیلا، سونیتا اور سومترا کو دیکھ کر انہوں نے کبھی دل میلا نہ کیا۔ سومترا کی ماں اگر کبھی چار چار لڑکیوں کے ہونے کا کبھی افسوس بھی کرنے لگتی تو وہ فوراً کہہ دیتے — "اونہہ اپنی قسمت سے سب کھاتے پہنتے ہیں۔ ان کے نصیب میں جو ہوگا یہ بیچاریاں بھی لیجائینگی۔

لڑکے ہی کمبخت کون سی تھیلی باندھکر لاتے ہیں؟ اُلٹے نالائق نکل جائیں تو زندگی بھر ان کے لئے جھینکو۔ یہ تو چار دن کی مہمان ہیں۔ ارے بیچاری لڑکیاں تو جھابے کی چڑیاں ہیں، رات رہیں اڑ جائیں۔ سومترا کی ماں! تم میرے شیر بہادروں کو کچھ نہ کہا کرو۔ دیکھتی تو رہو میں بیٹیاں دیکر کیسے کیسے لائق بیٹے لاتا ہوں۔"

اور انہوں نے کیا بھی وہی۔ اپنی تینوں بڑی لڑکیوں کو انہوں نے اچھے بروں اور بنے گھروں میں بیاہا۔ وہ پیسے بچانا تو جانتے ہی نہ تھے، اسٹور کیپر ہوتے ہوئے بھی کچھ روپے پس انداز کرنا تو درکنار ایک مکان تک نہ بنوا سکے۔

انہوں نے سوشیلا ہی کی شادی کے موقع پر ایک معقول رقم پیشگی لی تھی، جسے تھوڑا تھوڑا کرکے وضع کرا دیا۔ دو سال بعد سونیتا کی شادی میں بھی انہیں یہی کرنا پڑا۔

سومترا اپنی ساری بہنوں سے چھوٹی تھی۔ سونیتا کی شادی ہوئی تو وہ صرف نو سال کی تھی۔ اس لئے الکھ بابو اسے بہت پیار کرتے تھے۔ وہ اپنے باپ ہی کی طرح تندرست و توانا اور گوری چٹی دراز قامت تھی۔ الکھ بابو اکثر کہا کرتے "میرا اصلی بیٹا تو سومترا ہی ہے۔ اسکی شادی میں جلدی نہ کرونگا۔ خوب پڑھا لکھا کر اسے راجکمار سے بیاہونگا۔ اور اپنے بیٹے کو گھر ہی رکھ لونگا۔"

وہ اگر جیتے رہتے تو کرتے بھی ایسا ہی۔ لیکن یکایک انفلوئنزا کا شکار ہوکر چل بسے۔ اس وقت سومترا گیارہواں سال ختم کرکے بارہویں میں لگ رہی تھی، اور اسکول کی آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ باپ کے مرتے ہی اسکی پڑھائی ختم ہوگئی۔ بڑی مشکلوں سے رو دھو کر اس سال کا امتحان دے سکی۔ اس کے بعد تو اسے ایک دم کھانے پکانے اور چولہے چکی میں لگ جانا پڑا۔ ماں تو یہ نہ چاہتی تھی کہ اسکی پڑھائی چھوٹے۔ لیکن چچی جو جلاد تھی اسکے شوہر کی کمائی پر تینوں پلیں گی اور کام بھی نہ کرینگی؟ واہ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ دیورانی کے بھی رُخ دیکھ کر سومترا کی ماں نے جی نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اسکول سے اٹھا لیا۔ پھر تو تین مہینے کے اندر ہی اندر وہ روٹی پکانا، برتن مانجھنا، جھاڑو دینا۔ یہاں تک چچی کے چھوٹے بچے چار مہینے کے رجو کے پوتڑے دھونا بھی سیکھ گئی۔

اسی طرح دن گذرے، مہینے گئے، برس بیتے، سومترا بارہ، تیرہ، چودہ پھلانگ کر پندرھویں سال میں لگی لیکن ابھی تک اس کیلئے بر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ سومترا کی ماں اُٹھتے بیٹھتے دیور کو ٹوکتی "لالہ! سمو بڑی ہو چلی!" اور دیو پرکاش بھی سر ہلا کر کہہ دیتے "ہاں بھابی مجھے بھی فکر ہے۔" اتنا سنکر یہ بیچاری چپ رہ جاتی۔ اس سے زیادہ کہنے کی ہمت بھی نہ تھی۔ اور پھر کہتی بھی کس بوتے پر؟ اگر اسکے پاس کچھ جوڑا جامہ ہوتا تو خود لڑکا بھی تلاش کر لیتی۔ لڑکوں کی کمی تو تھی نہیں، لیکن وہ اُن عورتوں میں سے نہ تھی جو شوہر سے چھپا کر ہزار پانچ سو بچا کر آڑے وقتوں کے لئے رکھتی ہیں۔ اس غریب کے پاس تو وہی آٹھ سات معمولی زیور اور دو چار ریشمی جوڑے تھے۔ بھلا اتنے پر بیچاری کیا مُنہ کھولتی؟ کہیں اتنے سے بیٹی کی شادی ہوتی ہے؟

لالہ دیو پرکاش بھی کیا کرتے مجبور تھے۔ ایک تو انکے سامنے بھی دو دو لڑکیاں تھیں۔ دوسرے انکی شریمتی برجموہنی دیوی کی سخت حکومت سے جن کے حضور میں اپیل کرنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ وہ کسی طرح سومترا کے لئے تین چار سو سے زیادہ خرچ کرنے کی اجازت نہ دیتی تھیں۔ اور ان کے حکم کی خلاف ورزی اور ان سے سرتابی کرنے کی کسی اور میں جرأت ہو تو ہو۔ لیکن دیو پرکاش تو ان کے فیصلہ کے خلاف لب کشائی کی بھی ہمت نہ رکھتے تھے۔

دیو پرکاش گھر دیکھتے، بر دیکھتے۔ لیکن جہیز کی بات آتے ہی ٹھنڈی سانس لیتے گھر چلے آتے۔ ادھر سومترا دنوں دن بڑی ہو رہی تھی۔ کچھ تو شروع ہی سے اسکی بیل لمبی تھی۔ اٹھان بھی اچھی تھی۔ دوسرے چڑھتی عمر! اس کا بھرا ہوا جسم پھٹا پڑتا تھا۔ سولہ سال کی اس بے باپ کی سومترا کا شباب میلی کچیلی دھوتی کے اندر سے بھی پھوٹا پڑتا تھا۔ اسکی بیوہ ماں یہ دیکھتی اور ایک ٹھنڈی سانس کھینچکر رہ جاتی۔ وہ سوچتی "آہ اگر آج وہ ہوتے تو میری لاڈو اتنے سن کی ہوکر بھی یوں سونی سونی پھرتی؟ کیا یوں ہی چچی کے سارے کام کاج کرکے بھی یوں سونی سونی پھرتی؟ کیا یوں ہی چچی کے سارے کام کاج کرکے رات دن طعنے سنتی؟ بیچاری شرم کے مارے باہر نہیں نکلتی۔ کوٹھے پر تک نہیں چڑھتی۔ پھر بھی جسے دیکھو وہی — "ہائے سیانی ہوگئی — ہائے بڑی ہوگئی —!!" کہہ کہہ کر میری بچی کو آٹھ آٹھ آنسو رلاتا ہے۔

سومترا کی ماں نے ایک روز جی کڑا کرکے دیور سے کہہ ہی دیا — "لالہ! بیٹھے بیٹھے کیا سوچتے ہو؟ کیا سمو کے لئے دنیا سے بر اُٹھ گئے؟ جو اتنی بڑی ہوگئی اور ابھی تک گھر میں بیٹھی ہوئی ہے۔"

دیو پرکاش بھی روز روز کے جہیزوں کی مانگ سنتے سنتے اُکتا گئے تھے۔

وہ چاہتے تھے کہ جیسے بھی ہو کسی کے ساتھ سومترا کے ہاتھ پیلے کر کے جان چھڑائیں۔ بھاوج کی بات سُنکر انہوں نے بھی صاف صاف کہدیا ——
"بھابی تم تو گھر کی حالت دیکھ ہی رہی ہو۔ چار سو سے زیادہ خرچ کرنا میرے بس کا نہیں۔ اتنے میں جیسا بر گھر ملیگا سوچ لو تم اگر زیادہ خرچ کر سکو تو ویسی کہو۔ لڑکوں کی کمی نہیں۔ اور اگر مجھی پر چھوڑتی ہو تو مجھے جیسا ملیگا کر دوں گا۔"

سومترا کی ماں دیور کا مُنہ دیکھنے لگی، اسے یہ ان گمان بھی نہ تھا کہ لالہ اسے یوں وقت کے وقت دھوکا دے جائیں گے۔ چار سو! اتنا تو انہوں نے سومترا سے پہلے ہونیوالی لڑکی کی پیدائش میں خرچ کر دیئے تھے۔ ہائے میری بچی کی قسمت میں کیا کوئی دوہے جو ہی بر بندھے گا؟
وہ کچھ دیر چُپ رہی۔ پھر اُٹھ کر اندر چلی گئی۔

کسی نہ کسی طرح چھ مہینے اور گزر گئے لیکن اب جیسے دن آگے بڑھنا جانتے ہی نہ تھے۔ ذات برادری، ٹولے پڑوس، سب کی زبان پر سومترا تھی ——!! "ہائے سیانی کر رکھی ہے، جانے کیا کرینگے۔ جب ناک کٹ جائیگی تو اُجالا ہو جائیگا . . . . ."

بیچارے دیوپرکاش بھی کیا کریں۔ جیسا کام ملے کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن سومترا کی ماں کو بھائے تب نا وہ تو اپنی بیٹی کو راجکمار سے بیاہے گی، راجکمار سے ——!!

یہی نہیں کہ لوگ مُنہ پیچھے یہ باتیں کہتے ہوں۔ ہاں مُنہ پر ذرا مدھم سُریں کہتے تھے۔ آخر سومترا کی ماں نے دیور سے کہہ ہی دیا۔
"لالہ! جیسا بھی بر گھر ملے تم کر دو۔ کب تک بُرے بھلے کی راہ دیکھی جائیگی۔ گھر کی حالت تو سنبھلنے سے رہی جو سمو کے لئے ہزار بارہ سو نکل سکیں۔ اب تو اسکی قسمت میں جو لکھا ہوگا دیکھا جائیگا۔"

بیوہ ماں کے ان الفاظ میں کتنا درد۔ کتنی مایوسی۔ اور کتنا طنز بھرا ہوا تھا؟ اسے دیوپرکاش نے محسوس کیا۔ ایک بار انکے جی میں آیا کیوں تھوڑے سے لالچ کے لئے لڑکی کی زندگی تباہ کی جائے۔ بھائی صاحب نے بھی تو میرے لئے دھن کو دھن نہیں سمجھا تھا۔ جو مانگا وہی دیا لیکن رجّو کی ماں کو کون سمجھائے؟ یہ خیال آتے ہی انکی ساری چوکڑی بھول گئی۔

اب لالہ دیوپرکاش نے بڑے زور شور سے لڑکے کی تلاش شروع کی ادھر ٹھیک انہیں دنوں سومترا کی خوش قسمتی یا بدقسمتی سے برج بابو کی بیوی چل بسیں۔ دیوپرکاش نے موقع غنیمت سمجھ کر انہیں کے ساتھ اپنی بھتیجی کے ہاتھ پیلے کرنیکا فیصلہ کر لیا۔

جس روز سومترا کی ماں سے انہوں نے اس رشتے کے بارے میں تذکرہ کیا سو چُپکے چُپکے سارا دن روئی۔ لیکن سومترا ——! یہ تو کبھی خونکی روتی ہوئی آنکھیں پونچھ کر ایک بار زبردستی ہی ایک پھیکی ہنسی ہنس پڑی۔

شادی کے بعد کی تیسری صُبح نے سومترا کو مکمل "گھروالی" پایا۔ اس کے مُنہ پر گھونگھٹ تھی، گھر کے باہر جھانک نہیں سکتی تھی، پھر بھی بال بچوں والی تھی ——! دُلہن نہیں۔ تو عروس نہیں!!

انہیں تین دنوں میں اسے گھر کا۔ گھر کے بچوں کا۔ اور ان بچوں کے باپ کا پورا پورا انداز مل گیا۔ اور ملتا بھی کیوں نہ؟ گھر میں ساس اور نند کی جگہ پر تھی۔ بارہ تیرہ سال کی مُنہ زور بیٹی لڑکی پربھا عُرف بٹو! اور سُسر جیٹھ اور دیور کی کمی پوری کرنے کے لئے سفید بالوں والے سن رسیدہ برج بابو! جنہوں نے اپنی زندگی کے جوش وُلولہ سے بھرے ہوئے راحت آگیں ایام کسی دُوسری خوش نصیب کے ساتھ گذار کر جیسے تیسے بقیہ زندگی کاٹنے کے لئے بدنصیب سومترا کو ساتھ باندھ لیا تھا۔ کسی تڑپتے ہوئے پیاسے دل کی بیتاب چاہت اور والہانہ محبت کی توقع تو اس نے پہلے بھی نہیں کی تھی، ہاں ایک تجربہ کار سن رسیدہ "بیوی دیدہ" کے پُرتپاک خیر مقدم اور حمایت آمیز ناز برداریونکی امید اس نے اپنے پلّے میں ضرور باندھ رکھی تھی۔ اس نے سُنا تھا دیکھا اور سوچا بھی تھا کہ عورتیں اپنی سوت کے بچوں کے ساتھ نہایت سخت برتاؤ کرتی ہیں۔ اور ان کے وہ بوڑھے شوہر اپنی نئی نویلی دُلہن کے چاند سے مکھڑے کو دیکھ کر چپ چاپ یہ سب دیکھتے رہتے ہیں۔ جیسے اب ان بچوں سے ان کا کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو۔ اور اب انکی وہی دو ہے جو لاڈو بیوی ہی ہے۔ بس کچھ ہو۔ اس نے سوچا میں ایسا ہرگز نہ کرونگی۔ ان بچوں کو چاہے اپنی اولاد نہ بھی سمجھ سکوں۔ لیکن چھوٹا بھائی بہن ضرور سمجھونگی۔ انہیں پیار سے رکھونگی۔ میری وجہ سے انہیں باپ کے پیار و محبت سے بھی محروم ہونا پڑے۔ میں ایسا موقع ہرگز نہ آنے دوں گی۔

تیرہ سال کی نوخیز پربھا کو اپنی نوخیز لڑکی سمجھنے کے لئے سومترا کا دل کبھی آمادہ نہ ہوتا تھا۔ اور بچن منّے؟ وہ بھی تو اس سے تھوڑے ہی چھوٹے ہیں، ہاں مکھن ضرور چھوٹا ہے۔ تین سال کے مکھن نے جب شادی ہی والے دن اسے "چھوٹی ماں" کہا تو اسے کچھ بُرا نہیں لگا۔

لیکن وائے بدنصیبی اسکی یہ چھوٹی سی آرزو بھی پوری نہ ہو سکی۔ سُہاگ ہی رات کی رات کو اس نے اپنی قسمت ٹھونک لی۔ برج موہن بابو ان رس کے لوبھی مردوں میں سے نہ تھے جن کے دل میں رس کا کوئی سوتا چھپا ہو۔

اور جو نئی دُلہن کیلئے محبت نہیں تو موہ ہی کا جھرنا بن جائے ۔۔۔۔!

انہوں نے سومترا سے سب سے پہلی جو بات کہی وہ یہ تھی "سُنتی ہو جی! اب یہ سب گھر بار تمہارا ہی ہے۔ بچوں کو اچھی طرح رکھنا۔ سوتیلے سمجھ کر کبھی تنگ نہ کرنا۔ میں پہلے ہی کہے دیتا ہوں۔ میں نے ایک بھی شکایت سُنی تو اچھا نہ ہوگا۔ میں نے کچھ تمہارے رُوپ پر ریجھ کر شادی نہیں کی ہے۔ گھر سنبھالنے کو ایک عورت کی ضرورت تھی سو تمہیں لے آیا۔ کبھی اپنے رُوپ کے بل پر میرے سر چڑھنا چاہو تو یہ سب نخرے بازی یہاں نہیں چل سکتی۔ سمجھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ ؟"

نئی نویلی سومترا نے گھونگھٹ کے اندر ہی سے سر ہلا کر کہا ۔۔۔۔

"بہت اچھا۔"

"ہاں بس ٹھیک ہے۔ سمجھ بوجھ کر رہنا۔ زیادہ اُچھال بازی نہ کرنا، میں یہ سب چوچلے ذرا بھی پسند نہیں کرتا۔"

اتنا کہہ کر برج موہن بابو نے پان کی پیک تھوکی، اور حقے کی نگالی مُنہ سے لگالی۔ اور سومترا کے تو ان کی باتیں سُن کر حواس ہی اُڑ گئے۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے اسکے سر پر ایک من کا پتھر دے مارا ہو جسکی چوٹ سے اسکی گردن ٹوٹی پڑتی تھی۔ وہ اور بھی گردن جھکا کر بیٹھ گئی۔ نہ جانے وہ کب تک اسی طرح بیٹھی رہی۔ برج بابو نے اس درمیان میں ایک جھپکی بھی لے لی۔ انہوں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا سومترا ویسے پا تون ہو رہی تھی۔

"کہاں چلیں ۔۔۔۔؟" انہوں نے جمائی لیتے ہوئے پوچھا۔

"پربھا بلا رہی ہیں" کسی طرح گھونگھٹ کے اندر ہی سے کہہ کر سومترا کمرے سے نکل کر باورچی خانے کی طرف چل پڑی۔ اس کمرے میں جیسے اس کا دم گھُٹ رہا تھا۔ برج بابو کے بارے میں اس نے ان لمحات میں جو رائے قائم کی اسکے احساس و تصور سے اسکے دل کی جو حالت ہو رہی تھی، اُسے یا تو وہی جانتی تھی یا پرماتما ہی۔

کم و بیش ایک مہینہ گذر گیا۔ برسات کی دوپہر تھی۔ آسمان پر کالی گھٹائیں گھری ہوئی تھیں جنہوں نے اس دوپہر کو بھی شام بنا رکھا تھا ہوا بالکل بند تھی جیسے اندر دیوتا نے اسے بھی قید کر رکھا تھا گرمی سے بُرا حال تھا۔ سومترا نے چوکا برتن کر لیا تھا۔ بچن اور منّے ابھی سکول سے نہیں لوٹے تھے صرف پربھا کمھن کو ساتھ لئے ہوئے فضول کی بکواس کرکے گھر کے سکوت کو توڑ رہی تھی۔ جس روز سے چھوٹی ماں نے گھر میں قدم رکھے پربھا نے گھر کا ایک تنکا بھی ہلانے کی قسم کھالی تھی بھلا اب وہ کام کو ہاتھ لگا سکتی تھی؟ اس نے دیکھ رکھا تھا پڑوس کے مصری کی بہو اپنے سوتیلے لڑکے سے کتنا کام لیتی ہے۔ وہ سوچتی میں نے ذرا بھی کام کو ہاتھ تو لگایا نہیں کہ چھوٹی ماں میرے سر ہوئیں۔ اس لئے وہ ایسا موقع آنے ہی کب دیگی۔ بچن اور منّے کو بھی اس نے یہی سکھا دیا تھا۔ "دیکھو رے چھوٹی ماں سے ذرا بھی نہ دبنا۔ نہیں تو دیکھو یہ امنی لال کی طرح تمہیں بھی چاکری بجانی پڑیگی۔ جو زیادہ چیں چپڑ کرے تو بابو جی سے شکایت کر دینا۔" اس لئے ان خدا کے بندوں نے بھی کام کے نام سے تنکا بھی چھونے کی قسم کھا رکھی تھی۔ لیکن سومترا نے ایسا موقع ہی نہ آنے دیا اس نے تو دُوسرے ہی دن سے گھر کا رائی رتی کام اپنے سر لے لیا تھا۔ بچن اور منّے کو چھوٹی ماں کی شکایت کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ اور شاید آگے چل کر ملے۔ سو اس کی بھی کوئی خاص توقع نہ تھی۔

ہاں پربھا البتہ چھوٹی ماں کی ذرا ذرا سی باتوں پر نگاہ رکھتی تھی۔ اس میں کچھ تو برج بابو کا اشارہ تھا اور کچھ اپنی خوشی سے۔

برج بابو سمجھتے تھے کہ سومترا نوجوان ہے۔ خوبصورت ہے۔ اگر اس پر کڑی نگاہ نہ رکھونگا تو یہ میری اچھوتی عزت اور مرجادہ کو بٹہ لگا ہی دیگی۔ انسان کے اپنے عیوب و نقائص پر دُوسروں کے محاسن بھینٹ لگا کر اطمینان و سکون حاصل کرتا ہے۔ اپنے سن کی زیادتی دیکھ کر برج بابو کے خیالات سومترا کی طرف سے صاف نہ تھے۔ انکی بدگمانی کا یہ عالم تھا کہ اسکی معمولی بات چیت۔ ہنسنے بولنے اور چلنے پھرنے میں بھی انہیں بے شرمی اور بے حیائی کی بُو آتی تھی۔ اس کے کہیں باہر جانے یہاں تک کہ اپنے میکے جانیکی خواہش کرنے پر بھی انہیں بدگمانی کا بھوت کھائے ڈالتا تھا۔

سُسرال آنیکے بعد ایک ہی شہر میں رہنے کے باوجود سومترا ایک دن کے لئے بھی ماں سے ملنے نہ جا سکی۔ برج بابو کے پاس اسے روکنے کی بڑی اچھی ترکیب تھی۔ سومترا جب کبھی میکے جانے کیلئے زیادہ اصرار کرتی تو یہ بڑی سنجیدگی سے کہتے ۔۔۔۔ "سیانی لڑکی کو گھر میں اکیلی چھوڑ کر جانا اچھا نہیں۔ اور پربھا کو میں کسی حالت میں بھی تمہارے ہاں نہیں جانے دینا چاہتا۔"

گرمی سے سومترا کا جی اُلٹا جا رہا تھا۔ آنگن ایک تو چھوٹا تھا ہی اس پر طُرّہ یہ کہ برج بابو نے دروازے پر دُہرا پردہ ڈلوا دیا تھا۔ ایسی حالت میں ہوا آتی تو کدھر سے؟ اوپر کی چھت پر سائبان پڑا تھا ضرور لیکن کھُلا ہونیکی وجہ سے دِن میں سومترا کو وہاں جانیکی اجازت نہ تھی۔ ہاں نیچے کی بیٹھک میں ضرور دو بڑی کھڑکیاں اور ایک بڑا دروازہ تھا۔ سومترا کام سے نبٹ کر وہیں آ بیٹھی۔ دروازہ کھول کر اس نے چک گرا دی۔ کھڑکیوں کے پردے گرا کر انہیں بھی کھول دیا تو

ذرا ہوا آنے لگی۔

چھوٹی ماں کو دروازہ کھولتے دیکھکر پربھا بھی مکھن کو لئے ہوئے بیٹھک میں آگئی۔ اس نے دیکھا سومترا چک کے پاس بیٹھکر پنکھا جھل رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ پرسوں بابوجی نئی چک لانے کو کہتے تھے۔ کیونکہ یہ چک کئی جگہ سے ٹوٹ گئی تھی۔

"چھوٹی ماں تم کہاں بیٹھ گئیں ــــ؟" اس باپ کی سر چڑھی پربھا نے سومترا کو گھورتے ہوئے کہا ــ "جب نئی چک لگ جائے تو وہاں بیٹھنا۔ دیکھو سر کے پاس کتنی تیلیاں ٹوٹی ہوئی ہیں"

ایک تو گرمی کی وجہ سے پریشانی۔ اس پر اس چھوٹی سی لڑکی کی جو رشتے میں اسکی بیٹی لگتی تھی ایسی کڑوی باتیں؟ سومترا سے برداشت نہ ہوا۔ روز روز کی اس فضول بدگمانی کی چنگاریاں اسے یوں ہی جلا رہی تھیں۔ آج کی باتوں نے اور بھی آگ لگادی۔ اس نے چک سے مُنہ ٹکالیا اور بولی ــ "بٹو! اپنی بساط سے زیادہ بڑائی نہ جتایا کرو‘ کیا تم لوگ میرا دم گھٹا کر مجھے مار ہی ڈالنا چاہتی ہو ــ؟ چک کی دو تیلیاں ٹوٹی ہی ہیں تو کون سا غضب ہوا جا رہا ہے؟" اتنا کہکر سومترا زور زور سے پنکھا جھلنے لگی۔ خوف اور غصے سے اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آج خیر نہیں۔ یہ لڑکی اُن سے نہ جانے کیا کیا لگائیگی۔ میری زبان سے فضول ہی جانے کیا نہ کیا نکل گیا۔ آگ لگے میری اس ہوا خوری میں۔ اس نے دُوسرے ہی لمحہ دروازہ بند کرکے کُنڈی چڑھادی۔ اور اُٹھکر اندر جانے لگی۔ پربھا اس وقت سُرخ سُرخ آنکھیں کئے ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی۔ آخر تھی تو باپ کی بیٹی نہ!

سومترا نے اسکے یہ تیور دیکھے تو اسے بھی ضد سی آگئی۔ اس نے بھی تیکھی نگاہوں سے دیکھکر کہنا شروع کیا۔ "مرونگی تو آج بھی اور دو دن بعد بھی۔ پھر گھٹ گھٹ کر کیوں مروں؟ اس کل کی چھوکری کے ڈر سے کیا سُوراخ میں گھُس کر رہا کروں؟ کتنے پیار سے رکھتی ہوں۔ اپنے مُنہ کا نوالہ تک کھلانے کو تیار رہتی ہوں‘ پھر بھی .... بات یہ ہے کہ میرے جلے نصیبوں میں تو جلنا لکھا ہے سو جلوں گی"

اتنا کہتے ہوئے سومترا نے پھر دروازہ کھول دیا۔ اور تقریباً ایک گھنٹہ تک وہیں بیٹھی رہی۔ بچن اور منے اسکول سے آئے تو اُٹھکر اندر گئی۔

اس روز شام کے وقت اس پر کیا گذری؟ اس کی تفصیل کہاں تک بیان کی جائے۔ بس اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ برج بابو کی پھینک کر ماری ہوئی حقّے کی نگالی سے اسکی بائیں طرف کی بھوں کے اوپر زندگی بھر کے لئے ایک آڑی لکیر بن گئی!

~~~~~~

دسہرا قریب تھا۔ جوں جوں دن گذرتے برج بابو کو بُخار سا چڑھتا جا رہا تھا۔ ان کا معمول تھا کہ ہر سال بیوی اور بچوں کو رام جی کی برات اور بھرت ملاپ کا جلوس دکھانے کے لئے لے جاتے تھے۔ لیکن اب کے تو بڑی مُشکل کا سامنا ہے۔ اسی فکر نے ان کا کھانا سونا حرام کر رکھا تھا۔ اس سال تو ادھیڑ بیوی کی جگہ پر نوجوان سومترا تھی! حسین وجمیل اور پڑھی لکھی۔ بھلا وہ اسے اتنی بھیڑ میں جلوس دکھانے کے لئے کیسے لیجائیں گے؟ کتنا ہی گھونگھٹ نکالے رہے۔ دیکھنے کے لئے تو مُنہ کھولے ہوگی۔ اور اگر صرف بچوں ہی کو لیجائیں تو اسے گھر میں تنہا چھوڑنا بھی پرلے سرے کی بیوقوفی ہوگی۔ پورے چار گھنٹے جوان بیوی اور وہ بھی بُڈھے کی! تنہا گھر میں رہے؟؟ اجی توبہ کرو عقل کے ناخن لو۔ برج بابو ایسے پاگل نہیں ہیں۔

آخر انہوں نے طے کیا کہ طبیعت خراب ہونے کا حیلہ کرکے لیٹے رہیں گے۔ کسی کو بھی نہ لیجانا پڑیگا۔ اِس بار رام جی کی بارات نہ دیکھوں گا تو کیا ہو جائیگا؟ عزت وآبرو تو بچی رہے گی۔

~~~~~~

آج بارات نکلے گی۔ برج بابو آفس گئے ہوئے تھے۔ بچن اور منے بارات دیکھنے کی خوشی میں آج اسکول نہیں گئے۔ اور گھر ہی پر اُدھم مچا رہے تھے۔ پربھا نے بھی آج سومترا کے ساتھ برتن مانجھ لئے! شام کے کھانے کی تیاری کر دی۔ اور پھر دوڑ دوڑ کر بھائیوں کے کپڑے نکال نکال کر کھونٹیوں پر سجانے لگی۔ وہ اب بہت کچھ سیدھی ہوگئی تھی۔ سومترا کی محبت اور پیار بھرے سلوک نے اسے اس سے خوب ہلا ملا دیا تھا۔ وہ اسکے خلاف بابوجی سے ایک لفظ بھی نہ کہتی۔ سومترا بھی اسکی ہر وقت خاطر ودلجوئی کا خیال رکھتی۔ اور اسے اپنی بیٹی کی طرح ماننے لگی تھی۔ پربھا کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے تیسرے درجے تک اسکول میں پڑھا۔ اس کے بعد اسکی ماں نے گھر بٹھا لیا۔ کیونکہ اسکول گھر سے دُور تھا۔ اور گیارہ برس کی سیانی لڑکی کو اِس بُرے زمانے میں اتنی دُور بھیجنا مناسب نہ تھا۔

سومترا نے اسے رامائن پڑھا کر مہا بھارت شروع کرائی تھی۔ اسکی خواہش تو اسے پھر اسکول بھیجنے کی تھی۔ لیکن برج بابو رضامند ہی نہ ہوتے۔ اسکے علاوہ وہ اپنے سارے گہنے ہر چھوٹے بڑے تہوار میں

پربھا کو لا دیتی۔ کام کرنے کے نام سے کبھی اس سے ایک گلاس پانی بھی دینے کو نہ کہتی۔ اسکی انہیں سب باتوں نے تین چار مہینوں کی قلیل مدت میں اس سرچڑھی اور منہ زور لڑکی کو رام کر لیا تھا۔ ہاں سومترا نہ اپنا سکی تو ایک برج بابو کو۔۔۔! ان کے مزاج میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا۔ اُلٹے اب پربھا کو بھی سومترا کی ہاں میں ہاں ملاتی دیکھ کر انہیں خوف پیدا ہو چلا تھا کہ کہیں یہ میری بیٹی کو بھی نہ بگاڑ دے۔

چار بجے سے پہلے ہی پربھا سج سجا کر تیار ہو گئی۔ بچن، منے اور مکھن تو اس سے بھی پہلے کوٹ نیکر پہنکر صاحب بہادر بنے آنگن میں تھرک رہے تھے۔ صرف سومترا ہی نے ابتک دھوتی ہی بدلی تھی نہ بالوں میں کنگھی ہی کی تھی۔ پربھا کے بہت ضد کرنے پر اس نے صابن سے منہ ہاتھ دھو لئے تھے۔ ایک نئی ہوئی کناری دار دھوتی بھی نکال کر کھونٹی پر ٹانگ دی تھی۔ وہ برج بابو کے مزاج سے واقف تھی۔ کیا جانیں کیا سمجھیں۔ اُلٹی کھوپری کے آدمی ٹھیرے۔ کہیں گے کہ باہر جانیکی خوشی میں کیسی جلدی سے تیار ہو گئی۔ میرے پیچھے کہیں بچوں کے رنگ میں بھی بھنگ نہ پڑے۔ اِس خیال سے اس نے دھوتی پہنتے پہنتے رکھ دی۔

پربھا بہت دیر تک اِس بات پر چھوٹی ماں سے روٹھی رہی۔ جب سومترا نے اسکے گلے میں باہیں ڈال کر پیار سے کہا ۔۔۔ "بٹو! تم تو جانتی ہی ہو اپنے بابوجی کو۔ جب وہ کہدینگے تو بدل لونگی۔ سمجھیں؟" تب جا کر پربھا کا منہ سیدھا ہوا۔

بچن بار بار دروازے پر جا کر بابوجی کو دیکھتا، آتے ہیں یا نہیں؟ حسب معمول سوا چار بجے تنگ مہری کا سفید پاجامہ۔ بند گلے کا سیاہ کوٹ۔ اور نیلی دیوار کی فیلٹ کیپ پہنے برج بابو آتے نظر آئے۔ "بابوجی آگئے! بابوجی آگئے!!" کہتا ہوا ناچتا تھرکتا بچن اندر بھاگا۔ منے اور مکھن بھی دوڑ کر دروازے پر آگئے، لیکن یہ کیا ۔۔۔؟ ان کے بابوجی آج سیدھے گھر آنے کی بجائے شیام بابو کی بیٹھک میں گھس گئے، وہاں تاش کی ٹولی جمی ہوئی تھی، تقریباً ایک گھنٹے تک اور آنکھیں پھاڑنے پر پھر بابوجی کے درشن ہوئے۔ وہ دھیرے دھیرے گھر میں آئے۔ سومترا نے چھتری اور کوٹ لیکر کھونٹی پر ٹانگا۔ بوٹ اُتار دینے پر انہیں بھی کونے میں سرکا دیا۔ اور پھر اندر سے دال موٹ کی طشتری اُٹھانے چلی گئی۔

برج بابو نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا کہ لڑکے ایک دم مارچ کرنے کیلئے تیار کھڑے ہیں۔ ادھر پیٹ کی آنتیں بھوک سے اُلٹی جا رہی تھیں، طبیعت کی خرابی کا حیلہ کر لیا تو اور بھی دو گھنٹے فاقہ کرنا پڑے، تب کہیں جا کر کھچڑی تیار ہوگی، لیکن اس کے سوا چارہ کار ہی کیا تھا؟ اس زمانے میں عزت و آبرو بچانا کتنا مشکل کام ہے، اسے شریف ہی سمجھ سکتے ہیں۔ بیچارے چارونا چار آنکھیں بند کرکے پلنگ پر دراز ہو گئے۔

"بابوجی!" پربھا نے آکر کہا ۔۔۔ "جلدی سے کھانا کر تیار ہو جائیے، نا نہیں تو چھبیوں پر بڑی بھیڑ ہو جائیگی۔ پھر بارات دیکھنے میں بڑی مشکل ہوگی"۔

"نہیں بٹو! میرے سر میں بہت درد ہے۔ میں نہ کھاؤں گا"۔

پربھا ایک دم دودھ پیتی بچی نہ تھی۔ وہ بچن سے سُن چکی تھی کہ بابوجی گھنٹے بھر تک شیام بابو کے ہاں تاش کھیل کر آرہے ہیں۔ درد ورد کہیں نہیں۔ یہ سب نہ جانے کے حیلے ہیں۔ وہ رونی صورت بنا کر باورچی خانے میں گئی اور سومترا سے بولی ۔۔۔ "چھوٹی ماں! بابو کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بارات دکھانے نہ جائیں گے"۔

"کیوں ۔۔۔؟" سومترا نے پربھا کی آنکھیں بھیگی دیکھکر جلدی سے پوچھا۔

"نہ جانے کیوں۔ کہتے ہیں میرے سر میں درد ہو رہا ہے لیکن میں جانتی ہوں وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ ابھی ابھی تو گھنٹے بھر تک شیام نرائن چچا کے ہاں تاش کھیل کر آرہے ہیں"۔

"نہیں بٹو، درد ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔ شاید ہونے لگا ہو"۔

"اُونہہ تم کیا جانو، یہ سب نہ جانیکے بہانے ہیں"۔ جھنجھناتی ہوئی پربھا اوپر چلی گئی۔ سومترا ابھی سمجھ گئی یہ سب اسی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ بیچارے بچوں کے شوق و ولولے پر اسی کی وجہ سے کُند چھری پھیری جا رہی ہے۔

کہتے ہیں مسلی جاتی ہے تو چیونٹی بھی کاٹ لیتی ہے۔ سومترا کے جلے ہوئے دل کا جوالا مکھی بار بار کی ٹھیس کھا کر بھک اُٹھتا تھا۔ جانے کیسے وہ اندر ہی اندر بھنکتی۔ لیکن منہ سے اُف بھی نہ کرتی۔ غریب کے پاس اسکے سوا چارہ کار ہی کیا تھا؟ جو مرد ایک ذرا سی بات پر حقّے کی نگالی کھینچکر مار سکتا ہے وہ اگر زیادہ غصے میں آکر جلتی چلم پھینک مارے تو کیا کوئی تعجب کی بات ہوگی؟ یہی وجہ ہے کہ سومترا اندر ہی اندر خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی ہے لیکن آج بچوں کا اُترا ہوا منہ دیکھ کر اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ دالان میں آئی، اور برج بابو کو مُلا کر کہا ۔۔۔ "اُٹھو نا سمو سے ٹھنڈے ہوئے جاتے ہیں۔ ادھر بچے الگ جانے کی آفت اُٹھائے ہوئے ہیں"۔

"میں نے ایک بار کہدیا۔ میرے سر میں درد ہے، بولو مت"۔ برج بابو نے اپنی بھاری آواز کو ناک میں چڑھا کر گنگنا کر جواب دیا۔

سومترا ایک منٹ چپ رہی۔ پھر بولی ۔۔۔ "لاؤ امرت دھارا لگا دوں، چائے بنا دوں، پینے سے طبیعت صاف ہو جائیگی۔ ذرا سے درد کے لئے

بچوں کا دل کیوں توڑتے ہو؟"

"واہ رے بچوں کا دل!" برج بابو نے دل ہی دل میں کہا "سب سمجھتا ہوں، کسی اور کو بیوقوف بنانا۔ یوں کیوں نہیں کہتیں کہ میری ہی طبیعت سیر کیلئے مچل رہی ہے۔" انہوں نے ابھی کڑی آواز میں کہا —— "نانا جائے فلائے نہ بنانا۔ اس سے اور بھی طبیعت خراب ہو جائیگی۔ میں آج کہیں نہ جاؤں گا۔"

"کتنا سفید جھوٹ ہے!" سومترا کو طیش آگیا۔ انہوں نے مجھے جانے کیا سمجھ رکھا ہے۔ کیا دیکھا ہے جو اس طرح چوکی پہرے لگاتے رہتے ہیں؟

"جاؤ بچوں کے کپڑے اتارو۔ کھڑی کیا ہو؟" برج بابو نے سومترا کو چپ دیکھکر کہا "بغیر مجھ سے پوچھے تیار کیوں کر دیا تھا؟"

اب سومترا ابل پڑی۔ ذرا تیز آواز میں بولی —— "تیار کرنے نہ کرنے والی میں کون ہوں؟ ہر سال جاتے تھے۔ اس لئے بچے اپنے آپ ہی تیار ہو گئے۔ ان بیچاروں کو کیا خبر تھی کہ مجھ جنم جلی کے پیچھے انہیں بھی گھر میں سڑنا پڑیگا۔"

"کیا فضول بک رہی ہو؟ کچھ دماغ تو نہیں چل گیا ہے؟" برج بابو نے بگڑ کر تیز آواز میں کہا۔ بھوکے آدمی کا ٹمپریچر کچھ تو یوں ہی تیز رہتا ہے، اگر اس حالت میں اسکی کسی غلط روی پر نکتہ چینی کی جائے تو پھر کیا پوچھنا ہے؟ سومترا کی طنز آمیز باتوں نے ان کا پارہ ایکدم اوپر چڑھا دیا۔

پھر بھی سومترا کہتی ہی گئی —— "کون جانے کس کا دماغ چل گیا ہے؟ اپنے میری وجہ سے ان بیچاروں کا دل کیوں دکھاتے ہو؟ انہیں لیجاؤ، میں گھر رہ جاؤنگی۔"

یہ تو بڑا غضب ہوا۔ برج بابو کو جس بات کا خوف تھا وہی سامنے آئی۔ سومترا کو اکیلے گھر میں چھوڑنا پڑیگا! وہ ایسے پاگل نہیں ہیں۔ بات ایکدم ختم کر دینے کے لئے انہوں نے ڈانٹ کر کہا —— "بک بک مت کرو۔ کسی کی طبیعت بھی دیکھتی ہو یا اپنی ہی ہانکے جاتی ہو۔ پربھا اب سیانی ہو گئی، اسے لیکر کہاں جاؤں۔ اور اگر بچے جائیں تو وہ بغیر جانے ماننے والی نہیں۔" اتنا کہتے کہتے وہ منہ پھیر کر لیٹ گئے۔

سومترا دودھ پیتی بچی نہ تھی۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ پربھا سیانی ہو گئی ہے یا میں جوان ہوں! برج بابو کی ان پیچ در پیچ باتوں نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنی موجودہ حالت اور حیثیت کو بھول گئی، اس نے تن کر پوری آواز سے جواب دیا —— "یوں چبا کر کیوں باتیں کر رہے ہو؟ صاف کیوں نہیں کہتے، کہ مجھے تیرا اعتبار نہیں۔ یہ تو میں سمجھتی ہوں۔ اسے ایسا ہی ہے تو باہر سے تالا ڈال کر چلے جانا۔"

برج بابو غصے میں اٹھکر بیٹھ گئے۔ سومترا کبھی ایسی تیز آواز سے بول سکتی ہے۔ انہیں سان گمان بھی نہ تھا۔ میرے سامنے یہ حال ہے تو منہ پیچھے نہ جانے کیا کچھ گھر سر پر اٹھاتی ہوگی۔ غصے سے ان کا سارا بدن کانپنے لگا۔ انہوں نے کڑک کر کہا —— "بس خیریت چاہ تو اپنی زبان بند کر لے۔ اب کبھی اتنی زور سے بولی تو زبان کھینچ لونگا۔ حرام زادی کہیں کی۔ . . اتنی ہمت ہے؟"

"کیوں ہمت کو کیا ہوا؟ کیا کہیں ناک کٹائی ہے؟" سومترا نے اسی ٹون میں جواب دیا۔ اور چل دی۔

"ٹھیر تیری ہمت دیکھوں۔" کہکر برج بابو نے ایک ہی دھکا دیا تو سومترا آنگن کے فرش پر جا گری۔ اس کا سر بائیں طرف سے پھوٹ گیا۔

لیکن اسی وقت جب پربھا سر میں پٹی باندھتے ہوئے اپنی چھوٹی ماں کے سرہانے بیٹھی آنسو بہا رہی تھی تو اس نے اسے چپ کرتے ہوئے کہا "بٹو دیکھ باہر کسی سے نہ کہنا۔ کوئی پوچھے تو کہہ دیجیو کہ غسل خانے میں پاؤں پھسل گئے تھے، سمجھیں؟"

دہلی بدل کر آنے پر برج بابو کو جو سب سے بڑی دقت پیش آئی وہ سلیقے کے مکان کی تلاش تھی۔ بڑی تلاش و جستجو کے بعد ایک اچھا مکان ملا بھی تو وہ ایک بڑی حویلی میں تھا جس کے اوپر کے دونوں حصوں میں آٹھ آٹھ دس دس روپے کے کئی کرایہ دار رہتے تھے۔ اور اسکے سامنے والے کمرے میں کالج کا ایک لڑکا رہتا تھا۔

پہلے ہی روز جب برج بابو آفس جانے کو نکلے تو دیکھا۔ وہ نوجوان باہر کے برآمدے میں آرام کرسی ڈالے کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک اسے دیکھتے رہے۔ پھر اپنے آپ بڑبڑانے لگے —— "نہ صاحب! ایسے تو نہ کام چلیگا۔ اس طرح تو ایک دن بھی گذارہ ہونا مشکل ہے۔ کوئی بھلا آدمی اتنی بے پردگی میں کیسے رہیگا۔"

"آپ کس سے کہہ رہے ہیں جناب؟" نوجوان نے اپنے کانوں میں لگاتار بھنبھناہٹ سنکر کتاب کی طرف سے منہ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"بھیا آپ ہی سے کہتا ہوں . . . ."

"نوجوان حیرت زدہ ہو کر مستفسرانہ نگاہوں سے برج بابو کو دیکھنے لگا۔ برج بابو اسے یوں دیکھتے دیکھکر خشک انداز سے بولے —— دیکھتا ہوں۔ آپ کے بیوی بچے تو ہیں نہیں۔"

"نہیں صاحب ابھی میں نے یہ جھگڑا نہیں پالا ہے۔"

ایک اجنبی کے منہ سے یکایک ایسی باتیں سنکر نوجوان کو کسی قدر ہنسی بھی آئی۔ اور اس سے زیادہ برا بھی لگا۔

"یہی تو ایسی حالت میں آپکا یوں برآمدے میں بیٹھنا تو نہ ہوسکے گا۔"

"واہ جناب آپنے نہ بیٹھ سکنے کی ایک ہی کہی! اپنے ہی برآمدے میں کیوں نہ بیٹھا کرونگا؟ یہی تو ذرا سی کھلی ہوئی جگہ ہے۔ بھلا ہر وقت کمرے کے اندر رہکر کوئی کیسے زندہ رہ سکتا ہے؟"

"ہاں ہاں یہ سب تو میں بھی سمجھتا ہوں لیکن بھیا میں ٹھیرا گرہستی والا آدمی۔ میرے گھر میں چھوٹی عمر کی بہو بیٹی ہیں۔ اِس طرح آپ دِن بھر ہمارے دروازے کے سامنے رہیں گے کیسے چلے گا؟"

"آپ اپنے دروازے پر پردہ ڈال لیں۔ اس کیلئے میں آپ کو ہرگز منع نہ کرونگا" کہتا ہوا نوجوان پھر پڑھنے لگا۔

اسے برج بابو کی ان غیر مہذبانہ نکتہ چینیوں پر بڑا غصّہ آیا۔ برج بابو اور بھی بگڑ کر بولے — "یہ خوب رہی۔ پردہ ڈال لو۔ اس سے حاصل ہی کیا ہوگا؟"

"تو آپ چاہتے کیا ہیں؟" نوجوان نے چڑھکر کہا — "میں تو یہیں بیٹھونگا۔ آپ کو پردے کا اتنا ہی خیال تھا تو کوئی اکیلا گھر لیتے۔"

"واہ یہ اچھی منطق رہی۔ مگر کسی کی اتنی حیثیت نہ ہو تو کیا کرے؟"

"تو پھر اتنا پردے دار اور شاندار نہ بنے۔" نوجوان جھلا کر بولا۔ پھر اپنی کتاب بند کر کے کمرے میں جاتے جاتے کہنے لگا — "مجھے تو یہاں رہتے دو سال ہوگئے۔ آج تک میرے بارے میں کسی نے ایسی شکایت نہیں کی۔ آپنے ایک ہی دن میں کیا دیکھ لیا؟"

برج بابو ابھی کچھ دیر اور بھڑے رہتے لیکن آفس جانے کو دیر ہو رہی تھی۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے اُتر کر چلے گئے۔ نوجوان پھر آکر پڑھنے لگا۔

سومترا نے جو برج بابو کو باہر بولتے سُنا تو کواڑ کی شگاف سے جھانکنے لگی، لیکن بولنے والے کا مُنہ نہ دیکھ سکی۔ جب نوجوان اُٹھکر اندر جانے لگا تو اُس کا مُنہ شگاف کے سامنے آگیا۔

سومترا دیکھتے ہی پہچان گئی۔ ارے یہ تو گریش ہے!! سو بھدرا دیوی کی نند کا دیور! تین ہی برس میں کتنا بدل گیا۔ تب تو سینک سلائی تھا۔ اَب تو بدن بھی نکل آیا ہے۔ رنگ بھی کھل گیا ہے۔ اس کا دل اندر ہی اندر گریش سے باتیں کرنے کے لئے مچلنے لگا۔ جی جی کا حال معلوم ہوئے کتنے دِن ہوگئے۔ ڈیڑھ سال سے تو اماں پتاجی۔ جی جی۔ کسی کی بھی خبر نہ ملی۔ لیکن کیسے پوچھوں؟ یہ تو ویسے ہی اس پر توپ۔ بندوق بنے گرج رہے ہیں۔

سومترا کسی طرح دِل دبا کر وہاں سے ہٹ گئی۔ اپنی بے بسی پر اسے آج کی طرح رونا کبھی نہ آیا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس پیٹے کو اور خاندان کی اس عزت و آبرو کو جس نے ڈیڑھ ہی سال میں اسے جلا کر ہڈیوں کا ڈھانچ بنا دیا، آگ لگا دے۔ لیکن ہائے ہندوستانی عورت کی بے بسی! وہ سوچ تو سب کچھ سکتی ہے۔ لیکن کر کچھ بھی نہیں سکتی۔

سومترا چپ چاپ باورچی خانے میں جاکر برتن سمیٹنے لگی۔ بچن اور مکھن اسکول چلے گئے تھے۔ پربھا بھی اپنی کتابیں باندھ کر بولی —

"تو چھوٹی اماں جاؤں —؟"

"ہاں جاؤ" سومترا نے بھیگی دھوتی تار پر پھیلاتے ہوئے کہا۔

بات یہ تھی کہ اس حویلی کے نچلے حصے میں لڑکیوں کا ایک مڈل اسکول تھا۔ سومترا نے پربھا کے پڑھنے کا شوق دیکھ کر بڑی مشکلوں سے اسے اسکول بھیجنے کے لئے برج بابو کو رضامند کر لیا تھا۔ انہوں نے بھی یہ سوچ کر کہ آجکل لڑکے والے لڑکیوں کی شکل و صورت اور شعور و سلیقہ کے ساتھ انکی تعلیم کے بارے میں خاص طور سے پوچھتے ہیں پربھا کو اسکول جانے کی اجازت دے دی۔

پربھا چلی گئی۔ مکھن "جی جی" "جی جی" کرتا اسکے پیچھے چلا۔ اسے کئی دِنوں سے تھوڑا تھوڑا بخار تھا۔ سومترا گھبرانے لگی۔ گرمیوں کے دِن ہیں۔ لُو چل رہی ہے۔ اور یہ نیچے جاکر سڑک پر کھیلے گا۔ اس نے اُسے منع کیا۔ لیکن وہ بھاگ ہی گیا۔

سومترا سوچنے لگی۔ اس پاجی کو بُلانے کیسے جاؤں؟ یہ میلی سی دھوتی پہنے گھونگھٹ نکال کر باہر کیسے نکلوں؟ سامنے گریش بیٹھا ہے، اگر وہ پہچان لے تو گھونگھٹ دیکھکر کیا کہے گا؟ وہ جی جی کے گھر دیکھ چکی تھی کہ وہ کتنا شریر ہے۔ آخر سومترا بغیر گھونگھٹ ہی کے مکھن کو بُلانے چلی۔ اس نے دروازہ کھولتے ہی دیکھا چھوٹا مکھن، گریش کے پاس کھڑا اسکی دی ہوئی لیچیاں کھا رہا تھا۔ اور گریش اس سے پوچھ رہا تھا۔

"جو ابھی دفتر گئے ہیں تمہارے کون ہیں؟"

سومترا سے اب ضبط نہ ہوسکا۔ زبان دبانے دباتے بھی اسکے مُنہ سے نکل ہی گیا — "گریش!!" گریش چونک پڑا۔ آواز کان آشنا معلوم ہو رہی تھی۔ اُس نے دیکھا میلی سی دھوتی پہنے دُبلی پتلی، دراز قامت نوجوان عورت دروازے پر کھڑی تھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو کیا تین ہی برس میں سومترا کو بھول گئے —؟"

"ارے آپ ہیں؟؟" گریش جیسے آسمان سے گر پڑا — "تین ہی سال میں آپ اتنی بدل جائینگی۔ اس کا تو وہم و گمان بھی نہ تھا۔" کہتا ہوا وہ کرسی سے اُٹھکر کھڑا ہوگیا۔

"کیا سچ مچ میں بدل گئی ہوں —؟" سومترا نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ارے آپ میں تو زمین و آسمان کا فرق ہوگیا۔ ایکدم لکڑی ہی ہوگئیں،

رنگ کیسا میلا ہو گیا، جیسے کسی نے سیاہی کا پھیر دی ہو۔"

گریش کا دماغ چکرا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کیا سومترا انہی کالے کوٹ والے حضرت کی بیوی ہیں؟ سُنا تو اسنے تھا کہ سومترا دوہے جو کو بیاہی گئی ہے۔ لیکن وہ اس حالت میں ہو گی۔ اس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔

"ہو گا . . . . " کہتی ہوئی سومترا نے بات کا رُخ بدل دیا۔ اور بولی ــــ "جی جی کے گھر کی کچھ خبر ہے؟"

"ہاں بھابی آجکل وہیں ہیں۔ اُن کا خط آیا تھا۔ لکھا تھا۔ سب لوگ اچھے ہیں۔" گریش نے اپنے جذبات کو دباتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔

گریش سے باتیں کرنے کیلئے سومترا کا دم پھول رہا تھا۔ لیکن چپ ہو گئی۔ کوئی دیکھ لیگا تو کیا کہے گا۔ وہ سوچنے لگی ــــ "ہائے جب میں نند کی شادی میں گئی تھی تو گریش سے کیسی ہنسی ٹھٹول کرتی تھی۔ دولہے کے دعوے میں غلطی سے اسکے جوتے چھپا دینے پر سب نے اس پر کیسی پھبتیاں اُڑائی تھیں لیکن آہ وہ برج بابو کو کیسے یقین دلائیگی کہ وہ غیر نہیں ہے۔

گریش کچھ اور بولنا ہی چاہتا تھا کہ کھن نے زور سے چیخ کر کہا۔

"ارے چھوٹی ماں! پنڈت جی آ رہے ہیں۔"

سومترا پڑوس کے پنڈت جی کا نام سنتے ہی اندر چلی گئی۔ گریش سوچتا ہی رہ گیا ــــ "چھوٹی ماں . . . . ! تو سومترا انہی گھر والے کی بی ہیں؟؟"

کھن لیچیاں لھا کر اندر گیا تو سومترا نے اسے بُلا کر کہا ــــ "وہ سامنے والے بابو تیرے ماموں ہوتے ہیں۔ سمجھا؟ لیکن دیکھو اپنے بابو جی سے یہ نہ کہنا کہ میں ان سے باتیں کرتی تھی۔"

کھن نے وعدہ تو کر لیا۔ اور رشوت میں دیئے ہوئے پیسے بھی چٹ کر گیا لیکن شام کے وقت اس نے باتوں باتوں میں برج بابو سے ساری باتیں کہدیں۔ بچے کی عقل ہی کتنی؟ اس نے اپنی سمجھ سے کوئی بات نہ بتائی۔ لیکن برج بابو سب کچھ سمجھ گئے۔

"کیوں جی ــــ؟" ان کے حلق کا لقمہ حلق ہی میں پھنس گیا ــــ "لگائی نہ تم نے وہی بات . . . . ؟ سامنے والے چھوکرے سے بولنے کو تم سے کس نے کہا تھا ــــ؟"

سومترا کانپ اُٹھی۔ اس میں اب مار کھانے کا دم نہ تھا۔ ڈرتے ڈرتے بولی ــــ "وہ ایک رشتے سے میرا بھائی ہوتا ہے۔ بڑی جی جی کی نند کا دیور ہے۔ جی جی کا حال چال پوچھنے کو دو باتیں کی تھیں۔"

"کہاں کا رشتہ جوڑا ہے ــــ جی جی کی نند کا دیور! کیا خط لکھ لکھکر حال چال نہیں معلوم ہو سکتا تھا؟"

برج بابو اس وقت یہ بھول ہی گئے کہ انہوں نے اسے خود ہی کہیں خط بھیجنے کی سخت ممانعت کر رکھی ہے۔

"کوئی ضرورت نہیں بات کرنے کی۔ کالج کے لڑکے سالے بڑے لفنگے ہوتے ہیں۔" سومترا چپ ہو گئی۔ لیکن اس کا دل بغاوت کے بادل اُٹھاتے ہوئے اندر ہی اندر برس رہا تھا۔

کئی دن گزر گئے، سومترا اب باہر جھانکتے ہوئے بھی ڈرتی تھی۔ سوچتی تھی کہیں گریش اسے دیکھ کر کوئی سوال نہ کر بیٹھے۔ پھر تو بولنا ہی پڑیگا۔ بچن اور منے کے ذریعہ اسکی بہت سی باتیں معلوم ہو گئی تھیں۔ اس کے باپ بھی مر گئے ہیں۔ ماں تو پہلے ہی چل بسی تھی۔ اس کے باپ کے مرنیکا حال سنکر اسے رونا آ گیا۔ اس نے دوسرے ہی دن یہ بھی سُن لیا کہ وہ خرچ کی تنگی کے باعث ہوسٹل چھوڑ کر اس مکان میں رہنے لگا ہے۔ اور اپنے ہی ہاتھ سے دونوں وقت چائے بناتا ہے۔ سویرے تو صرف چائے اور ڈبل روٹی ہی کھا کر کالج چلا جاتا ہے۔ شام کو ہوسٹل میں کھا لیتا ہے۔

یہ باتیں سنکر سومترا کا دل اندر ہی اندر پیچ و تاب کھانے لگا۔ اس کا بس چلتا تو وہ ایک روز بھی اسے چولھا نہ جلانے دیتی۔ گھر ہی سے چائے بنا کر بھیجدیا کرتی۔ لیکن اسکی چلتی ہی کب تھی؟

اتنی سختی کے باوجود وہ کبھی کبھی پربھا کے ہاتھ کوئی بری بھلی چیز چپکے سے بھیج ہی دیتی۔ گریش چار ہی پانچ دنوں میں ساری باتیں سمجھ گیا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ سومترا سے پوچھے کہ وہ اس دبلے میں کیسے رہتی ہے؟ لیکن برج بابو کی صورت کا تصور آتے ہی اسکی ہمت جواب دے دیتی۔

اگرچہ سومترا نے برج بابو کے بارے میں اپنے منہ سے ایک لفظ بھی نہ کہا تھا۔ پھر بھی گریش سے کوئی بات چھپی نہ رہ سکی۔ اسی شرم کی وجہ سے وہ اور بھی اس کے سامنے نہ آتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اسکی حالت پر ترس کھا کر اس سے ہمدردی جتائے۔ اس کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی۔

مہینے کا آخری سنیچر تھا۔ بچن اور منے جلد ہی اسکول سے لوٹ آئے۔ گھر میں گھستے ہی بچن بولا ــــ "چھوٹی ماں! ماما جی کو تو بڑے زور کا بخار چڑھ رہا ہے۔"

"سچ بچن!" سومترا نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہاں وہ مجھ سے چولھا جلانے کو کہہ رہے تھے لیکن مجھ سے جلا ہی نہیں شاید چائے بنا لے۔"

سومترا سے نہ رہا گیا۔ اس بے ماں باپ کے پردیسی کیلئے اسکی محبت اُمنڈ پڑی۔ اس کا بھائی بھی جو پیدا ہوتے ہی مر گیا تھا۔ اگر آج جیتا ہوتا تو اتنا ہی بڑا ہوتا۔ اس نے جلدی جلدی چائے بنائی۔ اور بچن کے ہاتھ بھیج دی۔

وہ دن گذر گیا۔ دُوسرے روز بھی بچن نے بتایا کہ انکا بُخار نہیں اُترا۔
اتوار ہونیکی وجہ سے سومترا اندر ہی اندر پنجرے میں بند طائر کی طرح پھڑپھڑا کر
رہ گئی۔ لیکن تیسرے دن بھی جب بچن نے وہی بات دُہرائی تو وہ تڑپ اُٹھی اور
آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی "میرے بھیا تو میرے ساتھ ذرا چل تو سہی
میں بھی دیکھ آؤں"۔
"چلو مگر بابوجی ناراض نہ ہوں ..... ؟"
"نہ ہونگے۔ تو ان سے نہ کہیو"۔
"تو جلدی چلو۔ چار بجنے والے ہیں"۔
سومترا بچن کو ساتھ لیکر گریش کے کمرے میں گئی۔ وہ تیز بُخار میں
بُت بنا پڑا تھا۔ سومترا نے پکارا "گریش! گریش! گریش!!!"
لیکن گریش ہلا تک نہیں۔ نہ اس نے آنکھیں ہی کھولیں۔ اس کا
سُرخ چہرہ اور ڈھکی ڈھکی آنکھیں دیکھ کر سومترا نے بچن کو پکارا۔
"ہاں!" بچن نے پاس آکر کہا۔
بھیا نیچے سے پربھا کو بُلا لو۔ وہ میرے ساتھ رہیگی۔ اور تو دَوڑ کر کسی
ڈاکٹر کو بُلا لا۔ جا بیٹو تو میرے بچن"۔
بچن ایک سانس میں نیچے دوڑا، اور سومترا دیوی دیوتاؤں کی منتیں
مانتی دروازے سے کھڑی لگی رہی۔

"حرامزادی! تجھ سے کس نے کہا تھا وہاں جانے کو ---؟" برج بابو نے
سومترا کا ہاتھ مروڑ کر پُوچھا "وہ تیرا کون ہوتا ہے --- ؟ بھائی؟ باپ؟
یا اور کوئی؟ تو سمجھتی ہے میں کچھ نہیں جانتا۔ میرے تین درجن آنکھیں ہیں۔
تیری رگ رگ پہچانتا ہوں۔ تو وہاں کیوں گئی تھی --- ؟"
سومترا درد سے بِلبِلا رہی تھی۔ اس نے دانتوں سے ہونٹ دبا کر
اپنی نکلتی ہوئی چیخ کو روکا اور ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔
"جلدی بول، نہیں تو آج تیرے ہاتھ پاؤں توڑ کر رکھدونگا"
برج بابو نے اسے ہاتھ چھڑاتے دیکھ کر دو گھونسے جماتے ہوئے کہا۔
"ہائے اماں، ہائے اماں" کہتی ہوئی سومترا دروازے کے بیچ ہی میں
دھم سے بیٹھ گئی۔
"ہوں اب اماں اماں کرتی ہے؟ اب نہ جائیگی اپنے باپ کے ہاں؟"
پربھا نے برج بابو کا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا "ماما کو تیز بُخار چڑھا
ہوا ہے اسی لئے تو چھوٹی ماں مجھے ساتھ لیکر انہیں دیکھنے گئی تھیں۔ تم ..."
"تو چُپ رہ۔ نہیں تو تجھے بھی ٹھیک کر دونگا" برج بابو نے ڈانٹ کر کہا۔
"بابوجی!"

"تو پھر بولی ---؟" کہتے ہوئے برج بابو نے اسے کنارے دھکیل دیا۔
"کیوں جی! اب ہماری سیتا رانی! آپ تو کہتی تھیں میں اس سے بات تک
نہیں کرتی۔ پھر آج وہاں کیا کرنے گئی تھیں۔ شاید اب بوڑھے سے جی
اُکتا گیا ہے۔ کیوں --- ؟"
سومترا سے اب نہ رہا گیا۔ بگڑ کر بولی "زبان سنبھال کر بولو۔
اس کے بارے میں کچی پکی باتیں کروگے تو ٹھیک نہ ہوگا" اس نے برج بابو کی طرف
تیکھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "میرے لئے تو وہ بھائی سے بڑھکر ہے
تم چاہے جو سمجھو"۔
"اوہو کتنا بُرا لگا۔ ارے جہاں گڑھا ہوگا وہیں تو پانی بھریگا۔!!"
کہتے کہتے برج بابو نے ایک دو تین چار نہ جانے کتنے گھونسے اس مُرجھائی
اور سوکھی سہمی کلی سی سومترا پر برسا ڈالے۔

دو مہینے گذر گئے۔ سومترا نے جو اس روز سے چارپائی پکڑی تو پھر
اُٹھنے کی نوبت نہ آئی۔ اس روز کی مار سے اس کا تین مہینے کا حمل ضائع ہو گیا
تھا۔ برج بابو نے علاج معالجے کی طرف سے بے پروائی کی ہو۔ یہ بات بھی نہیں۔ لیکن
سومترا کو نہ اُٹھنا تھا نہ اُٹھی۔ وہ اُٹھنا چاہتی بھی نہ تھی۔ وہ تو گون ہی کی
رات سے دن رات یہی مناتی تھی کہ بھگوان کسی طرح میرے پردے ڈھک لیں۔
اپنے بابوجی کی عزت و آبرو سنبھالے ہوئے دُنیا سے چل بسوں۔ انکے نام کو
دھبہ نہ لگنے پائے۔ اب بھی وہ یہی سوچتی تھی۔
ہاں بچن کی محبت کبھی کبھی اسے بے چین کر دیتی تھی۔ پربھا نے
چھوٹی ماں کی دیکھ بھال اور خدمت و دلجوئی میں رات دن ایک کر رکھا تھا۔
وہ ساری ساری رات اسکے سرہانے بیٹھی رہتی۔ صبح سے شام تک اسکے پاس سے
نہ ہلتی۔ لیکن سومترا کی حالت روز بروز گرتی ہی جا رہی تھی۔
گریش نے تو اس روز کی مار دھاڑ کے دُوسرے ہی دن بُخار ہی کی
حالت میں وہ مکان چھوڑ دیا تھا۔ انسان ایسا جانور ہو سکتا ہے --- ؟
اپنی بے زبان بیوی پر اتنے مظالم ڈھا سکتا ہے۔ گریش جیسے جذباتی
نوجوان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آئی تھی۔ لیکن برج بابو کو دیکھ کر اسے
یقین کرنا پڑا کہ ہاں انسان کبھی کبھی جانور سے بھی گیا گذرا ہو سکتا ہے!
یہاں سے چلے جانیکے بعد گریش کئی بار آکر چپکے سے سومترا کا حال
پوچھ گیا۔ لیکن اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔

پربھا نے سومترا کی حالت روز بروز خراب ہوتی دیکھ کر ایک دن
برج بابو سے کہا "بابوجی چھوٹی ماں کو انکی ماں کے پاس بھیجدیا جائے

تو اچھا ہو گا۔ بہت ممکن ہے وہاں جا کر سنبھل جائیں۔"

برج بابو بھی سومترا کی بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر اپنی "مرجادہ" کو خطرے میں ڈال کر بھی اسے مراد آباد بھیج دینا چاہتے تھے۔ پربھا کی بات سنکر بولے ــــ "سوچ تو میں بھی یہی رہا ہوں۔ اچھا کل صاحب سے چھٹی کے لئے کہوں گا۔"

"نہیں نہیں . . . ." سومترا نے جیسے سوتے سے جاگ کر کمزور آواز میں کہا۔ "تمہارے پیروں پڑتی ہوں۔ مجھے کہیں نہ بھیجو۔ جو ہونی ہو سو یہیں ہو لے۔"

کیا فضول باتیں کرتی ہو۔ تمہیں ہوا کیا ہے؟ اچھی ہو جاؤ گی۔"

"نا نا میرے اچھے ہونے کی فکر نہ کرو۔ تم تو پرماتما سے بس یہی پرارتھنا کرو کہ میں تمہاری "مرجادہ" بچائے ہوئے انکے چرنوں میں پہنچ جاؤں . . . . . ."

برج بابو کچھ نہ بولے۔

تقریباً ایک ہفتے کے بعد سومترا ایک روز چپکے سے برج بابو کی "عزت و ناموس" کو گلے سے باندھے ہوئے چل بسی۔

ناز و نیاز

از جناب عزیز احمد

مری شاعری سے ہے تو جاودانی مری زندگی ہے تری زندگانی
مری فکر تیری مرادوں کی راتیں مرے گیت ہیں تیری الھڑ جوانی
مری نظم میں تیری رعنائیاں ہیں بہاروں کی مستی ہے رت ہے سہانی
مرے ہر تکلم میں آواز تیری مرے ہر نفس میں تری نوجوانی
مری طبع رنگیں کا عنواں یہی ہے تری مست فطرت تری بے زبانی
تری یاد میں بھول جاتا ہوں سب کو بیک جرعۂ ساغر ارغوانی
ترے حسن ہی کے کرشمے ہیں سارے پپیہے کے نالے، مری نغمہ خوانی
مرے شعر نے تیری تصویر کھینچی غریقِ تحیر تھے بہزاد و مانی

تری چشم رومان پرور کے صدقے
خطاوار ہے میری جادو بیانی

تاجدارِ سخن مفلسی کی آغوش میں!

تاریخِ ادب کا دردناک ورق

از جناب ماہر القادری

دنیا کو کمال اور اہلِ کمال سے ہمیشہ بیر رہا ہے، زمانہ کے ہاتھ نے اربابِ کمال کے گریبانوں کی ہمیشہ دھجیاں اڑائی ہیں، آب و آتش اور شعلہ و شبنم کی طرح خوشحالی اور فضل و کمال کی یکجائی بھی محال ہے۔ پریشان حالی اور فلاکت، ہنر اور کمال کے ستارے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں، فضل و کمال کی تاریخ کے اوراق خونِ تمنا سے رنگین ہیں۔ ایسے ویسوں کا کیا ذکر، "گلگشتِ مصلےٰ" اور "رکنا باد" کے شیدائی لسان الغیب حافظ شیرازی کے زمانہ میں کمال کی ناقدری کا یہ عالم تھا کہ احمق اور جہلا کے لئے دنیا قند و گلاب کا شربت مہیا کرتی تھی، اور اربابِ عقل و فکر خونِ جگر پیتے تھے، اس سے بھی بڑھکر قیامت یہ کہ:—

اسپِ تازی شدہ مجروح بزیرِ پالاں
طوقِ زریں ہمہ در گردنِ خرمی بینم

حافظ کے زمانہ میں ہی کچھ دنیا کی یہ رفتار نہ تھی، دنیا نے ہمیشہ "اسپِ تازی" کو مجروح کیا اور گدھوں کی گردنوں میں سنہری طوق ڈالے ہیں۔ آج بھی دنیا اپنی قدیم روایاتِ برنجتی کے ساتھ قائم ہے، اور زمانہ کی "کمال دشمنی" اور "سفلہ پروری" مستقبل کے مورخ کے لئے مواد فراہم کرتی جا رہی ہے۔

ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

تاجدارِ سخن میر تقی میر کو کون نہیں جانتا، ہندوستان کے "شاعرِ اعظم غالب" نے میر کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:—

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

قلعۂ معلیٰ کی منزلِ شعر و ادب کا امیرِ کارواں ذوق کہتا ہے:

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

تاریخِ شعر و ادب غالباً کوئی ایسی مثال پیش نہیں کرتی کہ میر کے بعد کسی شاعر نے میر کے کمال سے انکار کیا ہو، اور غالب کے اعتراف نے تو میر کی استادی کو قطعی طور پر مستند اور رجسٹرڈ (Registered) کر دیا۔ میر ہمارے درمیان سوز و درد کے آتشکدے چھوڑ گیا ہے۔ اردو زبان اس کے بارِ احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی، خود اعتمادی کا یہ عالم کہ دل کی بات بے اختیار شعر کے سانچے میں ڈھل گئی، کس درد و شور کیساتھ کہتا ہے:—

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

زبان اور روزمرے کا تو میر امام تھا ہی مگر اس کے تخیل سے بھی متاخرین شعراء متاثر ہوئے ہیں، علامہ اقبال کا یہ مشہور شعر:—

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

میر کے اس شعر کا:—

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

نقشِ ثانی معلوم ہوتا ہے۔ اور جوش ملیح آبادی کا یہ شعر:—

نرمی و لطف سے لے کام کہ دل کے ہاتھوں
زندگی کارگہِ شیشہ گراں ہے ساقی!

تو میر کے اس شعر کی:—

ہر قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں
یہ کارگاہ ساری دکانِ شیشہ گر ہے

بالکل صدائے بازگشت ہے!

میر کا مکان: جانتے ہو دنیا نے میر کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ تم میں میر کی غزلوں کو "تغزل کی جنت" اور "فردوس" کے جلی عنوانوں سے شائع کرتے ہو، معلوم ہے کہ "فردوسِ تغزل" کا مالک میر کس کلبۂ احزاں اور غم خانہ میں رہتا تھا، اسی کی زبان سے اس کی بپتا سنو:—

کیا لکھوں میر اپنے گھر کا حال — اس خرابی میں میں ہوا پامال
گھر کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے — سخت دل تنگ یوسفِ جاں ہے
چار دیواری سو جگہ سے نم — ترشح سے ہو تو سوکھتے ہیں ہم

[مکان کی چار دیواری ضعف سے خم کھا گئی ہے اور سیلاب ہے، ذرا بھی گیلی ہو جاتی ہے، تو گرنے کے ڈر سے میر صاحب کی جان سوکھنے لگتی ہے]

اس کشاکش کا سلسلہ کیا کہئے — نہ اٹھے سے کب تک گرتے بھرتے

ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثق   سو شکستہ تر از دلِ عاشق

[میر صاحب کے گھر میں ایک حجرہ جو سب سے زیادہ مضبوط تھا ،
اُس کا یہ عالم ہے کہ عاشق کے دل سے بھی زیادہ شکستہ اور چھلنی ہے]

کونے ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں   پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں
جسم خاکی میں جس طرح جاں ہے   اس طرح خانہ ہم پہ زنداں ہے
ظلمتیں اس کی سب پہ روشن ہیں   زندہ در گور ہم کئی تن ہیں

میر صاحب نے نہایت ہی دردناک الفاظ میں اپنے مکان کی تفصیل پیش کی ہے۔ اشعار کیا ہیں خونِ جگر کی بوندیں ہیں، مکان کے بودے پن کا یہ عالم ہے کہ ایک کوا دیوار پر آ کر بیٹھ گیا تو دیوار کا ایک حصہ ٹوٹ گیا۔

میر کی غربت اور فلاکت کی کوئی انتہا ہے :—

مینہ میں کیوں نہ بھیگئے یکسر   پھوس بھی تو نہیں ہے چھپر پر
بانس کی جا دیئے ہیں سرکنڈے   سوئے ہیںوں میں سب ہوئے ٹھنڈے

چھت سے جو پانی ٹپکتا ہے تو اُس کی بدرنگی نے میر صاحب کے کپڑوں کو بدنما اور داغدار بنا دیا ہے، گھر میں لے دیکے دو تین چارپائیاں ہیں سو اُن کا یہ عالم ہے کہ کسی کی ادوان درست نہیں، کسی کے پائے ٹوٹے ہوئے ہیں، پھر اُس پر قیامت یہ کہ موذی کھٹملوں نے میر صاحب کے گھر میں چھاؤنی چھائی ہے اور رات کھٹمل مارتے اور ایڑیاں رگڑتے گذرتی ہے، برسات کی رُت، بودا مکان، چھت چھلنی، اُس پر مفلسی کا دور دورہ، حالت یہ ہے :—

اَب وہی گھر ہے بے سروسایہ   اور میں ہوں وہی فرومایہ
دن کو ہے دھوپ رات کو ہے اوس   خوب راحت ہے یاں سے سو سو کوس
قصہ کوتہ دن اپنا کھوتا ہوں   رات کے وقت گھر میں سوتا ہوں

نہ اثر بام کا نہ کچھ در کا
گھر ہے کاہے کا نام ہے گھر کا

ایک تو میر صاحب کا مکان پہلے ہی بودا تھا، اُس پر ہوئی زور کی بارش، مکان میں بارش کے ریلے کا زور سہنے کی سکت ہی کہاں تھی، یہ چھت بیٹھی، وہ دیوار گری، صحن کا چھپر پانی پر تیرنے لگا، ستون مٹی کا ڈھیر ہو گئے، اَب میر کو مکان چھوڑ دینا پڑا، میر صاحب اپنے مکان سے کس طرح روانہ ہوئے ہیں، اُس کی تفصیل اُن ہی کی زبان سے سُنئے :—

گٹھری کپڑوں کی میں اُٹھائی تھی   سر پہ بھائی کے چارپائی تھی
بوجھ کپڑوں کا جن نے باندھا تھا   اُس کا سارا اُدگار کاندھا تھا
چھاج کی کر کے کوئی اوٹ چلا   مینہ کے مارے کوئی لوٹ چلا

ایک نے بوریا لپیٹ لیا   اور پایا جو کچھ سمیٹ لیا
اپنا اسباب گھر سے ہم لے کر   الگنی سب کے ہاتھ میں دے کر
صف کی صف نکلی اس خرابی سے   تاکہ پہنچیں کہیں شتابی سے

میر جی اس طرح آتے ہیں
جیسے کنجر کہیں کو جاتے ہیں

غرض یہ تاجدارِ سخن اور شہنشاہِ اقلیم معانی خانہ بدوش کنجروں کی طرح ڈیرے ڈنڈے لئے ہوئے ایک دوست کے یہاں پہنچا۔ دوست نے میر کی حالت پر رحم کھایا اور اپنے یہاں ٹھیرا لیا۔ یہ ہے میر کی خانہ خرابی، مُفلسی، پریشاں حالی اور فلاکت زدگی کی ایک تصویر! دلّی کے بہت سے کُندۂ ناتراش اور جاہل و احمق اُمراء اور اہلِ دولت اپنی حویلیوں اور کوٹھیوں میں چین کی نیند سو رہے تھے اور یہ امامِ فن کپڑوں کی گٹھری اُٹھائے ہوئے پانی اور کیچڑ میں چل رہا تھا :—

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

غنی کاشمیری کا واقعہ | تمہیدی سطور میں کہا جا چکا ہے کہ اہلِ کمال کے ساتھ دُنیا کا سلوک ہمیشہ دردناک رہا ہے، یہاں غنی کاشمیری کا ایک قصہ یاد آ گیا جس کا تذکرہ یقیناً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

غنی کاشمیری کی عادت تھی کہ وہ جب تک گھر میں رہتا گھر کو مقفل کر دیتا اور جب باہر جاتا تو گھر کو چوپٹ کھلا چھوڑ دیتا، لوگوں نے اُس سے کہا کہ تمہارا دستور دُنیا سے بالکل اُلٹا ہے، لوگوں کا قاعدہ ہے کہ جب کہیں باہر جاتے ہیں تو گھر کو بند کر جاتے ہیں اور جب گھر میں ہوتے ہیں تو کھلا رکھتے ہیں، تم اس کا بالکل اُلٹا کرتے ہو، غنی نے جواب دیا کہ لوگ اپنے مال و اسباب کی حفاظت کیلئے ایسا کرتے ہیں، میرے گھر میں کیا رکھا ہے، اپنے گھر کی سب سے قیمتی چیز میں خود ہی ہوں، اس لئے میں جب گھر سے باہر رہتا ہوں تو گھر کو کھلا چھوڑ دیتا ہوں اور جب گھر میں ہوتا ہوں تو مکان مقفل کر دیا جاتا ہے۔

کتنی سچی بات کہی غنی نے (خدا اُس کی قبر پر رحمت کے پھول برسائے)! واقعی اربابِ کمال کا سرمایہ خود اُن کا وجود ہوتا ہے، زمانہ کی ناقدری سے کمال کی قدر و قیمت کم نہیں ہو سکتی، تم سچے موتی کو مٹی میں پھینک دو گے، تو کیا تمہارے ایسا کرنے سے موتی کی ذات بیچی ہو جائے گی۔

میر کی بددماغی | اربابِ کمال بہت کچھ مستغنی المزاج ہوتے ہیں مگر دُنیا کی ناقدری اور زمانہ کی بے مہری کا بہرحال اُن پر اثر ہوتا ہے۔ چوٹ کھا کر آہ کرنا فطرت کے عین مطابق ہے۔ غموں نے میر کو بالکل بدحال بنا دیا تھا، خود ہی کہتے ہیں :—

۵۱ بارش کی وجہ سے سرکنڈے بھی گل گئے۔
۵۲ بارش سے بچنے کے لئے چھاج سر پر رکھ لیا۔

حالت تو یہ کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ
دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے نام مجلسوں میں مرا میرِ بے دماغ
ازبسکہ بے دماغی نے پایا ہے اشتہار

غموں کی شدت سے آدمی نازک مزاج ہو جاتا ہے کسی کی ذرا سی بات بھی وہ سہار نہیں سکتا۔ میر کی اسی نازک مزاجی کو لوگ "بددماغی" سے تعبیر کرتے تھے لیکن میر کی یہ "بددماغی" متکبر امیروں اور دولتمندوں کے ساتھ تھی، عوام کے ساتھ اُن کا سلوک بہت اچھا تھا۔ اور متکبر امیر اور مغرور دولتمند حقیقت میں اسی متکبرانہ سلوک کے مستحق بھی ہیں کہ:—

التکبرُ مع المتکبرِ صدقۃٌ

متکبر کے ساتھ تکبر کرنا بھلائی ہے، تو اگر میر نے امیروں کا پندار توڑنے کے لئے بددماغی اور تکبر کا اظہار کیا، تو اُس کا یہ طرزِ عمل ہزاروں ستائشوں کا مستحق ہے!

میر مر گیا مگر اُس کی باتوں پر دُنیا آج تک سر دھنتی ہے۔ میر کے عہد کے امیروں اور دولتمندوں کو کوئی نہیں جانتا کہ کس خاک کا پیوند ہو کر رہ گئے لیکن میر ہمارے دلوں، نگاہوں اور خیالوں میں زندوں کی طرح چل پھر رہا ہے۔ میر نے خود کہا بھی تو تھا:—

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سُنیے گا
پڑھتے کسی کو سُنیے گا تو دیر تلک سر دُھنیے گا

منائے کون؟

از حضرت نواب غازی آف گوردھا (سی۔پی)

بیکس کے حالِ زار پہ آنسو بہائے کون — ویرانہ جل رہا ہے الٰہی بچائے کون؟
لے دیکے ایک فکرِ کفن ترکۂ غریب — اب موت کے سوا مری بالیں پہ آئے کون؟
ناکام حشر بوقِ سرافیل بے اثر — خوابِ عدم سے کشتۂ غم کو جگائے کون؟
مظلوم کا گواہ خداوندِ غیب دان — بندوں کے روبرو مگر آقا کو لائے کون؟
اے بادِ صبح میں گُلِ شمعِ گداز ہوں — آنسو مرا خمیر ہیں مجھ کو ہنسائے کون؟
برگشتہ بددماغ کو لے آئیں راہ پر — رُوٹھے اگر مشیّتِ باری منائے کون؟

غازی دروغ باف نہ مردِ زمانہ ساز
اس بے ہُنر کو بزم میں اپنی بُلائے کون؟

اعتبارات

کیا بتائیں آہ کیا عالم ہمارے دل کا ہے

از حضرت دلؔ شاہجہانپوری

خون کی ہر بوند میں جوش آج کل اک دل کا ہے
اس بھروسہ پر ارادہ کوچۂ قاتل کا ہے

ضبطِ کاوش سے عجب عالم ترے بسمل کا ہے
جو نفس ہے اک مرقع اضطرابِ دل کا ہے

حسن کیا ہے اک کرشمہ جس کی فطرت دلفریب
عشق کیا ہے ایک نقشہ بیکسیٔ دل کا ہے

شوقِ دل جتنا بڑھا گردا اور بھی بڑھتی گئی
آگے آگے قیس کے دھوکا سا کچھ محمل کا ہے

سو حجابوں میں بھی تجھکو سب نے دیکھا بیحجاب
شاہدِ خلوت نشیں تو رنگ ہر محفل کا ہے

آنِ واحد میں الٰہی غرق کر دینا اُسے
عشق کے دریا میں جس کو آسرا ساحل کا ہے

پیچھے پیچھے خاک بر سر عشق کی رسوائیاں
آگے آگے قافلہ صبر و شکیبِ دل کا ہے

شمع پروانہ بنے پروانہ جل کر خاک ہو
یہ تقاضا انتہائے گرمیٔ محفل کا ہے

یہ ہوائے سرد، یہ سبزہ، یہ لطفِ جوئبار
کیا بتائیں آہ کیا عالم ہمارے دل کا ہے

پاس رہ کر یہ تکلف، ساتھ رہ کر یہ حجاب
میرے ان کے فاصلہ گویا کئی منزل کا ہے

سینۂ مجروح سے اے چارہ گر پیکاں نہ کھینچ
ناشناسِ راز! یہ ٹکڑا تو میرے دل کا ہے

ٹھوکریں کھا کر جہاں گرنا وہیں کرنا قیام
یہ نشاں اے طالبِ منزل تری منزل کا ہے

حضرتِ دلؔ ہر قدم پر اک نیا سر چاہیے
تشنۂ خوں ذرہ ذرہ کوچۂ قاتل کا ہے

مغل لائن لمیٹڈ

حاجیوں کو لے جانے والی جہاز ران کمپنی

حاجیوں کے جہازوں کی روانگی کا انتظام حکومت ہند کے مشورے سے ہوگیا ہے اور مغل لائن حسب معمول اعلیٰ جگہ اور سہولتیں بہم پہنچائے گی۔

حالات جنگ کے باعث جہازوں کی روانگی کی ٹھیک تاریخیں اور ان کے نام نہیں بتائے جاسکتے۔ لیکن حکومت ہند کے سرکاری اعلان مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۴۰ء کے مطابق جو حاجی بمبئی یا کراچی سے روانہ ہونا چاہیں انہیں چاہیئے کہ وہ ان بندرگاہوں پر بدرجہ آخر ۲۲ نومبر تک پہونچ جائیں۔ جو حاجی کلکتہ سے روانہ ہوں انہیں بدرجہ آخر ۲۹ نومبر تک کلکتہ پہنچ جانا چاہیئے

کرائے حسب ذیل ہیں:-

	بمبئی سے جدہ تک	کراچی سے جدہ تک	کلکتہ سے جدہ تک اور بمبئی تک واپسی
درجہ اول کا واپسی کرایہ معہ خوراک	۷۲۵ روپے	۷۰۰ روپے	۷۷۰ روپے
عرشہ کا کرایہ واپسی معہ خوراک	۱۹۵ روپے	۱۸۹ روپے	۲۲۶ روپے

حکومت ہند کوشش کر رہی ہے کہ ماہ دسمبر میں کسی وقت ایک دفعہ اور حاجیوں کو لیجانے کیلئے جہازوں کا انتظام ہوسکے۔ مگر حاجیوں سے پُر زور سفارش کی جاتی ہے کہ جن جہازوں کی روانگی کے انتظام کے متعلق اوپر بیان کیا گیا ہے انہی سے روانہ ہوں مزید تصریحات ذیل کے پتے سے دریافت کیجئے:-

ٹرنر ماریسن اینڈ کو لمیٹڈ ۱۶ بنک سٹریٹ بمبئی

مقدّس پیالہ

یونانی مورّخ پلوتارک کے ایک قصّے کا بدیشی ناٹک جو ولایت کی اسٹیج پر متواتر ایک سو تیس رات کھیلا گیا!

نوشتہ لارڈ ڈینیسن

مترجمہ:- جناب رحمٰن مذنب

افرادِ تمثیل

اہل کالیسیا

سناریقوس ... ... کالیسیا کا سابق صوبیدار

سناطوس ... ... ،، ،، موجودہ ،،

لڑکا ... ... جو مقدس پیالہ اور سنیام لے جاتا ہے

باندی ... ... قامہ کی لونڈی ،

غلام ... ... سناطوس کا غلام

فیبی ... ... معبد کی پجارن

قامہ ... ... سناطوس کی بیوی

اہل روما

انطونیاس ... ... رومی سپہ سالار

فوبلیاس ... ... سناریقوس کا محافظ

فالتو لوگ ... پجارنیں خلقت سنپے سپاہی

مقام

قدیم روما کی مملکت کا ایک صوبہ جو کالیسیا کہلاتا ہے!

پہلا باب

پہلا منظر

مملکت کالیسیا کا بعیدی نظارہ ۔ پردہ اٹھتے ہی دور سے ارطمیز دیوی کا مندر نظر آتا ہے جہاں سے پجارنوں کے نغمے کی دھیمی آوازیں بانسریوں کے سُروں سے مل کر کانوں تک پہنچتی ہیں ـــــ رومی سپاہیوں کا دستہ سردار سناریقوس اور سپہ سالار انطونیاس کی معیت میں داخل ہوتا ہے اور بستی سے نصف کوس باہر پہاڑی ندی کے کنارے بلوط کے درختوں کا جھنڈ دیکھ کر پڑاؤ ڈالدیتا ہے ۔ مشرقی سمت ناہموار پہاڑیوں کا مختصر سا سلسلہ ہے جن میں انگوروں کی وادی ہے اور شمال مشرقی گوشے میں گھنا جنگل ہے جو بہت بڑی شکارگاہ ہے ۔ سناریقوس ندی کے ساتھ ساتھ ذرا فاصلے پر چلا جاتا ہے جہاں سے ارطمیز کا معبد اور بستی کا باقی نظارہ خوب دکھائی دے سکتا ہے ۔

سناریقوس ۔ یہی وہ بستی ہے ـــــ صنوبر، بیچ، بلوط، اخروٹ، شمشاد، خوبانی اور چنار کی بستی، حنا اور انگوری بیلوں کی بستی جہاں وہ رہتی ہے (ذہن میں ایام گزشتہ کا خیال لاتے ہوئے) آج سے تین برس پہلے جب میں اس صوبے سے فرار ہو کر روما کا رخ کئے ہوئے تھا تو وہ مجھے ملی ـــ معبد کی دوشیزہ اپنی دوشیزہ باندیوں کی ہمراہی میں آہستہ آہستہ نغمہ سرا تھی ۔ آہ ! اے دیوتاؤ ! وہ میری قسمت ہے ۔ میری قسمت مجھے اس بستی میں دوبارہ کھینچ لائی ہے ۔ لیکن ہائے میری بدقسمتی وہ بیاہی جا چکی ہے ۔ یہاں کے صوبیدار سے اس کا بیاہ ہو گیا ہے ۔ اگر وہ کسی طرح غدار ثابت ہو جائے تو روما اسے زنجیریں پہنا دیگا یا سپرد اجل کر دیگا ۔ پھر میں اسے پا لینے کی امید رکھ سکتا ہوں ہماری ملکہ ـــ ! مملکت روما ہماری مرہون منت ہے کیونکہ میں نے اپنے قبائل کی کمزوری اور باہمی تنازعات سے اسے آگاہ کر دیا ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ انھیں کیونکر آسانی سے کچلا جا سکتا ہے ۔ کمبخت نسل ! ایک دفعہ تو میں نے نسل بھر کی دنیا اُجاڑ دینے کی ٹھان لی تھی جبکہ میں یہاں کا صوبیدار تھا لیکن زندگی کے ایسے مشکل وقت میں انتقام کی قیمت انتقام ہوا کرتی تھی ۔ اگر ایک بار ہمارے مقاصد پورے ہو جائیں تو ......؟ (فرغل کے نیچے سے مقدس پیالہ اور ہرن کی کھال پر لکھی ہوئی تحریر نکال کر) یہ مقدس پیالہ ـــــ میں نے کبھی کسی عورت کے لئے ایسے حسرت بھرے جذبے کا اظہار نہیں کیا (لپٹی ہوئی تحریر کھولتا ہے) میں نے اس کے نام کیا تحریر کیا ہے (پڑھنے لگ جاتا ہے)

"لاکوشتنا، صوبیدار سناطوس کی اہلیہ کی طرف ارطمیز دیوی کا ایک عقیدتمند اور حمدگو جس نے برسوں پہلے اسے معبد میں پرستش کرتے دیکھا اور اسی لحظہ فریفتہ ہو گیا ۔ یہ مقدس پیالہ بھیجتا ہے جو اس نے دیوی کی خانقاہوں میں سے کسی بستی کی ایک جلتی ہوئی خانقاہ سے بچایا تھا جہاں سے وہ رومی عسکر لے کر گزرا ۔ یہ مقدس پیالہ وہ ہے جو ہمارے یہاں شادی بیاہ کی تقریبوں پر برتا جاتا ہے اسے اس کی جانب سے قبول کرو جو خود کو فی الحال اس کے سوا اور کچھ نہیں لکھ سکتا ۔"

"کالیسیا کا ایک باشندہ جو رومی عسکر میں جبراً کام کر رہا ہے ۔"

(پڑھ چکنے کے بعد) عورتوں کے درمیان کافی تجربہ رکھنے کے باوجود میں اس سے ایک دم بر ملا ملنے سے گریز کرونگا ۔ بہتر یہ ہے کہ مقدس پیالہ اور تحریر کسی قاصد کے ہاتھوں اس تک پہنچا دوں (ادھر ادھر دیکھتا ہے تاکستان سے ایک لڑکا انگوروں سے لدی ہوئی ٹوکری اٹھائے معبد کی طرف جاتا دکھائی دیتا ہے سناریقوس بلاتا ہے) او لڑکے ! ادھر آیو ذرا ۔ (لڑکا رخ پلٹتا ہے اور سناریقوس کے پاس آجاتا ہے) ـــ کیا تو سناطوس کے محل میں جا سکتا ہے ؟

لڑکا ۔ ہاں، سرکار ! یہ ٹوکری مجھے انھیں کے محل میں لے جانی ہے جو معبد کے متصل ہے

سناریقوس ۔ (ہاتھ کے اشارے سے) وہ سامنے ۔

لڑکا ۔ جی ہاں سرکار !

سناریقوس ۔ (فرغل کے دامن سے نصف روبل نکال کر لڑکے کو پکڑاتے ہوئے) یہ تیرا انعام ہے اور کام یہ ہے کہ یہ پیالہ اور تحریر سناطوس کی بیوی قامہ تک پہنچا دے ۔

لڑکا ۔ سرکار ! وہ تو اپنے شوہر کا شکار دیکھنے باہر گئی ہوئی ہیں ۔

سنارلیقوس - تو کچھ مضائقہ نہیں، تو دونوں چیزیں اس کی دہلیز پر چھوڑ آنا
لڑکا - بہت بہتر آقا!
(لڑکا اپنی ٹوکری بائیں ہاتھ سے کندھے پر لٹکا کر پیالہ اور
تحریر دائیں ہاتھ میں لیکر چلدیتا ہے)

... .

(ٹرائویرسے انطونیاس بھی آجاتا ہے)
انطونیاس - (لڑکے کو جاتا دیکھ کر) او لڑکے! کہاں بھاگا جا رہا ہے (سنارلیقوس سے) کیا یہی پیالہ ہے جو تم نے آگ سے بچایا تھا؟
سنارلیقوس - ہاں، میں اسے ساطوس کی بیوی کی جانب بھیجتا ہوں جو مذہبی رسوم کی دیوانی ہے۔ تم جانتے ہو کہ ہم اپنی قیادت میں رومی سپاہی لے کر آئے ہیں تاکہ عرصہ سے رکا ہوا خراج اس سے زبردستی حاصل کیا جائے۔ تم اس ساطوس کی اس کی وطن پرستی سے شاکی ہو کیونکہ تمھارے نزدیک یہ غداری ہے لیکن سردست تمھارے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے اب یہ پیالہ ان کے محل میں داخل ہونے کے لئے پروانہ راہداری ہے اور اسے بھیجنے والے کے نام خیر مقدم کا پیغام۔ مجھے یقین ہے کہ ایک بار تو میں ان کے مضائق میں کیڑے کی طرح گھس جاؤں گا۔
انطونیاس - اگر تم ترقی کر جاؤ تو ہماری مجلس زعما جو ریاستوں کی باہمی کینہ سازیوں سے تنگ آگئی ہے بہت اغلب ہے کہ انھیں اڑا دے اور ان پر ایک سردار مسلط کر دے جو رومیوں کا سچا بہی خواہ ہو اور جو کچھ میں نے روما میں سنا ہے یہ باجگذارانہ تاج تمھاری قسمت میں آئے گا۔
سنارلیقوس - سردار اور باجگذارانہ تاج کا تذکرہ روما میں؟ انطونیاس کیا یہ سچ ہے؟
انطونیاس - بالکل سچ ہے۔
سنارلیقوس - خوب! تاج مل جانے پر میں کالیسا کی خدمت کرونگا اور اسے ہلاک ہونے سے بچالوں گا۔ میں روما کا ایک رومی سے بڑھکر وفادار بن جاؤں گا۔

دوسرا منظر

تاکستان کا ایک گوشہ اور پہاڑیوں کا سلسلہ —— قامہ اپنی باندی کے ہمراہ ساطوس کا شکار دیکھنے آئی ہے ایک چٹان پر چڑھ جاتی ہے تاکہ بلندی سے ہر شے اچھی طرح نظر آسکے۔

قامہ - ساطوس کہاں ہے؟
باندی - لو بتائے دیتی ہوں۔ وہ آبشار ہے نا؟
قامہ - ہاں، ہاں، ہے۔
باندی - اس کی سیدھ میں دیکھئے۔ دور جھاڑیوں میں جہاں ہرن ہے وہیں پیڑوں کے پیچھے سے ساطوس بھاگے آرہے ہیں۔
قامہ - اوہو، معلوم ہوگیا۔ وہ ہرن چھٹ گیا۔ وہ ساطوس نے تیر مارا اُف نشانہ خطا گیا۔ باندی! اب یہاں سے اتر چلیں اور یہ سامنے کی چوٹی پر پہنچیں۔
باندی - چلئے وہیں چلیں، چوٹی کافی بلندی پر ہے۔ ذرا سنبھل سنبھل کر قدم جما کر چڑھئے گا۔
قامہ - تو زیادہ فکر اپنی کر۔
(دونوں یہاں سے اتر کر سامنے کی پہاڑی پر چڑھ جاتی ہیں۔ لیکن ساطوس شکار کرتا کرتا جنگل کے دوسرے گھنے حصے میں جاکر اوجھل ہو جاتا ہے۔ قامہ باندی کو لیکر لوٹ آتی ہے اور محل کی طرف چلی جاتی ہے۔)

پھر وہی پہلا منظر

سنارلیقوس دور سے قامہ کو جاتے دیکھ لیتا ہے لیکن اپنا چہرہ اسے دکھانے سے بچاتا ہے۔
سنارلیقوس - (زیر لب) حسنِ قیامت، مجسمۂ محشر، یوں معلوم ہوتا ہے کہ دھڑ جونو دیوی کا ہے —— ابرو اور آنکھیں زہرہ کی —— چہرہ اور شباہت بے نظیر،
انطونیاس - تم اسے اس میلان سے کیوں تک رہے ہو؟
سنارلیقوس - تاکہ جان سکوں وقت نے اسے بدل تو نہیں دیا۔؟
انطونیاس - (طعنے کے طور پر) کہیں تمھیں اس سے محبت تو نہیں؟

....

سنارلیقوس - مجھے ساطوس پر رشک آگیا تھا جب اس نے اسے بیاہا۔
انطونیاس - کیا وہ اس چیز سے واقف ہے؟
سنارلیقوس - واہ واہ، وہ تو میری صورت بھی نہیں پہچانتی۔
انطونیاس - ساطوس بھی نہیں؟
سنارلیقوس - ساطوس بھی نہیں!
انطونیاس - جو شیلے دلبر! میں نے روما میں لوگوں کی زبانی سنا تھا کہ تمھاری اپنی رعیت نے تمھیں کسی خاتون کی ناشائستگی کے ساتھ

آبروریزی کرنے پر بستی کی حدود سے باہر نکال دیا۔ جس طرح روما نے طاراقین[1] کو نکالا تھا۔

سنارلقوس۔ خیر! اگر یونہی ہے تو میں طاراقین کی طرح تاج و تخت کے لئے واپس آیا ہوں۔

انطونیاس۔ لیکن طاراقین ہی کی طرح شکست کا مُنہ دیکھوگے اگر تم نے روما کی اٹل اور مستحکم حکمت عملی کی پیروی نہ کی یاد رکھو کہ عشق اور شہوانیات کی احمقانہ آگ تمھیں بھسم کردیگی یا پھر تم روما کی خاطر ڈوب رہوگے۔

سنارلقوس۔ ہشت! مجھے خائف نہ کرو۔ میں ہمیشہ صنف نازک کے درمیان فتوحات پاتا رہا ہوں۔ میں روما کا سب سے سچا رفیق ہوں،

انطونیاس۔ (زیرلب) مجھے اس انسان سے نفرت ہے —— ہماری مجلس زعما کیسے نجس ہتھیاروں سے کام لیتی ہے تاہم مجھے ضرور اطاعت کرنی ہوگی۔ (سنارلقوس سے) مجھے جانے کی اجازت چاہئے الوداع —— (چلا جاتا ہے)

سنارلقوس۔ الوداع ——!

انطونیاس۔ (رکتے ہوئے) ذرا دیکھنا! اگر تم سناطوس کا کسی سازش میں کھوج لگاؤ تو اسے اسیر کرنے کا فرمان میرے پاس ہے اسے ساتھ لے لو۔

(فرمان پکڑا دیتا ہے۔ انطونیاس پڑاؤ پر آجاتا ہے لیکن سنارلقوس جنگل کی شکارگاہ کو ہولیتا ہے)

تیسرا منظر

(جنگل کا وہ حصہ جو گھنا ہے۔ سناطوس اور اس کے ہمراہی تھک تھکا کر پسینے میں شرابور ہوجاتے ہیں۔ وہ چھوٹے سے جوہڑ کے کنارے کچھ دیر سستانے کے لئے بیٹھ جاتے ہیں۔ غلام شراب کا قرابہ اور پھلوں کا طباق لے کر آجاتا ہے)

سناطوس۔ پھلوں کا طباق بیچ میں رکھ کر لٹا دو! لیکن ٹھیرو۔ شراب کے قرابے کو بچاؤ کہیں اسے ٹھیس نہ لگ جائے۔

غلام۔ آقا! اسے تو اپنے پاس ہی رکھ لیجئے۔

سناطوس۔ ٹھیک ہے۔

(غلام شراب کا قرابہ سناطوس کی تحویل میں کردیتا ہے اور پھلوں کا طباق سب ہمراہیوں کے بیچوں بیچ پٹک دیتا ہے۔ خوب لوٹ مچتی ہے۔ سناطوس شراب پینے لگ جاتا ہے)

سناطوس۔ اور یہ شکاری کتے بیٹھے مُنہ تکتے رہیں گے انھیں ہرن کا ایک لوتھڑا خنجر سے کاٹ کر دیدو۔

(غلام کمر سے خنجر نکال کر ہرن کے گوشت کا ایک لوتھڑا کاٹ کر ان کے آگے ڈال دیتا ہے ان میں بھی ہڑبونگ مچ جاتی ہے۔)

(سنارلقوس یہ سب کچھ دور سے دیکھتا ہے)

سنارلقوس۔ سناطوس وہی ہے جو غلام کو حکم دے رہا ہے —— ایک اکھڑ ناتراشیدہ اور سیدھا سادھا انسان۔ اگر ہم مغز کا پتہ چھلکے سے لگا سکتے ہیں تو وہ عورت کی وفاداری قابو میں نہیں لا سکتا جب اس پر عشق اور فریب سے ہلہ بولا جائے۔ میں اس کے ساتھ ہو لیتا ہوں۔ اس سے کچھ نہ کچھ فائدہ تو اٹھا ہی لونگا اور یوں شاید آج ہی قامہ سے مل لوںا لیکن یہ اس کے ساتھ کون لوگ ہیں؟ کوئی ایسی شکل نظر نہیں آتی جو مجھے پہچان سکے۔ کیا میں جان جوکھوں میں ڈالدوں۔ بس اس وقت ایک رومی ہوں۔ وہ مجھے چھونے کی مجال نہیں رکھتے۔

(سنارلقوس ان کے پاس چلا جاتا ہے)

سنارلقوس۔ جناب! آپ کو دن مبارک ہو، کیا آپ کو رومیوں کی پروا نہیں جو آپ یوں جنگل میں شغل کر رہے ہیں انھوں نے تو یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ڈیرا ڈال رکھا ہے۔

سناطوس۔ واہ پروا کیوں نہیں، لیکن تم کون ہو اور تمھیں مجھ سے کیا کام ہے

سنارلقوس۔ میں بہت پہلے سے شکار کا شوقین ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ مجھے شرکت کی دعوت دیں اگرچہ میں اجنبی ہوں۔

سناطوس۔ اگر ایسا ہی ہے تو ضرور شریک ہو لو (شراب کا پیالہ بڑھا کر) لو ذرا تازہ دم ہوجاؤ۔ شراب ختم ہوچکی ہے تلچھٹ بھی اب تو باقی نہیں رہی۔ قدرے پہلے آتے تو شراب بھی زیادہ ملتی اور پھل پھلاری بھی تمھارے پلے پڑتے

سنارلقوس۔ خیر! یہ بھی کافی ہے (زیرلب) بیدھے سادھے انسان پھل پھلاری کے بجائے تیری بیوی میرے پلے پڑیگی۔

سناطوس۔ تمھارا نام کیا ہے؟

سنارلقوس۔ میرا نام سطرالو ہے۔

سناطوس۔ رومی نام تو نہیں ہے یہ؟

سنارلقوس۔ نہیں جناب! یہ یونانی نام ہے۔ آپ کو علم ہے کہ ہم کالیبیا

---

[1] مغرور طاراقین سپاربوس روما کا آخری تاجدار تھا جسے ۵۱۰ق۔م میں تخت سے برطرف کیا گیا۔ اس کے بعد اہل روما نے ملوکیت کا خاتمہ کردیا، طاراقین نے تخت کے حصول کی خاطر کئی بار محاربت کی لیکن ہمیشہ شکست کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ آخرکار نہایت بیچارگی اور مایوسی کی حالت میں مرا۔

کے باشندے یونانی اور گال دونوں ہوا کرتے ہیں۔

ساطوس ۔ لیکن تم بن ہتھیار کے ہو (ہمراہی سے) سطراطو کو تیر اور کمان دے دو اور اٹھو اب ہرن کا پیچھا کریں۔

(ساطوس اٹھ کر چل دیتا ہے۔ ہمراہی ساتھ ہو لیتے ہیں۔ کل جماعت کتوں کی چیخ پکار اور ناقوس کے شور میں غائب ہو جاتی ہے۔)

چوتھا منظر

(سردار ساطوس کا ایوان ـــ دیواروں پر فراسکو تصویریں کھنچی ہیں۔ ایک طرف گدوں والا تخت پوش بچھا ہے قریب ہی چھوٹی سی میز دھری ہے جس پر شراب کا قرابہ، چند جام انگوروں کا طباق اور مقدس پیالہ چنے رکھے ہیں۔ شام ڈھل چکی ہے باہر چاندنی نکھر رہی ہے۔ قامہ داخل ہوتی ہے اور کھڑکیوں کے پردے کھول دیتی ہے۔)

قامہ ۔ چاند طلوع ہو رہا ہے اور ساطوس کا ابھی تک پتہ نہیں۔

(ستارے لیتی ہے اور گدے پر بیٹھ کر گانے بجانے لگ جاتی ہے)

چاند ـــ!
کھیت پر اور جھاگ پر
ویرانے پر اور دشت پر
جلوہ گر ہے ـــ!
اے چاند! ـــ پیارے چاند ـــ!
اسے گھر واپس لے آ،
واپس لے آ،

اے چاند ـــ!
اسے اندھیرے اور جاڑے سے بچا کر،
گھر واپس لے آ،
بھیڑیئے سے بچا کر،
ریوڑ کے ساتھ باڑے میں لے آ،
اسے گھر واپس لے آ،

ـــ کیا وہ آ رہا ہے۔ مجھے خیال ہے کہ میں نے قدم کی چاپ سُنی ہے، ابھی نہیں، لوگ کہتے ہیں کہ رومانے ایک بھیڑیئے سے جنم لیا ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ میرا استراتاج بھیڑیئے کے خلاف کسی سازش میں نہ شامل ہو جائے اس پہاڑی چرواہے نے تو کبھی روما کو خواب میں بھی نہیں دیکھا

(گاتی ہے)

بھیڑیئے سے بچا کر،
ریوڑ کے ساتھ باڑے میں لے آ،

(اشتیاقاً) وہ عظیم نشیب، جو جنگل بھر میں سے گزرتا ہے۔ وہاں آج سے بیس برس پہلے بہت سے شکاری، ان کے شکاری کتے اور ہرن گردن کے بل گر کر ہلاک ہو گئے۔ کہیں میرا استراتاج ـــ اوہ، وہ تو آ بھی گیا۔

(ساطوس داخل ہوتا ہے۔ ساتھ سارلیقوس ہے)

ساطوس ۔ (خفگی سے) بھلے آدمی! میں تمہیں کہتا ہوں کہ میرا تیر ہرن کو لگا۔

سارلیقوس ۔ کیا واقعی یوں ہوا؟ آپ تو بہت آگے تھے۔ ہوا میرے تیر کو سَن سے لیکر گزری اور وہ سیدھا ہرن کی گردن میں جا لگا۔

ساطوس ۔ مجھے یقین ہے کہ اُسے میں نے مارا تھا۔

سارلیقوس ۔ آقا! مجھے بھی یوں یقین ہے کہ ہرن کو میں نے مارا تھا (زیر لب) ہرن تو ایک طرف جب تم کہیں جاؤ گے تو میں ہرنی کا بھی شکار کرلونگا۔

قامہ ۔ آؤ آؤ، ہم ہرن کا رونا نہ روئیں۔ تمہارے انتظار میں میرا دل پریشانی سے کٹا اور تمہارا تو اس سے زیادہ پریشانی سے کٹا ہوگا آؤ، میٹھو کھاؤ، پیو، اور اپنا بدلہ گوشت کے "مچوں" سے لو۔

ساطوس ۔ بس بس ہم کھا چکے ہیں، اس وقت تشنگی میں ہیں شراب دو۔

قامہ ۔ ہمارا مہمان کون ہے؟

ساطوس ۔ یہ اپنے تئیں سطراطو کے نام سے پکارتا ہے۔

(قامہ، سارلیقوس کو شراب پیش کرتی ہے اور ساطوس اپنا کام خود چلاتا ہے۔)

ساطوس ۔ سطراطو! میں تمہاری صحت کا جام نوش کرتا ہوں۔ (شراب پیتا ہے)

سارلیقوس ۔ میں آپ کی صحت کا جام نوش کرتا ہوں (شراب پیتا ہے)

ساطوس ۔ (مقدس پیالہ دیکھکر) یہ یہاں کیا ہے؟

قامہ ۔ ایک عجیب تحفہ جو مجھے آج بھیجا گیا ہے۔ یہ ہماری عظمت مآب دیوی کی ایک جلتی ہوئی خانقاہ سے بچایا ہوا ایک مقدس پیالہ ہے جس کی بستی سے انطونیاس ہوکر گزرا۔ مجھے یقین ہے رومانے رعایا پر یلغار کی تھی نہ کہ دیوتاؤں نے۔

سارلیقوس ۔ زیادہ اغلب ہے کہ شہری انطونیاس کے خلاف بغاوت کر اُٹھے ہوں جس پر اس نے آگ لگا دی اور متبرک خانقاہ محض اتفاق سے آگ کی نذر ہو گئی ہو۔

ساطوس ۔ تو کیا مقدس پیالے کے ہمراہ تمہیں کوئی پیغام نہیں پہنچا۔

قامہ ۔ کیوں نہیں، یہ دیکھو!

(قرطاس اس کے حوالے کر دیتی ہے)

ساطوس۔ (پڑھتا ہے) "لائق ثنا قامہ کی طرف ـــ تمہیں دور سے دیکھا، تم پر فریفتہ ہو گیا۔ تمہاری خدمت میں یہ پیالہ بھیجتا ہوں جسے ہم شادی بیاہ پر برتتے ہیں ـــ اپنے تئیں سردست اس کے سوا اور کچھ نہیں لکھ سکتا۔

(کالیبیا کا ایک باشندہ جو رومی عسکر میں جبراً کام کر رہا ہے")

ـــ جبراً کام کر رہا ہے۔ کیا پھانسی لٹکنے کو درختوں کی شاخیں نہ تھیں اور ڈوب مرنے کو دریا نہ تھے۔ جبراً کام کر رہا ہے۔ تف! دنیا کی کوئی طاقت مجھ سے جبراً کام نہیں کروا سکتی۔

سارلقوس۔ پھر کیسے ہو؟ میرے آقا! رومیوں نے بستی سے باہر پڑاؤ ڈال رکھا ہے اور ان کی عسکری طاقت ہم سے ہزار گنا ہے کیا ایسے میں کالیبیا پھانسی لگ جائے یا ڈوب مرے؟ آپ تو اس مملکت کے سردار اور صوبیدار ٹھیرے ـــ

ساطوس۔ تو کیا میں بزدل ہوں؟

سارلقوس۔ جبروت آفریں ختم! لیکن کل جب انطونیاس خراج کا مطالبہ کریگا تو کیا آپ نبرد آزما ہو سکیں گے؟ کیا آپ کے ساتھ اتحادی ہیں مثلاً باتینیا، بانطوزیا یا فلیقونیہ۔ عہد قدیم میں مشرقی بادشاہوں سے ہمارے رابطے قائم تھے۔ اگر اب بھی کوئی ایسا رابطے والا ہے تو میں آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔ آپ کون سا طرز عمل اختیار کرینگے

ساطوس۔ میں بھرا بیٹھا ہوں، یوں مت کرو کہ میں پھوٹ نکلوں اور میرا راز ایک ناگہانی مہمان کے ہاتھ لگ جائے جو میرے ساتھ شکار میں شریک تھا۔ تم نے دیکھا میرے کتے کیسا شکار کا ٹھیک کھوج پا لیتے ہیں اور ہم میں دو ٹانگوں والے ایسے بھی کتے ہیں جو خوب موقع شناس ہیں اور جانتے ہیں کہ کب بھونکنا ہے اور کیسے؟

سارلقوس۔ اچھے سردار! میں ایک دفعہ شیر کے شکار پر تھا۔ دوڑ دھوپ کے شور و شغب سے شیر جاگ اٹھا اور جنگل کے سرے پر آ ڈٹا۔ اس کی شاندار ایال تیز کانوں کے ارد گرد سور کے بالوں کی طرح کھڑی ہو گئی وہ شکاری کو کھڑا گھورتا رہا۔ بیس ایک کتے اس کے ٹخنے کاٹنے لگ گئے۔ آخر اس نے پاؤں میں درد محسوس کیا ایک پنجہ مارا اور چار کو ڈھیر کر دیا۔ لیکن اپنے تئیں اسے خبر تک نہ ہوئی بلکہ ٹس سے مس ہوئے بغیر شکاری کو گھورتا رہا۔ اسی طرح آپ اگر روما سے اُلجھے تو وہ آپ کو کچل کر رکھ دیگا۔ زاں بعد وہاں کی مجلس زعما میں معمولی سی خبر پہنچنے کے سوا اور کچھ پتہ نہ ہو گا کہ اس نے کیا کر دیا ـــ؟

(زیر لب) کیا میں اسے کسی طرح بھڑکا سکونگا۔ (قامہ کو متوجہ کرتے ہوئے) مجھے یقین ہے کہ معزز قامہ جس قدر خوبصورت ہے اسی قدر دانشمند بھی ہوگی اور اس بارے میں مجھ سے اتفاق کریگی کہ کامل پابوس کی مہارت سے فوری اطاعت بہتر ہے۔ ہمارے جنگجو شہریوں نے ناحق خونریزی کا بازار گرم کیا۔ سپوتوں۔ شوہروں اور بھائیوں کو مفت میں موت کا گھاٹ اُتار دیا۔ مختصری ریاست ایسی بیدردی سے روندی گئی کہ اس سے تو وہ جنبش ہی نہ کرتی۔

قامہ۔ جناب! میرا ایک بیٹا تھا جو بچپن ہی میں عدم کے ملک کو سدھار گیا اگر وہ جیتا رہتا اور مرد ہو جاتا تو میں دکھ محسوس کئے بغیر اُسے ساطوس کی رضامندی سے لڑائی پر ہر اوّل صف میں بھیجتی (اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے) جناب! اگر کوئی اقلیم ایکدم ہتھیار ڈالدے تو وہ اسی آن منادی جائیگی اور فاتح کی تاریخ اسے ہڑپ کر لیگی لیکن آزادی اور مدافعت کی لڑائی میں جیت یا ہار کی شوکت یا آشوب اس قوم کو اچھال لگا کر باہم ملا دیتے ہیں جو آگے بڑھنے اور پیچھے نہ ہٹنے کی قسم کھا کر میدان میں آئی ہو ـــ جی ـــ مانا کہ انہیں شکست ہوئی لیکن جو لڑے اور کٹ مرے ان کے نام آگ کے الاؤ کی مانند ہیں جو ہر صدی بعد شعلے بھڑکاتا ہے اور اپنی قوم کو آخر میں ظفریابی کی راہ دکھاتا ہے مجھے اس پر دیوتاؤں کی ارواح کی طرح یقین ہے۔

ساطوس۔ قامہ! تم نے خوب کہا۔

سارلقوس۔ (تسلیم کرتے ہوئے) جناب! میں اس کا اعتراف کرتا ہوں،

ساطوس۔ تعجب نہیں جو اس انطونیاس کے ہمراہ سارلقوس بھی ہو جس نے اپنے وطن کی سرزمین سے بدترین سلوک کیا اور جو تین برس روما میں رہا۔

سارلقوس۔ سارلقوس کون؟

ساطوس۔ تم کالیبیا کے رہنے والے ہو اور یہ بھی نہیں جانتے کہ سارلقوس کون ہے۔ وہ یہاں کا صوبیدار تھا لیکن نہایت قاہر اس نے ہماری عورتوں کی بڑی بے حرمتی کی۔

سارلقوس۔ غالباً آپ اسے کم فراخدلی سے جانچ رہے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ وہ یہاں کا صوبیدار تھا پھر ہو سکتا ہے کہ بہت سی ایسی خوش چشمند عورتیں ہوں جو بے حرمتی کو حرمت خیال کرتی ہوں۔

قامہ۔ یوں مت کہو میں کالیبیا بھر میں ایسی عورتوں سے ناواقف ہوں جو آپ خیال کی ہوں البتہ چند بازاری عورتیں ہو سکتی ہیں جن کی زندگی سراسر بے حرمتی ہو

(غلام داخل ہوتا ہے)

غلام۔ (علیحدگی میں) آقا! چند لوگ ملنے آئے ہیں۔

ساطوس۔ (" ") کون ہیں وہ! کیا روما کے خلاف سیاسی جماعت کے ارکان؟

سارلقوس۔ (سن پاتا ہے۔ زیرلب) میرے پاس بہت کچھ ہے ۔۔۔ روما کے خلاف سیاسی جماعت کا ڈر کسی اور کو ہوگا۔

ساطوس۔ (سب سے) میرے بعض احباب مجھ سے گفتگو کرنے باہر آئے ہیں، (باہر جاتے ہوئے) سطراطو! میرے واپس لوٹنے تک تم خوب جی بہلاؤ۔

(باہر چلا جاتا ہے)

سارلقوس۔ قامہ! مجھے بہت کچھ کہنا ہے اور کہنے کے لئے وقت نہیں ہے پہلے یہ جانو کہ میں ہی وہ کالبیا کا باشندہ ہوں جس نے تمھیں پیالہ بھیجا۔

قامہ۔ میں دل سے تشکر یہ ادا کرتی ہوں۔

سارلقوس۔ میں روما کی خدمت کالیبا کے لئے کر رہا ہوں۔ یہ میرا راز ہے خواہ اسے چھپا رکھو اور خواہ اس سے مجھے عذاب اور موت کے ہاتھوں بیچ دو۔ (زیادہ نزدیک ہو جاتا ہے) فقط تمھارے کانوں کے لائق مجھے تم سے محبت ہے ۔۔۔ تمھارے مارے عظمت مآب دیوی سے عقیدت ہے۔ مجھے رومیوں نے تم پر جاسوس بناکر بھیجا ہے تاکہ میں تمھیں اور تمھارے شوہر کو کیفر کردار تک پہنچاؤں لیکن ایسا کرنے سے پہلے میں مرنا قبول کرونگا۔ (حکمنامہ نکالتا ہے) یہ حکمنامہ ہے اس پر مہر ثبت ہو چکی ہے کیا تم اسے لیکر پڑھو گی؟

قامہ۔ (لیکر پڑھتی ہے) "تمیں ساطوس کو حراست میں لانا ہے اگر ۔۔۔

ساطوس۔ بس زیادہ نہیں کیونکہ اس کے آگے جو کچھ ہے اسے کسی خاتون کی آنکھیں دیکھنے کی تاب نہیں رکھتیں۔ قامہ! روما نے اس غداری کی جھلک پالی ہے۔ روما نے کبھی کسی غدار کی جان بخشی نہیں کی کس قدر ہولناک ہے۔ کھال کھینچ لی جاتی ہے۔ کوڑوں سے جان بحق تسلیم کر دیا جاتا ہے یا پھر سولی پر چڑھا دیا جاتا ہے۔

قامہ۔ میں بڑی کمزور دل ہوں، مجھے کیوں تختہ مشق بناتے ہو؟

سارلقوس۔ میں تمیں کیوں تختہ مشق بنانے لگا؟ مجھے تم کیسی غلط فہمی میں ڈالتی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ میں ہر طرح ذلیل ہو چکا ہوں لیکن اگر تم اپنے شوہر کے ہاتھوں مجھے فریب دلوا دو ۔۔۔

قامہ۔ لیکن کیا اس حکمنامہ کے ذریعے تم اسے فریب دو گے؟

سارلقوس۔ دیکھو قامہ! میں اسے پرزے پرزے کئے دیتا ہوں مجھے اس پر عمل کرنے کا کبھی خواب بھی نہیں آیا۔

(حکمنامہ پھاڑ دیتا ہے)

قامہ۔ میں جیتے جی تمھاری احسانمند رہوں گی۔

سارلقوس۔ کیا ساطوس نے کبھی اس سازش کا تم سے ذکر نہیں کیا؟

قامہ۔ کس سازش کا؟

سارلقوس۔ کس سازش کا؟ واہ! روما نے سب کچھ دیکھ لیا، تمام پتا لگ گیا اور علم بھی ہو گیا۔ یہ آنے والی رو کیلئے بچے کا رتیلا قلعہ تھا، ساطوس کے بچاؤ کی اب کوئی گنجائش نہیں۔

قامہ۔ تم نے اس کا ذکر میرے دلیر ساطوس سے کیوں نہ کیا؟

ساطوس۔ دلیر ۔۔۔؟ آہا! بہت ہی دلیر اور حد سے بڑھکر بیباک! اپنے تئیں، تمھیں اور مجھے ہلاک کرنے میں بیباک، روما کی مہلک گرج سر پر ہوتے ہوئے عین رومی پڑاؤ کے سامنے آج ہرن کا تعاقب اور کون کر سکتا تھا؟ یہ معجزہ ہے کہ انھوں نے اسے گھر لوٹ آنے دیا۔ نہ تو اسے ماخوذ کیا اور نہ لنگڑا نہ اندھا۔ (قامہ لرز جاتی ہے) (زیرلب) میں نے اسے لرزا دیا (بلند آہنگ ہوکر) میں جانتا ہوں وہ اسے موت کی سزا دیا چاہتے تھے مگر مجھے یہ بتانے کی جرات نہیں کہ میں نے اسے کیونکر جانا؟ مجھے یقین ہے کہ میں اسے کہہ چکا ہوں کہ اس کی سازش محض باولا پن ہے میں تم سے کہے دیتا ہوں کیونکہ تم نسبتاً فہمیدہ ہو ۔۔۔ روما کو سب علم ہے ۔۔۔ لیکن تم اس کی تہ داری سے واقف نہیں۔

قامہ۔ کیا روما میں تمھیں کچھ اقتدار حاصل ہے؟ ہو تو ساطوس کی خاطر اس سے کام لو۔

سارلقوس۔ افسوس! مجھے روما میں کسی قسم کا اقتدار حاصل نہیں۔ البتہ انطونیاس کو ہے (قریب ہو جاتا ہے گویا کوئی فوری خیال سوجھ گیا ہو) وہ کل پو پھٹے مندر کے دروازوں کے آگے سے ہوکر گزریگا۔ نازنین! تمھارے پاس حسن ہے۔ وہ عورتوں پر بیحد مہربان ہے اور اس نے کبھی کسی عورت کی التجا واپس نہیں لوٹائی۔ اس سے التجا کرو۔ مجھے یقین ہے تم اس پر سکہ جما لوگی۔

قامہ۔ اس کا مجھے اپنے سرتاج سے ذکر کرنا چاہیئے۔

سارلقوس۔ کیا وہ اپنے لئے کسی رومی سے التجا کرنے دیگا؟

قامہ۔ مجھے اندیشہ ہے نہیں کرنے دیگا۔

سارلقوس۔ پھر اس سے ذکر مت کرو۔ یا کرو تو اس وقت کرو جب تم واپس پلٹ آؤ اور ہمارے سردار کو رحم سے موم کر چکو۔ اور پھر بعد میں سب کچھ ٹھیک ہے۔

(باہر سارلقوس، سارلقوس کا غلغلہ پیدا ہوتا ہے)

قامہ۔ میں ایسا ہی کرونگی اور تمھیں بھی فریب نہ دونگی ۔

سارلیقوس۔ (ساطوس کو آتا دیکھ کر) پرے ہو جاؤ۔

(ساطوس اور غلام داخل ہوتے ہیں)

ساطوس۔ سارلیقوس تمھیں ہوتا؟ جس آدمی کو تم نے باہر دھکیلا یا تھا اس نے تمھیں انطونیاس کے ساتھ پہچان لیا ہے۔ باہر لوگ تمھاری ہڈی پسلی ایک کرنے کے لئے چلا رہے ہیں۔

سارلیقوس۔ میں بہت ذلیل ہو چکا ہوں مجھے کالیسیا کی خدمت کا فکر تھا۔

ساطوس۔ پہلے اپنا فکر کر! بے ایمان آدمی! میری چار دیواری کے اندر وہ میرے مہمان کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ (عقبی دروازے کا اشارا کرکے) ادھر کا رخ کر۔ وہاں دروازہ ہے جو جنگل میں کھلتا ہے! جا، دفع ہو آج سے میں جانی دشمن ہوں۔

سارلیقوس۔ تاہم میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں آپ نے میری جان بچائی۔

(تلوار بے نیام کرکے بھاگ جاتا ہے)

ساطوس۔ (غلام سے) واپس جاؤ اور ان سے کہو کہ سارلیقوس یہاں نہیں ہے۔

(غلام چلا جاتا ہے) (قامہ سے) ایمان سارلیقوس نے تم سے کیا کہا؟

قامہ۔ کیا وہ سارلیقوس تھا؟

ساطوس۔ تم مجھ سے کیوں شبہ کرتی ہو؟ ان میں ایک آدمی اسے جانتا تھا!

قامہ۔ صرف ایک! شاید وہ اس کی صورت پہچان نہ سکا ہو؟

ساطوس۔ تو کیا وہ خود انکار کر سکا؟ اس نے تم سے کیا کہا؟

قامہ۔ اسے کیا کہنا چاہیے تھا؟

ساطوس۔ اسے کیا کہنا چاہیے تھا؟ پیاری بیوی! یہ کہنا چاہیے تھا کہ جب وہ صوبیدار تھا تو اس کی رعایا نے ملوث سکے کی طرح اسے اپنی چوکھٹ سے باہر پھینک دیا۔

قامہ۔ کیا وہ رعایا پر مہربان نہ تھا؟

ساطوس۔ مہربان! واہ، دنیا کا سب سے رحمدل شہزادہ بھی اپنی ایماندار رعایا کی پیٹھ پر دھول ہی جمائیگا۔ تم سمجھیں اسے کیا کہنا چاہیے تھا، یہ کہ میری بیوی سے کچھ نہ کہنا چاہیے تھا جبکہ مجھے اس کا گلا گھونٹنا تھا اس نے روما کی نفسانیت میں اپنے تئیں پورے طور سے بھگو لیا تم کیونکر جان سکتی ہو کہ وہ کیسا درندہ تھا؟

قامہ۔ بہر نوع وہ رحمدل معلوم ہوتا تھا اس نے کہا کہ اسے روما کی ان سختیوں سے نفرت ہے جو وہ اپنے باجگذار حاکموں سے روا رکھتی ہے۔

ساطوس۔ کیا اس نے یہ کہا؟

قامہ۔ ہاں تو، اور پھر جو تم اجنبی سے شاذ و نادر ہی "خلط ملط" ہوتے ہو تم نے آج اسے مہرن کے شکار میں ساتھ کر لیا۔

ساطوس۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو، جاکر سو جاؤ۔

(کواڑ لگانے جاتا ہے)

قامہ۔ اس رات کواڑ بند نہ کرو۔ رات آدھا دن معلوم ہو رہی ہے۔

ساطوس۔ ٹھیک ہے ویسے بھی کہیں میرے رفقا اس کی کھوج نہ پالیں اور بھاگتے میں اسے تہ تیغ کر دیں۔

قامہ۔ وہ تو جا بھی چکا۔ ادھر آؤ ذرا —— وہ دیکھو! —— اس پہاڑی پہ درختوں کا ایک جھنڈ ہے جو دلکش چاند سے پیاری پیاری برف کی طرح سفید ہو رہا ہے لیکن اس کے نیچے سیاہی کا دھبہ بھی ہے۔ ساطوس تمھیں یاد ہے؟ ہاں ضرور یاد ہوگا، تین برس پہلے، انگوروں کے خوشے، درختوں کی چوٹیوں تک پہنچ گئے تھے اور انھوں نے اپنی بیلیں زمین پر لٹکا دی تھیں جنھیں پانچویں مہینے کی خوشبودار ہوا رک رک کر جھلاتی تھی —— وہاں تم نے اپنی محبت کا اظہار کیا اور ہم نے جھولتی ہوئی انگور کی بیلوں کی طرح اپنی آنکھوں، اپنے دلوں اور امید افزا آرزوؤں سے تمام نیا عہد طے کیا۔ بیاہ کے تین برسوں میں، جب تم نے ... کا چاند طلوع دیکھا تم نے مجھ وہاں پھر پیار کیا۔ ساطوس! اب پھر پیار کرو۔

ساطوس۔ ... پیار کیا؟ (پیار کرتا ہے) پھر اس کے ... ہم تو یوں ... کہ شاید یہ آخری بار ہو۔

قامہ۔ تم کچھ کھانا لوگے؟

ساطوس۔ اوں ہوں، ... پرولت کا جھونپڑا ملا گیا تھا ہم نے وہاں اس کے دودھ اور اس کے پھل اڑائے۔

قامہ۔ میں فجر کو منہ اندھیرے اٹھ بیٹھوں گی اور پہاڑ بلا! ... کی خانقاہ پر چڑھ آؤنگی۔

ساطوس۔ اچھا ——

قامہ۔ اگر میں نیم ساعت تک پلٹ نہ آؤں تو میرے پیچھے چلے آنا۔

ساطوس۔ کیوں؟ کوئی خطرہ ہے؟

قامہ۔ نہیں، ویسے تو کوئی خطرہ نہیں یہاں سے خانقاہ تک ایک ... کی بات ہے لیکن ... رومی پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں جو کس پہ ...

ساطوس۔ میرا سر نیند سے بھاری ہو رہا ہے۔ میں تو سونے جا رہا ہوں جانے سے پہلے مجھے جگا لینا۔

(دروازہ بھیڑ کر چلا جاتا ہے)

قامہ۔ (پردے کھینچتے ہوئے) سارلیقوس! —— اس کا چہرہ ... تھا اور اس نے ... کر دیا تھا ... پاس ...

نہ گئی تو؟ موت، ایذا ——— (دل میں خیال پیدا ہوتا ہے) انطونیاس نے کبھی عورت کی التجا واپس نہیں لوٹائی ——— میں جاؤنگی لیکن اپنا خنجر اپنے ساتھ لے لونگی۔

پانچواں منظر

(معبد کا دالان ——— معبد میں گانا ہو رہا ہے۔ سنار یقوس دیکھ بھال کرتا ہوا داخل ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے فوبلیوس اور سپاہی ہیں۔)

سنار یقوس۔ فوبلیوس ———!

فوبلیوس۔ یہ ہوں سردار۔

سنار یقوس۔ یاد ہے میں نے تمہیں کیا بتایا تھا؟

فوبلیوس۔ یہ کہ جب آپ "روما، روما" پکاریں تو جس سے آپ باتیں کر رہے ہوں اسے روما کے غدار کی حیثیت سے پکڑوں۔ وہ خواہ مرد ہو، خواہ عورت ———!

سنار یقوس۔ بس بس جاؤ! تم کتنے ہو؟

فوبلیوس۔ کوئی دس ایک۔

(فوبلیوس اور سپاہی چلے جاتے ہیں)

سنار یقوس۔ (خنجر دیکھکر) میرا نگہبان میرے پاس ہے۔ مجھے اس ہجوم سے ڈرنے کی ضرورت نہیں جس نے گزشتہ شب میرا پیچھا کیا۔ میں آدھی رات گئے بمشکل خیمہ تک پہنچا۔ کیا وہ اب آجائیگی جبکہ وہ مجھے سنار یقوس سمجھتی ہے۔ اگر سناطوس نے میری قلعی کھولدی تو وہ نہیں آئیگی لیکن جس الجھن میں میں پھنس گیا ہوں، وہ میرے بس میں نہیں۔ یہ میں قسمت کو سونپتا ہوں۔ مجھے علم ہے کہ میں خوش مزاج ہوں۔ میں خوش رہونگا اور دوسروں کو بھی رکھونگا تاکہ وہ مجھ سے "آڑے ٹیڑھے" نہ ہوں ——— نہیں وہ نہیں آنے کی ——— تاہم اگر وہ سچی شوہر پرست بیوی ہے تو شاید سناطوس کو بچانے کے لئے آجائے ——— ایلو میری سفید فاختہ چال کے آگے بڑھی آرہی ہے۔ میں اسے کرشمہ جانتا ہوں۔ توانا دل مجھے یوں لرزا رہا ہے جیسے یہ اس نوجوان کا ہو جو پھلواڑی میں پہلی بار اپنی دلربا سے ملے۔

(قامہ پیالہ لے کر آتی ہے)

پہلے پہل خنڈول سورج کی روشنی اپنے پردوں پر لیتی ہے لیکن فجر کے تارے کی بینلی سورج کی رہنمائی کرتی ہے۔

قامہ۔ انطونیاس کہاں ہے؟

سنار یقوس۔ ابھی یہاں نہیں۔ تم تو اس کے مارے بڑے سویرے آگئی ہو (معبد کی طرف چل پڑتی ہے) کیوں؟ اب کدھر ———؟

قامہ۔ ارطمیز کی پاک خانقاہ پر پیالہ چڑھانے اور وہاں سے پچھلے پاؤں آنے کو جا رہی ہوں۔

سنار یقوس۔ تاکہ آکر اس سے مل لو۔ (معبد میں چلی جاتی ہے) (سنار یقوس پیچھے دیکھتا ہے) عزیز ترین زندگی! جس نے اس پر نچھاور کر دینے کے لئے سماوات سے اجالا لیا اور زمین کو اس کی پرچھائیں سے مالامال کیا۔ مجھے یقین ہے وہ پلٹ کر آئیگی۔ یہ رومی معبد کی بیحرمتی کرنے کی تاب نہیں رکھتے۔ خیر، میں اپنے شکار کو خیمے میں پھسلا لونگا میں عورت کے بدلے جی اور مر سکتا ہوں۔ کیا عورت کے بدلے مرنا، یہ کیا نیا ایمان ہے؟ میں باولا نہیں، بیمار نہیں اور کافی معمر نہیں کہ ایک پر فریفتہ ہو رہا ہوں، ہاں ہاں، میں اس کے لئے باولا ہوں، عظمت والی قامہ کیلئے۔ عالی دماغ قامہ کیلئے میں باولا ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کوئی انوکھی اور منحوس بلا مجھ پر آنے والی ہے۔ مجھے دیوتاؤں کی سوگند، میں اپنے تئیں انوکھا معلوم ہو رہا ہوں۔

(قامہ دوبارہ آتی ہے)

قامہ۔ انطونیاس کہاں ہے؟

سنار یقوس۔ میں نے پہلے ہی کہدیا ہے تم بڑے سویرے آگئی ہو؟

قامہ۔ تمہارے ساتھ اکیلا رہنے کو بڑے سویرے آگئی ہوں؟ دنیا تمہیں برا کہے یا نہ کہے عورتوں میں یہ حرکت برائی والی ہے (اونچی آواز) انطونیاس کہاں ہے؟

سنار یقوس۔ محترمہ! تم جانتی ہو خیمہ شہر سے باہر آدھ کوس پر ہے۔ تم میرے ساتھ چلو تو ہم انطونیاس کو راستے میں مل لینگے۔ یا پھر کم از کم خیمے میں پالیں گے۔

قامہ۔ اوں ہوں، تمہارے ساتھ ایک قدم بھی نہیں (زیادہ اونچی آواز میں) انطونیاس کہاں ہے؟

سنار یقوس۔ (اس کی جانب قریب ہوتے ہوئے) تمہاری اور تمہارے خاوند کی خاطر میں پوری شرافت سے کہتا ہوں کہ مجھے تمہیں مجبور کرنا چاہیے۔

قامہ۔ (خنجر نکالتے ہوئے) ٹھہرو ——— زیادہ قریب موت ہے۔

سنار یقوس۔ (اسے بے ہتھیار کر دیتا ہے) کیا عورت کو بے ہتھیار کرنا سہل نہیں؟

(سناطوس آجاتا ہے اور وہ پیچھے سے سنار یقوس کا گلا گھونٹ دیتا ہے سنار یقوس بڑبڑاتا ہے لیکن آواز بمشکل قابل سماعت ہے) روما ——— روما ———! (کوئی نہیں آتا)

ساطوس۔ سگ زانی ——!

سارلیقوس۔ (قامہ کا خنجر بھونکتے ہوئے) کیا اسے لے لوگے؟

(قامہ چیخ مارتی ہے اور ساطوس کی طرف لپکتی ہے)

ساطوس۔ (پیچھے جا پڑتا ہے) میں نے اسے دل میں لے لیا —— قامہ! معبد —— میں بھاگ —— جاؤ —— میری خاطر —— ورنہ وہ تمہیں پکڑ لیں —— گے —— یاد رکھو —— رخو چکر —— ہو جاؤ —— الوداع۔"

(دم دے دیتا ہے)

قامہ (پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے) الوداع ——!

(معبد میں بھاگ جاتی ہے)

سارلیقوس۔ (اسے نکل جاتا دیکھ کر) معبد کی پجارنیں اسے اندر لئے جا رہی ہیں۔ فوبلیوس، فوبلیوس ——!

(کوئی نہیں آتا ——)

انطونیاس مجھے خانقاہ میں نہیں گھسنے دیگا۔ وہ بھاگ گئی۔ (نیچے ساطوس کی نعش کو دیکھتے ہوئے) "سگ زانی!" یہ تمتمائے ہوئے چہرے کا غضب مجھ پر، ایک ہی ادنی گھاؤ سے دائمی سکون، یوں تمام جذبات ختم ہو گئے۔ آخر جذبات سے حاصل ہی کیا؟ جذبات ہماری دم توڑنے والی زندگی کے سرد رشتوں کو گرمانے کے لئے ہیں مبادا ہم موت کی سی بے رخی سے یخ نہ ہو جائیں۔ جذبات ہیں کام پر لگا دیتے گرما دیتے۔ چست کر دیتے، ہاتھ بٹاتے اور موت کی خاکدان دیکھنے سے بچا لیتے ہیں جس کی راکھ سب بنیں گے۔ جذبات سبھی کے کام آتے ہیں میں نے مصر میں کہاوت سنی کہ خواہش سمندر کی لہر ہے جیسے تم جتنا زیادہ پیو اتنی ہی زیادہ پیاس لگے گی۔ اسے زیادہ پی لیا تو ڈوبتی ناؤ والوں کی طرح تمہیں باولا کر دیگی، میں ایسا ڈوبتی ناؤ والا نہیں اور نہ ہی ایسا قمار باز ہوں۔ اگر بازی جیت لی تو دو گنا ہو رہوں گا ورنہ سب کچھ کھو دوں گا۔ روما کی مجلس زعما جس کے ہاتھوں میں میں کھلونا بنا رہا ہوں مجھے تاج دیا چاہتی ہے قامہ میری دشمن ہو گی —— لوگ اس سے محبت کرتے ہیں اگر میں نے اس کی محبت حاصل کر لی تو لوگ مجھ سے چمٹیں گے میں پھر روما کا باجگذار تاجدار بن جاؤں گا (ساطوس کو دیکھتے ہوئے) میں نے اسے کیوں مارا اس کے خلاف کافی ثبوت بہم پہنچ جانے کے بعد میں یقیناً یہ اقدام روما پر چھوڑ دیتا اس نے میری جان بچائی تھی۔ کیا واقعی؟ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے میں نے بھرتی میں حماقت کی اور یہ حرکت قامہ کو ہنگامی طور پر میرے خلاف اکسا رہی ہے۔ قامہ! مجھے ایسی عورت کوئی نہیں ملی جسے میں نے طوعاً و کرہاً یا بہلا پھسلا کر اپنی مرضی پر نہ کیا ہو۔ خیر وہ میرا تاج پہن کر آخر کار خوش ہو گی میں کالیسا کو نہال کر دونگا۔ ہم انگوری بیلوں میں چھپائیں گے اور (ساطوس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ہم ابدی سکوت تک گزری ہوئی باتوں پر مسکراتے رہیں گے روما! روما! (فوبلیوس اور سپاہی آتے ہیں) دو دفعہ میں نے روما روما پکارا تم پہلے کیوں نہ آئے۔

فوبلیوس۔ اب ہم کیوں آگئے، ہم کیسے اسیر کریں؟ **سارلیقوس** (ساطوس کی نعش

دوسرا باب

آخری منظر

(ارطمیز کے معبد کا اندرون —— دیوی کے ذیشان مجسمے کے آگے، پردے کے سامنے، چبوترے پر، چھوٹے چھوٹے دروازے معبد کے بیچوں بیچ تپائی والی قربانگاہ جس کے اوپر جلتا ہوا چراغ دھرا ہے۔ ہر محراب کے درمیان روشن قندیلیں لٹک رہی ہیں۔ اسٹیج کے اردگرد تپائیاں، گلدان اور پھولوں کے ہار پڑے ہیں۔ دیوی سے ملواں پچھلی طرف، قربانگاہ ہے جس پر دو پیالے رکھے ہیں۔ متبرک گانا ہو رہا ہے پجارنیں معبد کو سجا رہی ہیں۔ ایک پجارن آتی ہے)

پجارن۔ فیبی! سارلیقوس کا وہ آدمی جو نئی پجارن سے کئی دفعہ مل چکا ہے ایک مرتبہ پھر معبد کے آگے کھڑا انتظار کر رہا ہے۔

فیبی۔ ہم نئی پجارن کو خبر کر دیں گے!

(پجارنوں میں سے ایک کو آگاہ کرتی ہے اور وہ باہر چلی جاتی ہے)

جب سے قامہ سارلیقوس سے فرار ہو کر ہمارے معبد میں چلی آئی ہے اور اپنی خوبصورتی، عظمت اور اپنے رعب کے باعث یہاں کی پجارن منتخب ہوئی ہے کیا تم نے ہمیشہ اس کی نگاہ مرمری فرش پر گڑی نہیں دیکھی۔ آج وہ جمی ہوئی اور اجلی ہے —— کیا اس نے سارلیقوس سے بیاہ

کرنے کی ٹھان لی ہے؟

پجارن ۔ اس سے بیاہ کرنے کی جس نے اس کے شوہر کو خنجر بھونکا؟ تم مجھے آسانی سے اس پردا دیتے نہ پاؤگی۔

(قامہ پجارن بن کر نکلتی ہے پردوں کے آگے)

تم سارنقوس سے بیاہ تو نہ کروگی؟

قامہ ۔ میری سہیلی! میں موت کی بیاہتا ہوں اور فقط مُردوں سے بیاہ کرتی ہوں۔

پجارن ۔ تو سارنقوس سے تو نہیں کروگی؟

قامہ ۔ کئی دفعہ صاف بات کہنے میں ارطمیز معظمہ کا کاہن دوسروں کاہنوں سے زیادہ اختیار نہیں رکھتا۔

فیبی ۔ کیا تم سارنقوس کے قاصد سے بات کروگی جو معبد کے باہر کھڑا انتظار کررہا ہے۔

قامہ ۔ کیوں نہیں؟ اسے آنے دو۔

(سیڑھی سے بیائی تک آجاتی ہے قاصد اندر آجاتا ہے)

قاصد ۔ (جھکتا ہے) سارنقوس کی طرف سے آداب اور سلامتی! ایک سے زیادہ بار آپ نے اس کے ہاتھ کو رد کیا۔ پہلے جو میں آپ سے ملا تھا تو آپ پوری طرح مان گئی تھیں، اب وہ آپ کے آخری جواب کیلئے التجا کرتا ہے۔ جب وہ ساطوس پر جھپٹا ۔۔۔ جیسا کہ میں نے کئی دفعہ آپ سے کہا ۔۔۔ اس وقت اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ اس کا گلا کس نے بھینچا۔ وہ آپ سے اسے بھول جانے کی درخواست کرتا ہے کیونکہ یہ شاید ہی اس کی حرکت ہو۔ (یہ ایک نا کے بغیر حملہ تھا) باقی سب آپ کی محبت تھی۔ وہ گڑگڑاتا ہے کہ آپ اس پر اعتماد کریں۔

قامہ ۔ میں عرض کرتی ہوں کہ وہ مجھ پر یقین کرے ۔۔۔ میں اس پر اعتماد کرتی ہوں۔

قاصد ۔ واہ، یہ خوب ہے، آپ کی منشا اس سے بیاہ کرنے کی ہے۔

قامہ ۔ میری منشا اس سے بیاہ کرنے کی ہے بشرطیکہ یہ بھلی بات ہو۔

قاصد ۔ آج ہی کے دن رومی اسے روما کی تمام وفادارانہ خدمات کے عوض میں تاجدار کررہے ہیں۔ اس کی نیت ہے کہ آج ہی کے دن آپ اس سے بیاہ کرلیں تاکہ دونوں سب مخلوق کی آنکھوں کے سامنے اکٹھے تخت نشین ہوں اور دنیا جان جائے کہ دونوں کی صلح ہوگئی اور کسی قسم کے جھگڑے ان کی پُرامن رومی باجگذاری میں خلل پیدا نہ کریں۔

قامہ ۔ آج ہی؟ یہ تو بڑی جلدی ہے۔ میں اس پر سوچ بچار کروں گی! وہ اسے کب تاجپوش کرینگے؟

قاصد ۔ ابھی آن ۔۔۔!

قامہ ۔ کہاں ۔۔۔؟

قاصد ۔ یہیں آپ کے معبد کے قریب۔

قامہ ۔ تاجپوشی سے پہلے ایک دفعہ پھر میرے پاس آؤ، میں جواب دونگی۔

(قاصد چلا جاتا ہے)

فیبی ۔ پاک ارطمیز قامہ! کیا یہ بہتر اور دانشمندانہ ہوسکتا ہے کہ تم اس ہاتھ کو قبول کرلو جو ساطوس کے متبرک لہو سے رنگا ہوا ہے۔

قامہ ۔ خوب! سارنقوس کے چھینے ہوئے میرے ہی خنجر نے ساطوس کے سچے دل میں بھلائی پائی اور اس کی پیاس ہمیشہ کے لئے بجھا دی زندگی موت کے آگے گھٹنے ٹیکتی ہے اور عقل قسمت سے خم کھاتی ہے۔ ہم شاہی روما سے نہیں لڑسکتے البتہ یہ ہے کہ وہ ادر میں گالیسیا کی پیدائش ہیں اور باجگذار تاجدار ہیں۔ ہم روما کو اپنی رعایا کی واقفیت کے ذریعہ بتا سکتے ہیں کہ کہاں بھاری اور کہاں ہلکا باج لگتا ہے۔ شاید میں اس کے لئے جی نہ سکوں اور میری تمام آرزو رفاہ عام کے خیال میں ڈوب جائے۔

فیبی ۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس سے بیاہ نہیں کروگی۔

قامہ ۔ کیا تمھیں اتنا ہی یقین ہے۔ میں تم سے عرض کرتی ہوں کہ تم صبر کرو اور دیکھتی جاؤ۔

(دور سے سارنقوس سارنقوس کا غل مچتا ہے)

"سارنقوس! سارنقوس!" زیادہ مدت نہیں ہوئی کہ انھوں نے ساطوس کے نعرے لگائے تھے ۔۔۔ یہ مجھے بدحواس کرتے ہیں جو اپنا رویہ بدل لے اور دکھے کہ وہ اپنے تئیں ملزم جانے بہت سے لوگ جھوٹ تک نے نشر ہینگے۔

فیبی ۔ اغلباً یہ رومی سپاہی تھا جو چلایا۔

قامہ ۔ ان کا فخر کے نعرے والا۔ ڈھال پر بٹھایا ہوا وطن پرست۔ دوپہر کو پھانسی لگتا ہے اور ان کا پوچھنے کا غدار سہ پہر کو ہنگامہ خیز محبوب بنتا ہے۔ وہی سر جسے انھوں نے گیند بنایا اور ٹھکرا ٹھکرا کر اس کا حلیہ بگاڑا آج اسی کو وہ تاجپوش کرینگے۔

(نقاروں کی آوازیں گالیسیا کا ایک سردار تاج رکھ کر اندر آتا ہے)

سردار ۔ (گھٹنے کے بل جھک کر) سارنقوس کی طرف سے آداب اور سلامتی! وہ گالیسیا کی پہلی ملکہ کے لئے یہ تاج بھیجتا ہے تاکہ آپ اس کے اقبال پر نظر جمائیں اور آج کے دن اپنی زندگی کو اس کی زندگی سے وابستہ کرلیں اور اس کے تخت پر اس کے ساتھ بیٹھیں۔ وہ آپکے جواب کا منتظر ہے

قامہ۔ اسے کہو کہ تمام سایوں میں سے ایک سایہ اور تمام روحوں میں سے ایک روح ہے ـــــ بالکل تازہ وارد، ان میں بالکل اجنبی ـــ ایک پردیسی، ابھی تک جس میں شوہر پن ہے۔ اگر ایک ہی تخت پر مل کر بیٹھنے سے سارنقوس اور قامہ کا نعرہ اس تک جا پہنچا تو وہ سایہ جی پڑے گا اور وہ روح بیدار ہو کر جسم بن جائیگی جس کی پسلیوں میں خونی ستارہ اور میرا خنجر ہوگا ـــــ وہ اپنے اور میرے شاہانہ نعرے لگائیگا۔ اور لوگوں کو دہشت سے خوفزدہ کر دے گا۔ جناب مجھ میں ہمت نہیں اسے تخت نشین کرو ـــــ پھر بیاہ کی رسم ہو گی ـــ اور ہاں اسے کہو! میں کالیسیا کا تاج قبول کرتی ہوں۔

(سب ششدر رہ جاتے ہیں)

تم نے مجھے تاج پہنے دیکھ لیا (تاج پہن لیتی ہے) مجھے اس کی تاجپوشی ملکہ بننے کا انتظار ہے۔

سردار۔ میں اسے کہدوں گا۔

(چلا جاتا ہے)

موسیقی

دو پجارنیں سیڑھیوں پر سے درگاہ پر پہنچتی ہیں، دیوی کو عریاں کرنے کے لئے دونوں طرف پردے کھینچ دیتی ہیں پھر دروازے کھولتی ہیں، ور سیڑھیوں پر ایک ایک کر کے دونوں طرف کھڑی ہو جاتی ہیں اور جھکتی ہیں ایک پجارن ادھر کو جاتی ہے اور بیاہ کا نقاب لیکر پلٹ آتی ہے اور قامہ کو نقاب پوش کرنے میں فیبی کا ہاتھ بٹاتی ہے اسی وقت پجارنیں آتی ہیں اور معبد کے دونوں طرف کھڑی ہو جاتی ہیں۔ قامہ اور سب پجارنیں گھٹنے ٹیکتی، ہاتھ اٹھاتی اور سر جھکاتی ہیں،

("سارنقوس، سارنقوس" کے نعرے)

سب اٹھ بیٹھتی ہیں،

قامہ۔ دروازوں کو چوپٹ کھولدو اور ہماری شاہی ماں کے نوساختہ بچوں کو تماشہ دیکھنے دو۔

(سورج کی روشنی دروازوں میں سے آتی ہے)

میرے پاس ایسا کرنے کے لئے دل نہیں ہے (فیبی سے) میری خاطر دیکھو،

فیبی۔ وہ تخت پر چڑھ رہا ہے، گرم لہو، امنگ اور شیخی نے اس کے منہ کو پھلا اور تمتما دیا ہے ـــ کاش کہ یہ اس کا آخری تبسم ہو سکتا ہو! ادھت درندے! ہمارے نیک ساطوس سے کتنا مختلف ہے۔

قامہ۔ (فرش پر ٹک کر) دراصل تم غلط جان رہی ہو، جہاں تک چہرے کی بات ہے وہ ساطوس سے زیادہ خوبرو ہے۔

فیبی۔ (زیر لب) وہ کیونکر ایسی بات کہنے کی جرأت کر رہی ہے؟ میں اس سے اس چیز کے مارے نفرت کرتی لیکن وہ بدحواس سی ہو گئی ہے

(نقاروں کا شور)

قامہ۔ کیا وہ تاجپوش ہو لیا۔

فیبی۔ اے لو وہ اسے تاجپوش کر رہے ہیں؟

(باہر ہجوم سارنقوس سارنقوس کے نعرے لگا رہا ہے)

قامہ اٹھ بیٹھتی ہے۔ ایک پجارن اسے خوشبوؤں کا صندوقچہ لا دیتی ہے۔ جنھیں وہ قربانگاہ کی آگ پر چھڑکتی ہے۔

قامہ۔ قربانگاہ کے بجھے شعلے کو بیدار کر دو، اس میں لوبان، مالتی، دارچینی اما موم اور خوشبوئیں چھڑک دو تمام ہوا کو خوشبو کے دھوئیں میں گھومنے دو جس طرح جنت کے ٹھیک وسط میں ہوا کرتا ہے۔ بادشاہ کے لئے کیا دبیز غالیچے بچھا دو ـــــ بادشاہ کو اپنی دلھن کے پاس ارغوان پر چل کر آنا چاہئے۔ میرے آقا بادشاہ کے خیر مقدم کو موسیقی ہو۔

موسیقی

(فیبی سے) تمھیں یاد ہے ساطوس سے میں نے کب بیاہ کیا تھا؟ ـــ آہ وہ تم تو وہیں تھیں ـــ جانے کنوارے خطرے سے یا عظمت والی محبت سے کہ مجھے اس سے محبت تھی یا کسی دوسرے انوکھے منظر سے بیاہ کا پیالہ جس سے ہم دیوی کا چڑھاوا چڑھاتے ہیں یوں میرے ہاتھ میں لرزا کہ لال شراب سنگ مرمر پر بہ نکلی اور لہو معلوم ہونے لگی۔ لہو،

فیبی۔ مجھے آپ کے پہلے بیاہ کا خوف یاد ہے۔

قامہ۔ مجھے اپنے اس دوسرے بیاہ پر کوئی خوف نہیں۔ ادھر دیکھو! ـــــ میں اپنا ہاتھ باہر بڑھا رہی ہوں ـــــ اسے تھامو! یہ کتنا کڑا ہے۔

فیبی۔ اسے خنجر بھونکنے کے لئے کافی کڑا ہے۔

قامہ۔ چپ رہو! امن کرو، یہ تشدد ہمارے معبد کے سکون کو خراب کر دیگا۔ اس تقریب سے راستی اور نرم کلام ٹھیک میل کھاتا ہے۔

(پجارنوں اور بچوں کا جلوس ہار اور طلائی پیالے لئے پھول بکھیرتا بکھیرتا اندر داخل ہوتا ہے۔ سارنقوس بادشاہ کی حیثیت سے سنہری پھولوں کا تاج اور ارغوانی پوشاک پہنے آتا ہے اردلی میں انطونیاس، مو بلیوس امرا اور خلقت ہے)

قامہ۔ جہاں پناہ! خوش آمدید،

سارنقوس۔ ملکہ! مبارک ہو، تقدیر کے چکر نے مجھے چوٹی پر لا بٹھا دیا۔ آہ کاش یہ مسرت سوا ہوتی جس سے میں اپنا انعام و اکرام لوگوں پر

نچھاور کر دیتا۔ میری آرزو ہے کہ آج ہر آدمی ہمارے صنوبروں اور چناروں کی چھاؤں تلے ضیافت اڑائے کیونکہ میری اصل زندگی آج سے شروع ہوتی ہے۔ گزرا ہوا زمانہ اس پیاسی ہوئی زمین کے مثال ہے جو اب اُفق کے پیچھے دھنس گئی ۔۔۔ ویران ساحل کی طرح جو نمکین نباتات اُگاتا ہے لیکن اب پورے کا پورا محبت میں ڈوب گیا اور زوردار موج کی طرح چمک اُٹھا ۔۔۔ دریا دل خلیجیں اور بندرگاہیں فرحت ناک سمندر سے لبریز ہو رہی ہیں۔ میں بڑے تکبر سے نہیں کہہ رہا بادشاہ بن کر خوش ہوں۔ سب سے بڑھکر خوشی والی خاتون میرے پاس ہے۔

قامہ۔ جی ہاں ۔۔۔ !

سناریقوس۔ ہمارا انطونیاس، ہمارا وفادار روما کا دوست، اپنی وضعداری کے باعث التماس کرتا ہے کہ ہمارے بیاہ پر موجود ہو۔ روما اپنا آزاد قدم جہاں چاہے رکھے۔

قامہ۔ شکر اس کے ہمراہ ہے ۔۔۔ اگر وہ چاہے تو اُسے آجانے دو (انطونیاس سے) سردار انطونیاس! ہمارے معبد میں تمھیں آنا مبارک ہو ۔۔۔ (سناریقوس سے) آپ قربانگاہ کے اس طرف ہو جائیے (انطونیاس سے) تم اس جانب، سناریقوس! پہلے دیوی کا نام لو،

(سب دیوی کی طرف منہ کر لیتے ہیں، پجارنیں، بچے، خلقت اور محافظ گھٹنا ٹیکتے ہیں باقی کھڑے کے کھڑے رہتے ہیں)

سناریقوس۔ اے تو جو کرم میں جان ڈالتی ہے۔ بچہ جو زچہ کے گھر میں ایک تار ہوتا ہے اسے بدن کے حصے عطا کرتی ہے پھر ہوا دیتی ہے اور اس کے پاس اس کے باپ کا جلال بھیج دیتی ہے ۔۔۔ اے تو! جس کا سانس ہماری پہاڑیوں کو سبزے کا لباس پہنانے کے لئے خوشبودار ہوا ہے ۔۔۔ اے تو جو ہماری وادیوں کو حنائی کلیوں سے شعلہ زار کر دیتی ہے اور ہمارے اناج کے سنہری سمندروں کو لہلہاتی ہے اور لمبے لمبے انگوری خوشوں کو جھلاتی ہے۔ اے تو! جو سب کی طبیعت بہتات کی خواہش اور شاپے سے بھر دیتی ہے ۔۔۔ مجھے میرے بیاہ میں شادماں کر!

سب کا مل کر گانا۔ "ارطمیز! ارطمیز! آیونیا ارطمیز اکسُن!"

قامہ۔ اے تو! جو بچے کو پیٹ میں یا پیدا ہوتے وقت یا بعد میں مار دیتی ہے جب وہ لڑکا یا مرد بن جائے ۔۔۔ اے عظمت والی دیوی! جس کی طوفانی صدا مضبوط بلوط کو اکھاڑ دیتی ہے اور اس کی جڑ کو اس کی چوٹی سے اوپر اچھال دیتی ہے یا ہمارے پھلوں کو بکھیرتی ہے اور ہمارے سنہری اناج کو بچھاتی ہے۔ وہ صدا جو سمندر کو چیر جاتی ہے اور بادشاہوں اور مخلوق کی کشتیوں والی دولت کے اوپر جھاگ تیار کر دیتی ہے ۔۔۔ سُن ۔۔۔ اے تو! جس کا تیر طاعون ہے ۔۔۔ جس کی تیز چمک سے سمندر کے بیچوں بیچ مستول کو پاش پاش کر دیتی ہے۔ میناروں کو چٹان سے ٹکرا دیتی ہے اور فاتح کو اس سمیت جس کے سر پر تاج ہو نیچے پٹک دیتی ہے سُن! ۔۔۔ اے تو! جو اچھی خاصی زمین کو کپکپاتی اور اس میں شگاف کر دیتی ہے اور اس بند ہو جانے والے شگاف میں گنبدی شہروں کو دھکیل کر برابر کر دیتی ہے ۔۔۔ سُن! ۔۔۔ اے تو ۔۔۔ ! جس کے لاوا کے دھارے پھوٹ نکلتے ہیں اور جو ملک کو انگارے سے کوئلہ کر دیتے ہیں ۔۔۔ سُن! جس کی سردیوں کی آبشاریں کسی مملکت میں داخل ہو جاتی ہیں تو اسے چٹانیں اور کھنڈر بنا کر چھوڑ جاتی ہیں ۔۔۔ سُن! میں تجھے پکار رہی ہوں تاکہ تو میرے بیاہ کو بامراد کر دے۔

(سب کا مل کر گانا۔ ارطمیز! ارطمیز! یوفیتی ارطمیز اکسُن)

قامہ۔ ارطمیز! ارطمیز! کالیسی ارطمیز! میری سُن! میں اپنی دیوی کو اپنے معبد میں پکار رہی ہوں۔

(سب کا مل کر گانا ارطمیز! ارطمیز! کالیسی ارطمیز اسے سُن)

سناریقوس۔ (علیحدہ ہو کر) گرج! جب مجھے تاجپوش کیا جا رہا تھا تو پہاڑیوں میں طوفان بپا ہو رہا تھا۔ حیرت ہے اگر میں قامہ کی طرح زرد دکھائی دیتا ہوں۔

قامہ۔ کیا اب بھی آپ بیاہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں؟

سناریقوس۔ ضرور ۔۔۔ ارطمیز کو کہنے کے لئے یہ انوکھے الفاظ ہیں۔

قامہ۔ جہاں پناہ! الفاظ ہمیشہ ویسے نہیں ہوا کرتے جیسے وہ دکھائی دیتے ہیں۔ میں آپ کے مرنے تک آپ کی وفادار رہونگی۔

سناریقوس۔ میں تمھارا شکریہ ادا کرتا ہوں قامہ! ۔۔۔ شکریہ،

قامہ۔ (انطونیاس کی طرف منہ پھیرتے ہوئے) انطونیاس! ہم بڑے فضل والے ہیں کہ ہمارے مظالم کی نگہبانی کے لئے رومی ملکہ آئیں چاہتی ہے۔

(مڑتی ہے۔ سیڑھیوں سے قربانگاہ پر دیوی کے آگے جاتی ہے قربانگاہ سے پیالہ اٹھاتی ہے اسے انطونیاس کی طرف بڑھاتی ہے۔ انطونیاس۔ سناریقوس کے مقابل سیڑھیوں کی جڑ میں آجاتا ہے)

سردار تم یہ پیالہ دیکھتے ہو ۔۔۔؟

(اسے پکڑا دیتی ہے)

انطونیاس۔ بڑے شوق سے۔ کئی ایک چھاتیوں والی ماں ارطمیز اس پر منقوش ہے۔

قامہ۔ یہ پرانا ہے، یہ مجھے خبر نہیں کہ کتنے سو برس پہلے کا ہے۔ لاؤ! اسے مجھے پھر پکڑا دو۔ یہ پیالہ ہمارے ہی معبد کی چیز ہے۔

(اسے لوٹ کر قربانگاہ پر رکھ دیتی ہے اور مقدس پیالہ اٹھا لیتی ہے اسے انطونیاس کو دکھاتی ہے۔)

لو یہ ایک اور ہے جو دیوی کا متبرک ہے اور سناریقوس کا تحفہ ہے اور دیوی اس تحفے اور ہمارے بیاہ کے اعزاز میں آرزو مند ہے کہ مجھ پجارن کے ہاتھوں سناریقوس اپنے پیالے سے شراب نوش کریں'

سناریقوس۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں قامہ! ——— شکریہ!

قامہ۔ میرے آقا! کالیسیا میں یہ ہمارا پرانا رواج ہے کہ پیشتر اس کے کہ دو جانیں موت اور زندگی کے لئے جڑ جائیں ان دونوں کو واجب ہے کہ بیاہ کے رشتہ کی علامت کے لئے دیوی کی نذر گزار کر وہ ایک ہی پیالے سے اکٹھے شراب پئیں۔ (پجارنوں سے) مجھے وہ قیمتی شرابیں لادو جو ہم بیاہوں پر کام میں لاتے ہیں۔

(وہ شراب کا ایک بڑا قرابہ لے آتی ہیں۔ قامہ مقدس پیالے میں شراب انڈیلتی ہے)

(سناریقوس سے) ادھر دیکھئے! میں اسے بھر رہی ہوں (انطونیاس سے) سردار تم پیو گے؟

انطونیاس۔ میں؟ میں کیوں پیوں؟ میں تو نہیں بیاہا جانے کو۔

قامہ۔ لیکن یہ شاید ہم پر دوا کی برکت لے آئے۔

انطونیاس۔ (پیالہ موڑتے ہوئے) بیگم معاف کیجئے!

قامہ۔ تم راستی پر ہو۔ یہ برکت میرے اور سناریقوس کے لئے ہے ایلو میں دیوی کی نذر پہلے گزارتی ہوں۔

(نذر گزارتی ہے)

اب میں پیتی ہوں (پیتی ہے اور پھر پیالے کو دوبارہ بھر دیتی ہے) کالیسیا کے تاجدار! آپ کی باری ہے پیجئے اور خوب پیجئے! ——— ہمارا بیاہ پھولے پھلے گا۔

(سناریقوس اس تک بڑھتا ہے وہ اسے پیالہ پکڑا دیتی ہے وہ پی لیتا ہے)

سناریقوس۔ بس قامہ! میں نے قریب قریب سارا پیالہ چڑھا لیا۔ کچھ بوندیں بچ رہی ہیں۔

قامہ۔ یہ دیوی کی نذر ہیں۔

(وہ بچی ہوئی بوندیں قربانگاہ پر چھڑک دیتا ہے اور پیالہ قامہ کے حوالے کر دیتا ہے)

——— (قربانگاہ پر پیالہ دھرتے ہوئے) پھر دیوی کیوں سنے۔

(نیچے اتر آتی ہے اور تپائی کی طرف چلی جاتی ہے انطونیاس پیچھے ہو لیتا ہے)

——— انطونیاس! تم اس صبح کہاں تھے جب آدھا برس پہلے میں اس معبد کے قریب تم سے سناطوس کی جان کے لئے عرض کرنے آئی تھی۔

انطونیاس۔ میں نے آپ سے اس عرض کی بابت کبھی کچھ نہیں سنا۔

سناریقوس۔ (جھٹ تپائی کے قدموں کی جڑ کو پکڑتے ہوئے) میں نے اس کی جستجو کی لیکن میں اسے ڈھونڈ نہ سکا ——— مہربانی کر کے بیاہ کی رسمیں کئے جاؤ۔

قامہ۔ انطونیاس ——— "قامہ؟" کون بولا؟

انطونیاس۔ میں نہیں بولا۔

فیبی۔ اور کوئی بھی یہاں نہیں بولا۔

قامہ۔ مجھے پورا یقین ہے کہ کوئی بولا ہے۔ انطونیاس! اگر تم سناطوس کو روما کے خلاف سازش کرتا پاتے تو کیا تم اسے موت کی سزا دیتے؟

انطونیاس۔ مجھے اس کی سزا یا موت کا کوئی گمان نہ تھا اگر میں اسے سازش کرتے پاتا تو بے فائدہ مقابل ہونے کی بجائے چین پکڑنے کا مشورہ دیتا۔ روما دنیا پر حکومت کرنے کے لئے تخت آور ہو چکا ہے۔ اگر پھر بھی وہ نہ سنتا تو میں شاید اسے اسیر کر کے روما بھیج دیتا۔

سناریقوس۔ تم تقریب میں کیوں اٹکا اٹکا رہی ہو ——— بیاہ کی رسمیں ادا کئے جاؤ۔

قامہ۔ وہ تو ختم ہو چکیں۔

سناریقوس۔ کیسے ———؟

قامہ۔ تم نے مجھے خوش کرنے کے لئے خوب شراب چڑھا لی ہے۔ کیا تم اپنی رگوں میں اس محبت کو دکھتا نہیں پاتے جو مجھے تم سے ہے۔

سناریقوس۔ مجھے جو تم سے محبت ہے وہ میری رگوں میں تب سے دمک رہی ہے جبکہ میں نے پہلے پہل تمہیں دیکھا۔ لیکن یکی رسم کیوں برباد کر دو؟ کالیسیا کا تاجدار اپنی بیگم سے بیاہ کرتا ہے۔ تمام دیوتاؤں کے روبرو سب کچھ پوری پوری طرح ہونے دو! (چلتا ہے) یہ درد ——— یہ کیا ہے؟ ——— پھر دوبارہ؟ ——— پچھلے سال یہ مجھے روما میں اٹھا تھا۔ ہاں، ہاں، (انطونیاس سے) ذرا اپنا ہاتھ دو

یہ چلا جائے گا۔ میں انتہائی مسرت کے بوجھ تلے لڑکھڑا رہا ہوں۔
یہ دن بڑا خوشی کا ہے۔ بیگم کو ایکدم تاج پہنا دو (لڑکھڑاتا ہے) او
سب دیوتاؤ! مشتری! مشتری! ـــــ

(پیچھے گر پڑتا ہے)

قامہ۔ کیا آپ رومی دیوتاؤں کو پکار رہے ہیں؟ آپ کا لیسیا کی پیدائش ہیں۔ ہماری ارطمیز نے ان کی ڈائنا کو مات کر دیا ہے۔

سنارتیوس۔ (فرش پر گرتے ہوئے) مجھے زہر دیا ہے قامہ نے ـــــ معبد کے کواڑ بھیڑ دو اسے بھاگنے مت دو۔

قامہ۔ (تپائی پر جھکتے ہوئے) کیا میں نے آپ کے ساتھ وہی پیالہ نہیں پیا؟

سنارتیوس۔ ہاں قسم ہے مجھے روما اور دنیا بھر کے دیوتاؤں کی اس نے بھی پیا ـــــ دلھن ـــــ بیگم ـــــ اور میں ـــــ درندہ جس نے اسے پیار کیا۔

قامہ۔ میں نے ان سے پیار کیا۔

سنارتیوس۔ او ہلاک کرنے والی دیوانی عورت! (اپنے آدمیوں سے) ہرقی سے تم مجھے اٹھا لو اور کچھ دیر مجھے ٹہلاؤ۔ میں نے سنا ہے کہ یہ زہر بیٹھ جانے ہیں (انطونیاس اور فولیاس اسے اٹھا لیتے ہیں) میرے پاؤں منوں سنگے کے ہو رہے ہیں یہ زمین میں لوٹ پھوٹ جائیں گے ـــ میں دھنس رہا ہوں ـــــ مجھے تھامو! مجھے اکیلا چھوڑ دو (وہ اسے چھوڑ دیتے ہیں' وہ زمین پر بیٹھ جاتا ہے) بڑی دیر ہو گئی ـــــ میں نے خود کو سیانا جانا ـــــ ایک عورت کا فریب' انطونیاس مجلس زعما کو بتا دینا کہ میں روما کا سچا وفادار تھا ـــــ اس کا وفادار رہتا ـــــ اگر ـــــ اگر ـــــ

(مُردے کی طرح گر پڑتا ہے)

قامہ۔ (اگر اس پر جھپٹ ہوتی ہوئی) ساعت بھر کا تخت یوں گر جاتا ہے کیا؟

سنارتیوس۔ (آدھا اٹھتے ہوئے) تخت؟ کیا یہ تو ہے؟ قسمتیں تخت نشین ہوئی ہیں' نہ کہ ہم ـــــ ہم اپنے تئیں کے خطاوار نہیں تیری اور میری قیامت ـــــ تو بھی ـــــ میری راہ پہ آ رہی ہے قامہ ـــــ شب بخیر ـــــ!

(دم دے دیتا ہے)

قامہ۔ (ماتمی پجارنوں کے سہارے اٹھتے ہوئے) تیری راہ پر؟ لیے بسر کیڑا سب سے نچلی جہنم میں اپنے اندھیرے بل کے اندر رینگ کر جا رہا ہے۔ انطونیاس! کیا وہ جہنم میں جا لیا؟ میری نیت تھی کہ تم بھی میری پیروی کرتے ـــــ خیر یوں بہتر سہی۔ اگر میری رعیت کو روما کا غلام بننا ہے تو وہ بھلامانس ہے اگرچہ رومی ہے۔

(پجارنوں کے بازوؤں میں جا پڑتی ہے)

انطونیاس۔ تم اپنی قوم میں بے مثال ہو قامہ! اگرچہ میں رومی ہوں لیکن تمھیں معاف کرتا ہوں۔

قامہ۔ (اپنے تئیں اٹھاتے ہوئے) "قامہ!" یہ پھر کیوں؟ مجھے یقین ہے مجھے کسی نے ضرور بلایا ہے۔ او عورتو! تمھارے آقا رومی ہونگے میں خوش ہوں کہ میں یہ نہ دیکھوں گی! کیا کسی یونانی نے نہیں کہا کہ موت ہی بڑی نعمت ہے۔ اس نے اس کی خاطر میری قسمت غصب کی۔ اسے زہر دیا گیا۔ (پھر پیچھے گر پڑتی ہے) کیا آج میرے سر پہ ہے۔ میں اپنے آخری بحری سفر پر اپنے ارادے کی تاجدار بن کر اسے ملنے جاؤں گی ـــــ لیکن ہوا رہ گئی ہے، اندھیرا چھا رہا ہے ـــــ تاہم چپو چلانے کو کافی اجالا ہے ـــــ مبارک جزیروں کی طرف چپو چلاؤ ـــــ برکت والے جزیرے سناطوس! ـــــ وہ مجھے ملنے کیوں نہیں آتا ـــــ یہ [illegible] ـــــ رک رہا ہے ـــــ لیکن میرے ہاتھ [illegible] [illegible] کو [illegible] ـــــ

(تپائی سے [illegible] اتار دیتی ہے)

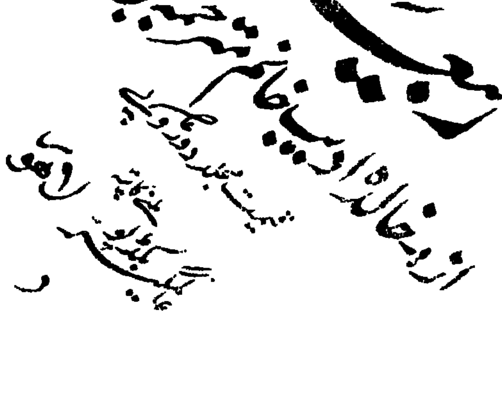
ـــ مجھے کس نے چھوا؟ ـــ تمہی تم ـــ تمھارا شکریہ!

(ہاتھ پھیلائے اٹھتی ہے)

ـــ ہاں! ـــــ ہمیشہ چمکنے والے سورج کے نیچے ـــــ ہمیشہ چمکنے والے ساحل کی طرف بڑھو ـــــ کوس کوس بڑھو ـــــ میں اسے دیکھ رہی ہوں ـــــ قامہ قامہ! ـــــ سناطوس! ـــــ سناطوس! ـــــ

(دم دے دیتی ہے)

ـــــ تمت بالخیر ـــــ



احسن الکلام

حضرت احسن مارہروی مرحوم کی غیر مطبوعہ غزل

مرسلہ جناب ابر احسنی گنوری

آہ آسمانِ ادب کا یہ روشن ستارہ ۳۰ اگست ۱۹۴۰ء کو پٹنہ میڈیکل کالج میں بمرضِ سرطان غروب ہو گیا۔ ۳۱ اگست کو نعش مارہرہ پہنچی اور شب کے ۱۱ بجے یہ زمین کی امانت زمین کی سپرد کر دی گئی۔ استاد قبلہ کی موت نے جہانِ سخن میں ایسا خلا پیدا کر دیا ہے جو مدت تک پر ہوتا نظر نہیں آتا۔ ایسی احتیاط سے شعر کہنے والی ہستیاں ہندستان میں بہت کم ہیں۔ آپ کی بلیغ النظری ملک میں مسلمہ تھی۔ آپکے جاننے والے جانتے ہیں کہ آپ بے پناہ قابلیت کے مالک تھے آپکی معلومات کا دائرہ وسیع تر تھا۔ اللہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے!

غمزدہ ابر احسنی گنوری

جو قہر آگین نگاہِ آسماں معلوم ہوتی ہے ۔۔۔ یہ تیری مہربانی مہرباں معلوم ہوتی ہے
تڑپ بجلی کی ہر دل میں نہاں معلوم ہوتی ہے ۔۔۔ کہاں معدوم ہوتی ہے کہاں معلوم ہوتی ہے
کدورت دل کی ہمدوشِ فغاں معلوم ہوتی ہے ۔۔۔ یہی ہے وہ زمیں جو آسماں معلوم ہوتی ہے
پیام آیا، نہ خط آیا، نہ وہ آئے، نہ موت آئی ۔۔۔ مری سعیِ طلب سب رائیگاں معلوم ہوتی ہے
یکایک رک گئے وہ ملتے ملتے جب تو میں سمجھا ۔۔۔ کہ یہ تمہیدِ مرگِ ناگہاں معلوم ہوتی ہے
یہ عالم گومگو کا ہم نے تیرے عہد میں دیکھا ۔۔۔ نہیں معلوم ہوتی ہے نہ ہاں معلوم ہوتی ہے
چمکتی ہے بہت دور آسماں پر برقِ سوزندہ ۔۔۔ مگر مجکو قریبِ آشیاں معلوم ہوتی ہے
کئے ہیں خاکسارانِ محبت نے جہاں سجدے ۔۔۔ زمیں اس رہگزر کی آسماں معلوم ہوتی ہے
مزے لے لے کے ذکرِ حور و غلماں شیخ کرتے ہیں ۔۔۔ طبیعت پیرو مرشد کی جواں معلوم ہوتی ہے
بساتی ہے یہی دنیا بناتی ہے یہی عقبیٰ ۔۔۔ محبت کارسازِ دو جہاں معلوم ہوتی ہے

جہانِ بے ثبات اک مستقل غمخانہ ہے احسن
یہاں آوازِ نغمہ بھی فغاں معلوم ہوتی ہے

سنٹرل ایکس چینج بنک لمیٹیڈ لاہور

شاہراہ ترقی پر

بنک کے ڈائرکٹروں نے سال گزشتہ کی طرح اس سال بھی اپنے حصہ داروں کو

چھ فیصدی منافع تقسیم کیا ہے

مزید برآں ابتدائی اخراجات کی رقم قطعی طور پر صاف کر دی گئی ہیں

اور نیز

تین ہزار روپیہ مد سرمایہ

محفوظ منتقل کر دیا گیا ہے پبلک کو چاہیئے کہ اسکے حصہ جات خرید کر فائدہ اٹھائیں میعادی امانتوں پر ۴ ۱/۲ فیصدی
سود دیا جاتا ہے

دیگر ہر قسم کے بینکنگ کا کام کیا جاتا ہے

مزید حالات کیلئے بنک کو لکھیں یا
ٹیلیفون نمبر ۳۲۰۴ پر گفتگو کریں

میاں احسان الہٰی بی اے منیجنگ ڈائرکٹر

اردو شاعری اور جناب شیخ

دلچسپ ادبی تبصرہ

از محترمہ صدیقہ بیگم صاحبہ سیوہاروی

صوفیائے کرام کے مریدین کے لئے ابتدائی درجہ مشق "فنا فی الشیخ" ہوتا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اپنے مرشدوں کی اس تعلیم سے اُن کے روحانی شاگرد کہاں تک مستفید ہوتے۔ اور اپنے عمل سے اس درجہ کو حاصل کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئے۔ لیکن ہمارے شعرا البتہ "فنا فی الشعر" ہونے سے زیادہ "فنا فی الشیخ" نظر آتے ہیں۔ ہاں البتہ مختلف مراحل طے کرنیکے بعد انسان مُرشد کامل بنجاتا ہے اور یہاں اُس کا درجہ کم ہوجاتا ہے۔ اس حقیقت کو خود مولانا حالی کے الفاظ میں سُنیئے :۔

"فقہا اور اہل ظاہر ہمیشہ دو فرقوں کے سخت مخالف رہے ہیں۔ ایک اہل باطن (شیخ) کے دوسرے اہل رائے کے فقہا کے فتووں سے اِن دونوں گروہوں کو ہمیشہ سخت نقصانات پہنچتے رہے ہیں قتل کئے گئے ہیں۔ دار پر چڑھائے گئے ہیں۔ (منصور) مشکیں بندھی ہیں۔ کوڑے کھائے ہیں۔ قیدیں بھگتی ہیں۔ جلا وطن کئے گئے ہیں۔ کتابیں جلائی گئی ہیں اور کیا کیا کچھ ہوا ہے۔ جبکہ فقہا کی مخالفت کا ان لوگوں کیساتھ یہ حال تھا تو یہ بھی اپنی تصنیفات میں نثر ہو یا نظم خوب دل کے بخارات نکالتے تھے بقول شخصے "کسی کا ہاتھ چلے اور کسی کی زبان"۔ فقہا اور واعظین انکے اقوال و افعال پر گرفت کرتے تھے۔ انہوں نے انکے اخلاق کی قلعی کھولنی شروع کی۔ وہ کہتے تھے یہ لوگ خلاف شرع کام کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ شراب خواری اور قمار بازی جو اکبر الکبائر ہیں وہ بھی جَو فروشی اور گندم نمائی سے بہتر ہیں۔ وہ کہتے تھے یہ لوگ خلاف شرع باتیں کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا علانیہ کفر بکنا اس سے بہتر ہے کہ دل میں کفر ہو اور زبان پر اسلام وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اوروں کو ہدایت کرنے اور آپ گمراہ رہنے سے بڑھکر کوئی گناہ نہیں۔ وہ کہتے تھے تم لوگ حقوق الٰہی ادا نہیں کرتے انہوں نے کہا تم حقوق عبادت میں خیانت کرتے ہو۔ الغرض شعرائے متصوفین نے جو اہل ظاہر پر خردہ گیریاں کی ہیں وہ اسی قسم کی تعریضات اور مطارحات ہیں۔"

غرض آج کی صحبت میں ہم دورِ قدیم اور دورِ حاضر کے اُن رِیادل شعرا کے کلام پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے جنہوں نے خود نہیں بلکہ شیخ کے ہاتھوں انتہائی فیاضی سے جام پر جام لنڈھائے۔ گلابی کے دریا بہائے۔ کبھی درِ میخانہ بند نظر آیا تو زنجیر میخانہ ہلا ہلا کر قیامت برپا کردی۔ اور کبھی رندوں کو ایسا از خود رفتہ کیا کہ انہوں نے دستارِ شیخ کو اُچھالتے اُچھالتے کرسیِ ہفت فلک سے جا ٹکرایا جہاں اُسکا ایسا شیرازہ منتشر ہوا کہ تار تار الگ نظر آنے لگا۔ پھر آسمانِ شاعری پر چڑھکر بیچارے پر وہ بے رحمانہ گولہ باری کی کہ فرشتوں کے دل بھی دہل اُٹھے اور اُس غریب کا مُنہ کُھلا کا کُھلا رہ گیا۔

۱۔ شیخ کی زندگانی

سب ہی جانتے ہیں کہ شیخ کی زندگی کس قدر دُنیا سے بے ربط اور خشک ہوتی ہے (خاصکر شاعرانہ نقطہ نظر سے) ظاہر ہے کہ یہ موضوع کسی طرح بھی دلچسپ اور پُر کیف نہیں ہوسکتا۔ لیکن اسکے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے شعرا نے اس بنجر زمین میں بھی ایسے ایسے چمن کھلائے ہیں جو اپنی جاذبیّت سے ایک عالم کو اپنی طرف محو کئے ہوئے ہیں۔ شاعر کے آسمانِ تخیل پر جہاں دلفریب، حسین ستارے جگمگاتے نظر آتے ہیں وہاں غریب شیخ بھی مثل کہکشاں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ لفظ "نمایاں" کو مدِنظر رکھتے ہوئے ذیل کا شعر پڑھئے تو دل پہلو میں لوٹ لوٹ کر رہ جائیگا

؎ اے جذب دل اُڑا دے مجھے کہکشاں تلک
یہ راستہ گیا ہے کسی کے مکاں تلک

حق تو یہ ہے کہ ۔۔۔۔۔ ع
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

شیخ کی خشک زندگانی پر حضرت جوش ملیح آبادی یوں ترزباں ہیں ؎

کیا شیخ کی خشک زندگانی گزری ۔۔۔ بیچارے کی ایک شب نہ سہانی گزری
دوزخ کے تخیل میں بڑھاپا بیتا ۔۔۔ جنت کی دعاؤں میں جوانی گزری

اِس رباعی میں لفظ "بیچارہ" شاعر کے مافی الضمیر کو کتنے اچھے اسلوب سے ظاہر کرتا ہے۔ ذرا غور کیجئے کیسے اچھے پیرائے میں اظہارِ افسوس کیا ہے۔ شعر پڑھئے اور شاعر کے اسلوبِ بیان کی تعریف کیجئے۔

اِسی ضمن میں حضرت جوشؔ کی ایک رُباعی اور سُنئے ؎

زاہد نے بھی کیا حیاتِ فانی کاٹی　　آغوشِ لحد میں زندگانی کاٹی
مُلّاؤں کی خدمت میں لڑکپن کھویا　　پیروں کی ولایت میں جوانی کاٹی

زاہد کی زندگی کا کس قدر گہرا مطالعہ ہے۔ شاعر نے اُس کی اِس افسوسناک زندگی کو کس سختی سے محسوس کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ شاعر سمجھتا ہے کہ جبتک ہم خود غرض مُلّاؤں اور پیروں کی گرفت سے نِکل کر راہ عمل پر گامزن نہ ہونگے ہم اپنے مُلک اور قوم کو غلامی کی آہنی زنجیروں سے آزاد نہیں کرا سکتے۔ پس وہ زندگی جو ایک کونہ میں بیٹھکر یا کسی کی غلامی میں گزار دی جائے حقیقتہً انتہائی خشک زندگی ہے۔ اور سچی زندگی کہلانے کی مستحق نہیں۔

۲۔ صحبتِ رنداں و شیخ

شیخ فانی کو زندہ دِل رندوں کی صحبت سے دُور کا بھی تعلق نہیں لیکن ہمارے شعرا اس کو یوں کھینچ بُلاتے ہیں اور عالمِ تخیل میں اُس پر پھبتیاں کس کر اپنا دِل یوں خوش کرتے ہیں۔

حضرت وحیدؔ ؎

یہ صحبت تو ایسے شیخ رندوں کی ہے
کہاں آپ پھر بشارہ پر در چلے

اِتنا اور یاد رکھنا چاہئے کہ ضرورتِ شعری شاعر کے یہاں شیخ کو ہر جگہ "شیخ" ہی نہیں رہنے دیتی۔ بلکہ وہ کہیں زاہد، کہیں واعظ، کہیں قاضی، کہیں مُلّا، کہیں ناصح، غرض متعدد الاوصاف مختلف ہستیوں میں نمودار ہوتا ہے۔ مثلاً ـــ میخانہ تک تو شیخ کو حضرت وحیدؔ کھینچ ہی لائے ہیں۔ اَب حضرت جگرؔ مراد آبادی ان کا خیر مقدم کرتے ہیں ؎

مجھے اُٹھانے کو آیا ہے واعظِ ناداں
جو اُٹھ سکے تو مرا ساغرِ شراب اُٹھا

یہی شُبہ حضرت ریاضؔ خیر آبادی کو آشنا از خود رفتہ کرتا ہے کہ ؎

واعظ آیا سوئے میخانہ تو بدست ریاضؔ
عوض شیشہ لئے ہاتھ میں پتھر نِکلا

حضرت دِلؔ شاہجہاں پوری کے دِل سے یوں آواز نکلتی ہے ؎

زاہد بھی میکدے میں ہے ساغر بدست آج
میکش یہ کہہ رہے ہیں کہ حضرت ادھر کہاں؟

حقیقت یہ ہے کہ چند ہی فقروں میں شیخ کی زندگی کے تمام اوراق اُلٹ کر دکھائے ہیں۔

ریاضؔ، جوشؔ اور جگرؔ، تو جنموں کے "سیاہ مست" ہیں۔ یہ جو کچھ بھی شیخ کی آؤ بھگت کریں تھوڑی ہے۔ مگر رئیس السالکین حضرت جان جاناں مظہر علیہ الرحمۃ اس قدوم میمنت لزوم کے یوں راہ کھولتے ہیں ؎

مدارات رندوں نے کی شیخ کی وہ
کہ پگڑی سنبھالے سنبھلتی نہیں

شعر کو سَو بار پڑھئے۔ بقول اقبالؔ ؏

دِل سے جو بات نِکلتی ہے اثر رکھتی ہے

اور داد دیجئے۔

اَب جبکہ شیخ رندوں کی ٹولی میں پہنچ ہی گیا ہے تو اس کو شریکِ صحبت کس انیلے پن کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

نسیمؔ ؎

شیخ برسوں سے ندیدہ تھا مئے گُلگوں کا
جام تک بھی نہ لیا اُوک لگا بیٹھا

کیا خوب! لفظ "ندیدہ" نے شعر میں عجب چلبلاپن پیدا کر دیا ہے، شیخ صاحب تو بے صبری میں گویا بچوں سے بھی بازی لے گئے۔

جب اِس طرح بھی کام چلتا نظر نہ آیا تو حضرت ریاضؔ نے شیخ کو ٹالنے کی کیا انوکھی ترکیب نکالی ؎

لے رہے ہیں شیخ جی انگڑائیاں
ساقیا لا جام مئے اُن کے لئے

لیکن شیخ محروم کب اس کا متحمل ہو سکتا ہے۔ اِس لئے باسطؔ بسوانی یوں احترام کرتے ہیں ؎

ظاہر میں شیخ صاحب ایسے شُبہ ہو فرشتہ
باطن کا حال یہ ہے مُشکل سے آدمی ہو

اِسی فرشتہ کی تہجد گزاری کا پردہ جناب سائلؔ دہلوی کس انداز سے فاش کرتے ہیں ؎

تہجد کو وضو کے واسطے کیا شیخ آتا ہے؟
ہلا کرتی ہے کیوں پچھلے پہر زنجیر میخانہ؟

شاعر نے جب شیخ کی زندگی پر گہری نظر ڈالی تو اس پر وہ تمام اسرار جو عوام کی نظروں سے پوشیدہ تھے عیاں ہو گئے۔ پھر اس نے اس حقیقت کو لفظی جامہ پہنا کر ہمارے سامنے پیش کیا۔ اندازِ بیان

قابلِ داد ہے۔ بہرحال شعر پڑھئے اور لطف اُٹھائیے۔
حضرت ریاض اس گرہ کو یوں کھولتے ہیں اور ناممکن کو یوں ممکن بناتے ہیں ؎

کونسا دام نہاں شیخ کے جامے میں نہیں
تیج ایسا بھی کوئی ہے کہ عمامے میں نہیں

جوشِ سرمستی سے خالی شیخ کی بے حسی پر ریاض ع
ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں
کہتے ہوئے اس طرح اشارہ کرتے ہیں ؎

اُتری ہے آسمان سے جو کل اُٹھا تو لا — طاقِ حرم سے شیخ وہ بوتل اُٹھا تو لا
طاقِ حرم میں شیخ وہ بوتل ہے بھل سی — اس کام کا ملے گا تجھے پھل اُٹھا تو لا

یعنی ـــــ اس آسمانی عطیہ کا تو بھی منتظر ہے۔ آب تو چکھ ع
وہ بھی تھوڑی سی مزامنہ کا بدلنے کیلئے
ہمارے شعرا نے اشتباہ سے کام لیکر شیخ کی زندگی کو اس طرح مشکوک کیا ہے کہ فرشتے بھی دم بخود ہیں ؎

خدا کو علم ہے زاہد کے پینے کا نہ پینے کا
مگر سنتے ہیں ہم بھی جھوٹ سچ راوی کی گردن پر

۳۔ شیخ اور عبادت

شیخ عبادت گزار ہے۔ عبادت گزاری اس کا شعار ہے۔ اس لئے وہ دوسروں کو بھی اس ثواب سے محروم ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ مگر اُس کو یہ علم نہیں کہ رندوں کے منہ لگ کر اُلٹی آنتیں گلے پڑینگی۔ چنانچہ تذکرۂ نماز پر اکبر کیسا وضو شکن جواب دیتے ہیں ؎

کیسی نماز ہال میں ناچو جناب شیخ
تم کو خبر نہیں کہ زمانہ بدل گیا

پھر فرماتے ہیں کہ حضرت اپنی شب زندہ داری کی اُلٹی تدبیر پر بھی کچھ غور فرمایا ؎

شیخ سوتا ہے مرا پڑھ کے نمازِ معکوس[1]
رات کو تختۂ تدبیر اُلٹ جاتا ہے

حضرت نوح ناروی سے بھی شیخ کی عبادت گزاری دیکھ کر خاموش نہ رہا گیا۔ چنانچہ بول ہی اُٹھے ؎

زاہد حرم میں رہ کے نہ مٹی خراب کر
بہتر تو اس سے یہ ہے کسی دل میں گھر بنا

---

[1] حضرت اکبر الہ آبادی کا یہ شعر غیر مطبوعہ ہے۔ (صدیقہ سیوہاروی)

علامہ اقبال مرحوم کی نظر میں بھی بیچارے شیخ کی عبادت گزاری اور خداترسی عین مکاری ہے۔ فرماتے ہیں ؎

بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں
لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے

یہ ظاہر ہے کہ شیخ کی زندگی عبادتِ الٰہی میں گزرتی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود اس عبادت کے وہ حقیقت سے مجاز کی طرف جھک جاتا ہے جیسا کہ سودا کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

کوچے سے شیخ اُس کے گزرا تو دیکھتے ہیں
جز سجدہ کرتے اس کو کچھ اور بن نہ آئی

یہ شیخ کی عبادت کی خامی ہے۔ ورنہ حقیقتاً خدا میں جذب ہو جانے کے بعد مادی حسن پر مچل جانا سچے پارسا کا شیوہ نہیں۔ اسی مسئلہ پر حضرت جوش ملیح آبادی کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

صلوٰۃِ بے ریا کی وادیوں میں — ہزاروں سختیاں جھیلے ہوئے ہیں
یہ مشقِ کاروبارِ ضرب یا ہو — مہینوں سر سے نر تیلے ہوئے ہیں

۴۔ شیخ اور ریاکاری

ذوق ــــ صلح کل ہیں۔ لیکن انہوں نے بھی شیخ کی کج بحثیوں پر یوں مہرِ خاموشی ثبت کر دی ؎

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھکو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

حمایتِ فرائض شیخ کا قدیم ترین شعار ہے۔ اور اُس پر تعریض بھی ازلی۔ چنانچہ مولانا حالی لکھتے ہیں :ـــ

"نور بائی گائن جس نے اپنے حسنِ جمال، خوش آوازی، بذلہ سنجی اور مصاحبت کی عمدہ لیاقت کے سبب محمد شاہ کے تقریب کا درجہ حاصل کیا تھا اور جو تمام امرائے دربار کے دِلوں پر قابض تھی۔ ایک روز نواب روشن الدولہ کے یہاں بیٹھی تھی اور ہنسی چہل کی باتیں ہو رہی تھیں، اتنے میں میراں سید بھیک صاحب کی سواری جن سے نواب کو کمال عقیدت تھی آپہنچی۔ نواب نے فوراً بائی کو دوسرے کمرہ میں بٹھا کر آگے سے چلمن چڑھوا دی۔ میراں صاحب آئے اور اتفاق سے بہت دیر تک بیٹھے۔ بائی جو ایک نہایت چلبلی اور بے چین طبیعت کی عورت تھی تنہائی میں زیادہ بیٹھنے کی تاب نہ لاکر بے باکانہ باہر نکل آئی اور شیخ کے

حضور میں جھک کر آداب بجا لائی عرض کی کہ لونڈی کو حکم ہو تو کچھ گائے۔ میراں صاحب چونکہ سماع کے عاشق تھے خاموش ہو رہے۔ باندی نے ان کی خاموشی کو اجازت سمجھ کر یہ رباعی نہایت سوز و گداز کی لے میں گانی شروع کی۔

رباعی

شیخے بہ زنِ فاحشہ گفتا مستی کز خیر گسستی و بشر پیوستی
زن گفت چنانکہ می نمایم ہستم تو نیز چنانکہ می نمائی ہستی؟

[مولانا شبلی اس کی تشریح یوں کرتے ہیں :—

"یعنی زاہد نے فاحشہ عورت سے کہا کہ تو بڑی نالائق ہے عورت نے کہا میں جیسا اپنے کو ظاہر کرتی ہوں باطن میں بھی ویسی ہی ہوں۔ یعنی میرا ظاہر اور باطن یکساں ہے۔ کیا حضور بھی باطن میں ایسے ہی ہیں جیسا ظاہر میں نظر آتے ہیں"۔]

"شیخ کی حالت اِس برمحل رُباعی کے سُننے سے ایسی متغیر ہوئی کہ باندی کو اپنی جسارت سے سخت نادم ہونا پڑا۔ باوجودیکہ تو باندی کو خاموش کر دیا گیا تھا شیخ کی شورش کسی طرح کم نہ ہوتی تھی۔ زمین پر مُرغِ بسمل کی طرح لوٹتے تھے، دیر تک یہی حال رہا اور بہت مشکل سے ہوش میں آئے۔"

لیکن ہمارے شعرا کا شیخ تا قیامت ہوش میں نہ آئیگا۔ اس موقع پر حضرت جوش کی ایک پُرجوش نظم یاد آگئی۔ جوش صاحب کا یہ ایک خاص رنگ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس رنگ میں خوب کہتے ہیں۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

مقامِ شیخ کا قائل ہوں میں بھی یہ پاپڑ تو بہت بیلے ہوئے ہیں
یہی ابلیس کی جمعیتوں کو جہنم کی طرف ریلے ہوئے ہیں
خیالِ حُور میں تڑپے ہیں برسوں کہیں دو دِن میں البیلے ہوئے ہیں

واللہ کس قدر صاف گوئی سے کام لیا ہے۔

ایک بار حضرت جوش نے یہ نظم علی گڑھ یونیورسٹی کے کسی مشاعرہ میں پڑھی تھی۔ جس کے ابتدائی تین شعر سنتے ہی ایک صاحب نے اس نظم کو "خلاف اسلام" ہونے کا اعلان کر کے "واک اوٹ" کا مظاہرہ کیا تھا۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری زبان اور ہماری شاعری کا ایک بہت بڑا حصہ اِن زاہدان ریاکار کی مذمت سے بھرا پڑا ہے۔ حضرت جوش کی اسی نظم کے چند اشعار اور سنئے۔ جو دلچسپی سے خالی نہیں ؎

انہیں پیرِ طریقت کے بدولت ہمیشہ عُرس کے میلے ہوئے ہیں
ہزاروں کو بنا ڈالا ہے چیلا ہزاروں بار خود چیلے ہوئے ہیں

اگر ہم اس قسم کے کلام کو "خلافِ اسلام" کہکر بیکار کر دیں تو فارسی اور اُردو کا بہت بڑا ذخیرہ برباد کئے جانیکے قابل ہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ اقبال جیسے اِسلام پرست شاعر نے بھی زاہدوں اور پیروں پر جی بھر کر چوٹیں کی ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

یہ شعر علامہ نے اس وقت کہا تھا جب جو فروش و گندم نما "شیخوں" پیروں اور واعظوں نے ان پر "شکوہ" لکھنے کے پاداش میں کفر کا فتویٰ لگا دیا تھا۔ حق تو یہ ہے کہ کہاں تک انسان صبر کرے۔ ایک وقت ایسا آہی جاتا ہے جب پیمانۂ صبر لبریز ہو کر چھلک جاتا ہے۔ بات درصل یہ ہے کہ اس قسم کے کلام سے لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں ورنہ حقیقتہً شاعر کا مقصد یہ نہیں کہ لوگ مذہب سے بھاگنے لگیں۔ اُن کے قدم راہ راست سے ڈگمگا جائیں۔ بلکہ وہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں بھولے بھالے مسلمان اِن روباہ صفت لوگوں سے بچیں جو دُنیا کو فریب میں ڈالنے کیلئے زاہدوں اور پیروں کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔ اس سے میرا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ سب ہی ایسے ہوتے ہیں۔ سو پچاس میں ایک آدھ حقیقتہً سچا زاہد اور شیخ بھی ہوتا ہے لیکن وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ کیونکہ ظاہری پوشش و عادات سے باطن کا پتہ لگانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ مسلمان خود ایک نور ہے پھر کیوں دوسروں کا سایہ ڈھونڈے۔ اپنی روشنی سے اپنی راہ کو جگمگائے۔

بقول اقبالؒ ؎

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

علامہ اقبال کی نظر میں مسلمان کا وجود خود اُنکی زبان سے سُنئے ؎

وہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز نہیں معلوم وہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

سُبحان اللہ کیا پاکیزہ خیال ہے۔ اور کسقدر دلآویز انداز بیان ہے معلوم ہوتا ہے کہ تابندہ گوہر ہیں جو آنکھوں کو خیرہ کئے دیتے ہیں۔ کاش مسلمان اِن موتیوں کو اپنے کانوں میں ڈال لیں تو تا زندگی وہ ایسا نغمہ سُنتے رہیں گے جس سے وہ تمام عالم کو حقیقی معنی میں دیکھ اور سُن سکیں گے۔

جو لوگ راہ عمل سے بھٹک کر مُلاؤں اور واعظوں کی چکنی چپڑی باتوں میں پھنس کر اپنی زندگی کے قیمتی لمحات برباد کرتے ہیں۔ اقبال کی دردناک آوازیں سُنئے اور قوم کی اس شکستہ حالی پر ماتم کیجئے ؎

تن بہ تقدیر ہے آج اُن کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

اچھا! اب آگے چلیں اور دیکھیں کہ ہمارے دیگر شعرا کیا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ شیخ جب پینے سے گریز کرتا ہے تو سمجھتے ہیں کہ جلسۂ عام اس جام نوازی سے مانع ہے۔ لہٰذا حضرت باسط بسوانی تعریضاً فرماتے ہیں ؎

چھپ چھپ کے مثل زاہد گوشے میں جس نے پی ہو
بے کیف کیوں نہ ساقی پھر اس کی زندگی ہو

شاعر نے جب شیخ کے باطن پر نظر ڈالی تو وہ سمجھ گیا کہ یہ پاکدامنی صرف ظاہری ہے۔ ورنہ اُس کے دل میں بھی رنگینیوں کا طوفان موجیں مار رہا ہے۔ چنانچہ اسی خیال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حضرت ریاض بھی پکار اُٹھے ؎

کس قدر بنا ہوا ہے زاہد
جیسے اُس نے یہ چیز پی ہی نہیں

اکبر بھی ہمنوائی میں شریک ہیں ؎

خلاف شرع مرا شیخ تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اُجالے یہ چوکتا بھی نہیں

حضرت ریاض نے اپنے قیافے کو کامل الیقینی کی حد کو پہنچا دیا ہے معلوم ہوتا ہے گویا جناب شیخ محفل رنداں میں شاعر کے ہمراہ موجود تھے۔ یا پھر شاعر نے کہیں ان کو گوشے میں چھپکے پیتے دیکھ لیا ہے۔ بہرحال صورت جو کچھ بھی ہو۔ ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ شیخ صرف ظاہر داری سے کام لے رہا ہے۔ ریاض صاحب کے اسلوب بیان کی داد دینا گویا چاند کے رُو برُو نور افشانی کا معمہ حل کرنا اور گلزار میں پھول لے جانا ہے۔

۵۔ شیخ فانی کو ترغیبات مجاز

جب دیکھتے ہیں کہ شیخ فانی کسی طرح بھی جام، صراحی اور شراب کی طرف راغب نہیں ہوتا (خواہ اس کا یہ فعل صرف ظاہری ہی کیوں نہ ہو) تو پھر ایسے ایسے انوکھے ڈھنگ سے اس کو ترغیب دیتے ہیں کہ بیچارے کے منہ میں پانی بھرے بغیر نہ رہے۔

حسرت موہانی فرماتے ہیں ؎

واعظو منہ میں تمہارے بھی بھر آئے پانی
مئے رنگیں کے جو ساغر کا چھلکنا دیکھو

اسی طرح حضرت ریاض فرماتے ہیں ؎

تجھے جانا بھی جنت میں ہے اے واعظ جواں ہو کر
جو آیا ہے تو دیکھے جا ذرا تاثیر میخانہ

یہ ممکن نہیں کہ حضرت ریاض کے اِن فقروں کو سُنکر سادہ لوح شیخ چٹخارے نہ لے۔ اور زبانِ سائل سے دل ہی دل میں یہ نہ کہنے لگے ؏

مجھ کو ملے تو خوب نہا لوں شراب میں

اسی ذائقہ کا ایک شعر حضرت سائل دہلوی کا ملاحظہ ہو ؎

پی کے دیکھو تو ذرا ساغر صہبائے نشاط
شیخ جی پیری میں بھی اس سے شباب آتا ہے

سُبحان اللہ! "پی کے دیکھو تو" اور وہ بھی کیا "ساغر صہبائے نشاط"۔ حضرت دعا ڈبائیوی شیخ کی کم بیں اور موٹی نظروں کے لئے یہ سُرمہ مُفت نذر کرتے ہیں ؎

اِن مدبھری آنکھوں کی تعریف ہو کیا زاہد
دیکھو تو ہیں دو ساغر سمجھو تو ہیں میخانہ
ایثار محبت کی زندہ نشانی ہے
آنکھوں سے لگا زاہد خاکستر پروانہ

پہلے شعر میں آنکھوں کو ساغر سے تشبیہ دیکر حسن خیال کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ دوسرے شعر کے انداز بیان کی تعریف ناممکن ہے۔ کیسے دلآویز لہجے میں پروانہ کی راکھ آنکھوں سے لگانے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ پروانہ نے اپنی ننھی سی جان کی جو بے مثال قربانی کی ہے۔ اس کو شاعر نے کس قدر محسوس کیا ہے۔ اور اس کے دل میں پروانہ کی کس درجہ عزت اور وقعت قائم ہو گئی۔ اس لئے وہ زاہد سے کہتا ہے کہ تو اسکی خاک کو آنکھوں سے لگا تاکہ تجھے بھی نظر آجائے کہ جلوۂ ایثار اور نور محبت کیا چیز ہے۔ تو اپنے کو خدا کا سچا عاشق بتاتا ہے۔ اور تیری ظاہرداری سے دُنیا بھی یہی سمجھتی ہے کہ تو راہ خدا میں اپنی ہستی کو مٹا رہا ہے۔ دیکھ عشق اس کو کہتے ہیں۔ پروانہ کس طرح محبت کے شعلوں میں جل کر خاک ہو جاتا ہے۔

حضرت عیش کس نئے ڈھنگ سے شیخ کو شراب نوشی کی ترغیب دیتے ہیں ؎

اِک دن ہے لب کوثر جانا کام آئیگا مرا سمجھانا
چل محفل ساقی میں واعظ آجائیگا ساغر چھلکانا

سچ کہا ہے۔ پہلے سے مشق ہونا ضروری ہے۔ ورنہ عین موقع پر ہات پیر پھول جانے کا ڈر ہے۔

آخر کار ناسمجھ شیخ شاعر کی ترغیباتِ مجاز میں آ ہی گیا۔ کیونکہ شاہد علی فانی فرماتے ہیں ؎

نوجواں ہونے کی بھی حرص بُری ہوتی ہے
وہ چلے شیخ عصا ٹیکتے میخانہ کو

۶۔ شیخ اور بُت پرستی

اصنام پرستی شیخ کا شعار نہیں۔ پھر بھی دیکھئے ہمارے شعراء نے کیسے کیسے گُل کھلائے ہیں۔

حسن فرماتے ہیں ؎

دیکھا اُس بُت کو جو زاہد نے تو یہ حال ہوا
پھینکا عمامہ کہیں سبحۂ صد دانہ کہیں

جو جی میں آئے کہے جایئے۔ مگر اس بیچارے کا تو بقول طالب آملی اب یہ حال ہے ؎

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی
دہن بر چہرہ زخمے بود و بہ شد

اسی قبیل کا ایک شعر شیفتہ کا سنئے ؎

وہ شیفتہ کہ دُھوم تھی حضرت کے زہد کی
مت پوچھئے کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

اس موقع پر حافظ کا ایک شعر زبان پر آگیا ہے۔ ہر چند کہ یہ مضمون فاسق سے متعلق نہیں لیکن کیا کروں لکھے بغیر نہیں رہا جاتا ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

اس شعر میں حافظ نے بلا کسی رُو و رعایت کے حضرت شیخ کی اپنی پرائیویٹ زندگی کو عریاں کر دکھایا ہے۔

حضرت جوش ملیح آبادی نے بھی شیخ کی زندگی کے اس رنگین پہلو کو (جس کو وہ عام نظروں سے چھپائے ہوتا ہے) روشنی میں لانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اس وقت اُن کی ایک حد درجہ دلچسپ نظم "فتنۂ خانقاہ" میرے دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔ نظم بہت طویل ہے اس لئے صرف چند اقتباسات درج کرتی ہوں ؎

اِک دن جو بہرِ فاتحہ اک بنتِ مہر و ماہ   پہنچی نظر جھکائے ہوئے سوئے خانقاہ
زُہاد[1] نے اُٹھائی جھجکتے ہوئے نگاہ   ہونٹوں میں دب کے ٹوٹ گئی ضربِ لا الٰہ
برپا ضمیرِ زہد میں کہرام ہو گیا
ایماں دلوں میں لرزہ بر اندام ہو گیا

یوں آئی ہر نگاہ سے آوازِ الاماں   جیسے کوئی پہاڑ پہ ندی میں دے اذاں
دھڑکے دل کہ رُوح سے اٹھنے لگا دھواں   ہلنے لگیں شیوخ کے سینوں پہ داڑھیاں
پرتو فگن جو جلوۂ جانانہ ہو گیا
ہر مرغِ خلد حسن کا پروانہ ہو گیا

حُسن حقیقی کو حُسن مجازی کے سامنے فراموش کر دینا یقیناً بُت پرستی ہے۔

آگے چل کر حضرت جوش نے اس بنتِ مہر و ماہ کی چال ڈھال اور حُسن و جمال کا بہترین نقشہ کھینچا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے لیکن یہاں ہم کو تو صرف اتنا دیکھنا ہے کہ حُسن مجاز شیخ کے دل پر کیا اثر کرتا ہے۔ یہ خود حضرت جوش کی زبان سے سنئے ؎

ہر چہرہ شیخ اُٹھا کہ ترے ساتھ جائینگے   اے حُسن تیری راہ میں دھونی رمائینگے
اب اس جگہ سے اپنا مصلّے اُٹھائینگے   قربان گاہِ کفر پہ ایماں چڑھائینگے
کھاتے رہے فریب بہت خانقاہ میں
اب سجدہ ریز ہونگے تری بارگاہ میں

اسی نظم کا آخری بند اور ملاحظہ فرمایئے۔ جو شیخ کی اصنام پرستی کی اچھی طرح قلعی کھولتا ہے ؎

زاہد حدودِ عشقِ خدا سے نکل گئے   انسان کا جمال جو دیکھا پگھل گئے
ٹھنڈے تھے لاکھ حسن کی گرمی سے جل گئے   کرنیں پڑیں تو برف کے تودے پگھل گئے
القصّہ دین کفر کا دیوانہ ہو گیا
کعبہ ذرا سی دیر میں بُت خانہ ہو گیا

۷۔ شیخ اور پند و نصائح

خواہ شیخ کی زندگی کیسی ہی رنگین کیوں نہ ہو لیکن جب وہ ظاہرداری میں ایک اعلیٰ زندگی کا نمونہ پیش کرتا ہے تو پھر ضرور دوسروں کو پند و نصیحت بھی کرتا ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ ہم کو یہ بھی دیکھنا ہے کہ بیچارے کی محنت کچھ کارگر بھی ہوتی ہے یا صرف "بھینس کے آگے بین بجانے" کی مصداق ہے۔

حضرتِ اکبر کے الفاظ میں شیخ ناصح کی تعریف یہ ٹھہرتی ہے ؎

شیخ بھی کم نہیں ہے انجن سے
اس میں بک بک ہے اس میں بھک بھک

کسی منچلے نے بھی خوب کہا ہے ؎

اپنے بھی دن تو یاد کرو شیخ جی ذرا
کیا کیا مزے اُڑائے ہیں عہدِ شباب میں

شعر کا ایک ایک حرف صداقت پر مبنی ہے۔ حقیقتاً ایسے شخص کی پند و نصائح کا کیا اثر ہو سکتا ہے جو سراپا "سو سو چوہے کھا کے بلّی حج کو چلی" کی صحیح مصداق ہو۔

میر فرماتے ہیں ؎

واعظِ ناکس کی باتوں پر کوئی جاتا ہے میر
آؤ میخانہ چلیں تم کس کے کہنے پڑ گئے

[1] مُراد شیخ سے۔ (صدیقہ سیوہاروی)

بیچارے واعظ کی ساری محنت اِن دو مصرعوں نے خاک میں ملا دی۔ خیر میر صاحب نے تو یہیں تک نوبت پہنچائی۔ اُستاد ذوق تو لگے اُلٹی دلیلیں چھانٹنے ؎

زاہد شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں؟
کیا ڈیڑھ چلو پانی میں ایمان بہہ گیا؟

سچ ہے۔ ایمان نہ ہوا گویا پھونس کا تنکا ہو گیا۔ جو پانی میں بہہ جائے اور وہ بھی صرف ڈیڑھ چلو پانی۔ اگر زاہد کافر بتائے تو یہ اسکی بھول ہے۔
علامہ اقبال نے تو اُستاد ذوق سے بھی نمبر بڑھا دیا ہے، فرماتے ہیں ؎

زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر
یا وہ جگہ بتا دے جہاں پر خدا نہ ہو

اِس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ دیر ہو یا حرم خدا ہر جگہ موجود ہے۔ پھر اگر زاہد مسجد میں شراب پینے سے روکتا ہے اور سمجھتا ہے کہ مسجد میں خدا ہے تو پھر کیوں نہیں ایسی جگہ بتا دیتا جہاں پر خدا نہ ہو۔
علامہ اقبال، میر اور ذوق تو صرف زبانی جمع خرچ کرتے رہے لیکن حضرت ریاض نے تو الفاظ کو عملی جامہ پہنا کر دکھا دیا ؎

ہم نے جی کھول کے پی بیٹھ کے مسجد میں شراب
واعظِ خشک بچاتا رہا دامن اپنا

واللہ! کیا خوب کام کیا۔ واعظ بھی داد دیئے بغیر نہ رہا ہو گا۔
بیچارے شیخ کی پند و نصائح نے کیا خوب اثر کیا! فاق فرماتے ہیں ؎

وہاں محتسب سر پٹکتا رہا
یہاں خوب نالوں میں ڈھلتی رہی

ولایت گورکھپوری ؎

کبھی شیخ حرم سے اسکی میں تعبیر پوچھونگا
کہ آتی ہے نظر کیوں خواب میں تصویرِ میخانہ

یہ شعر ظرافت کا بہترین مرقع ہے شیخ جو میخانہ کا نام تک سننا گوارا نہ کرتا ہو، وہی اسکی تعبیر بتلائے۔
ملاحظہ ہو ایک تو بیچارے کی نصیحتوں پر عمل کرنے سے گئے۔ پھر اوپر سے اس کو کیسے کیسے سبز باغ دکھاتے ہیں۔

درد ؎

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو — دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

خواجہ آتش ؎

مجھے اے شیخ کیا نارِ جہنم سے ڈراتا ہے
سمندر موج مارے گر نچوڑوں پاٹ دامن کا

ہر چند اس شعر میں مبالغہ و غلو پایا جاتا ہے۔ تاہم شاعر نے اپنے خیال کو خوب ادا کیا ہے۔ مُراد یہ ہے کہ ہماری تر دامنی (معصیت) تیرے زہد سے بالاتر ہے۔

۸۔ شیخ کا خدّ و خال اور لباس

غرض ۔۔۔ ع لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

اب ایک بار شیخ کے خدّ و خال اور لباس پر نظر ڈال جائیے اور ہمیشہ کے لئے سمجھ جائیے کہ وہ اپنی وضع و قطع، چال ڈھال، طور و طریق اور لباس وغیرہ میں کیسی اعلیٰ اور کیسی ادنیٰ تصویر ہے۔ اگر یہ مقدس ہستی شعرا کی ضیافت طبع کا سامان نہ فراہم کرتی تو شاید ان کی شاعری ہی "زاہد خشک" بنکر رہ جاتی۔
انشاء ۔۔۔ شیخ کے سر، مُنہ اور گردن کا بیک وقت نقشہ کھینچتے ہیں ؎

آئینہ کی گر سیر کرے شیخ تو دیکھے
سر خرس کا مُنہ خوک کا لنگور کی گردن

یا بالفاظ دیگر ؎

سفرہ پہ ظرافت کے ذرا شیخ کو دیکھو
سر نون کا مُنہ پیاز کا اچور کی گردن

اُستاد ناسخ شیخ کی پگڑی پر یوں پھبتی کستے ہیں ؎

دیکھو ناسخ سرِ شیخ معمم کی طرف
کیا کلس مسواک کا ہے گنبدِ دستار پر

ادھر دیکھئے اُستاد ذوق بیچارے کی نورانی ریش کی کیا مٹی پلید کرتے ہیں ؎

ریشِ سفید شیخ میں ہے ظلمتِ فریب
اس مکر چاندنی پہ نہ کرنا گمانِ صبح

ذوق ایک شعر اور ملاحظہ فرمائیے ؎

باقی ہے شیخ کو ابھی حسرت گناہ کی
کالا کرے گا مُنہ بھی جو داڑھی سیاہ کی

امیر مینائی شیخ کے گیسوؤں پر یوں حملہ آور ہوتے ہیں ؎

پیری میں ایسے زاہد نہیں یہ ترے گیسوئے سفید
ہیں دوش پر یہ دو کفن ایک اسطرف ایک اسطرف

انشاء ؎

کیوں نہ لڑکے سب کہیں تم کو اتمہیں اے شیخ جی — ہے جھوجی کی سی صورت یہ ڈرانی آپ کی
گول پگڑی نیلی لنگی مونچھ منڈی تکیہ ریش — پھر وہ رنگلی اور وہ آنکھوں تا س دانی آپ کی

ذوقؔ آلہ آبادی ؎

نہیں شیخ صاحب کے تن میں یہ رعشہ
گناہوں کے ڈر سے یہ تھرا رہے ہیں

ہمارے شعراء نے شیخ کے ہر ہر پہلو پر نظر ڈالی ہے۔ خود تو جو کچھ کہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ لیکن شیخ کو شیخانی کے مُنہ سے بھی وہ کچھ کہلوا چھوڑا کہ شیطان کانوں میں انگلیاں دے کر بھاگ جائے۔

اکبر آلہ آبادی ؎

بی شیخانی بھی ہیں بڑی پُر جوش
کہتی ہیں شیخ سے بجوش وخروش
خواہ لنگی ہو، خواہ ہو تہمد
در عمل کوش وہر چہ خواہی پوش

اُردو شاعری میں یہ ہے جنابِ شیخ کی حقیقت، مگر میں تو یہی کہوں گی ؎

پیارا ہے ہم کو شیخ ہمارا بُرا سہی
چاقو ولائتی نہیں دیسی چھُرا سہی

اکبرؔ

عزمِ سفر

از:۔ حضرت نفیسؔ سندیلوی

کیوں بال پریشاں کیے جاتے ہو کدھر آج
کیا کر گیا دشمن کوئی دنیا سے سفر آج

کل آئیں گے پُرسش کو یہ آئی ہے خبر آج
مَرنا ہے مگر اے دلِ بیمار نہ مَر آج

دُنیا ہی سے قاصد کا ہے کیا عزمِ سفر آج
کمبخت نے پھر کھول کے باندھی ہے کمر آج

جانے کو ہیں گھر سے وہ مرے غیر کے گھر آج
ہے حشر کا دن آج قیامت کی سحر آج

کیا ضعف کی یہ منزلِ آخر تو نہیں ہے
گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے مرا دردِ جگر آج

صبحِ شبِ ہجراں کو ذرا دیکھ لوں میں بھی
تو عمرِ رواں روکے سے رُک جائے اگر آج

کل تک تو ہمیں ضعف سے ہلنا بھی تھا دشوار
اُٹھ اُٹھ کے بٹھاتا ہے مرا دردِ جگر آج

تکلیفِ عیادت نہ کر اے محوِ تغافل
بیمار سدھارا ترا اللہ کے گھر آج

تاثیر نفیسؔ آپ نے اس ضبط کی دیکھی!
اشکوں کی جگہ آنے لگا خونِ جگر آج

روحِ عمل

جرأتِ عزم بڑھا خواہشِ انعام نہ کر

از حضرت طالب باغپتی

فکرِ فردا ہے عبث صبح کو یوں شام نہ کر / کام کرنا ہے تو اندیشۂ انجام نہ کر

پائے ہمت کو بڑھا وقت کی رفتار کے ساتھ / سر جھکا کر گلۂ گردشِ ایام نہ کر

حسنِ آہنگ سے کر روحِ عمل کو بیدار / ذوقِ تدبیر کو وابستۂ اوہام نہ کر

کامیابی تری تدبیر سے ممکن ہے اگر / اپنی ناکامی پہ تقدیر کو بدنام نہ کر

دے زمانے کو کوئی زیست کا اپنی بھی ثبوت / خالقِ زیست کے اثبات میں ابہام نہ کر

تو کہاں زاہدِ مرتاض کہاں حور و قصور / چند سجدوں کے عوض یہ ہوسِ خام نہ کر

حکمتِ رومی و رازی کو سمجھ کر بے لطف / ناسمجھ مسلکِ خیام کو بدنام نہ کر

"عیشِ حاضر" "غمِ فردا" کا تقابل تو نہیں / جاودانی ہو اگر مرگ تو آرام نہ کر

طالب لطف و کرم چھوڑ یہ دریوزہ گری
جرأتِ عزم بڑھا خواہشِ انعام نہ کر

بارش کا چھینٹا

افسانہ

از جناب ممتاز حسین بسمل منشی فاضل ادیب فاضل

اکتوبر کے دِن تھے۔ آسمان بالکل صاف تھا بمبئی کے خوبصورت مکان دُھوپ میں چمک رہے تھے۔ ایک آن میں آسمان پر ایک ننھا منا بادل ظاہر ہوا۔ برسا اور کھُل گیا بمبئی کے مصروف باشندے اپنے کاروبار میں مصروف تھے اُن میں سے اکثر بھیگ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد حسبِ معمول سورج چمک رہا تھا البتہ سڑکوں اور دیواروں پر تھوڑی سی نمی بارش کے ایک چھینٹے کی کہانی سنا رہی تھی

ایک آدھ گھنٹے کے بعد بارش ماضی کی بھولی بسری کہانی بن گئی مگر اس حقیر بوندا باندی نے دو دھڑکتے ہوئے دِلوں کو ہم آغوش کرکے کامرانی کی دولت سے مالامال کر دیا۔

دُنیا میں ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔ ایک آدمی سڑک پر چلتے چلتے ایک اشتہار پڑھنے کے لئے رُک جاتا ہے اور اس مختصر وقفہ میں اُس کی زندگی تبدیل ہو جاتی ہے، ایک مُسافر ایک چوراہے میں راستہ بھول کر مشرق کی بجائے جنوب کی طرف مُڑ جاتا ہے اور یہ حقیر غلطی اُسے گمنامی کی تاریکی سے نکال کر شہرت اور عزت کے اُجالے میں لے جاتی ہے اسی طرح بارش کے ایک چھینٹے سے پروین اور بہرام کو دن رات کی پریشانی سے نجات دی۔ دو ہفتوں سے ایک دوسرے کے متعلق غلط فہمی میں مُبتلا تھے اُن کی زندگی سسکیوں اور ہچکیوں کی آئینہ دار تھی۔ بادل برسا اور کھُل گیا اور اُس کے ساتھ ہی اُن دونوں کی دُنیا جو غم کی آندھی اور ناکامی کی گھٹاؤں سے ملگجی تھی مہر و محبت کے آفتاب کی کرنوں سے منور ہو گئی۔

اُس روز پہلی بار اُنہیں معلوم ہوا کہ ایک نوجوان لڑکی اور ایک نوجوان لڑکا ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔

شہروں کی گنجان آبادی میں آدمی کی اصلیت کو پہچاننا بہت مشکل ہے اکثر اوقات ایک قیمتی اچکن کے نیچے ایک پھٹی پُرانی میلی کچیلی قمیض پوشیدہ ہوتی ہے۔ چمکیلے جوتوں میں ایسی جرابیں چھپی ہوتی ہیں۔ جن میں عاشق کے دل کی مانند سینکڑوں سُوراخ ہوں۔ شہر کے بانکے جوان شام کو بن ٹھن کر نکلتے ہیں اور اُن میں سے کئی رات کو بھوکے رہتے ہیں۔ پچھلے دنوں فرسٹ کلاس میں سفر کرتا ہوا ایک یورپ زدہ نوجوان پکڑا گیا۔ اُس نے انگریزی لباس پہن رکھا تھا۔ ایک پیسہ اور تار کا ایک سگرٹ اُس کی جیب سے برآمد ہوا ایسے واقعات ہماری روزانہ زندگی کا جزو ہیں۔ اُنہیں تفصیل سے بیان کرنے کی کیا ضرورت ؟ البتہ پروین اور بہرام کے متعلق بتانا ہے۔

پروین ایک پارسی خاندان سے تعلق رکھتی تھی اُسکی ماں بمبئی کے پاس لبِ ساحل ایک گاؤں میں رہتی تھی۔ اُس کا باپ جمشید ایک تاجر کا ملازم تھا۔ ایک بار کاروبار کے سلسلے میں اُس گاؤں میں گیا اور جب واپس لوٹا تو اُس کی زندگی کی کتاب میں شادی کا باب درج ہو چکا تھا۔

جمشید کی آمدنی قلیل تھی مگر اُس نے اپنے بچوں کی تعلیم پر بے دریغ روپیہ صرف کیا۔ پروین نے میٹرک کا امتحان فسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ زمانۂ تعلیم میں وہ اپنی کلاس کی زینت تھی سُرخ اور سپید رنگت سیاہ اور بل کھائے ہوئے گیسو بڑی بڑی مخمور آنکھیں۔ اُسکی اُستانیاں اور سہیلیاں اُس کی ذات پر فخر کرتیں۔ پروین چاہتی تھی کہ پڑھ لکھ کر باپ کا ہاتھ بٹائے مگر امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اُسے پہلی بار اس تمدن کی تلخی کا احساس ہوا جسکی بنیاد سرمایہ داری پر رکھی گئی ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ اُمرا کے بچوں کو تعلیم دیکر اپنا پیٹ پال لے گی۔ مگر سرمایہ دار تاجر اُسکی من موہنی صُورت دیکھ کر لٹو ہو جاتے اور سونے چاندی کی چند ٹکیوں کے عوض اُسکی عزت کے درپے ہوتے۔

چھ سات مہینوں کی دوڑ دھوپ کے بعد پروین نے یہ خیال چھوڑ دیا اور مستقل ملازمت کا خیال اُس کے دل میں چٹکیاں لینے لگا۔ اُسکی ایک سہیلی ایک فلم کمپنی میں ملازم تھی اُسکی سفارش سے اُسے تھوڑا سا کام مل گیا۔

جب جمشید کو اسکی اطلاع ملی تو اُس نے نفرت کا اظہار کیا۔ مگر پروین دُھن کی پکی تھی اُس نے فلم میں کام کیا اور ایک سو بیس روپے معاوضہ ملا۔ ایک سو بیس روپے کا چیک دیکھ کر جمشید کی آنکھیں چمک اُٹھیں بڑھتے ہوئے اخراجات اور قلیل آمدنی کو دیکھ کر اُس نے یہ رقم غنیمت سمجھی۔ پروین چاہتی تھی کہ اُس فلم کمپنی میں اُسے مستقل آسامی مل جائے۔ مگر اس مقصد کیلئے مالک کی خوشنودی ضروری تھی۔ چونکہ وہ مالک کو خوش نہ کرسکی اس لئے اُسے جواب مل گیا۔

جب فلم کی نمائش کی گئی تو عوام نے پروین کا مختصر کام بہت پسند کیا اور پردۂ فلم پر اُس کی خوبصورتی اور معصومیت نے لاکھوں دلوں کو دردِ محبت سے آسودہ کر دیا۔

ظہیر نگر کا سیٹھ جسمانی خصوصیت سے متاثر ہوا۔ وہ پروین کی تلاش میں بمبئی پہنچا۔ وہاں ایک خوبصورت بنگلہ کرایہ پر لیا اور فلم کمپنی کے مالک سے

مِل کر پروین کے گھر کا پتہ معلوم کیا۔ دُوسرے دن نو بجے کے قریب ایک خوبصورت کار رُکی۔ ایک خوش پوش خادم نے دروازہ کھولا اور ادب سے ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ سیٹھ چمنائی قیمتی سُوٹ پہنے بنا سنورا کار سے اُترا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ جمشید نے کھڑکی سے دیکھا اور گھبرا کر دروازے کی طرف دوڑا۔

"مَیں آپ سے ملنے آیا ہوں"۔ چمنائی نے کہا۔

"حکم"۔ جمشید نے سینہ پر ہاتھ باندھتے ہوئے جواب دیا۔

"مَیں کل اپنے خاندانی کاغذات دیکھ رہا تھا۔ آپ کے والد نے ایک بار میرے والد کو مُصیبت سے بچایا تھا۔ مَیں نے سوچا کہ آپ سے تعارف پیدا کرُوں"۔

"شکریہ شکریہ"۔ جمشید نے جذبات کی شدت سے کانپتے ہوئے کہا۔

سیٹھ نے نوکر کو اشارہ کیا وہ کار سے ایک بڑا پارسل اُٹھا لایا۔

"ایک معمولی سا تحفہ نذر کرنے کیلئے لایا ہوں"۔ سیٹھ نے کہا۔ "اور بمبئی میں میرا پتہ یہ ہے"۔ اُس نے ایک خوبصورت سنہری کارڈ جمشید کی طرف بڑھایا۔

پروین کھڑکی سے دیکھ رہی تھی سیٹھ کی عُمر پچاس برس کے قریب تھی۔ رنگ سانولا۔ چہرہ بدنما۔ دانت لمبے اور گھناؤنے۔ آنکھیں چھوٹی اور چندھیائی ہوئی مگر دولت کی فراوانی تھی۔ سونے کی گھڑی اور جواہرات کی انگوٹھیاں تکمہ اتھیں۔

جمشید نے جواب دینے کی کوشش کی مگر جذبات کی شدت سے الفاظ اُس کے گلے میں پھنس گئے۔ اُس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے سیٹھ صاحب کو ایک نظر دیکھا اور پارسل لے لیا۔ سیٹھ کار میں جا بیٹھا اور ایک منٹ کے بعد نظروں سے غائب ہو گیا۔

جمشید نے پارسل کھولا۔ مٹھائی کے ڈبے۔ ریشمی رومال جُرابیں وغیرہ اسی قسم کی چیزیں تھیں۔

دوسرے دن سیٹھ کا مُلازم جمشید کو بُلانے آیا اور تیسرے چمنائی جمشید کے ہاں چلا آیا۔ اسی طرح چند روز میں بے تکلفی پیدا ہو گئی۔ جمشید چمنائی کا کلمہ پڑھنے لگا۔ ایک ہفتہ گزر گیا چمنائی اور جمشید سیٹھ کے بنگلے میں کرُسیاں بچھائے بیٹھے تھے۔ چمنائی حرفِ مطلب زبان پر لایا اور جمشید کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ وہ پروین کی فطرت سے آشنا تھا مگر سیٹھ کی بیشمار دولت سے مُنہ موڑنا اُس کے بس میں نہ تھا۔ ایک جانب سونے چاندی کے انبار دیکھ کر اُس کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ اور دُوسری جانب پروین کی خودسر اور بے باک طبیعت نے خدشہ پیدا کر دیا۔

اُس روز شام کو جمشید نے ڈرتے ڈرتے پروین کو اپنے سامنے بُلایا۔

اِدھر یہ حالات پیدا ہو رہے تھے اُدھر پروین کسی دفتر یا کمپنی میں مُلازمت حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس کا حُسن چاند تاروں کو شرماتا تھا۔ شباب فصلِ بہار سے زیادہ خوشگوار تھا مگر اُس کی نگاہوں میں بیحیائی نہیں تھی۔

اِس لیے سرمایہ داروں نے اُسے مُنہ نہ لگایا۔

وہ صبح سویرے اپنا بہترین لباس نکال کر بڑے اہتمام سے پہنتی اور اپنی اُستانیوں کی دی ہوئی سندیں بغل میں دبا کر دفتروں کا طواف کرتی۔ اُس کے پُرتکلف اور قیمتی لباس کو دیکھ کر کسی کے دِل میں یہ خیال نہیں آتا تھا کہ بیچاری پیٹ پالنے کے لئے ماری ماری پھرتی ہے۔ عوام اُسے دولتمند سمجھتے اور اُس سے ہمکلام ہونے کی جرأت نہ کرتے۔ پروین شام کو ناکام اور تھکن سے چُور واپس لوٹتی۔ اپنے گھر میں پہنچ کر اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ وہ اپنے قیمتی لباس کو اُتار کر احتیاط سے تہ کرتی۔ جُوتا صاف کر کے ڈبّے میں رکھتی اور سرد آہ بھر کر گھر کے کام کاج میں مصرُوف ہو جاتی۔

اُس روز شام کو جب جمشید نے اُسے بُلایا تو پروین بھونچکی رہ گئی۔ وہ بدصُورت اور بوڑھے سیٹھ کو احترام کی نظر سے دیکھتی تھی مگر اُس سے بیاہ کرنا اُسے گوارا نہ تھا۔ سیٹھ کے ہاں دولت تھی۔ نوکر چاکر تھے۔ موٹریں تھیں۔ امارت کے جمگھٹے تھے۔ شان و شوکت کے مظہر تھے۔ مگر موتیوں کی آب سے دل کی پیاس نہیں بجھتی

"مَیں سوچ سمجھ کر جواب دُونگی"۔ اُس نے کہا اور اُلٹے پاؤں واپس چلی آئی۔

اُس رات پروین کو نیند نہ آئی۔ تمام رات پہلو بدل بدل کر گزر گئی۔ اُس نے سمجھ لیا۔ کہ اگر جلد کام نہ مِلا تو سیٹھ کا پلڑا بھاری ہو جائیگا۔ اور اُسے سونے کی چھُری سے ذبح کر دیا جائیگا۔

صُبح سویرے حسبِ معمول اُس نے اپنا قیمتی لباس پہنا اور نوکری کی تلاش میں گھر سے نِکل گئی۔ تھوڑی دُور جا کر اُسے ایک دولتمند سہیلی ملی جو ایک خوبصورت خوش پوش نوجوان کے ہمراہ سمندر کے کنارے چہل قدمی کے بعد واپس آ رہی تھی۔

"مسٹر بہرام اور مس پروین"۔ اُسکی سہیلی میراں نے دونوں کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"آپ سے مِل کر بڑی خوشی ہوئی"۔ بہرام نے جواب دیا۔

تھوڑی دُور تینوں اکٹھے چلتے رہے۔ آخر میراں کا گھر آ گیا اور وہ اُن سے رُخصت ہو کر چلی گئی۔

"آپ کہاں جائیں گی"۔ بہرام نے پُوچھا۔

پروین نے ایک نظر بہرام کے قیمتی سُوٹ کو دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ بہرام کا مردانہ حُسن اُس کے حواس پر چھا رہا تھا۔ اُس خوبصورت امیرزادے کو اپنی منزلِ مقصُود کا پتہ دینا اُسے گوارا نہ ہوا۔

"مَیں صُبح ہوا خوری کے لئے گئی تھی اب گھر جا رہی ہوں"۔ پروین نے جواب دیا۔

"مَیں آپکے ہمراہ چلوں"۔ بہرام نے پروین کو محبت بھری نظروں سے

دیکھتے ہوئے کہا۔

"شکریہ" پروین نے جواب دیا "میں نے ابھی کئی ایک چیزیں خریدنی ہیں"۔

"چائے کا وقت ہے اگر ناگوار نہ ہو تو آئیے یہاں چائے پی لیں"۔ بہرام نے ایک سستے ہوٹل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پروین اِس دعوت کو رد نہ کر سکی۔ دونوں نے مل کر چائے پی۔

"آپ کے والد کیا کام کرتے ہیں"۔ بہرام نے پوچھا۔

"ایک پارسی سوداگر کے مختار ہیں"۔ پروین نے اپنے افلاس کے بھیانک چہرے کو جھوٹ کے خوشنما نقاب میں چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ کیا کام کرتے ہیں ؟" پروین نے پوچھا۔

"میں ڈرامے لکھتا ہوں"۔ بہرام نے مسکرا کر جواب دیا۔

"چائے پی کر اور دوسرے دن پانچ بجے پبلک پارک میں ملنے کا وعدہ کرکے دونوں رخصت ہوئے۔ افلاس اور ناکامی کے خیال سے پروین کا دل بھر آیا۔

"کتنا سندر جوان ہے"۔ اُس نے اپنے دل سے کہا "کسی لکھ پتی کا لاڈلا بیٹا ہے۔ تیاتر سے دلچسپی رکھتا ہے اسی لئے شغل کے طور پر ڈرامے لکھتا ہے مگر مجھے کیا؟ میں ایک غریب گھر میں پیدا ہوئی تھی۔ اگر مجھے دولت کی خواہش تھی تو اپنے آپ کو بیچ کر ملے گی"۔

اُس نے عالمِ خیال میں سیٹھ کے پوپلے منہ کو دیکھا اور اُسکی رگ رگ میں نفرت کی رَو دوڑ گئی۔

"کتنا سندر اور بھولا بھالا ہے میرے ساتھ گھر آنا چاہتا تھا میرا لباس دیکھ کر دھوکے میں آگیا۔ سمجھتا ہوگا۔ کہ کسی امیر کی لڑکی ہے۔ میں اُسے اپنے گھر کیسے لے آتی۔ اِس ٹوٹے پھوٹے اور حقیر مکان کو دیکھ کر وہ مجھ سے نفرت کرنے لگتا"۔

انہی خیالات میں ڈوبی ہوئی وہ اپنے گھر پہنچی۔ اُس کا والد دروازے میں اُس کا انتظار کر رہا تھا۔

"پروین آج ہم سب شام کو سیٹھ صاحب کے ہمراہ سیر کیلئے جا رہے ہیں بڑا لطف آئیگا"۔ اُس نے کہا۔

سورج چھپنے کے بعد چمنائی کار لیکر آیا۔ جمشید، اُسکی بیوی بچے سب سوار ہوگئے۔ تھوڑی دیر کے بعد کار بمبئی کی گنجان آبادی سے نکل کر سنسان سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے روح سے سرگوشیاں کرنے لگے اور رات کی تاریکی کانوں میں بھولی بسری کہانیاں دہرانے لگی۔ دو گھنٹے گزر گئے۔ آخر کار کار سمندر کے کنارے درختوں کے ایک خوبصورت جھنڈ کے قریب رُک گئی۔ آسمان پر لاکھوں ستارے تھے۔ سمندر میں اُن کا عکس کانپ رہا تھا۔ پانی کے قریب دُور تک جگنو اُڑ رہے تھے۔ کار کی بتیوں کے سامنے پتنگے ناچ رہے تھے۔ عجیب نظارہ تھا اور جمشید، اُسکی بیوی اور بچے اِدھر اُدھر کھسک گئے۔ پروین اور سیٹھ تنہا رہ گئے۔

"پروین میری پیاری" سیٹھ نے کہا "تم میرے خوابوں کی ملکہ ہو، میرے دل کی مالک ہو۔ میں تمہارا پجاری ہوں"۔

پروین بالکل خاموش تھی مگر اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

"میں اپنا محبت بھرا دل آپ کی خدمت میں نذر کرتا ہوں"۔ سیٹھ نے دوبارہ کہا۔

پروین نے جواب دینے کا ارادہ کیا، مگر بول نہ سکی۔

سیٹھ نے آگے بڑھکر پروین کو آغوش میں لینے کی کوشش کی مگر وہ تڑپ کر الگ ہوگئی۔

"سیٹھ صاحب میری طبیعت خراب ہے مجھے دق نہ کیجئے"۔ اُس نے کہا۔

چمنائی نے مزید قسمت آزمائی بے سود سمجھی اور آدھ گھنٹہ چہل قدمی کے بعد تمام قافلہ واپس چلا آیا۔

(۲)

بہرام پروین سے الگ ہوکر ایک غلیظ گلی میں داخل ہوا۔ وہاں ایک شکستہ کوٹھڑی میں اُسکی رہائش تھی۔ اُس نے دروازہ کھولا۔ کوٹھڑی میں ایک معمولی سا بستر، ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی، چند کتابیں، لکھنے پڑھنے کا سامان اور لوہے کا ایک چولہا تھا۔ بہرام بے اختیار چارپائی پر گر پڑا۔ وہ پروین کو دل دے چکا تھا مگر جس آدمی کے پاس رات کو کھانے کے لئے کچھ نہ ہو وہ عشق اور وہ بھی امیر لڑکیوں سے عشق کا تصوّر نہیں کرسکتا۔

اُس نے اپنا سوٹ اُتارا۔ احتیاط سے بستر کی چادر کے نیچے رکھدیا۔ پھٹے پُرانے کپڑے پہن لئے اور اپنے ڈرامے کے مسودے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

"کاش اس کا کوئی گاہک مل جائے"۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ "پلاٹ نرالا، دلچسپ مگر قسمت کا کیا علاج۔ میں نے اپنے باپ کا تمام ورثہ ایک سوٹ پر صرف کر ڈالا۔ میرا خیال تھا کہ قیمتی اور بہترین سلا ہوا لباس میری سفارش کریگا مگر افسوس مجھے اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی"۔

اُس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نقدی نکالی۔

"افسوس صرف دو روپے تین آنے باقی ہیں۔ اِس شہر میں کب تک ساتھ رہیں گے"۔

بہرام نے اُٹھکر آٹا گوندھا۔ کوئلے سُلگائے اور روٹی پکانے لگا۔ روٹی پکاتے وقت اُسے پروین کا خیال آیا اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔

"پروین تو کتنی خوبصورت ہے"۔ اُس نے اپنی محبوبہ کو عالمِ تصور میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تیرے گھر میں بیسیوں خادمائیں ہونگی، تو سینکڑوں روپے صرف کر دیتی ہے اور میں روکھے سوکھے ٹکڑے چبا کر گزارا کرتا ہوں"۔

بہرام کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کرنے لگے۔

صبح اُٹھکر اُس نے حجامت بنائی۔ سوٹ پہنا اور ڈرامے کا مسودہ بغل میں دبا کر دھڑکتے ہوئے دل سے ایک فلمساز کمپنی کے دفتر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مالک نے ایک نظر ڈرامہ دیکھا اور پھر اپنی رائے کا اظہار کئے بغیر واپس دے دیا۔

بہرام مایوس ہو کر ایک دوسری جگہ گیا مگر وہاں سے بھی ناکام لوٹا۔

پونے پانچ بجے بہرام پبلک پارک میں پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پروین آتی ہوئی دکھائی دی۔ اُس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ رات کے واقعات نے اُس کے ننھے سے دل کو بہت متاثر کیا تھا۔ دونوں تپاک سے ایک دوسرے سے ملے موسم خوشگوار تھا۔ ہوا میں پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سی تھی۔ دونوں ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ زبانیں گنگ تھیں مگر دماغوں میں خیالات کا ہجوم تھا۔

جمشید پروین کو دولت کی قربانگاہ پر ذبح کرنے کا ارادہ کر چکا تھا، پروین کی نوجوانی اور ناتجربہ کار طبیعت کے لئے ناممکن تھا کہ سیٹھ کی بیشمار دولت موٹروں بنگلوں سے آنکھیں موند لے۔ عین اُس وقت جب وہ اپنے آپ کو بیچنے کے لئے تیار تھی قدرت نے بہرام کو اُس کے راستے میں لا کھڑا کیا۔

"ان دنوں یہ باغیچہ بڑا خوبصورت دکھائی دیتا ہے"۔ بہرام نے بات چیت چھیڑنے کے لئے کہا۔

"ٹھیک ہے"۔ پروین نے جواب دیا۔

"آپ گرمی کا موسم کہاں بسر کرتی ہیں"۔ بہرام نے پوچھا۔

پروین کے لئے یہ سوال بالکل نرالا تھا اُس نے اپنی زندگی میں بمبئی سے باہر قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ یونا مناسب ہوگا یا اوٹاکمنڈ۔ پھر خیال آیا یہ کوئی سوال پوچھ بیٹھے اس لئے جوابدیا۔

"جہاں جی چاہا"۔

اتنے میں شام ہو گئی۔ آسمان شفق سے سرخ ہو گیا۔ پودے اُس کے عکس سے جگمگا اُٹھے۔ بہرام اور پروین اپنی جگہ سے اُٹھے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سڑک کی جانب آئے۔ درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ ایک دوش پر ننھے بچے کشتی لڑ رہے تھے مگر بہرام کسی اور دُنیا میں تھا۔

"فرض کرو کہ میرا ڈرامہ بک جائے"۔ اُس نے سوچا۔ "مجھے کوئی خزانہ بخشنے سے رہا۔ پروین امیر کی بچی ہے میری تمام رقم ایک دن میں صرف کر دے گی، مگر دل کو کیسے سمجھاؤں؟"

جب وہ جدا ہوتے تو پروین نے دوسرے دن ملنے کا اقرار نہ کیا۔ وہ ہر روز اُسی لباس میں بہرام سے کیسے ملتی۔ تین چار روز کے بعد اُسی لباس میں ملاقات کرنا چنداں برا نہ ہوگا۔

پروین گھر پہنچکر ابھی لباس اُتارنے نہ پائی تھی کہ سیٹھ کا نوکر کچھ گلدستے لیکر آیا۔ اُس نے پروین کو ایک لفافہ دیا۔ جب اُس نے کھولا تو دس دس روپے کے پانچ نوٹ اُس میں بند تھے۔

رات کو بدنصیب پروین دیر تک سو نہ سکی۔ اُس کے دل میں قیامت کا درد تھا۔ محبت کی ناکامی پھانس بن کر چبھ رہی تھی۔ بہرام کی پیاری پیاری صورت ایک منٹ کے لئے آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتی تھی۔ روتے روتے اُسکی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اُدھر بہرام اپنی کوٹھڑی میں مدھم لالٹین کے سامنے بیٹھا ہوا کاغذ پر اپنا خون ٹپکا رہا تھا مسودہ پڑھکر اُسکی روح جھوم اُٹھی مگر خودغرض سرمایہ داروں کو رام کرنا اُس کے بس میں نہ تھا۔

دوسرے دن سیٹھ بیوپار کے سلسلے میں دو چار روز کے لئے بمبئی سے چلا گیا۔ اور پروین نے اطمینان کا سانس لیا۔ پانچویں روز وہ بڑے اشتیاق سے بہرام سے ملنے گئی۔ دونوں پبلک پارک میں گھنٹوں باتیں کرتے رہے آنکھیں ایک دوسرے کو محبت کا پیغام دے رہی تھیں دلوں میں محبت کا طوفان انگڑائیاں لے رہا تھا مگر زبان سے کہنے کی ہمت نہیں تھی۔ اُس روز بہرام کی جیب میں چند آنے باقی رہ گئے تھے اس لئے وہ پروین کے چاند سے چہرے کو بڑی حسرت سے تک رہا تھا۔

پروین کا دل بجھا جاتا تھا امراء کے طبقے میں سینکڑوں بدصورت اور بوڑھے اُس کے حسن کے خریدار تھے مگر ایک خوبصورت اور نوجوان امیرزادے کی محبت حاصل کرنا اُس کیلئے بہت دشوار تھا۔ اُسے اپنے مفلس گھرانے اور ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے کا خیال آ رہا تھا۔ آخرکار اُس نے اس کھیل کو ختم کرنیکا تہیہ کر لیا اور بہرام سے رخصت ہو کر گھر چلی گئی۔ وہاں جمشید اُس کا انتظار کر رہا تھا۔

"پروین بچی"! اُس نے کہا۔ "چغتائی آج واپس آ رہا ہے اگر وہ تمہیں سیر کیلئے باہر لے جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ میری بچی اُسے ناراض کرنا مناسب نہیں ہے"۔

پروین خاموش رہی اُس کی پلکیں آنسوؤں سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

شام کے قریب سیٹھ کار لیکر آیا اور پروین کو اپنے ہمراہ لے گیا۔ اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد وہ ایک شاندار ہوٹل میں گئے اور وہاں کھانا کھایا۔ پروین اُس وقت بہرام کو بھلا دینے اور چغتائی سے شادی کر لینے کا ارادہ کر چکی تھی۔ کھانا کھا کر دونوں ہوا کھانے کے لئے شہر سے باہر نکل گئے۔ اُفق پر آندھی کے آثار ظاہر تھے اس لئے سیٹھ نے شہر کا رُخ کیا اور تھوڑی دیر میں ایک خوبصورت بنگلے میں پہنچ گیا۔ تمام کمرے آراستہ اور بجلی کی روشنی میں جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔

"پروین میری پیاری" چغتائی نے کہا۔ "یہ سب کچھ آپ کا ہے"۔

پروین ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ چمنائی اُس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

"شادی کے بعد ہم اسی جگہ رہیں گے یا ظہیر نگر چلے جائیں گے" پروین نے پُوچھا۔

"شادی ۔۔ میری پیاری بھلا شادی کی کیا ضرورت ہے" چمنائی نے جواب دیا "میں تمہارے لئے دُنیا بھر کی نعمتیں مہیا کرونگا۔ میں بیوپار کے سلسلہ میں اکثر یہاں آیا کرتا ہوں۔ ہم اس بنگلہ میں عیش کیا کریں گے۔ شادی کی بھلا ضرورت کیا ہے؟ میں تمہیں جواہرات سے لاد دوں گا۔ تمہارا گھر سونے سے بھر دونگا۔ بنک میں ہزاروں روپے تمہارے نام سے جمع ہونگے"۔

چمنائی نے پروین کو آغوش میں لینے کی کوشش کی مگر وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"خبردار میرے جسم کو ہاتھ نہ لگانا" وہ غصہ سے بید کی طرح لرز رہی تھی۔

"پروین تم کس خیال میں ہو" سیٹھ نے کہا "تمہارے باپ نے مجھ سے پانچ سو روپے لئے ہیں۔ اگر تم میرا کہنا نہ مانو گی تو میں اُس پر نالش کر دونگا اور اُسے قید خانہ میں ٹھونس دونگا"۔

"دیکھا جائیگا" پروین نے غضبناک ہو کر جواب دیا اور وہاں سے چلی آئی۔

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے ہوا تیز چل رہی تھی مگر غصہ کی وجہ سے پروین میں غیر معمولی قوت پیدا ہو گئی تھی، وہ تیز چلتی ہوئی پندرہ بیس منٹ میں گھر پہنچ گئی۔ راستے میں وہ بہرام کے متعلق سوچتی رہی۔

"وہ امیر زادہ ہے" اُس نے سوچا "میں اپنی بپتا کہہ سناؤنگی۔ وہ میری مدد کریگا"۔

جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو سب سو چکے تھے۔ اُس کے والد نے دروازہ کھولا۔

"سیٹھ صاحب کب تشریف لائیں گے" اُس نے پوچھا۔

پروین دُوسرے دن بہرام سے ملنے کے متعلق طے کر چکی تھی، بے خودی میں اُس کی زبان سے نکل گیا۔

"کل ۔۔۔ کل"۔

(۳)

بہرام نے پانچ بجے پروین سے ملنے کا اقرار کیا تھا صبح کی ڈاک میں اُسے ایک مشہور فلمساز کمپنی کے مالک کاوس جی کا خط ملا جس میں اُس کے ڈرامے کی خرید کا ذکر تھا اور ساڑھے چار بجے ملنے کے لئے بُلایا تھا۔

بہرام تمام دن بیقرار رہا۔ وہ چاہتا کہ پروین کو اطلاع دی جائے تاکہ وہ اُسے وقت پر غیر موجود پاکر حیران نہ ہو۔ مگر اُسے پروین کے گھر کا پتہ نہ تھا اِس لئے مجبور تھا۔ ساڑھے چار بجے وہ کاوس جی سے ملنے گیا۔ وہاں جا کر اُسے پہلی بار اُسے حوصلہ افزا کلمات سُننے کا اتفاق ہوا۔ کاوس جی نے ہزار روپے میں اُس کا ڈرامہ خرید لیا اور پانچ سو ماہوار کے عوض اُس کی خدمات مستقل طور پر حاصل کرلیں۔

سوا پانچ بجے بہرام کاوس جی کے دفتر سے نکلا۔ اُس کا دِل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پر لگا کر پروین کے پاس پہنچ جائے مگر عین اُس وقت آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا ظاہر ہوا۔ برسا اور کھل گیا۔ بہرام کے کپڑے بھیگ گئے حُلیہ بدل گیا۔ وہ نوجوان تھا۔ دانا تھا۔ اُس لباس اور صورت میں اُسے اپنی محبوبہ کے سامنے جانا گوارا نہ تھا۔ پہننے کا صرف وہی ایک جوڑا تھا۔ اِس لئے وہ ایک بنچ پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ اُسکی جیب میں ہزار روپے کا چیک تھا مگر اُس وقت نہ روپیہ مل سکتا تھا اور نہ کپڑے، آخر کار اُس نے چُپ چاپ پروین کا تعاقب کرنیکا فیصلہ کیا۔ تاکہ اُس کا گھر دیکھ لے اور بعد میں معذرت کے لئے حاضر ہوجائے۔

(۴)

پروین پانچ بجے کے قریب پبلک پارک میں پہنچ گئی۔ بہرام موجود نہیں تھا۔ اُس کا دِل تیزی سے دھڑکنے لگا روح آنکھوں میں کھنچ آئی۔ ہر آہٹ پر وہ چونک پڑتی مگر بہرام نہ آیا۔ اُس نے اپنی بدبختی پر آنسو بہائے۔ وہ دِل میں ہزار اُمیدیں لیکر وہاں آئی تھی مگر بدقسمتی نے اُس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اپنے باپ کو قید کی ذلت سے چھڑانے کے لئے اُسے چمنائی کی آغوش آباد کرنی پڑیگی۔ اپنی عزت بیچنی پڑے گی ۔۔ اُس کا دل بھر آیا۔ ہونٹ تھرانے لگے۔ اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔

چھ بجے کے قریب وہ دل میں اپنی بدقسمتی پر آنسو بہاتی ہوئی اُٹھی اور گھر کی جانب روانہ ہوئی۔ بہرام اُس کا تعاقب کر رہا تھا چلتے چلتے وہ چمنائی کے بنگلے کے سامنے رُک گئی۔ اُس نے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرلیا تھا اِس لئے بلا جھجکے چُپ چاپ بنگلہ میں داخل ہوگئی۔ سامنے برآمدہ میں چمنائی کھڑا تھا اور اُس کے ہونٹوں پر فاتحانہ تبسّم کھیل رہا تھا۔

بہرام پھاٹک کے قریب رُک گیا اور مُلازم سے دریافت کیا۔

"کیا پروین اسی جگہ رہتی ہے؟"

"میں نے اُسے آج پہلی بار دیکھا ہے" مُلازم نے جواب دیا۔

"یہ صاحب کون ہیں؟" بہرام نے سیٹھ کے متعلق پُوچھا۔

"سیٹھ چمنائی" مُلازم نے جواب دیا۔

"یہ بنگلہ اُنہیں کا ہے" بہرام نے پُوچھا۔

"یہ بنگلہ رنگین تیتریوں کو پھانسنے کیلئے ایک جال ہے۔ میرا خیال ہے کہ سیٹھ صاحب نے آج ایک نیا شکار مارا ہے۔"

بہرام کا کلیجہ دھک سے رہ گیا اور آنکھوں سے وحشت ٹپکنے لگی۔

اتنے میں پروین دروازے کے قریب پہنچ چکی تھی۔

"تم نے اچھا کیا کہ میرے پاس آ گئیں ورنہ کل تمہارا باپ حوالات میں ہوتا۔" چمنائی نے کہا اور اُسے آغوش میں لینے کے لئے لپکا۔

جب وہ پروین کے قریب آیا تو اُس کے مُنہ سے شراب کی بُو آ رہی تھی۔ پروین چیخ کر پیچھے ہٹ گئی۔ بہرام کھڑا یہ نظارہ دیکھ رہا تھا۔ پروین کو چیختے دیکھ کر اُسے صبر کا یارا نہ رہا۔ نوکر نے روکنے کی ہزار کوشش کی مگر عشق کا بھوت سر پر سوار تھا وہ اُسے ایک جانب گرا کر اور گھونسا تان کر چمنائی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

سیٹھ بھونچکا رہ گیا۔ بہرام کو دیکھ کر پروین کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"اگر قدم آگے بڑھایا۔ تو سر توڑ دونگا۔" بہرام نے ہانپتے ہوئے کہا۔

سیٹھ بُڈھا تھا زور کے بجائے زر پر بھروسہ رکھتا تھا۔ اس لئے اُس نے میدان چھوڑ دیا اور بہرام پروین کے ہمراہ کوٹھی سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد دونوں باغ میں پھولوں کے ایک کنج میں بیٹھے تھے اور پروین اپنی رام کہانی سُنا رہی تھی۔ سُورج غروب ہو گیا۔ ستارے جھلملانے لگے مگر اُن کی محویت میں فرق نہ آیا۔

"آپ کہاں رہے؟" پروین نے اپنی داستان ختم کرتے ہوئے کہا۔

"میری جان" بہرام نے جواب دیا۔ "میں آج بارش میں بھیگ گیا تھا۔ میرے پاس اِن کپڑوں کے سوا اور کپڑے نہیں تھے جنہیں بدل کر یہاں آتا۔"

اُس کے بعد بہرام نے اپنی کہانی سُنائی۔ دونوں پر ایک دُوسرے کی محبت اور حقیقت کھُل گئی۔ تاروں کی چھاؤں اور خوبصورت پھولوں کی محفل میں بیٹھ کر اُنہوں نے پیمانِ محبت باندھا۔

"لوگ کہتے ہیں بارش نہیں تھی۔ تھوڑی سی بوندا باندی ہوئی۔" بہرام نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مگر ہمارے لئے وہ بارانِ رحمت سے کم نہ تھی۔ اُس کے طفیل ہمارے نخلِ محبت میں پتے اور پھول نکل آئے۔"

نوٹ:۔ نام اور مقام سب فرضی ہیں۔

کاہن آملہ ہیئر آئیل رجسٹرڈ

اپنی بے نظیر خوبیوں کی وجہ سے ہندوستان میں رسم ورواج کی چیز بن گیا ہے۔ اس کا چند روزہ استعمال بالوں کی سیاہی چمک اور ملائمت میں خاطر خواہ اضافہ کرتا ہے بالوں کی ہر قسم کی بیماریوں کا کامیاب مقابلہ کرنا کاہن آملہ ہیئر آئیل کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ نواب راجے رؤسا امراء اور شاہی بیگمات کاہن آملہ کی سرپرستی فرماتی ہیں۔ قریباً ۵۰ سال سے ایک ہی نسخہ ایک ہی ترکیب سے دیسی یا ولایتی رنگ و بُو کی ملاوٹ کے بغیر نایاب و بیش قیمت جڑی بوٹیوں کو خالص تلی کے تیل میں پکا کر تیار کیا جاتا ہے اور ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں واجبی قیمت پر دستیاب ہو سکتا ہے۔

گوبند رام کاہن چند جنرل عطاران، ہیڈ آفس گیرہ بازار لاہور — شو روم انارکلی

نکات

ایک ایک شعر

ازحضرت فراق گورکھپوری ایم۔اے

جب اہل حسن کے تیور برے نظر آئے
وہ عشق کے لئے تمہید خودشناسی تھی

صرف صحت کے سہارے زندگی کٹتی نہیں
روگ پیدا کرلے کوئی زندگی کے واسطے

تین دن قبر میں بھی بھاری ہیں
چھٹتے ہی اس سے کیا سکوں پائیں

نیکی وبدی کے درمیاں ہے
آئے نہ نظر لکیر ایسی

دیکھا تری آنکھوں میں پرستان کا عالم
دنیا کا ہر اک ملک نگاہوں میں تھا لیکن

آب حیات کو آئے پسینے
عکس پڑا جب اس میں تیرا

سُنا کے گیت ترے اٹھ گیا میں دنیا سے
جہاں میں یوں بھی نئی روح پھونک دیتے ہیں

مرے اشعار میں اے دوست یہ جھنکار کسکی ہے
یہ میرے بول ہیں؟ پہچان کچھ آواز تو اپنی

اِس اِک چراغ سے کتنے چراغ جل اٹھے
تو ایک تھا مرے اشعار میں ہزار ہوا

ابھی معلوم ہو سکّہ جو یہ ٹکسال چڑھے
عشق دولت کے پجاری کا ہے کھوٹا کہ کھرا

ہیں جہاں ایک خواہش اور عمل
اس بلندی پہ عشق کو لے جا

نہ جہنم ہے کچھ نہ جنت ہے
عشق کی آنچ! حسن کی ٹھنڈک!

نہ فرق تا بقدم حسن شبنم وگل ہے
رُکے رُکے سے کچھ آنسو، رکی رکی سی ہنسی

دیئے کی لو کو تیرے مسکرا دینے سے کیا نسبت
نہ وہ ٹھنڈک، نہ وہ نرمی، نہ ایسی جگمگاہٹ ہے

جھوم نہ جا اشعار پہ میرے ہضم بھی اِن کو کر نادِل ۔۔۔ یہ وہ غذا ہے جو معدے میں مشکل سے حل ہوتی ہے

سچ جھوٹ کا سوال نہیں حسن و عشق میں ۔۔۔ گر ہے کوئی سوال تو عنوانِ شوق کا

یہ فرق تیری وفا و جفا میں سہل نہ تھا ۔۔۔ سمجھ سمجھ کے محبت بھی آج روئی ہے

شعر ایسے ہوں تو ہم بھی مان لیں ۔۔۔ "شاعری جزویست از پیغمبری"

آنکھیں کس کو دیکھ رہی ہیں ۔۔۔ روشنی، روشنی، اور روشنی"[۱]

[۱] مشہور عالم جرمن مفکر اور شاعر گیلٹے کے مرنے سے چند لمحے پہلے آخری الفاظ تھے "روشنی، روشنی اور زیادہ روشنی" (LIGHT, LIGHT, MORE LIGHT)
(فراق)

تنویراتِ نیّر

شیدا ہوں ازل سے کعبے کا الفت ہے عجب بتخانے کی

از جناب شیخ عبدالرحمٰن نیّر تلمیذ حضرت دل مدظلہٗ شاہجہانپوری

معلوم نرالی ہوتی ہے ہر بات ترے دیوانے کی ۔۔۔ پوچھی جو کسی نے کعبے کی تو اُس نے کہی بتخانے کی

صہبائے نگاہِ لطف مجھے آنکھوں سے پلا دے اے ساقی ۔۔۔ مجھکو نہیں حاجت مینا کی ساغر کی اور پیمانے کی

کس طرح نہ شیخ و برہمن کی آنکھوں میں مجھکو جگہ ملے ۔۔۔ شیدا ہوں ازل سے کعبے کا الفت ہے عجب بتخانے کی

ملتی ہی نہیں فرصت مجھکو اس شام و صبح کے جھگڑے میں ۔۔۔ اے گردشِ چرخ اجازت دے دنیائے دنی سے جانے کی

اس سوز و شرر کی دنیا میں لایا ہے کھینچ کے جوشِ جنوں ۔۔۔ کہتی تھی یہ شمع بزم سے شب راکھ اڑا کر پروانے کی

بیٹھا ہوں تصور میں ساقی کب روزِ جزا کا آئیگا ۔۔۔ جی بھر کے پیونگا کوثر کی اور جنت کے میخانے کی

نیّر کو نہیں اب تابِ ستم ہو اس پہ نگاہِ لطف و کرم ۔۔۔ دل سوختہ ہے اور خستہ جگر حالت ہے عجب دیوانے کی

ایک نفیس مزاج مہارانی

نے

اپنے صدر اعظم سے کہا دنیا کے ہر چہار جانب قاصد روانہ کرو کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں تاکہ میں اپنے لئے بہترین خوشبو منتخب کر سکوں، تعمیل حکم کے لئے فردوس مثال کشمیر، جنت نظیر سوئٹزرلینڈ، شباب انگیز نسمانیہ کے گلپاش مرغزاروں کی گلچینی کی گئی۔ جب سب پھول دور دراز سفر کے بعد مہارانی کے حضور میں پیش کئے گئے تو بیشتر اپنی خوشبو کھو چکے تھے اور باقی اس قدر مرجھائے ہوئے تھے کہ مہارانی کی حسن شناس نگاہوں کو تکلیف ہوئی۔ مہارانی اس خواہش کے پورا نہ ہونے سے ملول رہنے لگی۔ کھانا پینا ترک کر دیا۔ مہاراجہ کو فکر دامنگیر ہوا اور وزراء سے مشورہ طلب کیا۔ مہتمم توشہ خانہ نے "اصغر علی محمد علی" سے عطر منگوانے کو کہا۔ رائے معقول تھی فوراً عمل کیا گیا۔ جب عطر آیا تو مہارانی کا شباب رفتہ ایک بار پھر اپنی پوری بہاریں ساتھ لئے واپس آگیا!

اصغر علی محمد علی

تاجر عطر لکھنؤ

تیمور اور بایزید انگورہ کے میدان میں!

تاریخ اسلام کا ایک ورق!

از مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

۶۹۹ھ میں بانی سلطنت عثمانیہ یعنی عثمان خاں اول نے قونیہ میں تاج سلطانی سر پر رکھا گویا سلطنت سلجوقی کے خشک تنے سے عثمانی سلطنت کی ایک سرسبز شاخ پھوٹی۔ قریباً سو برس کے بعد ۷۹۲ھ میں سلطان مراد خاں عثمانی نے جنگ کسووا میں فتح مبین حاصل کر کے عالم اسلام کو عیسائیوں اور یورپ والوں کے حملوں سے بےخوف و مطمئن ہی نہیں کیا بلکہ یورپ کو بتا دیا کہ اب مسلمانوں کی شمشیر خارا شگاف سے محفوظ رہنے کی فکر کرو۔ مغلوں کی طاقت پچاس سال تک مسلمانوں کے لئے بلائے بے درماں رہنے کے بعد ڈیڑھ سو برس تک اسلام کی خدمتگزار رہ چکی تھی اب آٹھویں صدی ہجری کے آخر میں مغلوں کی اہمیت معدوم ہونے کو تھی کہ یکایک اس دبی ہوئی طاقت اور مرجھائی ہوئی قوم میں پھر ہیجانی کیفیت پیدا ہوئی اور چنگیز خاں کے قبیلہ میں ایک دوسرا چنگیز خاں جس کا نام تیمور تھا پیدا ہوا۔ چنگیز خاں اور تیمور کا رشتہ اور خاندانی تعلق ذیل کے شجرہ سے سمجھ میں آئیگا۔

مسماۃ الانقوا (مغولستان کی مریم ثانی)

بوزنجر یعنی فرزند بے پدر —— بوقا خاں —— تومن خاں

قبل خاں —— تومنہ خاں —— بالیسنغر خاں —— قائدو خاں

قاچولی بہادر —— امیر ایرومجین —— امیر سوغوچیجر

امیر ملنگر —— امیر ایلجل —— امیر قراچار

امیر برگل —— امیر ترا غانی —— امیر تیمور

قوبلہ خاں —— جان بہادر —— تونیو بہادر —— چنگیز خاں

تیمور کا ابتدائی زمانہ

تیمور کے متعلق اس قدر بیان کر دینا ضروری ہے کہ بخارا سے اکیس تیس میل مشرق کی جانب سمرقند سے تیس میل جنوب مشرق کی سمت ترکستان میں ایک بستی شہر سبز کے نام سے موسوم ہے اس کے حوالی میں گلہ بانوں کے ایک گروہ کا سردار مسمی ترا غی جو خدا پرست اور نیک آدمی تھا خیمہ زن تھا اس کے یہاں ۸ را پریل ۱۳۳۶ء مطابق ۷۳۶ھ میں بیٹا پیدا ہوا، ترا غی شہر سبز کے عالم اور خدا رسیدہ بزرگ مولانا شمس الدین سے خصوصی عقیدت رکھتا تھا۔ تولد فرزند کی نوید سن کر مولانا ممدوح کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت مولانا قرآن مجید کی تلاوت میں مصروف تھے۔ ترا غی نے بیٹا پیدا ہونے کی خبر سنا کر اس کے نام کی فرمائش کی۔ مولانا جب اس آیت پر پہنچے۔ **امنتم من فی السماء ان یخسف بکم الارض فاذا ھی تمود**۔ تو فرمایا کہ لڑکے کا نام تیمور رکھو کہ وہ زمین کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلا دیگا۔

تیمور کی عمر نو برس کی ہوئی تو اس نے نماز اور آخری پارہ کا ایک پاؤ ازبر کر لیا تھا۔ اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ قبیلہ کے سردار کا بیٹا ہونے کی وجہ سے شہسواری اور شکار کھیلنے کی بخوبی مشق ہو گئی تھی۔ اس زمانہ میں چنگیزی خاندان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پریشان و ناتوان ہو چکا تھا' ایران خراسان، ترکستان۔ افغانستان وغیرہ ملکوں کے چھوٹے چھوٹے قطعات پر چنگیز خاں کی اولاد کے اکثر افراد جدا جدا حکومت کرتے مگر اپنے خاندان کی پرانی شوکت و ہیبت قریباً ضایع کر چکے تھے۔ جب تیمور کی عمر اکیس سال کی ہوئی تو اس کی شادی سمرقند کے حکمران امیر کرغان کی بیٹی سے ہو گئی۔ اس رشتہ داری نے تیمور کے لئے ایک طرف حصول سلطنت کی کوششوں کے موقعے پیدا کر دیئے تو دوسری طرف رقیبوں اور حریفوں کی سازشوں اور معرکہ آرائیوں میں اس کو مبتلا ہونا پڑا جس کی وجہ سے اس کی صعوبت کشی و پختہ کاری میں خوب ترقی ہوئی۔ تیمور کی جوانی کا ایک حصہ اسی طرح نشیب و فراز، ترقی و تنزل' امید و بیم' امیری و فقیری کے گوناگوں حالات میں صرف ہوا۔ جس طرح اس کی چھٹی پشت میں بابر کی نوجوانی کے ایام ترکستان و افغانستان کے پہاڑوں میں صرف ہوئے تھے۔ بالآخر تیمور اپنے تمام حریفوں کو نیچا دکھا کر سمرقند کی چھوٹی سی سلطنت پر قابض و متصرف ہو گیا اور بہت جلد اس نے اپنی قوت بڑھا کر تمام ترکستان، خراسان' ایران اور افغانستان پر قبضہ کر لیا۔ اس موقع پر بے اختیار یہ بات یاد آ جاتی ہے کہ عثمان خاں کی شادی جس طرح شاہ قونیہ کی بیٹی سے ہوئی۔ جس طرح عثمان خاں اپنے ہم قوم ترکوں یعنی سلجوقیوں کی سلطنت کا وارث بنا اسی طرح تیمور اپنے

ہم قوم مغلوں یعنی چنگیزیوں کی سلطنت کا وارث ہوا۔ سلجوقیوں کی سلطنت بھی دو سو برس تک قائم رہی اور چنگیزیوں کی سلطنت بھی دو سو برس تک قائم رہی۔

بایزید پر حملہ

۸۰۰ھ میں جب تیمور ہندوستان (۱) پر حملہ آور ہوا تو یہاں تغلقوں کی حکومت جانکنی کی حالت میں تھی، مگر اسلام اور اسلامی عظمت و اقتدار کو کوئی خطرہ نہ تھا، اسپین کی اسلامی حکومت کو جس کا دارالحکومت غرناطہ تھا عیسائی بالکل مٹا دینے پر آمادہ ہو چکے تھے لیکن کسووا کی جنگ عظیم اور بایزید یلدرم کی پر ہیبت معرکہ آرائیوں کے خوف سے یورپ کے عیسائی کچھ سہم سے گئے تھے اور ان کو اپنی جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسپین میں مسلمانوں کا وجود تقریباً ڈیڑھ سو برس تک کے لئے اور باقی رہ گیا۔ تیمور ہندوستان میں مشرق کی جانب ہردوار تک آیا۔ دہلی۔ ملتان اور دامن کوہ کشمیر میں قتل عام سے خون کے دریا بہا کر اور ہندوستان کا ملک یہاں کے باہمت و ذی حوصلہ مسلمان سرداروں کے لئے چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ تیمور ہردوار میں تھا کہ اس کے پاس خبر پہنچی کہ بایزید یلدرم کو یورپ میں فتوحات پر فتوحات حاصل ہو رہی ہیں۔ اس خبر کے ساتھ ہی قیصر روم یعنی قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہ کا ایلچی مع خط پہنچا کہ بایزید کے پاس آپ کے مغرور مجرم سلطان احمد جلائر اور قرا یوسف ترکمان راحت و اطمینان اور عزت و احترام کی زندگی بسر کر رہے ہیں اس میں آپ کی بڑی بے عزتی ہے۔ بایزید نے ہماری قدیم سلطنتوں اور عزتوں کو پارہ پارہ کر دیا ہے حالانکہ ہارون الرشید اور معتصم باللہ عباسی نے بھی ہماری سلطنتوں کو مٹانا نہیں چاہا اور مسلمانوں نے ہمیشہ ہماری سلطنت اور حکومت کو عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھا۔ نیز بایزید نے اپنی فوجیں داغستان میں بھی جمع کی ہیں وہ بہت جلد آذربائیجان پر قبضہ کیا چاہتا ہے۔ آپ اس طرف آئیں، اپنی سلطنتوں کو بچائیں اور ہم کو بھی اس مصیبت سے نجات دلائیں۔

تیمور سے توقع تھی کہ وہ قیصر کی اس درخواست کا ایسا مایوس کن اور مسکت جواب دیتا جیسا کہ ساڑھے سات سو برس پہلے امیر معاویہ نے قیصر روم کو خط لکھا تھا کہ اگر تیرے مقابلہ کے لئے حضرت علیؓ کے لشکر کو حرکت کرنی پڑی تو سب سے پہلا سردار جو حضرت علیؓ کے جھنڈے کے نیچے تجھ پر حملہ آور ہوگا وہ معاویہ ہوگا۔ لیکن تیمور جذبۂ رقابت پر غالب نہ آسکا نیز سلطان احمد جلائر اور قرا یوسف ترکمان کے بایزید کی پناہ میں چلے جانے کو برداشت نہ کر سکا وہ ہندوستان سے فوراً چل دیا راستہ میں ایک لاکھ ہندوستانی قیدیوں کو جو بار خاطر یا گرانباری سفر کا موجب تھے بجائے اس کے کہ آزاد کر دیتا قتل کر ڈالا ہندوستان سے افغانستان ہوتا ہوا سمرقند پہنچا وہاں سے تیاری کر کے ایران ہوتا ہوا اپنے ملک کی مغربی اور بایزید کی قلمرو کی مشرقی سرحد پر پہنچ کر بایزید کو جو قسطنطنیہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا ایک تہدیدی خط لکھا کہ ہمارے مغرور مجرموں کو ہمارے پاس فوراً بھیج دو لیکن بایزید نے پناہ گزینوں کے واپس دینے سے صاف انکار کر دیا۔

سیواس کا محاصرہ

اس پر تیمور نے بایزید کی مملکت کے مشرقی صوبہ پر حملہ کر کے شہر سیواس کا محاصرہ کر لیا۔ سیواس میں بایزید کا بیٹا بطور قلعدار و صوبہ دار موجود تھا اس نے سیواس کی مقامی فوج سے تیمور کا سخت مقابلہ کیا بالآخر لڑائی میں مارا گیا۔ تیمور نے سیواس کو فتح کر کے تباہ و برباد کر دیا۔ چار ہزار ترک جو گرفتار ہوئے اس جرم میں کہ انھوں نے تیمور کی فوج کا بہادری سے کیوں مقابلہ کیا زندہ زمین میں دفن کئے گئے۔ چار ہزار بہادر مگر مجبور و اسیر سپاہیوں کا زندہ دفن کرنا یقیناً اس سنگدلی سے بڑھکر سنگدلی تھی جو ہندوستان کے ایک لاکھ قیدیوں کو قتل کرانے میں تیمور نے دکھائی تھی۔ یہ نمونہ غالباً چنگیز خاں کے ہاں بھی دستیاب نہ ہو سکے گا۔ سیواس کو برباد کرنے اور اپنی سنگدلی کا یہ عجیب نمونہ دکھانے کے بعد تیمور نے اپنا رخ بجائے مغرب کے جنوب کی طرف پھیر کر شام و مصر کے فتح کر لینے کا ارادہ کیا اور دمشق و حلب کو جا لوٹا ایشیائے کوچک اور شام میں بہت سے چھوٹے چھوٹے حکمران تھے جن کو بایزید کے خوف سے اپنے اپنے مقبوضات چھوڑ کر آوارہ ہونے اور تیمور کی بارگاہ میں پناہ لینے کا موقع ملا تھا۔ ان سب کی معیت تیمور کے لئے اس واسطے مفید ثابت ہوئی کہ ان کو توقع تھی کہ جس طرح تیمور ہندوستان میں جو ایک وسیع اور زرخیز ملک ہے تاج بخشی کر کے آیا ہے اسی طرح ہمارا ملک فتح کر کے ضرور ہم کو عطا کر دیگا۔ بخلاف اس کے بایزید سے ان کو یہ امید اور توقع نہ تھی۔

بایزید کا غیظ

بایزید نے جب اپنے بیٹے کے مارے جانے، سیواس کے تباہ و برباد ہونے اور چار ہزار ترکوں کے زندہ زمین دفن کئے جانے کا حال سنا تو وہ صبر و ضبط کو کام میں نہ لا سکا اگر وہ محاصرہ جاری رکھتا تو اس عرصہ میں جبکہ تیمور دمشق اور حلب کو لوٹ رہا تھا قسطنطنیہ فتح کر چکا ہوتا لیکن اس نے سیواس کی خبر سنتے ہی قسطنطنیہ سے محاصرہ اٹھا لیا اور ایشیائے کوچک کی طرف چل دیا بایزید کے ایشیائے کوچک میں آنے کی خبر سن کر تیمور ملک شام سے شمال و مغرب

کی جانب روانہ ہوا اور اپنے علاقہ میں واپس آکر جنگ کی تیاریاں کرنے لگا۔ بایزید نے اپنی فوج سیواس کے کھنڈروں کے قریب فراہم کرنی شروع کی اس کی خواہش تھی کہ جس طرح ترکوں پر ظلم کیا گیا ہے اور اس کا بیٹا مقتول ہوا ہے اسی میدان میں دشمنوں سے بدلہ لے۔

تیمور کی چالاکی

بایزید چالیس سال کے قریب عمر کا جوان اور تیمور کچھ کم ستر برس کا گرگ باراں دیدہ سپہ سالار تھا بایزید نے مقابلہ کی پوری پوری تیاریاں سیواس کے قریب کر لی تھیں اور وہ تیمور کے حملہ کا اپنے سرحدی علاقہ میں منتظر تھا نہ کہ تیموری علاقہ میں پیش قدمی پر آمادہ تھا۔ تیمور کو بایزید کے مزاج کا صحیح اندازہ تھا اور وہ جانتا تھا کہ بایزید کا غضب اس کی مآل اندیشی پر ضرور غالب آجائیگا پس اس نے ایک نہایت ہی قابل تعریف سپاہیانہ چال چلی یعنی اپنی پانچ لاکھ سے زیادہ جرّار و کار آزمودہ فوج لئے ہوئے بایزید کی لشکر گاہ سے جنوب کی جانب کترا کر سیواس اور بایزید کی لشکر گاہ کو پیچھے چھوڑ گیا اور ایشیائے کوچک کے قلب میں سیواس سے دو سو پچیس میل مغرب کی جانب جا پہنچا اور جاتے ہی شہر انگورہ کا محاصرہ کر لیا۔ بایزید دشمن کو اپنے ملک میں اتنی دور اندر کی جانب دست اندازی کرتے ہوئے سن کر جوش غضب سے کانپ اٹھا اس نے دشمن کے اس زبردست جنگی پیچ کا توڑ سوچنے کی مطلق کوشش نہ کی فوراً بازو شاہیں کی طرح انگورہ کی جانب جھپٹا۔ سیواس میں اس کے پاس چار لاکھ فوج موجود تھی وہ تیمور کی پانچ لاکھ سے زیادہ فوج کو چیر پھاڑ کر تکا بوٹی کر دینے یا غبار بنا کر دھوئیں کی طرح ہوا میں اڑا دینے کی طاقت رکھتا تھا لیکن انگورہ کی سمت اس سیل رفتار سہ منزلہ یلغار میں وہ چوتھائی سے زیادہ فوج اپنے ہمراہ نہیں لے سکتا تھا۔

فریقین کی طاقتیں

تیمور کو اپنی پانچ لاکھ سے زیادہ فوج کے ساتھ بھی یہ جرأت نہ ہو سکی تھی کہ وہ بایزید کی چار لاکھ کی فوج سے فیصلہ کن مقابلہ پر آمادہ ہوتا اس نے اپنی مآل اندیشی سے جو جنگی چال چلی تھی وہ کارگر ثابت ہوئی اور اس کی ستائی ہوئی پانچ لاکھ سے زیادہ فوج کو صرف ایک لاکھ تھکی ماندی فوج سے میدان انگورہ میں مقابلہ کرنا پڑا۔ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں جو عظیم الشان لڑائی ہوئی تھی اس میں بھی متحارب فوجوں کی قریباً یہی نسبت تھی یعنی مرہٹوں کی فوجیں پانچ چھ لاکھ کے درمیان تھیں اور مسلمانوں کی جمعیت صرف اسّی نوّے ہزار کے قریب تھی لیکن مسلمانوں نے مرہٹوں کو شکست فاش دی تھی ۴۶۳ھ میں ایشیائے کوچک کے میدان ملاذ کرد میں سلطان الپ ارسلان سلجوقی نے مسلمانوں کی صرف بارہ ہزار مختصر فوج سے عیسائیوں کی دو لاکھ سے زیادہ جرّار فوج کو شکست فاش دی تھی۔ اس جنگ انگورہ میں اگر بایزید فتحمند اور تیمور مغلوب ہوتا تو یہ لڑائی بھی اسی قسم کی لڑائیوں میں شمار ہوتی جن میں حیرت انگیز طور پر قلیل فوجوں نے کثیر فوجوں کو شکست دی ہے لیکن چونکہ دونوں جانب لڑنے والے مسلمان ہی تھے لہٰذا اکثرت کو غالب اور قلت کو مغلوب ہی ہونا چاہئے تھا۔

امیر تیمور نے انگورہ پہنچ کر ہر قسم کی مضبوطی کر لی تھی اپنی لشکر گاہ کے گرد خندق کھدوا لی تھی۔ باموقع ٹیلوں پر قبضہ کر کے سرداروں کو متعین کر دیا تھا جا بجا خندقوں میں مناسب موقعوں پر فوجی دستے بٹھا دیئے تھے۔ بایزید نے جو نہایت تیز رفتاری سے سوا دو سو میل کا سفر طے کئے ہوئے آیا تھا، آتے ہی حملہ کر دیا اور ۱۹ ذی الحجہ ۸۰۴ھ کو میدان انگورہ میں دنیا کے دو سب سے زیادہ طاقتور بادشاہ مصروف جنگ ہوئے۔

دو ببر شیروں کی کشمکش

تیمور کی بہادری۔ ملک گیری۔ عالی ہمتی، خونخواری سب کچھ چنگیز خاں کی مانند تھی۔ فرق یہ تھا کہ چنگیز خاں اسلام کا دشمن اور کافر تھا لیکن تیمور مسلمان اور اسلام کی خدمتگذاری کا مدعی تھا اس لئے اس کا ظہور اسلام اور مسلمانوں کے لئے موجب مسرّت اور باعث شادمانی ہی ہو سکتا تھا نہ موجب خوف و خطر۔ اسلام اور مسلمانوں کی خوش قسمتی بظاہر اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی تھی کہ مغرب میں تمام یورپ اور عیسائی دنیا کو اسلام کا غاشیہ بردار بنانے کے لئے ترکوں کا زبردست سلطان بایزید یلدرم کافی تھا ادھر مشرق میں جاپان کے سمندروں تک اسلام کا علم بلند کر دینے کے لئے مغلوں کا زبردست پادشاہ تیمور کافی طاقت رکھتا تھا۔ ۸۰۴ھ میں روئے زمین پر بایزید و تیمور کے برابر زبردست کوئی تیسری طاقت نظر نہ آتی تھی۔ یہ دونوں ملک گیر و فتحمند بادشاہ مسلمان تھے۔ ایک سے دنیا کا مشرقی نصف حصہ کانپ رہا تھا۔ دوسرے سے مغربی نصف حصہ لرزہ براندام تھا۔ کیا اچھا ہوتا کہ تیمور کا منہ مشرق کی طرف اور بایزید کا منہ مغرب کی طرف رہتا لیکن سوء اتفاق سے انگورہ کے میدان نے اپنی زبردست قوت جاذبہ کا اظہار کیا اور تیمور و بایزید کو اپنی طرف کھینچا سمندر میں دو جہازوں کا ٹکرانا۔ خشکی میں دو نہایت تیز رفتار ریل گاڑیوں کا عالم گرم رفتاری میں مقابل سمتوں سے آکر متصادم ہونا، دو مست ہاتھیوں کا آپس میں ٹکریں لڑنا، دو خونخوار و غضبناک ببر شیروں کا ایک دوسرے پر حملہ آور ہونا بلاشک بڑے ہی ہیبتناک اور زہرہ شگاف مناظر ہوتے ہیں

لیکن انگورہ کے میدان میں تیمور و بایزید دو مسلمان بادشاہوں، دنیا کے دو
عظیم الشان شہنشاہوں، دنیا کے دو سب سے بڑے جرنیلوں اور سپہ سالاروں کا ایک
دوسرے سے نبرد آزما ہونا سب سے بڑھ کر ہیبتناک اور سب سے زیادہ زہرہ شگاف نظارہ تھا۔ دو پہاڑ اپنی اپنی جگہ سے حرکت کر کے ایک دوسرے کو ریزہ ریزہ کر دینے کے لئے میدان انگورہ کی طرف بڑھے تھے یا دو سمندر ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے جوش میں آگئے تھے۔ آفتاب نے زمین کی سطح پر پانی پت واٹرلو۔ اردبیل وغیرہ کے میدانوں میں بادشاہوں اور فوجوں کو ایک دوسرے سے مصروف کارزار دیکھا ہے لیکن انگورہ کے میدان کا جوش و خروش اور پرہیبت معرکہ اس کو کہیں نظر نہ آیا ہوگا۔

طرفین کی صف آرائی

امیر تیمور نے صفوف لشکر کو اس طرح آراستہ کیا کہ میمنہ پر شہزادہ مرزا شاہرخ کو افسر مقرر کیا۔ میمنہ کی فوجوں میں جن سرداروں کی فوجیں شامل تھیں ان کے نام یہ ہیں۔ امیر زادہ خلیل سلطان۔ امیر سلیمان شاہ، امیر رستم برلاس، سونجک بہادر۔ موسیٰ توی بوغا، امیر یادگار وغیرہ۔

میمنہ کی اس فوج گراں کے لئے امیر زادہ مرزا سلطان حسین کو ایک زبردست فوج کے ساتھ کمکی مقرر کیا۔ میسرہ میں امیر نور الدین جلائر، امیر بدمذق برلاس۔ علی قوچین۔ امیر مبشر۔ سلطان سنجر برلاس۔ عمر ابن تابان وغیرہ اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ متعین کئے گئے شاہزادہ میران شاہ کو میسرہ کی فوج کا سردار مقرر کیا گیا۔ میسرہ کی کمکی فوج امیر زادہ ابا بکر، امیر جہان شاہ برلاس، امیر توکل برلاس، پیر علی سلدوز کو سپرد کی گئی۔ قلب کی فوج کے داہنے حصے میں تاش تمور اغلن اوزبک، امیر زادہ احمد۔ سرائی اجلال باورچی، یوسف حاجی بابا سوچی، اسکندر ہندو بوغا۔ خواجہ علی بدوی، دولتمور، محمد قوچین اور الیس قورچی وغیرہ شامل تھے۔ ان سرداروں کی پشت پر بیگ ولی ایلچی کدائی، اہری ملک، ارغون ملک، صوفی خلیل، الیس تمور، شیخ محمد، سنجر و حسین و عمر بیگ پسران ینک روز، جون غربانی، بیروی بیگ قوچین، امیر زیرک برلاس، وغیرہ امرا بطور کمکی مقرر ہوئے۔ قلب کے بائیں حصے کی سرداری امیر توکل قرقرا، علی محمود، شاہ ولی، امیر سونجک، تنگری، بیرمش خواجہ، محمد خلیل امیر لقمان۔ سلطان برلاس، میرک ایلچی، پیر محمد، خنکم شیخ اصلان ایلیا کیک غاقی، دولت خواجہ برلاس، یوسف برلاس، علی قبچاق وغیرہ کو سپرد ہوئی، ان سرداروں کی کمکی فوج میں امیر زادہ محمد سلطان، امیر زادہ پیر محمد، اسکندر شاہ ملک، الیاس خواجہ، امیر شمس الدین وغیرہ اپنی فوجوں کے ساتھ شامل تھے۔

مذکورہ بالا تقسیم و ترتیب کے علاوہ نہایت زبردست چالیس دستے
تیمور نے اپنے ریزرو کے لئے بہت سی فوج محفوظ رکھی تاکہ لڑائی کے وقت جس حصہ فوج کو
ضرورت ہو فوراً امداد پہنچائی جا سکے۔ اس پانچ چھ لاکھ فوج کے علاوہ فیلان کوہ پیکر کی بھی ایک بڑی تعداد جن کی صحیح گنتی معلوم نہیں تیمور کے پاس اس جنگ میں موجود تھی۔ ان جنگی ہاتھیوں کی صف لشکر کے آگے ایستادہ کی گئی تھی۔ بایزید کے پاس ایک لاکھ فوج کے علاوہ کوئی جنگی ہاتھی نہ تھا۔

سلطان بایزید نے میسرہ کی فوج سلطان چلپی کو سپرد کی۔ میمنہ پر اپنی عیسائی بیوی کے بھائی کو جو ایک فرانسیس تھا مقرر کیا خود قلب کو سنبھالا اور اپنے پیچھے موسیٰ و عیسیٰ و مصطفیٰ اپنے تینوں بیٹوں کو رکھا۔

آغاز جنگ

طرفین سے طبل جنگ بجا اور شیران غرندہ ایک دوسرے کی طرف بڑھے غریو لشکر نے اردگرد کے ٹیلوں اور پہاڑیوں کو لرزا دیا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے فرش زمین نے غبار ہوا گیر ہو کر ابر تیرہ کی صورت اختیار کر کے تمازت آفتاب کو کم کر دیا مگر خود و شمشیر اور سنان و زرہ نے ایک دوسرے سے ٹکرا کر چنگاریاں برسائیں، خون کے فواروں سے چھڑکاؤ شروع ہوا۔ بہادروں کی اگلی صفیں چشم زدن میں مُردہ لاشیں بن کر بوریئے کی طرح زمین پر بچھی نظر آنے لگیں۔ پچھلی صفوں کے سپاہی اپنے بھائیوں کی لاشوں کو کچلتے ہوئے آگے بڑھے اور فوراً دوسروں کے لئے فرش راہ بننے لگے۔ تیروں کی سرسراہٹ، کمانوں کی چرچراہٹ، تلواروں کی چھپاچھپ، نیزوں کے زرہ میں پھنس جانے کا شور، شمشیروں کے آپس میں لڑ کر ٹوٹنے کی جھنکار۔ "باس کہ اینک می رسم"۔ "ہشیار باش"۔ "شاباش"۔ "کجا میروی"۔ "یکے از من بستاں" "بگیر و بزن"۔ "مردانہ پیش بیا"۔ کی آوازوں کا غل۔ تلواروں اور برچھیوں کی بجلیوں کا چمکنا، خون کا زمین پر برسنا، لاشوں اور سروں کا دھڑا دھڑ گرنا۔ زخمیوں کے منہ سے کبھی کبھی باوجود ضبط آہ کا نکل جانا، ہاتھیوں کا چنگھاڑنا گھوڑوں کا ہنہنانا یہ سب مل کر ایک ایسا لطف انگیز اور مسرت خیز سماں تھا کہ خوش نصیبوں ہی کو مدت العمر میں ایک دو دفعہ ایسے دلچسپ تماشوں کے دیکھنے یا ان میں شریک ہونے کا موقع مل سکتا ہے۔

ایسے تماشوں اور ایسے نظاروں کی خواہش میں بہادروں کے دل بے چین اور جوانمردوں کی آنکھیں نگراں رہا کرتی ہیں ایسے مبارک اور خوں فشاں مناظر کی قدر و قیمت کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ہزاروں لاکھوں سران کی رونق بڑھانے کے لئے جسم سے جدا ہو جاتے ہیں، جوش مسرت اور ہجوم شادمانی کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔

کہ جسمِ انسانی کا تعلق لوہے کے ساتھ حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ تلواریں خشک چمڑے کے نیام میں قیام کرنا پسند نہیں کرتیں بلکہ انسان کے زندہ گوشت میں چلنا ان کو مرغوب ہوتا ہے۔ سنان کی خواہش میں سینے آگے بڑھتے ہیں اور برچھی کے پھل کی شایعت میں خون کے فوارے محبت کی وجہ سے نکلتے ہیں۔ نامردوں نے سمجھ رکھا ہے کہ قیس عامری سب سے بڑا عاشق تھا جو لیلیٰ کی محبت میں مجنون بن گیا تھا لیکن عشق و محبت کی حقیقت ان جوانمردوں سے پوچھو جو شمشیر دودم پر دم دیتے اور میدان جنگ میں جس طرح تلوار خون کے دریا میں نہاتی ہے اسی طرح آپ بھی غرق خون ہونے کا شوق رکھتے ہیں۔ بہادروں سے ان باتوں کی تصدیق کرو۔ نامردوں کو یہ پر لطف و پر کیف باتیں نہ سناؤ کیونکہ وہ اپنا اور تمہارا وقت کج بحثی میں ضایع کر دیں گے۔

انگورہ کے میدان میں اس روز تمام دن یعنی صبح سے شام تک یہ دلچسپ تماشہ ہوتا رہا اور آفتاب و آسمان دونوں کو حسرت رہی کہ غبار کے بادل نے حائل ہو کر ان کو بہادروں کی جنگی قابلیت اور جوانمردوں کی نہنگانہ شجاعت کا اچھی طرح معاینہ نہ کرنے دیا۔

بایزید کی عدیم النظیر جرأت

تیمور کی فوج میں سے شہزادہ ابابکر نے سلیمان چلپی پر ایک نہایت سخت حملہ کر کے ترکوں کی صفوں کو درہم برہم کر دیا۔ ابابکر کے بعد ہی سلطان حسین نے دوسرا حملہ سلیمان پر کیا ان دونوں حملوں نے کچھ کم صدمہ نہیں پہنچایا تھا کہ تیسرا حملہ محمد سلطان نے کیا۔ بایزید نے میسرہ کی ایسی نازک حالت دیکھ کر بایزید کا ایک سردار محمد خاں چلپی سلیمان کی مدد کے لئے بڑھا۔ تیموری لشکر کے ان سخت و شدید حملوں کو ترکی فوج نے بڑی بہادری و مردانگی کے ساتھ روکا۔ مغلوں کی اس کثیر التعداد حملہ آور فوج کو تھوڑی دیر کی شمشیر زنی کے بعد اپنی مقررہ جگہ پر جو ایک سطح مرتفع تھی واپس آ جانا پڑا۔ سلطان بایزید کے میسرہ پر جب یہ مصیبت آ رہی تھی تو وہ اپنی فوج کے حصہ قلب کے ساتھ مغلوں کے اس عظیم و شدید حملہ کو روک رہا تھا جو مغلوں کے قلب نے جنگی ہاتھیوں کے ساتھ بایزید پر کیا تھا۔ بایزید اس معرکے میں اپنے انتہائی تہور کے سبب یہ بھول گیا کہ میں اپنی تمام فوج کا سپہ سالار اعظم ہوں اور مجھ کو صفوف قتال سے جدا رہ کر میدان جنگ کے ہر حصہ پر نظر رکھنی چاہیے بلکہ اس نے ایک بہادر سپاہی کی طرح بذات خود دشمن پر رستمانہ صفوف شکن حملے شروع کر دیئے۔ اس کی بہادر فوج نے بھی اپنے سردار کی تقلید میں صف شکنی و حریف افگنی میں مطلق کوتاہی نہ کی۔ بایزید نے مغلوں کے قلب کی فوج کو اپنے سامنے سے ہٹا دیا اور تیموری سرداروں کو بھگا دیا اب بایزید کا فرض تھا کہ وہ اپنے مین و یسار کی فوجوں کا بندوبست کرتا اور اپنی جمعیت کو بطریق احسن ترتیب دیکر آگے بڑھتا لیکن اس نے اپنے مقابل کی فوجوں کو بھگا کر بے تحاشا اس سطح مرتفع یا ٹیلہ پر حملہ کیا جہاں ابابکر و سلطان حسین وغیرہ واپس ہو کر متمکن تھے۔ تیموری شہزادے اور تیموری سردار اس حملہ کی تاب نہ لا سکے بایزید نے چشم زدن میں دشمن کے چھ زبردست سرداروں کو بیدخل کر کے اس ٹیلہ پر قبضہ کر لیا۔ تیمور شروع سے لیکر آخر تک بذات خود جنگ میں شریک نہ ہوا لیکن میدان جنگ کے ہر گوشہ پر اس کی نظر تھی اس نے بھی ہوئی شطرنج میں اپنے جس مہرہ کو کمزور دیکھا اسے زور پہنچایا اور جہاں سے جس مہرہ کو پیچھے ہٹانا مناسب سمجھا فوراً پیچھے ہٹایا۔ غرض اس نے انتہائی دوراندیشی اور کمال حزم و احتیاط کے ساتھ میدان جنگ کا رنگ شام تک اپنے حسب منشا بنا لینے کی کوشش کی۔

تیمور کی تازہ دم فوج کا حملہ

بایزید کو اس طرح فاتحانہ آگے بڑھا ہوا دیکھ کر اس نے اپنے تازہ دم دستوں کی مدد سے بایزید کے میمنہ اور میسرہ پر یکلخت حملہ کرا کر بایزید کو اس کی فوج کے بڑے حصے سے جدا کر دیا۔ پھر اپنی کثرت فوج سے فائدہ اٹھانے کی نہایت با موقع کوشش کی یعنی قرنا کے ذریعہ سے تمام فوج کو دشمنوں پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا۔ بایزید کی ایک لاکھ فوج میں سے جس قدر آدمی اب تک میدان جنگ میں کام آئے تھے تیمور کی فوج کے اس سے دگنے قتل ہو چکے تھے چونکہ تیمور کی فوج بایزید کی فوج سے پچگنی تھی اس لئے دونوں فوجوں کی نسبت میں اب اور بھی زیادہ فرق پیدا ہو گیا یعنی تیمور کی فوج کے ایک لاکھ آدمی قتل ہونے کے بعد چار لاکھ باقی تھے اور بایزید کے پچاس ہزار قتل ہو کر صرف پچاس ہزار باقی رہے جو دشمن کی باقیماندہ فوج کا آٹھواں حصہ تھے بایزید کی فوج کے جس حصہ پر اس کا عیسائی برادر زن حکم فرما تھا اس کی تعداد بیس ہزار تھی۔ مغلوں کی اس عام اور شدید یورش کے بعد وہی حصہ سب سے پہلے درہم و برہم ہوا۔ اس کے بعد بایزید کا شیر دل بیٹا مصطفےٰ مارا گیا۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ بایزید کی فوج میں ترکستان کے مغل قبیلوں کے بہت سے دستے شامل تھے۔ تیمور نے عین معرکہ جنگ میں ان مغل دستوں کو اپنے جاسوسوں اور پیغام رسانوں کے ذریعہ سے اس طرف توجہ دلائی کہ ہم کو اپنے ہم وطنوں اور ہم قوموں پر تلوار نہیں اٹھانی چاہیئے۔ یہی وجہ تھی کہ معرکہ جنگ میں ان مغل دستوں نے راہ فرار اختیار کی اور اس طرح بایزید مٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ دشمنوں کے نرغہ میں محصور رہ گیا۔

بایزید کی گرفتاری

میرے نزدیک سپاہ یا سپہ سالار کی بزدلی یا کوتاہی اور مغل دستوں کی بیوفائی کی داستانیں کوئی اہمیت اور وقعت نہیں رکھتیں۔ بایزید کی شکست کا سب سے بڑا سبب اس کی فوج کا تعداد میں بہت زیادہ کم ہونا۔ اس کی فوج کا تھکا ماندہ ہونا اور بایزید کا سپاہیانہ داؤ پیچ میں تیمور کی نسبت کسی قدر بے احتیاط ہونا تھا۔ بایزید جب اپنے انتہائی تہور کے سبب تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ تیمور کے ٹڈی دل میں گھر گیا تو اس نے شام تک حملے پر حملہ کیا۔ دشمنوں کو مارتا ہٹاتا اور صفوں کو چیرتا ہوا کئی مرتبہ اس مقام تک پہنچ گیا جہاں تیمور کھڑا ہوا اپنی فوج کے لئے مناسب احکام جاری کر رہا تھا۔ بالآخر غروب آفتاب کے بعد اس عثمانی شیر کو کمندیں ڈال کر یا گھوڑے سے ٹھوکر کھا کر گر جانے پر گرفتار کر لیا گیا اور میدان انگورہ میں اسلامی دنیا کی وہ تمام امیدیں جو بایزید کی ذات سے وابستہ تھیں دفن ہو گئیں۔

جنگ انگورہ کے نتائج

اگر بایزید کی چار لاکھ فوج تیمور کے مقابلہ پر آتی اور لڑائی بجائے انگورہ کے سیواس کے میدان میں ہوتی تو یقیناً نتیجہ جنگ برعکس ہوتا اور لڑائی کے فیصلے میں بجائے اس کے کہ پورا ایک دن صرف ہوتا شاید ایک ہی گھنٹہ کافی ہوتا۔ بایزید کے مغلوب و اسیر ہونے سے یورپ میں اسلام کے روز افزوں اقتدار و ترقی کو سخت نقصان پہنچا لیکن اگر تیمور شکست پا کر اسیر یا مقتول ہو جاتا تو صرف خاندان تیموری کی حکومت کو نقصان پہنچتا مگر اسلام کو براعظم ایشیا کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا اس لڑائی میں بایزید کی حد سے بڑھی ہوئی بہادری اور کسی قدر ناعاقبت اندیشی کو ضرور ملزم ٹھہرایا جا سکتا ہے اس کے سوا اس عثمانی سلطان پر اور کوئی الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ جنگ انگورہ نے تمام یورپ کو مسلمانوں کا محکوم و مغلوب ہونے سے بچا لیا۔ انگورہ کا معرکہ اگر برپا نہ ہوتا تو جاپان سے انگلستان تک تمام دنیا ایک مرتبہ پرچم اسلام کے سایہ میں آ چکی ہوتی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ انگورہ اس نقصان کی تلافی کب کرتا ہے اور دوسرا بایزید پیدا کر کے بایزید یلدرم کے ارادوں کو کب پورا کرتا ہے۔

تیمور کی حیثیت

تیمور کی دانائی اور کمال اندیشی کی جو اس سے انگورہ کی لڑائی میں ظاہر ہوئی اس لئے داد نہیں دی جا سکتی کہ اس کی فوج پانچ لاکھ سے زیادہ اور اپنے حریف کی فوج سے پنچگنی تھی۔ تیمور کی سفاکی اور بیدردی جو اس نے بایزید یلدرم جیسے رفیع المکان سلطان کو لوہے کے پنجرے میں بند کر کے ظاہر کی اس لئے قابل شکایت نہیں ہے کہ اس نے اصفہان میں ستر ہزار اور ہندوستان میں ایک لاکھ قیدی صرف اس لئے ذبح کر دیئے کہ ان قیدیوں کی حفاظت اور نگہداشت اس کی فوج سے نہیں ہو سکتی تھی۔ دہلی میں پندرہ روز تک قتل عام کرایا اور بیگناہ مرد و عورت نیز معصوم بچوں کا خون اپنی آنکھوں کے سامنے بہایا۔ حلب میں وہ ایک طرف قتل عام کا حکم دے چکا تھا اور مسلمانوں کے خون کی ندیاں گلی کوچہ میں بہہ رہی تھیں تو دوسری طرف مجلس عیش میں مصروف بادہ خواری تھا۔

بہادروں اور شجاعت پناہ لوگوں کے آئین میں خون آشام دشمن کا مقابلہ کرنا۔ حریف شمشیر زن کو قتل کرنا اور خود مقتول و زخمدار ہونا نہایت ہی مستحسن کام ہے لیکن عاجز و درماندہ اور اسیر و بیکس پا کر دشمن پر ہاتھ اٹھانا یا اس کو اپنی رستمی دکھانا بہادران عالم کی شریعت میں گناہ عظیم اور نہایت ہی قابل ملامت حرکت سمجھی جاتی ہے۔

ایک شریف اور بہادر کی تلوار ہتھیار استعمال کرنے والے دشمن کے خون میں نہانے کے لئے بیتاب ہوتی ہے لیکن عورتوں، بچوں اور امان طلب کرنے والے مردوں کے سامنے وہ تلوار ہرگز برہنہ نہیں ہو سکتی۔ بایزید نے بارہ تیرہ سال تک عیسائیوں کا زور گھٹانے اور اسلام کی عزت و عظمت کے قائم کرنے میں اپنی کوششیں صرف کیں لیکن تیمور والی سفاکیاں اس سے ظہور میں نہ آئیں۔ تیمور کو خدا تعالے نے اسلامی ملکوں پر قبضہ کرنے اور مسلمان بادشاہوں کو نالاں رکھنے کے سوا دشمنان اسلام کو زیر کرنے کی توفیق نہ دی لیکن ایام حیات میں جب اس نے چین کے ملک کا ارادہ کیا تو موت نے اس کے ارادہ کو پورا نہ ہونے دیا۔

روئے زمین کے شکست خوردہ بادشاہوں میں غالباً بایزید ہی ایک ایسا بادشاہ ہے کہ بہادران عالم کی مجلس میں اس کی عزت و عظمت مطلق کم نہ ہو سکی۔ فتحمند بادشاہوں میں تیمور ہی ایک ایسا بادشاہ ہے کہ جنگ انگورہ میں کامیاب و فتحمند ہونے کے بعد بھی بہادروں کی مجلس میں اس کی عزت و عظمت نے کوئی ترقی نہیں کی۔

[illegible]

رانک دیوی

سندھی افسانہ

مترجمہ جناب رفعت ہاشمی

کاٹھیاواڑ کو اٹھارویں صدی عیسوی تک "سوراسٹر" کے نام سے پکارا جاتا رہا جو سنسکرت زبان کا لفظ ہے اور جس کے معنی ہیں "عمدہ" یا "عمدہ ملک کی" مگر جب مرہٹوں نے اس پر قبضہ کیا تو انہوں نے اس کا نام کاٹھیاواڑ رکھدیا کیونکہ وہاں "کاٹھی قوم" کثیر تعداد میں آباد تھی اور ہے جس نے بڑی بے جگری سے مرہٹوں کا مقابلہ کیا تھا۔

کاٹھیاواڑ ـــــ کچھ اور کنبھات کے درمیان واقع ہے۔ قدیم زمانہ سے یہ علاقہ ہندوؤں کا متبرک مقام رہا ہے چنانچہ آج بھی کاٹھیاواڑ کے چار اضلاع میں سے جنوبی ضلع کو سوراسٹر یا سورت ہی کہا جاتا ہے۔ منہی ضلع میں گرنار۔ داتار اور پالتیانا تین متبرک پہاڑ ہیں۔ گرنار اور پالتیانا کے درمیان کوئی پندرہ سو مربع میل میں پھیلے ہوئے گھنے جنگلات ہیں۔ جن کا نام "گر بیلو" ہے۔ کوہ گرنار کی چوٹی پر جینیوں اور ہندوؤں کے منادر ہیں اور نیچے مہاراجہ اشوک اعظم کی لاٹھیں آج تک اسی حالت میں کھڑی ہیں۔ ۸۷۵ء میں نئے چوڑا نام ایک راجپوت راجہ نے کاٹھیاواڑ میں اپنی حکومت قائم کی اور ونتھلے نامی شہر کو دارالسلطنت قرار دیا۔ راجہ ہی کے نام پر اس کے خاندان کا نام بھی "چوڑا سمن" پڑگیا جس کا سب سے مشہور اور بہادر راجہ رائے "گر ہرپو" ہو گزرا ہے جس نے ونتھلے سے آٹھ کوس کے فاصلہ پر جھوناگڑھ گاؤں کے قریب اور کوہ گرنار کی اوٹ میں ایک عظیم الشان قلعہ تعمیر کرایا تھا جسے اب "اپرکوٹ" کہتے ہیں۔

جھوناگڑھ کا موجودہ شہر آہستہ آہستہ اسی قلعہ کے چاروں طرف آباد ہوا جس کے بعد سارے شہر کے گرد فلک بوس فصیل حائل کر دی گئی جو آج تک موجود ہے۔

رائے گرہرپو نے ۹۸۲ء میں وفات پائی تو اس کا بیٹا "رائے کورت" سریر آرائے سلطنت ہوا جو ۱۰۰۳ء میں گزر گیا تو پھر اس کا بیٹا "رائے وِیاس" تخت نشین ہوا۔ جسے مہی پال بھی کہتے ہیں۔

یہ خوفناک واقعہ ۱۰۱۰ء میں اپرکوٹ کے قلعہ میں رونما ہوا۔ اسلئے اس سال کو تاریخ کاٹھیاواڑ میں خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس سال سولنکی خاندان کے راجہ "ولبھ سین" نے گجرات کی عنانِ حکومت ہاتھ میں لی۔ اس سال وہ کاٹھیاواڑ پر حملہ آور ہوا اور اس سال رائے ویاس نے اپنے بے نظیر اقدام سے تاریخ عالم میں اپنی نظیر قائم کر دی۔

چونکہ یہ واقعہ سرزمین کاٹھیاواڑ سے متعلق ہے اسلئے مستند تاریخ کاٹھیاواڑ اور دیگر معتبر تاریخی کتب سے حقیقی حالات فراہم کرتے ہوئے اس ایک نئے راز کا انکشاف ہوا کہ رائے ویاس کا قصہ جس طرح کاٹھیاواڑ میں بیان کیا جاتا ہے سندھ میں اس سے مختلف نمونہ پر مروج ہے۔ اور اس کا سبب مزید چھان بین کرتے ہوئے یہ معلوم ہوا کہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ جب سیاحت کرتے ہوئے گجرات (کاٹھیاواڑ) گئے تو وہاں انہوں نے دو کہانیاں سنیں اور بہت عرصہ کے بعد واپس سندھ پہنچنے پر وہ دونوں کہانیاں ان کے ذہن میں گھل مل کر ایک ہو چکی تھیں اور ایسا ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ دونوں داستانوں میں تقریباً ایک ہی قسم کے واقعات اور نام توڑ مروڑ کر بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً اصل حکایت میں کمہار کا نام "رتنو" ہے مگر دوسری میں "ہرمیتو" اور ابتدا حالانکہ دونوں قصوں کی مختلف طریقہ سے کی گئی ہے مگر اختتام سوائے چند جزوی اختلافات کے ایک دوسرے کے بہت قریب ہے۔ اسی وجہ سے شاہ صاحب نے بھی اپنے اشعار میں رائے ویاس اور "رائے دیاچ" دونوں نام درج کر دئے ہیں اور "رانک دیوی" اور "رانی چندروتا" کو بھی ایک ہی سمجھ لیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایسی مسخ شدہ داستان ان کے دیوان کی دوسری حکایات کی طرح کسی قدیم تاریخ مثلاً "تاریخ طاہری" "تاریخ معصومی" اور "تحفۃ الکرام" وغیرہ سے ماخوذ نہیں ہو سکتی اور نہ اس سے متعلق شاہ صاحب کے عہد سے پہلے کے کسی شاعر مثلاً شاہ عبدالکریم بلڑے والوی وغیرہ کے اشعار دستیاب ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ میں نے شاہ صاحب

کے دیوان کے علاوہ تاراچند یوپٹ لال کی گجراتی تصنیف " ویرنی واتو " کے سندھی ترجمہ دلبر فوربس ہیل کی تاریخ کاٹھیاواڑ " اور نارکس کی تالیف " راس لا " سے حتے الوسع اس کہانی کے صحیح واقعات جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔

رائے ویاس کے عہد حکومت میں ونتھلے میں رتنو نام ایک دھوبی رہتا تھا۔ اس کی ایک ماہ پارہ دختر تھی جسے اس نے بڑے ناز و نعم سے پالا تھا اور چونکہ لڑکی کے خدوخال بالکل راجکماریوں ایسے تھے اسلئے وہ اسے رانک دیوی (چھوٹی رانی) کے نام سے پکارتا تھا۔

ایک مرتبہ گجرات کا راجہ ولبھ سین چند درباریوں کے ساتھ بھیس بدلکر سیر کرتا ہوا ونتھلے آپہنچا اور اتفاق سے رانک دیوی کو دیکھ پایا اور راجہ کے ہمراہیوں نے بھی اسے دیکھ کر خیال کیا کہ یہ حوروش ہمارے راجہ کی رانی بننے کے قابل ہے اور فوراً ولبھ سین کے سامنے دست بستہ اپنے خیال کا اظہار کردیا۔ اگرچہ راجہ ایک غریب اور اچھوت کی بیٹی سے شادی کرنے کو تیار نہ تھا مگر دھوبن کی موہنی صورت چونکہ حسن شاہی کو مات کررہی تھی اسلئے حسب نسب کا امتیاز بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ اس سے بیاہ کرنے پر آمادہ ہوگیا اور پھر سب رانک دیوی کے باپ کے پاس آئے اور اس کے سامنے بلاتامل حرف مطلب زبان پر لے آئے۔

کشور حسن میں اورنگ و افسر سجدہ ریز ہوگئے۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ رتنو پھولا نہ سماتے ہوئے بولا۔

" ہماری قسمت اچھی ہے کہ آپ ایسے زبردست راجہ ہماری بیٹی سے شادی کرنے کے خواہشمند ہیں مگر سرکار! میری یہی ایک بچی ہے جسے میں اس طرح خاموشی سے نہیں بیاہ سکتا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ مہینہ کے اس دن ہم سب انہلواڑہ آپہنچیں گے۔

بہت ردوکد کے بعد ولبھ سین رضامند ہوا اور سب گجرات واپس چلے گئے۔

وعدے کا دن آپہنچا۔ رتنو کے گھر باجے بجنے لگے اس نے رشتہ داروں اور عزیزوں کو دعوت دیکر بڑی دھوم دھام سے ایک شاندار برات سجائی اور انہلواڑہ جانے کی تیاری کرنے لگا۔

چند کاٹھیاواڑی منصبداروں نے جو ایک غریب دھوبی کا ایسا ظاہرہ شان و شوکت دیکھا تو ان میں سے ایک نے ایک براتی سے پوچھا " یہ کیا معاملہ ہے ؟ "

براتی :- سرکار رتنو اپنی پتری رانک دیوی کو راجہ ولبھ سین سے بیاہنے جا رہا ہے۔

وہ سب حیران ہوئے اور بھاگتے ہوئے شاہی محل پر پہنچے اور راجہ سے سب حال بیان کردیا۔

رائے ویاس یہ سنکر آگ بگولا ہوگیا اور انتہائی غصہ سے کہا۔

" ہمارے ملک کی لڑکی ہمارے دشمن سے بیاہی جائے یہ بات ہماری شان کے خلاف ہے۔ جاؤ رتنو سے میرے لئے کنیا مانگو اگر وہ انکار کردے تو اسے اور اس کی بیٹی دونوں کو گرفتار کرکے لے آؤ۔"

افسر سپاہیوں کی ایک بھاری تعداد کے ساتھ رتنو کے پاس پہنچے اور اسے شاہی فرمان سے آگاہ کیا مگر رتنو نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔

" میں رانک دیوی کو ولبھ سین سے بیاہنے کا وعدہ کرچکا ہوں اب اگر اپنی بات پر قائم نہ رہوں گا تو ایک طرف لوگوں کے سامنے شرمندہ ہونگا تو دوسری طرف ولبھ سین میری کھال کھینچ ڈالے گا۔"

افسروں نے اسے بہتیرا سمجھایا اور دلاسا دیا کہ اسے ولبھ سین کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا مگر رتنو نہ مانا اسلئے شاہی کارندے اسے اور اسکی بیٹی کو گرفتار کرکے رائے ویاس کے پاس لے گئے۔

رائے ویاس گرج کر رتنو سے مخاطب ہوا۔

" میرے دشمن کے ساتھ تمہیں اپنی بیٹی کی شادی کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ اب یہی بہتر ہے کہ ولبھ سین کو نیچا دکھانے کیلئے تمہاری لڑکی سے میں خود بیاہ کرلوں ــــــ "

دونوں وقت مل رہے تھے کہ رانک دیوی کو رائے ویاس سے بیاہ دیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آسمان ستاروں کے پھول برسانے لگا۔

عین اسوقت حکومت گجرات کے دارالخلافہ انہلواڑہ پاٹن میں گھر گھر شادیانے بج رہے تھے۔ مکانات اور بازار سجائے گئے تھے۔ ہر جگہ سے رقص و سرود کی آوازیں آرہی تھیں۔ ولبھ سین مسرت بے پایاں سے جھومتا ہوا خزانے کے دروازے کھول کر غریبوں کو منہ مانگا انعام دے رہا تھا۔

امیر و وزیر برات کے استقبال کے لئے محل کے صدر دروازے کے قریب چشم براہ تھے، بے شمار شاہی کارکن شادی کے انتظامات میں جوتے کہ ایک پہر رات گزرے۔ ولبھ سین کے ونتھلے بھیجے ہوئے جاسوس گھوڑے دوڑاتے واپس آئے اور فوراً ہی راجہ کو حقیقت حال سے آگاہ کردیا۔

راجہ اپنی بے عزتی کی خبر سنکر آتش زیرپا ہوگیا اسے ایسے اندھیر کا خواب و خیال بھی نہ تھا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ کاٹھیاواڑ پر اپنی حکومت قائم کرنے کا نہ یہ موقع ہاتھ آیا ہے۔ دوسرے ہی دن جب سورج کی خون آشام کرنیں تاریکی شب سے نبرد آزما ہوئیں۔ وہ ایک لشکر جرار کے ساتھ ونتھلے پر حملہ آور ہوا۔

انقلابِ فلک نے رنگ میں بھنگ ڈال دی۔ رائے ویاس کے بہی خواہ جو اپنے راجہ کے بیاہ کی خوشی میں نہایت لطف سے دادِ عیش دے رہے تھے غنیم کی یکبارگی یلغار سے گھبرا گئے اور میدانِ جنگ میں جم کر مقابلہ نہ کر سکے۔ دورانِ جنگ ہی میں واژوں بخت رائے ویاس ہوا کا رُخ دیکھ کر اپنے خاندانی افراد اور جاں نثاروں کی ایک کثیر تعداد کے ساتھ شاہی محلات کی زمین دوز سرنگ سے اپرکوٹ کے حصارِ عافیت میں جا پناہ گزیں ہوا اور ونتھلے بلا زحمت و صعوبت دشمن کے قبضے میں آ گیا۔

غیظ و غضب سے بھرا ہوا ولبھ سین ہاتھ میں شمشیر لئے لئے ویاس کو گرفتار کرنے کیلئے اہلِ سیف کے چند دستوں کی معیّت میں شاہی محل میں پہنچا اور گرج کر کہا۔

"کہاں ہے رائے ویاس کہ تجے اُس کی شایانِ شان نازنین بیاہ دیں"

مگر محلات سُونے پڑے تھے۔ ہر طرف خاک اُڑ رہی تھی۔ ولبھ سین کے سینہ میں آتشِ انتقام شعلہ زن تھی۔ ونتھلے کے قصرِ شاہی کے بامِ رفعت پر چند دامن رایتِ ظفر نصب کرنے کے بعد وہ سیدھا جھوناگڑھ پہنچا۔

امیدیں تو بڑی بڑی تھیں مگر اُسے تھوڑے ہی عرصہ میں معلوم ہو گیا کہ اپرکوٹ پر قبضہ کرنا بچوں کا کھیل نہیں اسلئے اس خیال سے قلعہ کا محاصرہ کر کے بیٹھ گیا کہ کم و بیش عرصہ میں جب قلعہ میں اشیائے خورد و نوش کی قلت ہو جائیگی تو رائے ویاس خود بخود اسیر ہونا قبول کر لیگا۔

مگر یہ اس کا خیال خام تھا۔ قلعہ میں اناج کے ڈھیر لگ رہے تھے اور پانی کا بھی اعلیٰ انتظام تھا۔ برسوں کھانے پینے کی تکلیف کا قلعہ والوں کے پاس پھٹکنا ناممکن تھا۔

ولبھ سین کی اس طویل غیر موجودگی کے باعث گجرات میں بھی اوراقِ حکومت منتشر ہو رہے تھے اور جھوناگڑھ میں حملہ آور فوج کو بھی مایوسی نے گھیر لیا تھا۔ یہ دیکھ کر ایکدن ولبھ سین نے خیال کیا کہ اس حالت میں جب کہ کامیابی کی کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی۔ قلعہ کو قبضے میں کرنے کیلئے کسی حکمتِ عملی سے کام لینا چاہیئے اور اس خیال کے آتے ہی اس نے سنہری سکوں کے ایک تھال کے ساتھ جھوناگڑھ اور ونتھلے میں ڈھنڈورا پٹوایا کہ۔

"جو شخص رائے ویاس کا سر کاٹ کر لائیگا۔ اُسے نعم البدل کے طور پر نہ صرف سنہری سکوں سے بھرا ہوا یہ تھال بلکہ اور بھی منہ مانگا انعام ملیگا"

بیجل نامی ایک بھاٹ کی بیوی نے جب یہ منادی سنی تو بھاگی ہوئی آئی اور تھال کو تھام کر شاہی کارندوں سے بولی۔

میرا پتی رائے ویاس کا سر لا کر راجہ کے قدموں میں رکھ دیگا۔

افسر۔ ہمیں منظور ہے لیکن اچھی طرح سوچ بچار کر لو۔ بیڑا اُٹھا کر تمہارا پتی ناکام رہا تو اس کی سزا بہت سخت ہوگی۔

بیجل کی بیوی۔ آپ بے فکر رہیں اتنا بڑا لشکر راجہ کے جس مقصد کو پورا نہیں کر سکا۔ دیکھنا میرا پتی کیسے پورا کرتا ہے۔ رائے ویاس کا سر آپ کا ہم پر قرض رہا۔

یہ کہہ کر وہ تھال اُٹھا کر گھر لے گئی۔

جب بیجل گھر آیا اور اسے اس کی بیوی نے تھال دکھا کر سب حال سے آگاہ کیا تو بیجل کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے خوف اور غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔

"تیرا بیڑا غرق ہو۔ یہ تو نے کیا کیا۔ اب اگر بات پوری نہیں کر پاتے تو راجہ ہمارے خاندان بھر کو مروا ڈالے گا"

آخر کار کوئی چارہ کار نہ دیکھتے ہوئے بیجل با دلِ ناخواستہ اپنے یکتارے کو صاف کر کے اور اُسے پھولوں سے سجا کر گھر سے نکل کھڑا ہوا اور اپرکوٹ کی طرف چل دیا۔

اپرکوٹ پہنچنے کے بعد رانک دیوی نے اپنے پتی کے متعلق ایک خوفناک خواب دیکھا تھا جس کے بعد اس کیلئے خواب و راحت حرام ہو گیا تھا۔ وہ دن رات پتی کی دیکھ بھال کرتی رہتی اور قلعہ میں ہر طرف ایسا سخت پہرہ قائم کر دیا۔ کہ بجز اپنوں کے کوئی نا جنس رائے ویاس کے کمرے میں داخل نہ ہو سکتا تھا۔

بیجل جب یکتارہ کاندھے پر رکھے قلعہ کے صدر دروازے پر پہنچا تو بھاٹ ہونے کی وجہ سے بے روک ٹوک اندر داخل ہو گیا کیونکہ اس زمانے میں بھاٹ ہندو راجاؤں کے دربار میں قصیدہ گوئی کی حیثیت سے خاص عزّ و وقار کے مالک ہوا کرتے تھے۔ راجے مہاراجے بھی ان کے منہ پھٹ اور نڈر ہونے کے باعث ان سے خوف کھاتے اور ان کی مرضی کے خلاف قدم نہیں اُٹھاتے تھے کہ کہیں بھاٹ رعایا میں اُنہیں خوار نہ کرے اور جو کوئی ان کا سوال رد کر دیتا تو وہ دھرنا مار کر بیٹھ جاتے اور بعض تو اپنی بات منوانے کیلئے خودکشی بھی کر لیتے۔ جو خود راجہ کے بھاٹ کو قتل کر دینے کے مرادف اور اس کی سخت ترین بدنامی کا باعث ہوتا تھا۔

بیجل قلعہ میں تو آسانی سے داخل ہو گیا مگر ویاس سے ملنا البتہ ایک مشکل کام تھا اسلئے پہلے تو دربان سے معلوم کیا کہ ویاس قلعہ کے کون سے گوشہ میں مقیم ہے اور معلوم کر کے اس جگہ جا بیٹھا اور ساز پر ویاس کی مدحت سرائی شروع کر دی۔ تھوڑی ہی دیر میں سحرِ موسیقی نے سامعین کو محو کر لیا۔ اپنی تعریف سُنکر رائے ویاس نے رنگ محل کی کھڑکی سے سر نکال کر کہا۔

"مانگ کیا مانگتا ہے"

بیجل۔ مجھے صرف آپ کے درشن کی ضرورت ہے۔ مہربانی کر کے اوپر

اپنے پاس بلالیں، ایک راز کی بات کہنا ہے۔

سیڑھیاں چونکہ بند رہتی تھیں۔ اسلئے رائے ویاس نے محل کی کھڑکی سے ریشم کی ایک سیڑھی لٹکائی جس کے ذریعہ بھاٹ اوپر پہنچا اور فرش پر قدم رکھتے ہی پاسِ ادب سے زمین بوس ہوگیا۔ اور پھر سر اُٹھا کر پکارا۔

"چوڑاسمن کے سردار رائے ویاس کی جے"

اور ساتھ ہی بیٹھ کر پھر کیتارہ بجانے اور تعریف کا گیت گانے لگا۔

دونوں کے سوا کمرے میں کوئی اور موجود نہ تھا۔ بیجل نے کمالِ فن کا ایسا مظاہرہ کیا کہ رائے ویاس کا دل موہ لیا اور وہ عالم بے خودی میں جھومتا ہوا انتہائی جوش سے پکار اُٹھا ——

"مانگ کیا مانگتا ہے؟"

یکلخت نغمے کا بہتا ہوا دریا رُک گیا۔ بیجل نے دست بستہ عرض کی۔

"میں تو بہت کچھ مانگ لوں لیکن اگر آپ انکار کردیں تو خواہ مخواہ دُنیا میں آپ کا چرچا ہوگا۔ مجھے صرف اس بات کا خوف ہے۔

رائے ویاس - تو کوئی فکر نہ کر۔ میں تجھے بچن دیتا ہوں کہ تو جو کچھ مانگے گا فوراً پائے گا۔

بیجل - سرکار! دھن دولت آنی جانی چیز ہے اور آپ کے طفیل میرے پاس اس کی کمی بھی نہیں۔ آپ کی دیا کا چرچا سنکر یہ سر جو آپ کے بدن کا سنگار ہے اس کا طلبگار ہو کر آپ کے دوارے آیا ہوں۔ یقین ہے کہ اب انکار نہیں کرینگے۔

رائے ویاس کو اس نرالی طلب پر سخت حیرت ہوئی تاہم چہرے پر آثارِ ملال نمودار نہ ہوئے بلکہ مُسکرا کر گویا ہوا۔

"بس اسقدر کشمکش کے بعد مانگا بھی تو سر۔ بھلے آدمی اس خالی ہڈی سے تجھے کون سا خزانہ مل جائیگا"

بیجل - اس سے آپ کو کیا واسطہ؟ عام فقیروں کی طرح میں کوئی روپے پیسے کا بھوکا نہیں۔ یہی آرزو تھی کہ کوئی ایسا انوکھا دان مانگوں کہ ساری دنیا میں مشہور ہو جاؤں۔ آپکے سر کے بغیر مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے۔

رائے ویاس - تیری اگر یہی مرضی ہے تو میں تجھے اپنا سر بڑی خوشی سے کاٹ دوں گا۔

ایک ناآشنا آواز سنکر دہشت کے مارے رانک دیوی کا رنگ زرد ہوگیا۔ وہ بھاگتی ہوئی اندر آئی اور حقیقتِ حال سے آگاہ ہونے پر سر پیٹ لیا اور زار و قطار روتے ہوئے بیجل سے مخاطب ہوئی۔

"تو اس بات سے ٹل جا، دیکھ میں تجھے ایسا انعام دونگی جو تجھے کبھی کسی نے نہ دیا ہوگا اور نہ کوئی دے سکے گا"

مگر بیجل باز نہ آیا۔ اتنے میں رائے ویاس کی بہن آ پہنچی، معاملہ سے واقف ہو کر اس نے خیال کیا کہ اگر میرا بھائی وچن پورا نہیں کرتا تو ہمیشہ کے لئے ہمارے خاندان پر کلنک کا ٹیکہ لگ جائیگا۔ اس لئے حوصلہ رکھ کر نیچی آواز میں بھائی سے کہا۔

"بھائی، بھاٹ کو سر کاٹ کر دے دو"

یہ شور و غل سنکر رائے ویاس کی ماں بھی بھاگتی ہوئی آئی اور سب باتیں سنکر بیٹے کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے بولی۔

"بیٹا کہیں اپنے قول سے پھر نہ جانا، سر دے کر سرفراز ہوجا"

ساس اور نند کی یہ استقامت دیکھ کر مجروحِ الم حرماں نصیب رانک دیوی نے بھی دو زانو ہو کر پتی کو پرنام کیا اور کہا۔

"پران ناتھ، آپ بیشک اپنا اقرار پورا کریں۔ آپکی یہ داسی بھی آپکے ساتھ ہی سورگ میں جا کر آپ کی سیوا کرے گی"

رائے ویاس کا دل انتہائی مسرت سے معمور ہوگیا۔ اس نے ہاتھ باندھ کر سب کو آخری سلام کیا اور بھاٹ سے بولا۔

ایک سر تو کیا اپنے بچن پر سارے خاندان کو قربان کرنا پڑے تو ویاس ایسا نہیں کہ ٹل جائے۔

ساتھ ہی کٹار کھینچ کر اپنی گردن پر ماری۔ دھڑ ایک طرف اور سر دوسری طرف جا گرا۔ رانک دیوی تیورا کر گر پڑی۔

بیجل کی ہٹ دھرمی بھی فوراً ہی رنگ لائی! اسے اس کا ضمیر کاٹنے کو دوڑا اور وہ بے اختیار پکارنے لگا۔

"ہائے بھگوان میں نے یہ کیا کیا! کیوں کیا!! لاکھوں مر جائیں تو سمجھوں کہ راجہ پر قربان ہوگئے۔ مگر لاکھوں کے پالنہار کا کبھی بال بھی بیکا نہ ہونا چاہیئے۔ ہائے۔ افسوس میں نے تو لاکھوں کے ان داتا کو مار کر سارے ملک کو رُلا دیا۔ اب اس مہا پاپ سے کس طرح چھٹکارا ہوگا"

بیجل آنسو بہا رہا تھا اور رائے ویاس کی کھلی ہوئی آنکھیں گویا اس سے کہہ رہی تھیں کہ —— "سر سنبھال لے"

بھاٹ بدحواس ہوگیا۔ اس کے ہاتھوں میں سر اُٹھانے کی ہمت نہ رہی۔ آخر کار راجہ کی ماں نے التجا آمیز لہجہ میں کہا۔

"بیجل جب تک تو یہ سر اپنے ہاتھوں میں نہ اُٹھائیگا اسوقت تک ویاس کی آتما کو شانتی نصیب نہ ہوگی۔ مہربانی کر کے سر قبول کر"

کوئی اور صورت نہ دیکھتے ہوئے بیجل نے جھک کر خون سے لتھڑا ہوا سر اُٹھا لیا۔

آناً فاناً اس حادثہ کی خبر قریب و دور جا پہنچی ہر جگہ صفِ ماتم بچھ گئی۔

ولبھ سین کو بھی سب حال معلوم ہوگیا۔ بیجل جب سر اٹھائے دربار میں حاضر ہوا۔ تو ولبھ سین نے اُسے دور ہی سے چیخ کر کہا۔

ٹھہر، کمینے، لالچ میں ویاس ایسے دیا کے اوتار کا سر لینے سے بھی دریغ نہ کیا۔ نہیں معلوم ہمارے ساتھ کیا گزرے گی۔ تو ہمارے ملک میں رہنے کے قابل نہیں۔ فوراً چلا جا۔ خبردار اگر پھر کبھی اسطرف کا رُخ بھی کیا۔

بیجل کے ہوش اڑ گئے۔ شامتِ اعمال سے شکستہ خاطر ہوکر دیوانوں کی طرح الٹے پاؤں اپرکوٹ کی طرف بھاگا۔

اپرکوٹ کے قلعہ میں چندن کی چتا کے قریب رانک دیوی ہار سنگار اور سج دھج سے چتا پر بیٹھنے کیلئے تیار ہو چکی تھی۔ اور لوگوں کا ایک جم غفیر ستی کا درشن کرنے کیلئے جمع تھا۔

اچانک ایک دیوانہ ہاتھوں میں ایک متبسم چہرے والا سر لئے دوڑتا اور پکارتا ہوا آتا دکھائی دیا۔

بچاؤ، بچاؤ، کوئی ہے جو سینہ کی بھڑکتی آگ بجھائے۔ اے ستی۔ یہ خوش قسمت سر میرے پاپی ہاتھوں میں بھلا معلوم نہیں ہوتا۔

ستونتی نے سر لے کر بیجل کو دُعا دیتے ہوئے پرماتما سے التجا کی۔

" اسے پرمیشور اس بے چین آتما کو شانتی اور سکھ عطا کر "

یہ کہہ کر پتی کی لاش گود میں رکھ کر چتا پر جا بیٹھی۔

گھی کے کنستر پلٹ کر آگ لگا دی گئی۔ اور آناً فاناً شعلے آسمان کو دعوت مقابلہ دینے لگے۔ اور ....

(رانک دیوی آہستہ آہستہ چشم عالم سے روپوش ہوگئی) [۵]

" گرمکھیانی " (سندھی)

---

[۵] رائے ویاس کی خودکشی کے بعد ولبھ سین کاٹھیاواڑ میں اپنا ایک نائب مقرر کرکے گجرات چلا گیا۔ مگر دس سال کے بعد ہی حکومت کی باگ ڈور پھر رائے ویاس کے بیٹے " رائے نوگھن " کے ہاتھ میں آگئی۔ (روح رومان)



ابتدائی زندگی ہی سے کفایت شعاری کی عادت ڈالئے اور بچہ کیلئے سرمایہ حاصل کیجئے

اورینٹل

قائم شدہ ۱۸۷۴ء

سے جو کہ ایک مضبوط اور ہندوستان کی سب سے مشہور بیمہ زندگی کمپنی ہے بچوں کے مخصوص بیمے کی پالیسی حاصل کریں

بچوں کا مخصوص بیمہ اس لئے تجویز کیا گیا ہے کہ والدین ادنیٰ شرح پر بچوں کے لئے محدود اقساط پر تمام کی پالیسی یا اکرای بیمہ کی پالیسی حاصل کر سکے ان پالیسیوں کے ماتحت کمپنی کی ذمہ داری کسی منتخبہ عمر سے شروع ہوگی جو بچے کی ۲۲ سال کی عمر سے پہلے نہیں ہوگی،

مزید معلومات کیلئے

لالہ گوپال داس سونی ایف۔سی۔آئی (اڈنبرگ)، ایف۔آر۔ای۔ایس (لندن) برانچ سکریٹری

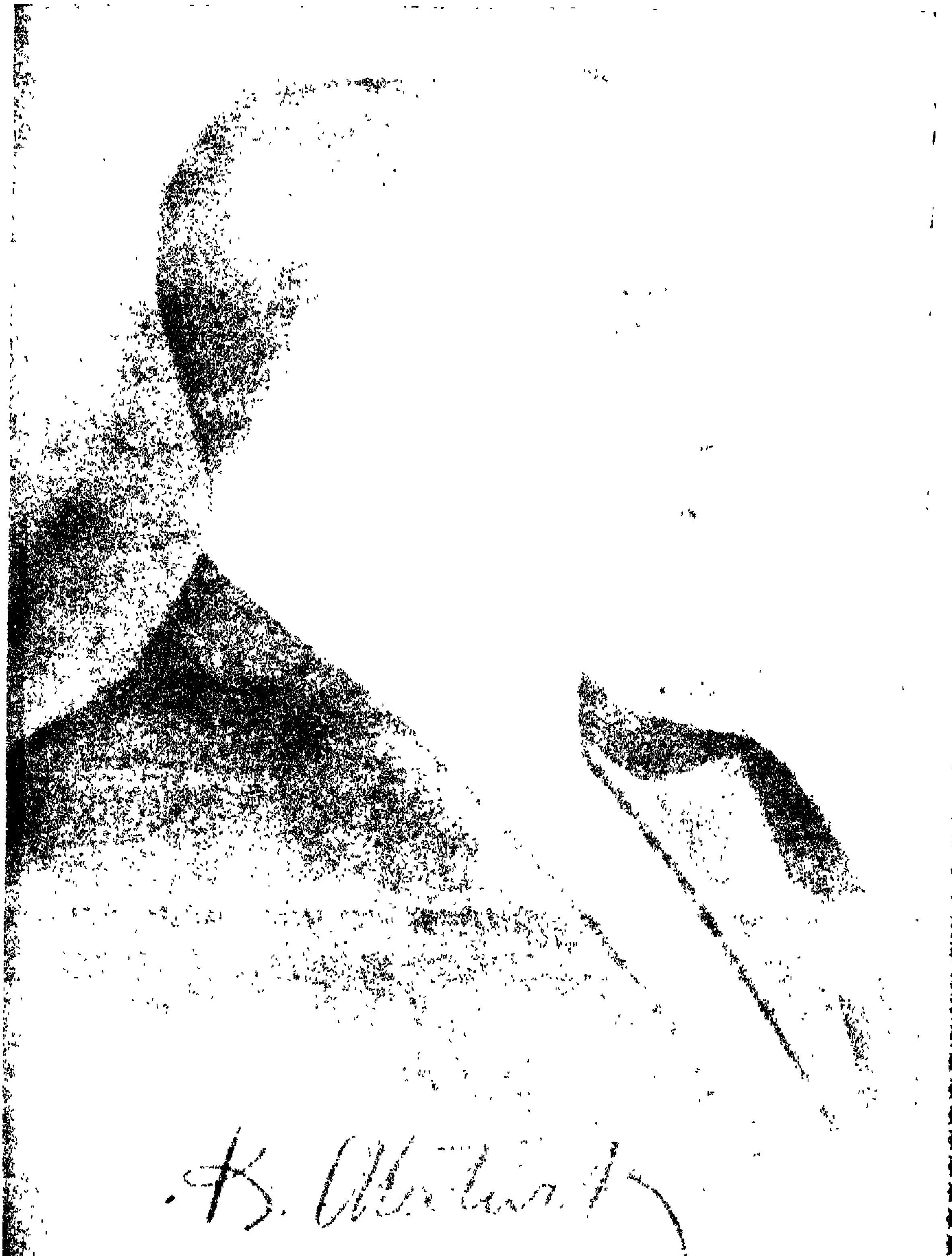
اورینٹل گورنمنٹ سکیورٹی لائف انشورنس کمپنی لمیٹڈ ۷ سی وی مال لاہور

سے خط وکتابت کیجئے

صدر دفتر بمبئی!



حضرت اتاترک مرحوم



حضرت آتاترک مرحوم



غازي عصمت انونو صدر جمهوريه تركيه

التجائے تغافل

نظم

از حضرت احمد ندیم قاسمی بی، اے

لبریز کر کے آج میرا ساغرِ شراب — ساقی نے مسکرا کے کیا مجھ سے یوں خطاب
"وارفتۂ ازل! تیری وحشت کے سامنے — بے رنگ ہے بھڑکتے جہنم کا اضطراب
یہ تیری بے نیاز طبیعت کے رنگ ڈھنگ — پہلو میں جیسے چاند ہیں قدموں میں آفتاب
اعجازِ عشق ہیں تیری آتش نوائیاں — حوروں کو کھینچتا ہے زمیں پر ترا رباب
دونوں جہان تیرے تخیل میں گرمِ سیر — یہ کائنات تیرے لئے گنبدِ حباب
تیری نظر ہے چاند ستاروں کی رازداں — تیری نگاہِ تیز کی قوت ہے بے حساب
مدت سے میں بھی تیری رضا کی غلام ہوں — رہتی ہوں صرف تیرے لئے بے نیازِ خواب

اِس پر بھی تیری روح ہے کیوں وقفِ رنج و غم
کیوں لوگ کہہ رہے ہیں تجھے خانماں خراب!"

میں نے کہا "ہے گرچہ ترا حسن دلنواز — بے رس ہے میرے عشق کا افسانۂ دراز
معراج ہے حیات کی وہ دردِ عاشقی — ہو جس کے التہاب سے روحِ ازل گداز
مٹی پہ لوٹنے میں جو لذت ہے ہمنشیں! — ملتی نہیں ہے چھو کے ترا آستانِ ناز
سر دھن رہی ہے بارگہِ حق میں زندگی — کھویا ہے جب سے میں نے جنوں خانۂ مجاز
پنہاں خروشِ نغمہ میں ہے زہرِ بے خودی — معصوم مستیوں کا امیں ہے سکوتِ ساز
ہے سر پٹخ کے دشت میں مرنا مجھے قبول — اے کاش! کوئی پھیر لے مجھ سے نگاہِ ناز
محرومیوں میں ہیں خلشِ عشق کے مزے — اِن الجھنوں سے اب مرا سینہ ہے بے نیاز

اے کاش پھر کوئی مجھے ٹھکرائے دمبدم
پھر اپنے رخ پہ ڈال دے کوئی حجابِ ناز!"

بابل اور نینوا

مختصر تاریخ

از جناب خان صاحب حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر اکبرآبادی

نوح علیہ السلام کے طوفان کے بعد جو مہذب حکومتیں قائم ہوئیں ان میں بابل کا بھی شمار ہے اِس شہر کو نوحؑ کے منجھلے بیٹے سام کی اولاد نے آباد کیا تھا۔ اس کے بعد نمرود نے اِس شہر کی بُنیاد رکھی۔ نمرود کنعان کا بیٹا تھا اور کنعان حام بن نوحؑ (یہ نوحؑ کے چھوٹے بیٹے تھے) کا پوتا تھا۔

نینوا کے آباد کرنے والے جرامقہ تھے اور فالغ سام بن نوحؑ کے پڑپوتے کی سلطنت کو خاندان جرامقہ کے بادشاہ نے تباہ و برباد کرکے اپنا اقتدار قائم کرلیا۔

بابل اور نینوا دُنیا کے دو قدیم متمدن اور خوبصورت شہر تھے۔ جن کو سامی نسل کے بادشاہوں نے آباد کیا تھا۔ بابل کی بُنیاد نمرود نے تقریباً دو ہزار ایک سو سال قبل مسیح سے رکھی۔ بابل کے مشرق میں موتساگروس شمال میں آرمینیا اور جنوب مغرب میں دریائے فرات ہے۔

نینوا کی بنیاد شاہ فینوس نے تقریباً دو ہزار برس قبل مسیح ڈالی اور آباد کیا۔ اسی زمانہ میں حضرت ابراہیمؑ بمقام اُریا اُور پیدا ہوئے اور سن شعور کو پہنچکر آپنے بُت شکنی کی۔ اور نمرود کے حکم سے بمقام بیر نمرود آگ میں ڈالے گئے یہ آگ خدا کے حکم سے آپ پر گلزار بن گئی۔ بیر نمرود کا نام بورسیا ہے۔ اور چاہِ ہاروت وماروت اسی مقام پر تھا۔

شہر بابل کے آباد کرنے والے سبطی اور شہر نینوا کے بانی جرامقہ تھے اور یہ دونوں آپس میں ماموں بھانجے تھے تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ سبطیوں کا اقتدار جرامقہ سے پہلے ختم ہوچکا تھا۔ کیونکہ نینوا کے بادشاہ سنجاریف نے سبطی سلطنت کا خاتمہ کرکے اس کو سلطنت جرامقہ میں شامل کرلیا تھا۔ سنجاریف کا گورنر بخت نصر اس سے باغی ہوگیا اور اس کو قتل کرکے خود بادشاہ بن بیٹھا۔ اور پینتالیس سال تک حکومت کرتا رہا۔ اس نے اپنا اقتدار مصر، سوڈان اور طرابلس تک قائم کرلیا تھا۔ یہ بڑا ظالم تھا اس نے بیت المقدس پر فوج کشی کرکے کئی مقدس عمارات کو نقصان پہنچایا اور یہاں کے یہودی باشندوں کو قید کرکے بابل لے گیا۔ بخت نصر کے بیٹے مراد نے ۳۲ بتیس سال حکومت کی۔ مراد کے بیٹے پر فارس کے بادشاہ دارا شاہ نے فوج کشی کرکے فتح حاصل کی اور اپنا قبضہ جمایا۔ دارا شاہ کو سکندر نے شکست دیکر اس خوبصورت شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی مختصر یہ کہ بابل کی سبطی سلطنت کو جرامقہ نے تباہ کیا اور سلطنت جرامقہ کو کسدانیوں (بخت نصر) نے برباد کیا۔ اور کسدانیوں کو کیانیوں (دارا) نے اور کیانیوں کو سکندر نے برباد کیا۔ محکمہ آثار قدیمہ نے ان دونوں شہروں کے کھنڈرات کی کھدائی کرائی ہے قدیم زمانہ کے کتبے، سکے اور اکثر نوادرات برآمد ہوئیں جو یورپ اور امریکہ کے عجائب خانوں میں محفوظ ہیں اور بعض کتبوں کی تحریریں پڑھی بھی گئی ہیں اور اکثر کتبے زیر تحقیق ہیں۔

علامہ ابن سعید نے لکھا ہے کہ حام بن نوحؑ کی اولاد میں کوش بن حام نے سب سے اوّل سلطنت کی بُنیاد بابل میں قائم کی اور کچھ عرصہ تک انہوں نے شام میں بھی قیام کیا۔ بابل میں اٹھارہ کوس مربع ایک شہر آباد کیا اسی کنعان کا بیٹا نمرود تھا۔ بابل میں یہ نمرودی خاندان (اس خاندان کے ہر فرد کا لقب نمرود ہوتا تھا) تیرہ سو سال تک حکومت کرتا رہا۔ نمرود بن کنعان نے ایک عالیشان محل بنوایا جس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے اس کے زمانہ میں بُت پرستی کا زور شور تھا۔ اس نے صابئی مذہب کو بہت ترقی دی تھی۔

نمرودیوں (سلاطین بابل) ہی سے مصریوں نے طلسمات اور سحر کی تعلیم حاصل کی تھی جس کو فرمانروایان مصر (فراعنہ) نے کمال کو پہنچادیا تھا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ پر فرعون اور اس کے ساتھی اپنے سحر کے گھمنڈ میں لڑنے کے لئے آگئے تھے۔

تفصیل ملاحظہ ہو تحقیقات ماہر علم الحروف صفحہ ۲۴- آب ور کا نام مقام فقیر ہے۔ ۱۲

اندھا

ایڈورسن لِف کا نفسیاتی افسانہ

مترجمہ جناب ایم اے خان یوسفی

کہتے ہیں کہ وہ پیدائشی اندھا تھا۔ اس کی بے نور آنکھوں میں جن کی بے پایاں گہرائیوں میں خاموش شکلیں ناچتی رہتی تھیں۔ پامال شدہ جذبات جھلکتے تھے۔ آنکھیں کھولتے ہی اس نے خود کو ایک مہیب اور تاریک دُنیا میں تنہا پایا۔ لیکن اس کا یہ نقص جس نے اس کی تمام زندگی کو ——— مہد سے لے کر لحد تک ——— یاس و حسرت اور تاریکی و تنہائی کا ایک بھیانک مرقع بنا دیا تھا۔ موروثی نہ تھا۔ اسکی ماں ایک شریف النفس عورت تھی ——— نیلی نیلی ہوشربا آنکھوں والی حسین عورت ——— نکھرا ہُوا سفید رنگ، گداز ٹھوڑی میں ایک خوشنما گڑھا، مضبوط کاٹھی، اس کا باپ بھی بقدیم شرفاء سے تھا جن کی پیشانی پر اندھے پن جیسے عیب کا داغ کبھی نہ لگا تھا۔ اسلئے اس کی قابلِ رحم معذوری کی وجہ اور بھی چیستان بنکر رہ گئی تھی۔ مشیت کی قہرمان مصلحتوں میں یہ ایک پُراسرار مصلحت تھی جس کی علت دریافت کرنا دنیوی علوم کی دسترس سے باہر تھا۔

کسقدر دلسوز حقیقت ——— وہ اندھا تھا!

اس کیلئے چمکدار دھوپ، گرمی کے خوشگوار احساس سے زیادہ حقیقت نہ رکھتی تھی۔ عزیز و اقربا اس کے نزدیک چند میٹھی میٹھی محبت آمیز آوازوں کا مجموعہ تھے جو اسے نظر نہ آتے تھے۔

لیکن جن کے جسم کی گرمی، جن کے ٹٹولتے ہوئے ہاتھ، جن کے جلتے ہوئے ہونٹ، اور گرم گرم آنسوؤں کو وہ اکثر اپنے رخساروں پر بہتا ہُوا محسوس کرتا تھا۔ اس کی تاریک دُنیا دلسوز مصائب، ناقابلِ عبور رکاوٹات اور نوکدار زہریلے کانٹوں سے پُر تھی جو قدم قدم پر اس کے چبھتے تھے اور جنکی کسک سے وہ بلبلا اٹھتا تھا۔ اسکی دنیا معمورہ تھی خوف و الم اور شور و غل کا جو اس کے کانوں کے پردے چیرتا ہُوا معلوم دیتا تھا۔ اس کی دنیا نام تھا اس مقام کا جس کی سطح نہایت کھردری، ناہموار اور سخت تھی، جس کو وہ اپنی حساس انگلیوں سے چھو کر کچکچا کر دانت بھینچ لیا کرتا تھا۔

روشنی اور سایہ، دن اور رات، صورت اور رنگ، فاصلہ اور تناسب، خوبصورتی اور بدصورتی ——— یہ وہ الفاظ تھے جن کے معنی سمجھنے سے وہ خود کو قاصر پاتا تھا۔

اگر روپیہ پیسہ کا نام ہی دولت ہے تو اس اعتبار سے یہ نابینا شخص بھی مالدار تھا۔ لیکن ان کی بہ نسبت وہ اپنی ماں اور بہن کی بے پایاں محبت کو زیادہ قیمتی سمجھتا تھا۔ اپنی ناکامی سے اس کے باپ کا دل ٹوٹ گیا اور وہ اس دُنیا سے نامراد رخصت ہُوا۔ کیونکہ اسکی تمناؤں کا واحد مرکز، اسکی زندگی کا سہارا اور آنکھوں کی ٹھنڈک یہی اکلوتا بیٹا تھا۔ یہ بچہ ایک تنومند اور خوشرو نوجوان بنا اور آخرکار ایک ہٹا کٹا اور جاذبِ توجہ مرد بن گیا۔ وہ نہایت خوش مزاج اور نرم دل واقع ہُوا تھا۔ نفاستِ خیال، اور مردانہ عزم اسکی فطرتِ صالحہ کا جوہرِ اعلیٰ تھا۔ وہ موسیقی کا دلدادہ اور رقص و سرود کا رسیا تھا۔ موسیقی کا دلآویز اور روح پرور اثر اسکی بیقرار روح اور غمگین دل کو سکون بخشتا اور اس پر نشاط و اہتزاز کی ایک کیفیت طاری کر دیتا تھا۔ وہ بڑی میٹھی اور سریلی آواز سے گاتا تھا اور پیانو اور وائلین بھی بجانا جانتا تھا۔ ادبِ لطیف سے بھی اسے دلبستگی تھی۔ اور چھوٹی سی عمر میں ہی وہ رومانی دنیا کے مسحور کن اسرار سے واقف ہو گیا تھا۔ دلچسپ صحبت، عمدہ شراب، لذیذ اور مرغن غذائیں، تلوار کی دھار کی مانند تیز اور لطیف حاضر جوابیاں، مزاح جو اپنی جامعیت کے باوجود سفاہت سے مبرا ہو، بلند قہقہے جو فضا میں ارتعاش پیدا کر دیں، فطری سوز و گداز، دنیا کے رطب و یابس، شادی و غم، غرضیکہ دُنیا کے تمام تنوعات سے محظوظ ہوتا تھا۔ وہ ہر حیثیت سے ایک مکمل انسان تھا، اس کو ایک خوش اور بشاش آدمی بھی کہا جا سکتا تھا۔ قطع نظر ان لمحات کے جب اپنی معذوری اور تلخکامی کا دلشکن احساس اس کے دل و دماغ کو پراگندہ کر دیتا تھا یا جب اس کا نقص سدِ راہ ثابت ہوتا تھا۔

اپنے وقت کا زیادہ حصہ وہ ساحل پر ایک پُرانے مکان میں گذارتا تھا وہاں سمندر کا تغیر پذیر ترنم اور اس کے "میٹھے میٹھے نمکین" ابخرات کی بھیگی بھیگی مست بُو اس پر ایک وجدانی کیفیت طاری کر دیتی تھی۔ شہروں سے اُسے وحشت ہوتی تھی، (حالانکہ اس نے کبھی اس کا اعتراف نہیں کیا) گھر کے محدود ماحول اور گھٹی ہوئی آب ہوا سے وہ بہت گھبراتا تھا۔ گلیوں کا شور و شغب جس کی وجہ سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اس کے کانوں کے پردوں کو چیرتا معلوم دیتا تھا اور گلیوں کی متعفن ہوا اور سڑے ہوئے ابخرات سے وہ اپنے نتھنے سکیڑ لیا کرتا تھا۔

لیکن بعض اوقات وہ پہاڑ پر چلا جاتا تھا۔ اوّل اول تو محض فطرت

کا سکوت اسکی متلوّن اور ذکی الحس طبیعت کو متاثر کئے بغیر نہ رہا۔ مگر کچھ عرصہ بعد ہی وہ محسوس کرنے لگا کہ اس کا دل سکوت کی اس مسلسل کیفیت سے گھٹتا جارہا ہے۔ وہ تنہا رہنے سے گھبرانے لگا کیونکہ تنہائی میں اس کے نہفتہ خیالات اس کے دماغ میں گھنٹیوں کی طرح بجنے لگتے تھے۔ اس لئے اس نے خواتین خانہ سے استدعا کی کہ وہ اسے واپس ساحل پر لے جائیں اور وہاں سمندر کی گرج، دھارے کی پر شور تیزی، فوارے کی ننھی ننھی تیز دھاروں میں اسے پھر ایک مرتبہ راحت محسوس ہونے لگی۔

اسی طرح اس کی غیر تغیر پذیر زندگی کے چوبیس سال گذر گئے۔ ناامید ہوکر اس نے اپنے دل کو سمجھا لیا کہ اس کی آنکھیں دنیا کی رنگینیاں دیکھنے کیلئے نہیں بنائی گئی ہیں۔ ناامیدی کا نام صبر ہے۔ بہت سے حکیم، ڈاکٹر اور کحال اس کا مرض تشخیص کرنے آئے لیکن اپنی معذوری کا اعتراف کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔ مرض لادوا تھا۔ ان کے صبر آزما سوالات کا جواب وہ صرف اپنے عزیزدم کی خاطر، صرف ان کی دلدہی کی غرض سے دیدیا کرتا تھا ورنہ وہ اب قطعی طور پر مایوس ہوچکا تھا۔ بیشک وہ محسوس کرتا تھا ـــــ کیونکہ وہ دلیر تھا بودا نہیں ـــــ کہ اپنے سے غلط امیدیں وابستہ رکھنا ناامیدی کو کھلے بندوں دعوت دینا ہے۔ برعکس اس کے صبر و توکل میں اس کو سکون اور راحت حاصل تھی۔ اب وہ راضی برضائے مولا ہوگیا تھا۔

لیکن جب اس نے پچیسویں سال میں قدم رکھا تو اس نے مسلسل افواہیں سنیں کہ ایک زبردست اطالوی ڈاکٹر بہت سے پیدائشی اندھوں کو اپنے دست شفا سے بینائی عطا کرچکا ہے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ لہٰذا اس نے اپنے ایک معتبر دوست وائی مین کو جو خود امراض چشم میں ماہر تھا اس افواہ کی صداقت کی تحقیق کی غرض سے اٹلی روانہ کردیا۔

"یہ پیریرا کچھ اچھا آدمی تو ہے نہیں" وائی مین نے واپس آکر جواب دیا۔ "لیکن اناڑی یا نیم حکیم بھی نہیں جیسا بعض ڈاکٹروں نے مشہور کر رکھا ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ـــــ پھر اس نے وہ چشم دید معجزات بیان کرنا شروع کئے جنکے توسط سے کئی اندھوں کی بینائی عود کرآئی تھی۔

"وہ فرڈیننڈ کا علاج کرنے کو تیار ہے لیکن ایک شرط پر ـــــ"

"وہ کیا؟" ماں نے بیقرار ہوکر پوچھا۔

"وہ کہتا ہے کہ اگر فرڈیننڈ فی الواقع اندھا ہے تو بینائی کی کوئی امید نہیں" عورتوں کے پر اشتیاق چہرے سفید پڑگئے۔

"اور وہ تو ـــــ پیدائشی ـــــ اندھا ہے" ماں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ حالانکہ پیریرا نے فرڈیننڈ کو نہیں دیکھا ہے لیکن اس کا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا اور مجھے اس پر یقین بھی ہے کہ ایسا دنیا میں بہت کم ہوتا ہے بلکہ یہ حقیقت کہ کوئی آدمی اندھا فطری ہو اسقدر عدیم المثال ہے کہ اس کے معرض وجود میں آنے کا امکان ہی نہیں وہ کہتا ہے کہ یقیناً فرڈیننڈ بھی بینائی رکھتا تھا خواہ وہ چند گھنٹوں بعد ہی سلب ہوگئی ہو"

"تو پھر ہمیں خبر نہ ہوئی ہوگی۔ دو دن تک تو خود مجھے بھی اس تلخ حقیقت کا علم تو کجا، شبہ تک نہ ہوا۔ اس اثنا میں میری آنکھیں برابر اس کے چہرہ پر ہی جمی رہیں"

"تو پیریرا اس خدمت کیلئے تیار ہے" وائی مین نے کہا؟ "اتنے بڑے آدمی سے مجھے ہرگز یہ توقع نہ تھی لیکن مجھے تو وہ ذرا حریص معلوم ہوتا ہے۔ مگر غریب نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ افلاس اور فاقہ کشی میں بھی تو گذارا ہے، اور اب تو وہ اس بد اعتقاد اور بیوقوف دنیا کے لئے ایک ہنسی کا ہے اور اسی احساس نے غریب کی زندگی کو ذرا تلخ اور بدمزہ بھی کردیا ہے"

"خواہ کسی قیمت پر ہی ہو، ہم اسے خوش آمدید کہنے کیلئے تیار ہیں بشرطیکہ وہ فرڈیننڈ کو بینائی عطا کردے" ماں نے کہا "فوراً تار دیدو اگر خدانخواستہ ـــــ وہ کامیاب بھی نہ رہا تو بھی کچھ ہرج نہیں"

اطالوی کو بلانے کا تار دے دیا گیا۔ اور ماں بیٹیاں اندھے نوجوان کو ملاقات کیلئے تیار کرنے چلی گئیں۔

"ہیں ـــــ پھر دوسرا تیار" فرڈیننڈ نے نیم محزون ہنسی ہنستے ہوئے کہا "میں نے تو سوچا تھا کہ چلو اب تو ان نیم حکیموں کے پنجے سے ہمیشہ کیلئے نجات پائی"

لیکن جب دو ہفتے بعد پیریرا وہاں پہنچا تو اس نے خود کو اس معجز نما حکیم کے دست شفا میں نہایت صبر و توکل سے سپرد کردیا۔

"میرا خیال تو یہ ہے کہ" پیریرا نے ابتدائی تشخیص کے بعد کہا۔ "امکان ہے ـــــ ہاں! پورا پورا امکان ہے" پھر وہ ایک سائنٹفک گفتگو میں منہمک ہوگیا جس کے دوران میں طبی اشارات و اصطلاحات غیر معمولی تسلسل اور تواتر سے استعمال کیں۔ لیکن باوجود اس کے اطالوی نے مریض پر اپنی قابلیت اور شخصیت کا ایک مرعوب کن اثر پیدا کیا۔ اس نے اپنی قابلیت کی شیخی نہیں بگھاری۔ اور نہ کوئی پیشینگوئی کی۔ کامیابی کا بھی اسے بہت زیادہ یقین نہ تھا "معاف فرمائیے!" اس نے سنبھل کر کہا "لیکن کیا آپ اپنی اصلی حالت سے آگاہ ہونے کے بعد بھی اسے صبر سے برداشت کرسکیں گے؟"

"مجھے تو ایسی ہی امید ہے۔" فرڈیننڈ کا جواب تھا۔

"آپ ایک دلشکن مایوسی کا مقابلہ کرسکتے ہیں؟"

"ہاں یہ تو کوئی نئی بات نہیں۔ میری عمر ہی اسی میں گذری ہے۔"

"تو پھر" ڈاکٹر بولا "میں آپ سے عرض کر سکتا ہوں کہ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ میں آپ کو بینائی دوبارہ واپس دلا سکتا ہوں اور ہمیشہ کے لئے ——"

وہ ٹھٹکا۔

"ہاں ہاں کہئے نا۔ آپ رک کیوں گئے" فرڈیننڈ نے بے صبری سے پوچھا۔

"تو سنئے۔ میں آپ سے حقیقت پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا۔ آپ کی بینائی کے عارضی ہونے کا قوی احتمال ہے۔ آپ سمجھے؟" اور پھر وہ ایک تازہ علمی گفتگو میں کھو سا گیا۔ "آپ کی بینائی عود تو کر آئے گی۔ اس کا تو مجھے پورا پورا یقین ہے" اس نے کہا "لیکن یہ عارضی ہو سکتی ہے۔ کیا آپ اسکو برداشت کر سکیں گے؟"

"یہ تو ذرا مشکل ہے" فرڈیننڈ نے جواب دیا "لیکن مجھے تو امید ہے کہ میں اسے بھی برداشت کر سکوں گا"

"سوچ لیا آپ نے پوری طرح سے؟" اطالوی نے سوال کیا "آپ جانتے ہیں کہ بینائی کا عارضی طور پر عود کر آنا آپ کے لئے کیا حکم رکھتا ہے؟ اسوقت تو آپکو اپنی معذوری اور محرومی کا پورا احساس اور اندازہ نہیں ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ آپ نے اپنی آنکھوں کو کبھی استعمال ہی نہیں کیا جو بینائی کی قدر معلوم ہو۔ لیکن اگر آپ کی بصارت عارضی طور پر عود کر آئے —— چند گھنٹوں کیلئے۔ یا شاید چند لمحوں کیلئے —— اور پھر وہی تاریکی اور اندھاپن —— آپ پھر وہی ناقابل شفا بدقسمت نابینا ——"

اس کے الفاظ ایک معنی خیز سکوت میں ڈوب گئے۔

"میں تو ہر ممکن بازی لگانے کو تیار ہوں" فرڈیننڈ نے فیصلہ کن لہجہ میں جواب دیا "بشرطیکہ کامیابی کا کوئی معقول موقع ہو"

"موقعہ کا کیا کہنا۔ موقعہ تو بڑا اچھا ہے" پیر برا نے اسے یقین دلایا۔ "بشرطیکہ آپ ہر بات میں بلا چون و چرا میری تعمیل کریں"

"اس کا میں پورا اطمینان دلاتا ہوں"

معاملہ طے ہو گیا۔ اطالوی نے مکان کے ایک کمرہ میں قیام کیا اور اپنا علاج شروع کر دیا۔

علاج مشکل، تکلیف دہ اور ساتھ ہی نتائج کے اعتبار سے بہت سست رفتار تھا۔ کامل چھ ہفتے تک فرڈیننڈ بیٹھے بل ایک تاریک کمرہ میں محبوس پڑا رہا۔ اس کے پپوٹوں پر لیپ کی موٹی تہ جمی ہوئی تھی۔ اور پیشانی پر پٹیوں کا ایک خول سا چڑھا ہوا تھا۔ وہ بڑا پرہیزی کھانا کھا رہا تھا۔ کسرت کو بھی ڈاکٹر نے منع کر دیا تھا۔ لیکن اس نے اس تعطل اور جمود، کامل سکوت کے نہ ختم ہونے والے دن، اور بدخوابی کی طویل راتوں کو نہایت صبر اور کشادہ پیشانی سے برداشت کیا۔ ہر اعتبار سے وہ ایک تمثیلی مریض تھا۔ کبھی بھول کر بھی وہ حرف مطلب زبان پر نہ لایا۔ اس نے ڈاکٹر کے ہاتھ کو کبھی اس امید میں نہیں دبایا کہ وہ مجبور ہو کر بتا دے کہ اس کے امتحان کا یہ صبر آزما معرکہ کب ختم ہو گا۔ یہ زمانہ امیدواری اسکی روح کی ساخت کا سخت ترین امتحان اور اسکے صبر کی آزمائش کا بہترین نمونہ تھا۔

چھٹے ہفتہ کے آخری دن پیر برا نے تمام گھر کو ورطہ حیرت میں ڈالدیا۔ خادمہ جو اس کے کمرہ میں چائے کی پیالی لیکر گئی تھی، تھوڑی دیر بعد ایک وحشتناک خبر لے کر واپس آئی۔ ڈاکٹر فرار ہو چکا تھا؛ اس نے خود اپنے ہاتھوں سے صندوق میں سامان بھرا اور خود ہی اسباب باندھا۔ اور لازمی طور پر خود ہی اسے اسٹیشن تک لیکر گیا ہو گا۔ مرے کو مارے شاہ مدار۔

ان کے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ میز پر وہ دونوں ایک دوسرے کو سہمی ہوئی نگاہوں سے تکتی ہی تھیں۔ ان کے دل پر ایک چوٹ لگی اور وہ کلیجہ مسوس کر رہ گئیں۔ اس خبر نے ان کے احساسات کو مختل اور پراگندہ کر دیا اور لبوں پر مہر خاموشی لگا دی۔ اُف۔ کیا ان کے رنگین خوابوں کی یہی تعبیر تھی؟

"مجھے یہ خط ملا ہے" خادمہ نے خط ماں کی رکابی کے پاس ڈالکر کہا۔

لیکن اس غریب خاتون کی انتشار آگیں نظروں میں دنیا اندھیر تھی۔ اُسے معلوم ہوتا تھا کہ دنیا اس کے گرد ایک دلدوز گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ چکر لگا رہی ہے۔ اس نے اپنے دل کو تھاما اور خط اُٹھا کر کھولا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ خط شکستہ میں لکھا ہوا تھا۔ وہ اسے پڑھ نہ سکی۔ اس لئے خاموشی سے اپنی لڑکی کو دیدیا۔

"نعمی، ذرا اسے پڑھنا" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

لڑکی نے جو ماں سے کم ہراساں یا خستہ نہ تھی اس کو آواز بلند پڑھکر سنایا۔

ڈاکٹر پیر برا بہت نادم تھا۔ اس نے اپنے الوداعی خط میں معذرت چاہی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ ضروریات نے مجھے بےحد پریشان کر رکھا ہے اور اپنے فرائض کے احساس اور ذاتی مفاد کے خیال نے مجھے تمہیں تنہا چھوڑ جانے پر مجبور کیا۔ جنوبی امریکہ کے ایک کروڑ پتی نے میری خدمات کے صلہ میں دو لاکھ پچاس ہزار ڈالر پیش کئے ہیں۔ اس کا نوجوان لڑکا بڑی سرعت کے ساتھ اندھا ہوتا جا رہا ہے اور اسے بچانے کی غرض سے مجھے سمندر عبور کرنے کی زحمت دیگئی ہے۔ لہٰذا میرا "فوراً" وہاں جانا لازمی ہے —— فوراً ——

پیر برا نے لکھا تھا کہ اس نوجوان کے اندھے پن کا سبب آنکھ کی رگ پر ایک معمولی سا زخم تھا جسے میں بآسانی مندمل کر سکتا ہوں جیسا کہ

مجھے برازیل کے ایک ماہر چشم کی تشخیص سے پتہ لگا ہے۔ اس صورت حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے میرے لئے یہ کیونکر ممکن تھا کہ اس زرّیں موقعہ کو اس طرح بے پرواہی سے کھو بیٹھوں اور بے انتہا دولت سے ہاتھ دھولوں۔ ایسے موقعے گھڑی گھڑی ہاتھ نہیں آتے۔ مزید برآں فرڈیننڈ کا علاج اب مکمل ہو چکا ہے۔ تھوڑی بہت جو کسر ہے وہ فرڈیننڈ خود ہی پوری کر سکتا ہے جوں ہی لیپ کی آخری تہ کی پپڑیاں جھڑ جائیں پٹیاں کھول دی جائیں۔ اور اگر فرڈیننڈ کی قسمت میں بینائی لکھی ہے تو یہ اس کو اسی وقت مل جائیگی۔ اس کے بعد کچھ عام ہدایات وتنبیہات تھیں اور آخر میں اسی بات کا اعادہ کیا گیا تھا کہ بینائی صرف عارضی ہوگی۔

خط پڑھنے کے بعد دونوں کے جی میں جی آیا۔ امید کی ننھی ننھی چمکدار کرنیں ان کے چہروں پر ناچنے لگیں۔ فرڈیننڈ دیکھ سکتا تھا! خط نے ان کا دل ہلکا کر دیا۔ اور ڈاکٹر کے اطمینان نے انہیں کچھ تسلی بخشی۔ اپنی جذبات کو لیکر وہ اندھے نوجوان کو ڈاکٹر کے فرار کا واقعہ سنانے لگیں۔

وہ خاموشی سے لیٹا سنتا رہا۔

"آہ۔ اب تو اس میں شک کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی کہ یہ شخص بھی نیم حکیم ہے" اس نے نرمی سے کہا۔ "لیکن جب تک مجھے معلوم نہ ہو جائے میں اسے ہرگز مطعون نہ کرونگا۔ چند دن کی بات اور ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا"

صبر آزما امتحان کے آخری دن نہایت کڑے، طویل، خشک اور بدمزہ گذرے۔ دھیرے دھیرے ـــــ رفتہ رفتہ ـــــ ریزہ بہ ریزہ لیپ جھڑ گیا۔ پیریرا نے ایک بات پر خاص طور پر زور دیا تھا۔ وہ یہ کہ جبتک لیپ کے آخری ذرات پپوٹوں سے جدا نہ ہو جائیں، پٹیاں ہرگز نہ کھولی جائیں۔

الانتظار اشد من الموت۔ انتظار کے پانچ دن اس المناک ڈراما کے تین کرداروں کے گرد اپنے گھنٹوں اور گھڑیوں کا تانا بانا بنتے رہے۔ حتیٰ کہ اس غریب نابینا، کورچشم کی رہائی کا وقت آگیا ـــــ وہ ساعت جو یا تو ابدالآباد کیلئے اس سے یہ نعمت عظمیٰ چھین لے گی یا تا دم زیست اسے حسن وروشنی کی بہشت میں داخل کر دے گی۔

لیکن جب وہ ساعت جس کا عرصہ سے انتظار تھا، نزدیک آئی۔ تو اسے ایک جھجک محسوس ہوئی۔ ڈراؤنا معلوم مستقبل کے خوف نے اس کے ہاتھوں کو پٹی کھولنے سے باز رکھا۔ وہ اس عجیب وغریب انسانی دنیا کو کیونکر دیکھ سکیگا یا یہ کیسے برداشت کر سکیگا۔ وہ اسے کبھی نہیں دیکھ سکیگا؟

عورتوں کو اس کے ناقابل اظہار تامل پر اچنبھا ہو رہا تھا۔ "نہیں" اس نے گہرا سانس لیکر کہا۔ "نہیں۔ میری ہمت نہیں ہوتی۔ میں ڈرتا ہوں ـــــ

امی جان۔ آہ! کاش یہ تجربہ مجھ پر نہ کیا گیا ہوتا۔ کچھ بھی ہو میں تو اس سے پہلے ہی خوش تھا۔ لیکن اگر ـــــ اگر اب ـــــ ان تمام کوششوں کے باوجود میری قسمت میں اندھیرے میں ٹھوکریں کھانا ہی لکھا ہے تو امی! ـــــ یاد رکھو! تمہاری متحدہ کوششیں بھی مجھ بدنصیب کی اشک شوئی نہیں کر سکتیں ـــــ اب میں کبھی خوش نہیں رہ سکتا"

اس کی ماں نے محبت آمیز انداز سے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا اس نے اسے پکڑ کر پیار کیا۔

"یہی ہے وہ" اس نے ہاتھ کو تھپکتے ہوئے چلا کر کہا: "جو مجھے پست ہمت بنا دیتا ہے۔ امی جان! یہ تم اور امیلی ہی ہو جو میرے مردانہ عزم میں تذبذب پیدا کر دیتی ہو" وہ سر جھکا کر گہرے خیالات میں مستغرق ہو گیا۔

"میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ اس کا مجھ پر کیا اثر پڑیگا۔ کون جانے؟" اس نے خیالات میں غرق ہو کر بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "کیا تم سوچ سکتی ہو؟ ـــــ تم دونوں ـــــ کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ تم نہیں سوچ سکتیں۔ تم کیا جانو؟ میں نے تمہیں پرندوں، پھولوں، رنگوں، متحرک اشیا، ننھے ننھے بچوں، چاند، سورج، آسمان اور سمندر کے متعلق باتیں کرتے سنا ہے۔ آہ! میں دیرآشنا سمندر کی آواز سن سکتا ہوں اور اس کی بو سونگھ کر پہچان بھی سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ مجھے سمندر سے کبھی نہیں ڈرنا چاہئے۔ لیکن امی! ذرا غور تو کرو: وہ اپنی کرسی پر بیٹھا کانپ اٹھا۔" شاید میں اسے برداشت نہ کر سکوں۔ لیکن میری مردانگی کا یہی تقاضا ہے کہ مجھے اس کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہئے" اس نے کچھ وقفہ کے بعد سنجیدہ لہجہ میں کہا: "میں اسے تنہا برداشت کرنا پسند کروں گا"

"تنہا!" وہ سب ہم آواز ہو کر چلائیں۔

"کیوں کیا ہوا؟" ریاضت تنہائی میں ہی اچھی ہوتی ہے۔ خدا سے انتہائے قرب انتہائے خلوت ہی میں نصیب ہوتا ہے۔ اس لئے میں تنہا رہنا ہی پسند کرتا ہوں" اس نے کہا "کچھ دیر پہلے میں نے بارگاہ ایزدی میں دعا کی تھی۔ اور یہ الہام اس کا جواب ہے۔ نوشتہ قسمت یہی ہے کہ میں امتحان میں تنہا شامل ہوں۔ ہاں ـــــ ہاں۔ یونہی ہوگا" اس نے نرمی سے کہا "اسی میں مصلحت ہے۔ اور میں یہی تہیہ کر چکا ہوں۔ امی اور امیلی۔ میں جانتا ہوں کہ اپنی قوت ضبط کی آزمائش کا یہی واحد طریقہ ہے"

وہ اس کے ساتھ چمٹ گئیں۔ روئیں اور گڑگڑائیں کہ وہ ایسا نہ کرے اور اس سے استدعا کی کہ وہ انہیں بھیجنے سے باز رہے۔ لیکن وہ تو تہیہ کر چکا تھا۔ بھلا کس کی مانتا تھا۔ آنسو اور ان کی التجائیں متحد مل کر بھی اسے متاثر نہ کر سکیں۔ اس کا دل مطلق نہ پسیجا۔

"میں تنہا رہوں گا۔" اُس نے ڈھٹائی سے دُہرایا۔ "اسوقت تک تنہا رہونگا۔ جبتک میں تمہاری چاندسی صورتیں دیکھنے کیلئے خود کو بخوبی تیار نہ کرلوں۔ دیکھو! جبتک میں اجازت نہ دوں اندر مت آنا۔ خبردار! دروازہ کھولنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں اسے مقفل کردونگا۔ سمجھیں؟ تمہیں میرے بلانے کیلئے انتظار کرنا چاہئے۔ آخر میں نے بھی تو کیا ہے۔"

"لیکن فرڈیننڈ ــــــ" اسکی ماں نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

"امی!" اس نے آواز کو ذرا سخت بناتے ہوئے جوابدیا۔ "کیا تم مجھے اپنے سامنے خود اپنی آنکھوں میں شرمندہ اور ذلیل کرنا چاہتی ہو؟ بالفرض میں چلاؤں یا پکاروں؟ کیا میں لوگوں کو خصوصاً ان کو جو مجھ سے محبت کرتے ہیں اپنی تحقیر کا مشاہدہ کرنے دوں؟ نہیں میں اکیلا رہونگا۔ سمجھیں؟ یہ ملاقات ہمارا امتحان ہے۔ چلو اسے ختم بھی کرو۔ شاید ہمیں اپنی تمام قوتیں مجتمع کرنے کی ضرورت ابھی پیش آجائے۔"

وہ اس کی مرضی پر چلنے کی اسقدر عادی ہوگئی تھیں کہ لامحالہ انہیں اس کی بات ماننا پڑی اور وہ اُسے چھوڑکر چلی گئیں۔ دروازہ تک وہ اُنہیں چھوڑنے آیا۔ اور دروازہ مقفل کردیا۔

"یاد رکھو! جبتک میں نہ بلاؤں۔" لوٹتے وقت اسکے آخری الفاظ تھے۔

جب وہ تنہا رہ گیا تو اس نے پٹیاں کھولنا شروع کیں لیکن اس کی انگلیاں کانپنے لگیں۔ اس کے ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہوگیا۔ اوّل اوّل وہ بند نہیں کھول سکا۔ وہ شخص جو چوتھائی صدی تک صبر سے کام لیتا رہا اب بیقراری اور بے صبری سے کراہنے لگا۔ اسی رست وخیز میں اس کا سر فرنیچر سے ٹکرایا اور وہ درد سے بیقرار ہوکر بچہ کی طرح بلبلا اُٹھا حالانکہ ایسی خفیف چوٹیں سہنے کا اس نے خود کو عرصہ سے عادی بنالیا تھا۔

انجام کار اس نے پٹیاں نوچ کر پھینک دیں۔

اس کے منہ سے بیساختہ ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

وہ دیکھ سکتا تھا!!!

اس کے پپوٹے جو سخت اور متورم ہورہے تھے۔ چٹخ چٹخ کر اوپر نیچے حرکت کرنے لگے۔ لیکن وہ دیکھ سکتا تھا ــــ وہ دیکھ سکتا تھا! ــــ اس حیرت افزا سنہری حقیقت سے کون انکار کرسکتا تھا ــــ وہ دیکھ رہا تھا!!!

جو چیز اُسے پہلے پہل نظر آئی وہ ایک بے وضع زرد سا کہر تھا۔ جس میں بھورے بھورے دھندلے دھبے آہستہ آہستہ تیر رہے تھے۔ پھر جب بینائی ذرا صاف ہوئی تو وہ بڑے بڑے دھبے اور زیادہ نمایاں ہوکر متصل ہوگئے۔ انہوں نے ایک غیر مبہم شکل وصورت اختیار کرلی۔ اور زیادہ نمایاں اور روشن ہوکر مرئی اشیا بن گئے۔

وہ چکرایا، لڑکھڑایا اور ایک وحشیانہ انداز سے اپنے ہاتھ حفظ ماتقدم کی غرض سے ان لاتعداد "خطرات" کی طرف پھیلا دئے جو چاروں طرف اپنے جبڑے کھولے کھڑے تھے۔ وہ لڑکھڑا کر ایک صوفہ پر گر پڑا۔

خوف اور دہشت کے مارے اس کی بُری حالت تھی۔ اس کا ڈر اس کے آڑے آیا۔ وہ حد درجہ سہما ہُوا تھا۔ اس کا پہلا خیال دروازہ کی طرف گیا ــــ لیکن، ان صدگونہ عجائبات میں سے دروازہ کون سا تھا؟ اسے خیال آیا کہ دروازہ کھٹکھٹا کر یا چلاکر مستورات کو بلالے اور وہ شاید ایسا کر بھی گذرتا اور ہمیشہ کے لئے اپنی خودداری اور عزت نفس پر دھبہ لگالیتا لیکن اس کے اعضاء ایکدم شل ہوگئے۔ تشنج کا ایک دورہ سا پڑا جس نے اسے بیٹھنے پر مجبور کیا۔ حالت موجودہ میں سوائے اس کے کہ وہ بیٹھا رہے اور خاموشی سے شریانوں میں اپنے خون کی آواز اور دل کی پرآشوب دھڑکن سنے وہ اور کیا کرسکتا تھا۔

یہ ایک پرسکون، دھوپ والا چمکیلا دن تھا۔ آسمان اور سمندر بھورے نظر آرہے تھے۔ ساحل کا ایک مثلث مرطوب ٹکڑا نجو بی نظر آرہا تھا ایک جہاز اپنی پوری رفتار سے اس کی نظر کے سامنے سے نکلا۔ وہ اس کے متعلق خیال آرائیاں کرنے لگا۔ کیا یہ پرند تھا؟ پھر اس نے پرندوں کا ایک جھنڈ دیکھا جو پھیکے آسمان پر ایک سیاہ دھبہ معلوم ہوتا تھا۔ "نہیں، پرند تو یہ ہیں۔" اس نے فیصلہ کیا۔ لیکن وہ سفید بہتی ہوئی شے کیا ہوئی؟ وہ کیا تھی؟ ایک کوربین کتاب خواں کی حیثیت سے اسے جہازوں کے متعلق علمی معلومات ضرور تھیں۔ لیکن وہ اسے شناخت نہیں کرسکا۔ حالانکہ تصور میں طوفانی ہوا کے تھپیڑوں سے گھبرا کر وہ بارہا مستول کے لمبے شہتیر سادبان جھکانے کے لئے لپٹ چکا تھا۔

اس عجیب وغریب انکشاف نے اپنی وقتی اور ہنگامی حیثیت کے باوجود اس کی دُنیا میں ایک انقلاب پیدا کردیا۔

اس کا خوف وہراس رفتہ رفتہ کم ہوتا جارہا تھا۔ اس کی بے چینی جا چکی تھی۔ لیکن مستورات کو اپنے پاس بلانے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ اس نے خود کو ایک خوشگوار مسرت کی آغوش میں کھودیا۔ وہ سب کچھ بھول گیا۔ اس کا دماغ مختل ہوچکا تھا۔ اور وہ کچھ نہیں سوچ سکتا تھا۔ وہ اپنے اولیں تاثرات کو مسلسل ومربوط نہیں کرسکا اور نہ ان کو بیان کرسکتا تھا۔

ہوا کے جھونکے نے ایک اخبار اس کے سامنے لا پٹکا۔ کیا یہ آدمی تھا؟ وہ سوچنے لگا۔ لہروں کی آواز جو لوٹتے وقت ساحل پر اپنے سفید جھاگ چھوڑ جاتی تھیں۔ اس کے کانوں میں صاف صاف آرہی تھی۔ اس لئے اس نے سمندر کا پتہ تو لگالیا۔ لیکن کیا سمندر اس سفید جھاگ دار لکیر پر ہی مشتمل تھا؟

یا کیا سمندر اس وسیع و عریض رقبہ کا نام تھا جو شفق کی ارغوانی لہروں میں مست ہو ہو کر اُٹھ رہا تھا اور پھر اپنا رنگ تبدیل کر کے، محراب نما شکل بنا کر واپس زمین پر سمٹ کر آ جاتا تھا۔ اور بالائی فضا کو ایک دھندلے کہر سے پُر کر دیتا تھا؟

ایک نوجوان لڑکے کی اُبھرتی ہوئی شکل اس کی نگاہوں کے سامنے اس قطعہ زمین پر نمودار ہو کر غائب ہو گئی۔ "کیا آدمی یہ تھا" وہ پھر لرزنے لگا۔

آئینہ کے متعلق اس کے ذہن میں کوئی خاص تصویر نہ تھی اور اگر وہ کسی سے دریافت بھی کرنا چاہتا تو نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ پیرپرا نے مستورات کو خاص طور پر متنبہ کر دیا تھا کہ وہ فرڈینینڈ کو اس وقت تک آئینہ نہ دیکھنے دیں۔ جب تک وہ اپنی بینائی کا پورے طور سے عادی نہ ہو جائے۔ اور فاصلہ تناسب اور عکس کے اصولوں سے کما حقہ واقف نہ ہو جائے۔ لیکن اس کیلئے ایک عرصہ درکار تھا۔ پیرپرا نے لکھا تھا کہ اس نے بہت سے آدمیوں کو دیکھا ہے جو آئینہ میں اپنی شکل پہلی مرتبہ دیکھ کر پاگل ہو گئے۔ اگر وہ خود کو دیکھ پاتا تو کیا ہوتا؟

اس طرح ایک گھنٹہ گذر گیا!

فکر ماں کے اور سب خیالات پر غالب آیا۔ وہ دبے پاؤں دروازہ پر آئی۔ اور آہستگی سے کھٹکھٹایا۔ وہ اس کا مطلب سمجھ لیا۔ لیکن عمداً آواز پی گیا۔ اب اس نے دروازہ شناخت کر لیا۔ اس نے اس پر پر اشتیاق نگاہیں ڈالیں گویا یہ اس کا پہلا انکشاف ہو۔ اسکی ماں نے دوبارہ دروازہ کھٹکھٹایا۔

"ابھی نہیں" وہ چلایا "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں دیکھ سکتا ہوں" اس نے اپنی ماں کو ایک پر جوش چیخ لگاتے ہوئے سُنا "لیکن —— ابھی نہیں"

جب وہ چلی گئی اور اس کے قدموں کی آواز فضا میں غائب ہو گئی تو وہ سنبھل کر اُٹھا اور سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن وہ اپنا توازن کھو بیٹھا۔ وہ کہنی اور گھٹنے کے بل گرا اور لڑکھڑاتا ہوا صوفہ پر آ رہا۔ وہ خود کو ایک نئے خوف کی آہنی گرفت میں بھنچا ہوا پا رہا تھا۔

خوف پھر دور ہو گیا۔ اسے اس کا کھٹکا پہلے ہی لگا ہوا تھا۔ اس لئے اب بالکل مایوسی نہ ہوئی۔ جبتک وہ وہاں تھا خوف و ہراس کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس کی عقل اس کے طفلانہ خوف پر مسکرا رہی تھی۔ اب وہ ہوشیار ہو گیا تھا۔ اگر اس کی جگہ کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو یقیناً بھاگ چھوٹتا اور اپنے ہیبتناک تاثرات کا شکار ہو جاتا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس نازک وقت پر خود فریبی کا واحد لمحہ اسے زندگی بھر کیلئے ایک روحانی کشمکش اور ذہنی خلفشار میں مبتلا کر دیگا۔ جو اس جسمانی اذیت اور کورچشمی سے بھی زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوگا جس سے اس نے خدا خدا کر کے نجات پائی تھی۔

پھر شبنم کے ٹھنڈے ٹھنڈے قطرات کی طرح اس پر رحمت اور سکون کا نزول ہوا اور وہ اس تمازت زدہ کلی کی طرح جو اوس کی ننھی ننھی بوندوں سے کھل جاتی ہے شگفتہ ہو گیا۔ وہ اس معجزہ کے حیرت انگیز احساس سے تھرتھرا اُٹھا۔

اس کی کنپٹیاں تھرانے لگیں۔ گلا سوکھ گیا۔ سانس بڑی تیزی سے دانتوں سے ٹکرا کر آواز پیدا کرنے لگا۔ اور پھیپھڑے اس کے سینہ میں بیقراری سے پھڑپھڑاتے ہوئے معلوم دیئے

اس کی ماں نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا اور اس نے پھر وہی جواب دیا۔

"نہیں، ابھی نہیں"

اس نے اپنی ماں کو بڑے اشتیاق اور لجاجت سے اپنا نام لیتے ہوئے سُنا لیکن، وہ سمجھتا تھا کہ ابھی ملنے کا وقت نہیں آیا ہے۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں اپنی حسین اور پیاری ماں کا اوّلیں دیدار اسے شادیٔ مرگ نہ کر دے۔

اس نے پھر سمندر اور آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔

اسی کشمکش و پیچ میں تقریباً دو گھنٹے گذر گئے۔ اس کی بصارت کی پہلی جیسی تیزی اب ذرا ماند پڑ چکی تھی۔ وہ نرم نرم گدیلوں پر لیٹ گیا۔ وہ بہت خوش تھا اور اس بشاشت نے اس کے رگ و پے میں سرایت کر کے اس کی قوت ارادی کو معطل کر دیا۔ اس کی ماں نے دو مرتبہ پھر دروازہ کھٹکھٹایا اور اس نے پھر اسے مایوس واپس بھیجا اور ہر دفعہ غریب نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ آخری مرتبہ اس نے فرڈینینڈ کو اس کی رکھائی اور بے مروتی پر بہت کچھ لعنت ملامت کی۔

"پھر" اس نے اپنے دل میں کہا اور مسکرا دیا۔

یکایک مسکراہٹ اس کے چہرے سے غائب ہو گئی۔ گویا کسی نے اس کے دل کی بشاشت کو نچوڑ لیا ہو۔

یہ کیا؟

اس نے اپنے ہاتھ اُٹھائے اور آہستگی سے آنکھیں ملیں۔ کیونکہ وہ سوزش سے ابھی تک دُکھ رہی تھیں۔ وہ ایکدم اُٹھ بیٹھا اور حیرت سے ٹکٹکی باندھ کر سامنے کا منظر دیکھنے لگا۔ کیا یہ صحیح تھا کہ وہ دوبارہ اندھا ہو رہا تھا؟ اس نے اپنی جلتی ہوئی آنکھیں بند کیں اور پھر کھولیں۔ آسمان اور سمندر کا بھورا رنگ کچھ گہرا نظر آیا۔ دیگر اشیا کی شکلیں بھی دھندلی اور گھلی ملی سی نظر آنے لگیں۔ اس میں اب کسی شک کی گنجائش نہ تھی۔ کچھ دیر پہلے وہ ریتیلے ساحل پر سبز گھاس کا کنج دیکھ سکتا تھا۔ اب اس کی شکل و صورت اور رنگ روغن سب غائب ہو چکے تھے۔ اب یہ دھندلکے میں ایک دھبّہ کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اور وہ بیکل لہریں؟ پہلے وہ ان کا مد و جزر، ان کی مضطربانہ حرکت، ان کا ساحل پر پچھاڑیں کھانا سب کچھ دیکھ سکتا تھا —— مگر اب —— اب ——

اس کا دل ڈوب گیا اور وہ خاموشی سے لیٹ گیا۔ اسکی ہیبت زدہ اور بے تعلق آنکھیں بیقراری سے کمرے کی چیزوں پر پڑ رہی تھیں۔ دیوار کے چپاں کاغذوں کے نقوش اور قالینوں کے گل بوٹے، دروازوں کے مرصع پردوں کے نقش و نگار، تصاویر، چھت، فرنیچر، غرضیکہ تمام چیزیں غیر محسوس طور پر ایک کہر اور دھندلکے میں اس کی نظروں سے محو ہوتی چلی جا رہی تھیں۔

اور اب اسے یاد آیا کہ اطالوی نے اسے متنبہ کر دیا تھا کہ بینائی بالکل عارضی ہوگی۔ "چند گھنٹوں کیلئے ـــــ یا شاید چند لمحوں کیلئے" فرطِ انبساط میں وہ اس کا امکان تو بھول ہی گیا تھا۔ اب یہ تلخ حقیقت اس کے گرد منڈلانے لگی اور آخرکار اس کی خوشگوار امیدوں اور رنگین خوابوں کو خوفزدہ کر کے دور بھگا دیا۔ پھر وہی مہیب تاریکی ـــــ وہی اندھیرا ـــــ وہی ظلمتکدہ۔ دنیا کی ایک جھلک ـــــ اور پھر ابدی محرومی! دنیا کے عجائبات کا یہ حیرت انگیز انکشاف اور پھر تادمِ زیست مایوسی!

اسی کربِ اضطراب کے عالم میں اس کی بصارت رفتہ رفتہ غائب ہوتی جا رہی تھی۔ اب اس حلیم الطبع شخص کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چلا تھا۔ وہ اپنے مقدر کو کوسنے لگا جس نے امید افزا مستقبل کی ایک جھلک دکھا کر عین موقعہ پر اسے ہمیشہ کیلئے بینائی ایسی نعمت سے محروم کر دیا۔

اس نے ایک زور کی چیخ ماری اور اٹھکر حسبِ معمول ٹٹولتا ہوا دروازہ تک پہونچا۔ اور تالا کھول دیا۔ اسکی دلدوز چیخ نے سکوتِ شب میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا۔ وہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔

~~~~~~~~

جب اسے ہوش آیا تو اس نے سوچا کہ اب وہ اس عالمِ ناسوتی کی قید و بند سے آزاد ہو کر عالمِ بالا میں آچکا ہے۔ کیونکہ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ پھر دیکھ سکتا ہے لیکن پہلے جیسا نہیں۔ ایک نرم گرم تازہ تنویر، اور ایک خوشگوار سنہری روشنی نے فضا کو منور کر رکھا تھا اس کی ماں کا چہرہ جواب تک تخیل کے ہاتھ کا کھلونا بنا ہوا تھا۔ اب اس کے سر پر جھکا ہوا تھا۔

"میں تمہیں نظر آتی ہوں۔ فرڈیننڈ؟"

"ہاں کیوں نہیں۔ چونکہ میں مر چکا ہوں اسلئے تمہیں بخوبی دیکھ سکتا ہوں" اس نے جواب دیا۔ ماں نے جھک کر اسے پیار کیا۔

"پاگل کہیں کے" وہ ہونٹوں میں بڑبڑائی۔ "پگلے تم زندہ ہو۔ تم ابھی تک اسی پرانی دنیا میں ہو۔ تم ـــــ نہیں نہیں۔ دیکھو ہم پر سوالات کی بوچھاڑ مت کرو ـــــ یہ تو صرف ـــــ ہم تمہیں اس کیلئے تیار کر دیتے ـــــ ہمیں کیا خبر تھی؟"

"میرا خیال ہے کہ میں نے کچھ دیکھا وہ بڑبڑایا: "شاید میرا واہمہ ہو۔ اور پھر اندھا ہو گیا"

"نہیں نہیں۔ تم اب بھی سوجھتے ہو" ماں نے چلا کر کہا۔

"اور ہمیشہ رہوگے" پیچھے سے وائی مین کی آواز آئی۔

"ہاں" ماں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: "تم اب ہمیشہ دیکھ سکوگے۔ یہ تاریکی جو تمہیں مسلط ہوتی ہوئی معلوم دی۔ یہ اندھاپن نہیں تھا۔ بھلا میں تمہیں کیسے سمجھاؤں؟ شام کا جھٹ پٹا سا ہوتا تھا۔ رات کی آمد پر دن کی روشنی اس طرح غائب ہو جاتی ہے۔ یہ تو صرف رات تھی رات! سمجھے؟"

لیکن اسے سمجھنے میں کافی وقت لگ گیا۔

~~~~~~~~

دعوائے شاعری نہیں ہے مجھکو
بیگانگیٔ خودسری نہیں ہے مجھکو
کہتا ہوں بہ منزلِ تقاضائے فطرت
سودائے پیمبری نہیں ہے مجھکو

از

حضرت رازؔ چاندپوری

ہیں اور سوالِ خودنمائی توبہ
ہیں اور سوالِ خودستائی توبہ
ہم رند بلانوشِ ازل ہیں اے رازؔ
ہیں اور خیالِ پارسائی توبہ

سکھ سنچارک کمپنی متھرا

یو۔پی میں آیورویدک شاستروکت اوشدھیاں شدھتا اور پوترتا سے

بنانے والا

سب سے بڑا کارخانہ!

جو نویجاد مشینوں سے چلتا ہے جس کی تعریف ویدھ ڈاکٹر ایڈیٹر اور سرکاری حکام نے کی ہے

"سکھ سنچارک دراکشاسو"

طاقت بڑھانے والا بھوک بڑھانے والا چستی دینے والا بڑھیا پینے کا ٹانک ہے صرف یہی ایک ایسا دراکشاسو ہے جس کی تعریف بیشمار ویدھ ڈاکٹر اور ۷ اخباروں نے کی ہے

قیمت

بارہ ۱۲ اونس کی بوتل ... ... ایک روپیہ ۱؎

چوبیس ۲۴ اونس کی بوتل ... ... دو روپے ۲؎

نوٹ :۔ بارہ اونسی تین درجن بوتلیں منگوانے پر اکیس روپے آٹھ آنے میں ہر ایک ریلوے اسٹیشن پر پہنچا دیا جائیگا

ملنے کا پتہ :۔ سکھ سنچارک کمپنی متھرا (یو۔پی)

سورج کی پہلی کرن

نظم

از حضرت عاصم جے پور

سودائے شب اندیشہ کامل نہ ہوا تھا — یہ راز ابھی ناز کے قابل نہ ہوا تھا

محو شب تاریک تھا وہ عالم تنویر — آنکھوں میں سمٹ کر جو ابھی تل نہ ہوا تھا

ہر چیز تھی خلوت کدۂ ناز سے باہر — آئینہ کوئی عکس کے قابل نہ ہوا تھا

وہ پردہ نشیں ہو کہ نہ ہو زینت محمل — پردہ ابھی شائستہ محمل نہ ہوا تھا

آسودۂ مضراب نہ تھا ساز تو لیکن — پیدا سبب شورش محفل نہ ہوا تھا

وا ماندۂ لب تھا ابھی کلیوں کا تبسم — گلشن میں ابھی شور عنادل نہ ہوا تھا

ہر ذرہ کا دل جس سے ہو پیغمبر فطرت — ہم پر وہ صحیفہ ابھی نازل نہ ہوا تھا

گو سینۂ اسرار میں تھا سوز محبت
ظاہر نہ ہوا تھا ابھی نوروز محبت

جب حسن حیا شیوہ ہوا آئینہ آرا — دیکھا لب جاں بخش کو زلفوں کو سنوارا

شب [illegible] تھے برافشاں [illegible] چھپی تھی وہ چھڑائی — ٹیکا وہ لگایا کہ بہا نور کا دھارا

دی داد [illegible] نغمۂ ہستی — دیکھا تو کیا باغ تمنا کا نظارا

مہکا ہوا پھولوں سے ہر ایک شاخ کا دامن چمکا ہوا ہر ذرّہ کی قسمت کا ستارا
سبزے کے لہکنے میں وہ انگڑائی کا عالم خوشبو میں صبا سے وہ مچلنے کا اشارا
ہر آن میں ایک بات وہ ہر بات میں مستی مستی میں تغافل وہ تغافل میں مدارا
بادِ سحری رقص میں یوں سرخوش و بدمست جس طرح نگاہوں میں محبت کا شرارا

یوں مہرِ جہاں تاب کی پہلی کرن آئی
کاشانۂ نیرنگ میں گویا دُلہن آئی

دیکھا در و دیوار کو دزدیدہ نظر سے انوارِ مسرت در و دیوار سے برسے
اُبھر وہ پڑھے غمزۂ غماز نے چپ چپ سو حُسن جھلکنے لگے ہر پردۂ در سے
چلنے میں وہ دوشیزہ اداؤں کی جھجک سی ایک کیف ٹپکتا ہوا اندازِ نظر سے
احساسِ خود آرائی میں ڈوبا ہوا ہر رنگ ہر سانس مچلتی ہوئی خود اپنے اثر سے
ہر سمت امنڈتا ہوا دریائے تاثر ہر چیز نہائی ہوئی بوئے گل تر سے
فطرت کا ہر انداز کہ ہے رازِ مسرت کھلتا ہوا سبزے سے شگوفوں سے شجر سے
سورج کی کرن ہے کہ ہے بینائی کا سہرا سب جشنِ عروسی کے ہیں آثار سحر سے

پانی مترنّم ہے ہوا زمزمہ پردا[illegible]
آتی ہے مبارک ہو مبارک ہو کی آواز

قصرِ جعفری

ایک فردوس مثال محل

از الحاج مولانا عبدالقیوم ندوی

مسلمانوں کی شاندار تاریخ کا "قصرِ جعفری" ایک خوشنما باب ہے۔ اگرچہ اردو میں اب تک اس کا تذکرہ بہت کم ہوا ہے مگر عربی مؤرخ اس کو نہایت لطف اور شان سے بیان کرتے ہیں۔ مؤرخ گبن نے اعتراف کیا ہے کہ یورپ میں آج جسقدر شاندار عمارتیں ہیں وہ اسی محل کی نمونہ ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکے گا کہ یہ محل کسقدر خوبصورت ہوگا؟ اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لینی پڑی۔ تاریخ مسعودی۔ تاریخ طبری۔ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ تاریخ ابن رشد۔ تاریخ ابن خلکان۔ تاریخ بغداد وغیرہ۔ (عبدالقیوم ندوی)

اسلامی تاریخ میں برامکہ کو خاص مقام حاصل ہے۔ برامکہ ملک بلخ میں آتشکدۂ "نوبہار" کے متولی اور سرپرست تھے۔ مگر جب مسلمانوں نے بلخ کو فتح کرلیا اور آتشکدہ کی آگ سرد پڑگئی تو برامکہ مسلمان ہوگئے اسوقت جعفر ابن خاماس وطن مالوف کو خیرباد کہکر دمشق میں جو اس وقت پایۂ تخت اور حکومتِ اسلامیہ کے جاہ وجلال کا مرکز تھا، چلاگیا اور وہاں کتابت کے عہدے پر مقرر ہوا مگر رفتہ رفتہ ترقی کرکے یہ کتابت سے وزارت کے جلیل القدر منصب پر فائز ہوگیا۔ اور اسوقت سے لیکر خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ تک وزارت ان کے خاندان میں بطور وراثت کے چلی آتی رہی۔ لیکن اسجگہ جس جعفر کا تذکرہ کرنا مقصود ہے وہ جعفر بن خاماس نہیں بلکہ وہ اس کی نسل سے ہے جو خلیفہ ہارون الرشید کا وزیر تھا اور جس نے قصر جعفری تیار کرایا تھا۔ جو تباہی و بربادی کا موجب ہوا۔

جعفرِ برمکی کا شجرہ نسب یہ ہے۔ جعفر بن یحییٰ بن خالد بن جعفر بن خاماس۔ ابن بشاشف مؤرخ مسعودی نے لکھا ہے کہ یہ اسقدر فیاض اور کریم النفس تھا کہ لوگ ضرب المثل کے طور پر اسے بیان کرتے۔" ابن جریر نے لکھا ہے کہ اپنی فیاضیوں اور سیرچشمیوں کی وجہ سے اس نے عوام میں وہ مقام حاصل کرلیا تھا جس سے خلیفہ صرف برائے نام کا خلیفہ معلوم ہوتا تھا۔ اس فیاض وزیر نے سنہ ۱۸۰ھ مطابق ۷۹۶ء کو بروز جمعرات بوقت عصر اپنا شاندار اور عظیم المرتبت قصر تیار کرایا جس پر علاوہ تمام ساماں اور دوسری چیزوں کے جواہرات [illegible] لات اور نوشیرواں کے قصر ابیض سے آیا تھا، وہ [illegible] تھا۔ محل کیا تھا؟ عجائبات عالم کا ایک [illegible] بغداد کے مشہور محلہ شماسیہ میں واقع تھا۔ [illegible] پانی بہہ بہہ کر ہمہ وقت اس کی دلکشی و دلفریبی میں اضافہ کرتا۔ آگے چلکر ہم اس محل کی تفصیل بیان کرینگے۔ اس جگہ چند قدرتی واقعات جو پیش آئے ان کو سُن لینا ضروری ہے۔ مؤرخ یعقوبی کا بیان ہے کہ جب یہ عالیشان محل سالہا سال کی محنت و کوشش کے بعد بنکر تیار ہوگیا۔ تو سب سے بڑا معمار وزیر موصوف کی خدمت میں حاضر ہوکر آداب مناسب بجالایا اور ان الفاظ میں محل کی تیاری کی خوشخبری دی "اے فیاضیوں کے سردار اور اے خوش بختیوں کے پیشوا! اس مالک حقیقی کا شکریہ ادا کیجئے کہ اس نے اپنی جنت الفردوس کے مکانوں میں سے ایک بہترین مکان آپ کو اس دُنیا میں رہنے کے لئے بھیجدیا ہے جس کا حسن لاجواب ہے۔ جس کی بلندی بے مثال ہے۔ جسکی رونق بے نظیر ہے، اور جس کا جمال و کمال ظاہری و باطنی نہ دیکھنے میں آیا ہے نہ آئیگا۔ آیئے کہ مکان اپنے مکین کا منتظر ہے۔" (تاریخ یعقوبی، تذکرہ برامکہ)

جعفر نے جیسے ہی اس خبر فرحت اثر کو سُنا، سجدۂ شکر بارگاہ لم یزلی میں گرکر بجالایا اور اس قدر خوش ہوا کہ بقول مسعودی ایک ہزار درہم اسی وقت خیرات کردیئے۔ اس کے بعد اس نے مکان میں داخلہ کیلئے نجومیوں کو بلایا تاکہ وہ زائچہ نکالیں اور بتائیں کہ کون سا وقت اس میں جانے کیلئے مناسب ہوگا۔ تمام نجومیوں نے متفقہ حیثیت سے یہ رائے دی کہ رات کا وقت اس کے لئے موزون و سعید ہے چنانچہ شب کے وقت جعفر اس میں داخل ہوا۔ جس وقت وہ داخل ہورہا تھا اس کے کانوں میں کسی دردانگیز پڑھنے والے کی یہ آواز آرہی تھی۔

تدبر بالنجوم ولست تدری	تم ناسمجھ بنکر ستاروں پر اپنی تدبیریں،
ورب النجم یفعل ما یشاء	قائم کرتے ہو حالانکہ ستاروں کا رب جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

جعفر یہ شعر سنکر ٹھہر گیا اور اس کو اپنے حق میں بدفالی تصور کیا۔

تھوڑی دیر کے بعد داخل ہوا تو شعراء نے مدحیہ قصائد پڑھے اور بڑے جشن منائے گئے۔ ابن رستہ جو خلیفہ مکتفی باللہ کے عہد کا زبردست مؤرخ ہے، بیان کرتا ہے اور اس کا منظر اس طرح کھینچتا ہے کہ جعفر کے قدیم سکونتی مکان سے اس جدید مکان تک سُرخ مخملیں، بانات کا فرش تھا۔ بڑے بڑے عہدے دار دو رویہ سڑک پر بڑے بڑے تھالوں میں اشرفیوں کے توڑے رکھے ہوئے مؤدب کھڑے تھے اور ان کے پیچھے بیشمار خلقت خدا جعفر کی فیاضی کی منتظر تھی کہ جعفر اپنے قصر میں داخلہ کیلئے عشا کے بعد اپنے گھر سے بیشمار مبارکبادیوں اور قسم قسم کے باجوں کے دلکش نغموں میں باہر نکلا۔ بیحد خوش، بیحد مسرور، اور اس فیاضی کے ساتھ کہ دائیں بائیں جس طرف آنکھ اُٹھتی، تھالوں سے روپیہ لے لے کر مخلوق پر سونے چاندی کی بارش کرتا ہوا جس میں اپنے پرائے کی کوئی تمیز نہ تھی جس وقت مکان میں داخل ہوا تو معلوم ہو رہا تھا کہ اس محل کے نور سے آج سارا بغداد منور ہو جائیگا۔ اور مشک و عنبر کی عطر بیز خوشبو سے ایک عالم مہک اُٹھیگا۔ محل کے داخلہ کے بعد ۱۰۰ شعراء نے اپنے اپنے قصیدے پڑھے اور امید سے زیادہ انعام و اکرام سے مالا مال ہوئے سب سے آخر میں ابو نواس نے اپنا قصیدہ سنایا اور جس وقت یہ شعر اس کی زبان پر آیا۔

ان بع البلاءِ ان الخشوع لہادی	اے مکان تو شکستہ منہدم ہوگا۔ مگر میں نے
علیک وانی لم اخنک ودای	تیری محبت میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں
سلام علی الدنیا اذا ما فقدتم	کی۔ اے برمک کی اولاد جب تم اس
بنی برمک من رائحین و غادی	دنیا سے کوچ کر جاؤ گے تو تم پر آنیوالے
	اور جانیوالے کی طرف سے سلام ہوگا۔

تو جعفر برمکی نے کہا کہ ابو نواس! خدا تیرا بھلا کرے تو نے ہم کو ہماری موت کی خبر دی۔ اتفاق دیکھئے جعفر کو جس چیز کا دھڑکا تھا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اس کے آثار ظاہر ہونے شروع ہو گئے۔ یعنی اس مکان کی شان و شوکت اور جمال و رونق نے خلیفہ ہارون الرشید کے دل میں رشک پیدا کر دیا اور اب وہ جعفر کا حریف بن گیا۔ ایک دن خلیفہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوا تھا کہ اس کو ایک گمنام خط ملا جس پر یہ عبارت تحریر تھی۔

قل لامین اللہ فی ارضہ	خدا کی زمین کا جو امانت دار ہے اور حل و
ومن اللہ الحل والعقد	عقد کا مالک اس سے کہدو کہ یحیٰی کا بیٹا جعفر
ھذا ابن یحیٰی قد غدا	مالک ہو بیٹھا ہے اور اس میں اور تجھ میں
مالکا مثلک ما بینما حد	کوئی حد فاصل نہیں رہی۔

امرک مردودٌ الیٰ امرہٖ	تیرا حکم اس کے حکم کے آگے مردود ہے
وامرہٗ لیس لہ ردد	لیکن اسکے حکم کو کوئی ٹالنے والا نہیں ہے۔
وقد بنی الدار التی ما بنیٰ	اس نے ایک محل ایسا بنوایا ہے کہ جس کی مثال
فرس لہا مثلاً ولا الہند	نہ ایران میں ہے اور نہ ہندوستان میں اسکی
والدر والیاقوت حصاءھا	نظیر ہے۔ جسکی کنکریاں یاقوت اور سچے موتی
وتربہا العنبر والند	ہیں اور جسکی خاک عنبر اور لوبان ہے ہم لوگ
ونحن نخشیٰ انہ وارث	اس بات سے خائف ہیں کہ جب آپکو قبر
ملک ان غیبک اللحد	چھپا لیگی وہ ملک و سلطنت کا وارث بن جائیگا۔

حکیم بختشوع ابن جبرئیل عیسائی جو خلیفہ ہارون کا حکیم اور مصاحب تھا بیان کرتا ہے کہ ایک روز خلیفہ اپنے شاندار محل "خلد" میں رونق افروز تھا۔ سامنے دریائے دجلہ کا منظر تھا اور پرے برامکہ کی عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ خلیفہ نے کہا کہ برامکہ ہمارے لئے کسقدر محنت برداشت کرتے ہیں اور ہم اسکی سہولت سے آرام و عیش کرتے ہیں۔ حکیم مذکور لکھتا ہے کہ ایک زمانہ کے بعد پھر مجھے خلیفہ کے قصر میں جانے کا اتفاق ہوا پھر وہی گذشتہ سماں ہماری نظروں کے سامنے تھا۔ میں نے رشید کو یہ کہتے سنا کہ حقیقت میں برامکہ خلافت کرتے ہیں اور میں تو برائے نام خلیفہ ہوں" اس واقعہ کے تھوڑے عرصہ کے بعد جعفر خلیفہ کے حکم سے قتل ہوا اور اس کے بھائی اور باپ قید خانے میں ڈالدیئے گئے جو ایک ایک کرکے اس میں مر گئے۔ (تاریخ بغداد جلد دوم ص۴۳)

مؤرخ ابن خلکان جو عہد عباسیہ کا مشہور مؤرخ ہے۔ اس کے متعلق بیان کرتا ہے کہ اس عالیشان محل کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ یہ محلہ شماسیہ کے وسط میں واقع ہے۔ دریائے دجلہ اس کے پشت سے نہایت مست خرامی سے گذرتا ہے۔ اس جگہ کا منظر اسقدر لطیف ہے کہ سو سال کا بیمار بھی شفایاب ہو اور محل اسقدر بارونق کہ اندھا بھی دیکھنے کی خواہش کرے۔ یہ محل زمین سے ۵۰ فٹ کرسی پر بنا ہوا ہے ۹۰۰ فٹ لانبا اور ۷۰۰ فٹ چوڑا ہے۔ چاروں کونوں پر چار نہایت مضبوط اور خوبصورت کنگرے ہیں جو زمین سے ۳۰۰ فٹ بلند ہیں۔ محل میں سنگ سفید کے بڑے بڑے کمرے ہیں۔ جن میں ایرانی ساز و سامان نہایت قرینہ سے چنا ہوا ہے۔ جا بجا ہیرے ا[illegible]ڑے ہیں اور چھت جو خالص سونے کے پتر سے منڈھی [illegible] ۲۴ سونے کی شمعیں ہیں جن میں بڑے بڑے [illegible]ات میں اس طرح رنگت ہوتے ہیں جیسے کسی [illegible]ل میں شمع روشن کر دی ہے۔ اس کے علاوہ ۸۰ چاندی کی قندیلیں ہیں جن میں زمرد و ہیرے لگے ہوئے

ہیں جن سے رات کو کافوری شمعوں کا گمان ہوتا ہے۔ اس طریقہ کے ہر طرف آٹھ آٹھ بڑے کمرے تین طرف اور ہیں جس میں ہر سمت کے لحاظ سے ہر ملک کا سامان آرائش و زیبائش ہے۔ سارے محل میں تقریباً ۳۰۰ چاندی کی اور ۲۰۰ سونے کی شمعیں ہیں اور جابجا سونے چاندی کے فانوس اور لوبان دان رکھے ہیں جن میں قیمتی عنبر اور مشک ہر وقت روشن رہتا ہے۔ عین وسط محل کے صحن میں ایک بہت بڑا باغیچہ ہے جس میں دنیا کے ہر گوشہ کے پھول لا کر لگائے گئے ہیں۔ اور کچھ اس قرینہ سے لگائے گئے ہیں کہ دیکھنے والے عش عش کر اٹھتے ہیں۔

اس گلستان کے وسط میں ایک حوض ہے جس کا طول ۸۰ فٹ اور عرض ۴۰ فٹ ہے جس پر چاندی کا پتر چڑھا ہے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ ۲۰۰ من چاندی صرف اس پر صرف ہوئی تھی۔ وسط میں کہیں کہیں سونے کے طشت اس حوض میں بنے ہیں۔ جن میں ہیرے اور جواہرات لگے ہوئے ہیں۔ اس حوض میں ہر روز صبح گلاب اور رات کو کیوڑہ بھرا جاتا تھا۔ وسط حوض میں وزیر کے بیٹھنے کیلئے ایک خوشنما مسہری ہے جو خالص چاندی و سونے کی بنی ہے۔ یہ ۱۰ فٹ لانبی اور ۱۲ فٹ چوڑی اور ۱۸ فٹ اونچی ہے۔ چار چاندی کے منقش ستون ہیں اس پر نہایت عمدہ اور خوبصورت چاندی کا منقش گنبد ہے جس پر اندر اور باہر سونے کا پتر چڑھا ہوا ہے۔ ستونوں اور چھت میں ہیرے اور جواہرات قرینے سے لگے ہیں اور وسط گنبد میں اندرونی جانب ایک قیمتی ہیرا معلق ہے جو مرغی کے انڈے کے برابر ہے جسکی تابانی آنکھ نہیں اٹھانے دیتی۔ خشکی سے اس جگہ تک آنے کیلئے دونوں طرف نہایت سبک پل بنے ہیں جو سنگ سفید سے تراش کر تیار کئے گئے ہیں

جعفر ہر جمعرات کو اپنی حسین کنیزوں سمیت اس عنبریں حوض میں غسل کرتا تو سارے محل میں روشنی ہوتی اور خوشبوئیں سلگائی جاتیں۔ جس کو دیکھنے کے لئے لوگ دور دور سے پا پیادہ سفر کرکے آتے اور لطف اندوز ہوتے۔ عید اور بقر عید کے موقع پر اس محل کی سجاوٹ قابل دید ہوتی تھی

(مورخ ابن خلکان)

۷۲۷ھ میں ابن بطوطہ مشہور سیاح بغداد آیا اسوقت تک اس محل کے اثرات کچھ کچھ باقی تھے۔ اس نے اسکے متعلق ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

وہ جنت نظیر محل، وہ بے مثل مکان، وہ فرحت نظر قصر جس کی رونق کے سامنے ساری رونقیں ہیچ تھیں۔ اب اسکے کچھ کچھ آثار باقی ہیں اس محل کی تاریخ بڑی دردناک ہے۔ کیا معلوم تھا کہ اس کا بنوانے والا تھوڑے ہی عرصہ تک اس کی بہاریں دیکھ سکے گا اور پھر اپنے سارے کنبہ سمیت تہ خاک ہوگا۔ اُف یہ اسقدر پر جمال تھا کہ بڑے بڑے خلفا بھی اس پر رشک کئے بغیر نہ رہ سکے ......

یہ محل چھ سال کی تگ و دو کے بعد تیار ہوا تھا۔ اسکو ۹۰۰ کاریگروں اور ۱۰۰۰ مزدوروں نے ملکر تیار کیا تھا۔ کاریگروں میں چین، مصر، ہندوستان اور ایران کے مشہور کاریگر تھے، ۷۰۰ اونٹ اور ۳۰۰ خچر بار برداری کیلئے تھے۔ افسوس کہ اب اس کے آثار ہی صرف اپنے مکین کی عظمت کی شہادت دے رہے ہیں ورنہ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی چھائی ہے اور بس۔" (سفر نامہ ابن بطوطہ)

پھر اس کے بعد زمانہ کی گردشوں سے یہ بھی محفوظ نہ رہ سکے اور اب وہ آثار بھی لاپتہ ہیں۔ یہ تھی اس محل کی مختصر تاریخ اور یہ تھی اس کی کہانی جس میں مسلمانوں کے فن تعمیر اور انکے ذوق عمارت کی بھی سچی تاریخ پوشیدہ ہے۔

آزاد قیود رسم ہستی ہوں میں
پابند اصول حق پرستی ہوں میں
[illegible] ہوں لیکن
[illegible] پستی ہوں میں

از

مشہور جہاں ہے خوش نگاہی تیری
مقبول خرد ہے حق نمائی تیری
ہیں مجرم عشق ہوں طفیلے اے راز
مبنی بر صدق ہے گواہی تیری

حضرت راز چاندپوری،



بواسیر کی مصیبت ختم

خونی ہو یا بادی، نئی یا پرانی، اندرونی یا بیرونی خواہ کسی قسم کی بواسیر کیوں نہ ہو اس جادو اثر دوا "ارش ماش" کے صرف ایک دفعہ کے استعمال سے درد۔ کھجلی ٹیس۔ سوجن جلن۔ مواد آنا۔ خون کا گرنا فوراً آرام ہو جاتا ہے۔ تین دن میں خراب سے خراب بواسیر، ناسور، بھگندر بغیر اپریشن جڑ سے شرطیہ آرام ہوتا ہے۔ لاکھوں بیمار صحت یاب ہو کر دوسروں سے اس کی سفارش کرتے ہیں۔ آرام نہ ہو تو دام واپس قیمت صرف دو روپے ۲ محصولڈاک ۸

ملنے کا پتہ

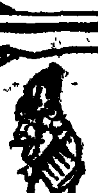
امریکن میڈیکل سٹور پوسٹ بکس نمبر ۱۳ دہلی A.L



گہری نیند کا لطف

سائنس کی حیرت انگیز ایجاد ویسٹن (Westonmon) کسی سوتے یا جاگتے ہوئے کو سونگھا دیجئے وہ ایک گھنٹہ کے لئے گہری نیند سو جائیگا اور ہلانے جلانے سے بھی نہ جاگے گا قیمت دو روپیہ ۲ (عـہ) محصولڈاک آٹھ آنے (۸ر) اگر ایک گھنٹہ سے پہلے جگانا ہو تو ریکشن (Raclian) سونگھائیے قیمت صرف دو روپیہ ۲ (عـہ) کم مقدار یا نمونہ مفت نہیں مل سکتا گارنٹی کی جاتی ہے کہ ویسٹن یا ریکشن دل کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاتیں۔

ایسٹرن آرٹس اکاڈمی نمبر ۴۵ (اے۔ایل) دہلی




کٹ پیس کپڑے اور گرم کوٹ کمبل

ہر قسم کے امریکن مانچسٹر جاپانی وغیرہ دس پونڈ سے لیکر ۳۰۰ پونڈ تک بنڈل لسٹ نرخ [illegible] دیں بچت ہوگی بہتہ کوٹ کرلیں۔

جام کوٹ کٹ پیس آفس نمبر ۴۵ د[illegible]

کالی بلّی

افسانہ

از جناب سیّد بادشاہ حسین حیدرآبادی

اس کا رنگ کالا تھا، بالکل کالا۔ بال ملائم تھے، غیر معمولی ملائم۔ قد میانہ ایسا ہی جیسا کہ عام طور پر اُسکی جنس کا ہوا کرتا ہے۔ آنکھیں چھوٹی اور روشن کبھی کبھی آہستہ سے ایک باوقار طریقہ پر دُم ہلاتی اور دانت نکوس کر "میاؤں" کا ایک نعرہ لگاتی۔ پھر تھوڑی دیر تک آنکھیں بند کئے مراقبہ میں چلی جاتی ۔۔۔ ایسی حالت میں کون کہہ سکتا ہے کہ وہ چوہے کا خیال کر رہی تھی یا حج کا بہرحال تھی وہ کسی گہری سوچ میں۔

یکایک رشیدہ کے قدموں کی چاپ نے اسے چونکا دیا۔ اسنے ایک پھریری لی اور شیریں خواب جسمیں اسے کیا کچھ نظر نہ آرہا تھا جھاتی اور انگڑائی لیکر وہ بیدار ہوئی۔ رشیدہ کو اس مکان کا ایک حصہ کرایہ پر لئے کچھ دن گذر چکے تھے لیکن اس نے کبھی اس جاذب نظر بلّی کو ایک پُرکیف حالت میں نہ دیکھا تھا۔ وہ رُکی، تماشا اس کے دل میں محبت کا دریا اُمنڈ رہا تھا۔ اس نے اپنی نرم و نازک آواز میں بلّی کو مخاطب کیا:۔

"پس پس ۔۔۔ پس پس . . . . ."

"میاں، میاں ۔۔۔ میاؤں"۔ گویا بلّی نے بھی محبت کا جواب بھیج دیا۔ رشیدہ مُسکرائی اور ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھی اور آن کی آن میں بلّی کو گود میں اُٹھا لیا۔

~~~

تھوڑی دیر بعد رشیدہ مکان کے محافظ سے پُوچھ رہی تھی۔ "کیا یہ بلّی کسی کی ہے؟"

"یہ بلّی ۔۔۔ نہیں خاتون، جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے مجھے تو یاد نہیں پڑتا۔" داڑھی کھجاتے ہوئے محافظ کہہ رہا تھا۔ "گویا میرا حافظہ زیادہ قوی نہیں ہے اور میں بسا اوقات بہت سی ایسی باتیں بھول جاتا ہوں جن کو یاد رکھنا میرے لئے ضروری ہوتا ہے ۔۔۔ پھر بھی، پھر بھی ۔۔۔ میں کیا کہہ رہا تھا معاف فرمایئے خاتون، آپ کی بلّی پر مجھے بڑا پیار آ [illegible]

"میں پوچھ رہی تھی [illegible] مالک تو نہیں ہے؟"

رشیدہ نے بھولا ہوا [illegible]

"اوہ! خوب [illegible] ان کسی کی ملک نہیں ہوسکتا تو پھر بلّی کیا [illegible] انی غلامی تو موقوف ہو گئی

۔۔۔ اب انسانوں کو تو نہ خریدا جا سکتا ہے اور نہ بیچا تو پھر بلّیوں کو کیونکر خریدا اور بیچا جا سکتا ہے؟"

"تو گویا یہ بلّی کسی کی نہیں ہے"۔

"سُن تو لیجئے کہ ہو کیسے سکتی ہے کسی کی ۔۔۔ میں تو اسی فکر میں ہوں کہ جلد یا بدیر ایک انجمن ایسی بنائی جائے جس کا مقصد اوّلیں بلّیوں کی خرید و فروخت کو روکنا ہو ۔۔۔"

"بہرحال میں اسے لیجاتی ہوں"۔ بوڑھے محافظ کو بڑبڑاتے چھوڑ کر رشیدہ بلّی کو اپنے کمرہ میں لے آئی۔

~~~

یہ ہے تمہارا نیا گھر ۔۔۔ اوہ! میں نے ابھی تک تمہارا نام رکھوائی ہی نہیں کی ۔۔۔ لیلیٰ لیلیٰ ۔۔۔ ہاں تو سمجھیں تمہارا نام ہوگا لیلیٰ ۔۔۔" رشیدہ نے بلّی کو اپنے کمرہ میں لا کر کہا۔ وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اور اسکی گود میں بلّی تھی۔ سر اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے اپنا پورا تعارف کراتے ہوئے آخر میں کہا۔ "لیلیٰ تم پریشان نہ ہو، یہاں تمہیں ہر قسم کا آرام مُہیا کیا جائیگا۔ کسی بات کی تکلیف نہ ہونے پائیگی ۔۔۔ اِدھر آؤ! میں تمہیں بتاؤں (وہ اُٹھکر بازو کے کمرہ میں گئی) یہ ہے سونے کا کمرہ، تم میرے ہی بستر پر سوؤ گی! ہے نا کرم ۔۔۔ اچھا اِدھر آؤ! یہ ہے کھانیکا کمرہ، تم میری میز پر ہی کھاؤ گی! اور ہاں اگر اوقات مقررہ کے سوا بھوک لگے تو تکلف نہ کرنا، اس الماری میں دودھ، دہی، پنیر، مسکہ وغیرہ ہمیشہ رہا کرتا ہے ضرورت کے مطابق کام میں لانا ۔۔۔ اِن سب کے معاوضہ میں تمہارے ذمہ ایک کام ہے اہم کام! اور وہ صرف یہ کہ میں اکیلی ہوں میرا دل بہلانا ۔۔۔ میں نہ رہوں تو تم ہمسایہ میں جا سکتی ہو لیکن زیادہ میل ملاپ مجھے پسند نہیں"۔

"میاؤں ۔۔۔ میاؤں"۔ لیلیٰ نے گویا شرائط منظور کر لئے مگر وہ گود سے چھوٹنے کے لئے بیقرار نظر آرہی تھی اس لئے رشیدہ نے اسے نیچے چھوڑ دیا اور وہ فوراً ہی بھاگ کر کھانے کے کمرہ میں پہنچی۔

"اچھا تو تمہیں بھوک لگی ہے"۔ رشیدہ نے معنی خیز مُسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"آؤ! میں تمہیں تھوڑا سا دودھ ہی پلا دوں"۔ یہ کہکر رشیدہ نے ایک پیالی میں

دُودھ لیکر لیلیٰ کے آگے رکھا اور وہ آنکھیں بند کر کے پینے لگی۔

جب تک لیلیٰ دُودھ پیتی رہی رشیدہ اپنے دل سے باتیں کرتی رہی —— "لوگ عام طور پر کالی بلی کو نیک شگون خیال کرتے ہیں۔ کاش میری قسمت کا پانسہ بھی پلٹے! پانچ مضمون لکھتی ہوں تو اخبار والے ایک مضمون قبول کرتے ہیں اور یہ بھی تو میری سمجھ میں آج تک نہ آئی کہ روز بروز معاوضہ میں کمی کیوں کی جارہی ہے۔ بہانہ یہ بتایا جاتا ہے کہ کاغذ گراں ہے —— کاغذ کی گرانی کو معاوضہ کی کمی سے کیا تعلق؟ یہ اخبار والے بھی بہت خود غرض ہوتے ہیں۔ دُوسروں کی دماغی کاوش سے خود روپیہ کماتے ہیں اور پھر وہ اس بلا کی کہ خدا کی پناہ! بیچارے نامہ نگاروں کو روپیہ میں ایک آنہ بھی نہیں دیتے۔ صرف باقی جمع خرچ۔ واہ واہ سُبحان اللہ۔ مگر زود طبیعت سخن در میں ہست —— دیکھیں یہ کالی بلی کیا رنگ کھاتی ہے"

"میاؤں، میاؤں"۔ لیلیٰ نے بظاہر دُودھ ختم کر کے زبان چاٹتے ہوئے کہا۔ لیکن رشیدہ نے اس کو اپنے دل کا مُدعا سمجھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ لیلیٰ نے ہامی بھری ہے کہ وہ ضرور اس کی قسمت پلٹ دے گی۔

دُوسرے دن جب رشیدہ اخبار کے دفتر میں نیا مضمون دیکر واپس لوٹی تو لیلیٰ کا پتہ نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ رشیدہ نے خیال کیا ہوگا کہ وہ ہمسایہ میں وقت گذار رہی ہوگی لیکن جب سہ پہر بھی ہو گئی اور لیلیٰ نہ آئی تو اس کو تشویش ہوئی۔ مکان کے دوسرے حصوں میں جہاں دوسرے کرایہ دار رہتے تھے رشیدہ تانک جھانک کرنے لگی کہ کہیں نہ کہیں لیلیٰ ضرور نظر آجائیگی چنانچہ اس کی کوشش رائیگاں نہ گئی اور بازو کے کمرہ میں جس میں ایک نوجوان کرایہ سے رہتا تھا لیلیٰ کی موجودگی "میاؤں میاؤں" سے ظاہر ہو گئی۔ دریچہ کا پردہ ہٹا کر رشیدہ نے دیکھا لیلیٰ فرش پر قالین کے ایک کونے پر لیٹی تھی۔ اس کا ہاتھ مُنہ پر تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ رشیدہ نے خیال کیا کہ وہ اپنی نئی مالکہ سے چھوٹ کر اُداس سی ہو گئی ہے، اور چونکہ اس کو موجودہ ماحول پسند نہیں ہے اس لئے اس نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔

فوراً ہی رشیدہ نے کمرہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک لمحہ بعد ایک نوجوان لنگی باندھا ہوا اس کے سامنے آموجود ہوا۔ رشیدہ نے اس نوجوان سے اب تک دوستی نہ کی تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ صاحب سلامت اور بات چیت کی بھی نوبت نہ آئی تھی البتہ دو ایک دفعہ ضرور اس نے اس کو اپنے کمرہ میں جاتے آتے دیکھا تھا۔ ایک دُبلا پتلا نحیف و زار نوجوان جس کے چہرہ پر جوانی کی شگفتگی کی بجائے سنجیدگی کی اُداسی برستی تھی۔ ناک نقشہ ویسے بُرا نہ تھا اور رنگ و روغن بھی معیوب نہ تھا لیکن زندگی کی کیف و مستی جو عام طور پر اس عمر میں رگ رگ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے اس نوجوان میں مفقود تھی اس لئے اس کی شخصیت میں کوئی خاص کشش نہ تھی ——

"کیا آپ براہِ کرم اجازت دینگے کہ میں اپنی بلی کو آپ کے کمرہ سے لیجاؤں؟" رشیدہ نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ اسے پوری توقع تھی کہ وہ نوجوان بھی ضرور ہی مُسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیگا اور بڑی خوشی سے بلی لیجانے کی اجازت دیگا —— لیکن۔

"آپ کی بلی؟" نوجوان نے اور بھی زیادہ سنجیدگی سے پوچھا۔

"جی ہاں میری کالی بلی لیلیٰ"۔ رشیدہ نے تفصیل بیان کی۔ "وہ آپ کے کمرہ میں ہے"۔

"میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے خاتون!" اس نے خشک لہجہ میں کہنا شروع کیا۔ "میرے کمرہ میں ایک ہی کالی بلی ہے اور وہ میری بلی عذرا ہے"۔

"لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے خود لیلیٰ کو آپ کے کمرہ میں دیکھا ہے، ابھی ابھی"۔

"وہی تو عذرا ہے —— خاتون میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو غلطی ہوئی"۔ نوجوان کا انداز گفتگو اٹل تھا۔

پہلی دفعہ رشیدہ کو معلوم ہوا کہ اس کا ملحقہ ہمسایہ ایک شریف آدمی نہیں بلکہ بدتمیز، بے ایمان اور بلیوں کا چور ہے اور چور بھی ایسا کہ جو ہاتھ میں چراغ لیکر چوری کو آئے۔ کمرہ میں لیلیٰ موجود ہے اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور چور کا سینہ زوری دیکھو کہ وہ جھٹلا رہا ہے۔ یقیناً یہ نوجوان پیشہ ور اور مشاق بلیوں کا چور ہے۔

"کیا میں دریافت کر سکتی ہوں کہ عذرا آپ کے ہاں کب سے ہے؟" رشیدہ نے جرح کی۔

"آج دوپہر سے"۔ نوجوان نے عجیب و غریب ڈھٹائی سے کہا۔

"کیا وہ اس دریچہ کی راہ سے آئی ہے؟"

"میں نے دیکھا تو نہیں ممکن ہے کہ آپ کا خیال صحیح ہو"۔

"میں آپ سے دوبارہ کہتی ہوں کہ آپ براہِ کرم میری لیلیٰ کو واپس کردیں"۔ رشیدہ نے قطعیت سے کہا۔

"اوہو، میں سمجھا۔ آپ اپنے جرحی سوالات سے یہ نتیجہ نکال رہی ہیں کہ آپ کی لیلیٰ آج دوپہر کو میرے ہاں آگئی اور —— اور —— خیر جانے دیجئے اس بحث [illegible] یہ تسلیم کئے لیتا ہوں کہ آپ کی منطق اصولاً صحیح ہے [illegible] ہوں کہ میری عذرا ہی در اصل آپ کی [illegible] میں کسی سمجھوتہ پر پہنچیں اور بلا ضرورت بات [illegible] مثلاً یہ کہ آپ کو دوسری بلی خرید دوں، ایک نہ سہی ایک [illegible] کی عذرا نہ ہوگا —— کہیئے

آپ کو منظور ہے ؟"

"کیا آپ میری لیلیٰ مجھے واپس دیدینگے ؟" رشیدہ نے تسلی تشفی کرکے کہا۔

"اِس بلی کی کیا حقیقت ہے، مَیں آپ کو بہترین بلیاں خرید دوں گا۔ کشمیری، ایرانی، انگورہ کی۔"

"بات بڑھانے سے کیا فائدہ۔" رشیدہ نے درشت لہجہ اختیار کیا۔ مَیں اپنی لیلیٰ چاہتی ہوں اور مَیں اسے لیکے رہونگی، سمجھے آپ، ورنہ —— ورنہ ——"

"اوہ! آپ تو خفا ہوگئیں" نوجوان نے بات کاٹ کر کہا "مَیں اب اپنے آپ کو آپ کے رحم وکرم پر چھوڑ دیتا ہوں۔ آپ کہیں تو یہ بھی مان لیتا ہوں کہ میری عذرا دراصل آپ ہی کی لیلیٰ ہے اور یہ بھی اقرار کررہا ہوں کہ مَیں نے بدنیتی سے اس کو اپنے ہاں روک رکھا —— مگر لِللہ سُن لیجئے کہ مَیں کیوں آپ سے بھیک مانگ رہا ہوں —— واقعہ یہ ہے کہ مَیں ابھی اپنے ایک ڈرامے کو فلم بنا کر واپس آرہا ہوں —— آپ نہیں جانتیں یہ فلم کمپنیاں کیا چیز ہوتی ہیں؟ فنی نقطۂ نظر سے افسانہ کتنا ہی بہترین ہو۔ زبان اور بیان کے لحاظ سے مکالمہ کتنا ہی بہترین ہو۔ سیرت نگاری کے لحاظ سے کردار کتنے ہی بہترین ہوں کوئی فلم کمپنی اسے اُس وقت تک قبول نہیں کرتی جب تک —— جب تک —— مَیں آپ سے کیا کہوں ان کا کیا معیار ہے، مجھے شرم آتی ہے کہتے ہوئے، جبتک کہ اسمیں اتنی لغویت نہ ہو کہ عوام اسے قبول کرلیں۔ مَیں فلم کمپنیوں کی مذمت نہیں کررہا ہوں بلکہ واقعہ عرض کررہا ہوں کہ وہ افسانہ کی جان فحش مکالمہ، عریاں کردار نگاری، مار پیٹ اور دوڑ دھوپ سمجھتے ہیں۔ وہ صرف چار آنے والوں کے مذاق کا خیال کرتے ہیں، شائد اِس لئے کہ وہ خود چار ہی آنے والوں کے زمرے میں ہوتے ہیں —— معاف کیجئے مَیں اپنی بحث سے بہت دُور جا پڑا —— ہاں تو مَیں کہہ رہا تھا کہ بڑی مشکل سے میرا ایک افسانہ فلم کمپنی نے قبول کیا تھا۔ آج اسکی شوٹنگ مکمل کرکے مَیں واپس ہو رہا تھا کہ عذرا کو نہیں نہیں لیلیٰ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا —— میری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ مَیں وہمی ہوں خصوصاً بلیوں کے معاملہ میں تو مجھے بہت سے تلخ تجربات گذرے ہیں۔ فلم کمپنی والوں نے کہا ہے کہ اگر میرے افسانہ نے ہردلعزیزی حاصل کی اور خوب روپیہ وصول کیا تو پھر دوبارہ میرا افسانہ قبول کرینگے ورنہ —— ورنہ ——" اسکی آواز گلوگیر ہوگئی تھی اور باوجود ضبط کے [illegible] معلوم ہوتا [illegible] کہ وہ رو پڑیگا۔ "اِسی لئے مَیں چاہتا تھا کہ [illegible] مَیں اِس بلی کو اپنے ہاں ہی رکھوں [illegible] ہاں سے چلی گئی تو فلم کا کامیاب ہونا [illegible] زندگی ——"

"اوہ! مَیں بھی، [illegible] کاٹ کر کہا۔ وہ دل میں شرمندہ تھی کہ ایسے شریف اور علم وادب کے خدمت گذار کو وہ بدنیت، بلیوں کا چور سمجھ رہی تھی۔ "یقیناً، اِن حالات کے تحت بلی آپ اپنے ہاں ہی رکھیئے!"

"پھر آپ ——"

"میری فکر نہ کیجئے۔ آپ کے پہلے فلم کا کامیاب ہونا ہے۔ آپ کا خیال صحیح ہے بہت سے لوگ کالی بلی کو خوش قسمتی کی نشانی سمجھتے ہیں۔ اسکی غیر موجودگی یقیناً آپ کے لئے بدشگونی کا باعث ہوگی۔"

"کیا واقعی آپ لیلیٰ کو مجھے دے رہی ہیں۔"

"ہاں عذرا کو آپ اپنے ہاں ہی رکھئے۔ مجھے اسکی خاص ضرورت نہیں البتہ ایک ذراسی دلبستگی تھی۔"

"کیا آپ کے ساتھ کوئی اور نہیں رہتا۔"

"نہیں، مَیں فی الحال یہاں تنہا ہی ہوں۔"

"تو پھر اس کو آپ کے پاس ہی رہنا چاہئے ورنہ آپ کے لئے تنہائی تکلیف دِہ ہوگی۔"

"نہیں آپ اس کی فکر نہ کریں۔"

"نہیں آپ لیجائیں۔"

"نہیں آپ رکھیں۔

دُوسرے ہی روز رشیدہ اور نوجوان صادق میں گاڑھی چھننے لگی۔ قاعدہ کی بات ہے کہ ایک ہی پیشہ کے جب دو آدمی ملتے ہیں تو دل کھول کر ملتے ہیں۔ رشیدہ صحافت کے میدان میں ٹھوکریں کھا رہی تھی اور صادق ڈراموں کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ دونوں کو ناقدرئ زمانہ کی یکساں شکایت تھی اور یقیناً یہی ایک مشترکہ محاذ تھا جہاں دونوں یکجا اور اکٹھے ہوکر انیس کی مناجات بطور فلمی دوگانہ کے گا رہے تھے۔

وہ روزانہ گھنٹوں یکجا رہتے۔ صادق اپنے نئے ڈراموں کے پلاٹ سُناتا اور رشیدہ اُن پر تبصرہ کرتی البتہ اِس تبصرہ میں تعریف اور قصیدہ کا رنگ زیادہ ہوتا۔ صادق کا دِل کسی نے اتنا نہیں بڑھایا تھا اور اس کے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی اس کے ڈرامے کو سُن کر کہے کہ وہ اگر ہندوستان کا شیکسپیئر نہیں تو برنارڈ شا ضرور ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ نہ شیکسپیئر کو اور نہ برنارڈ شا کو دُنیا نے پہلے ہی دِن بڑا مان لیا۔ شیکسپیئر کو لوگوں نے زندگی میں بُرا بھلا کہا اور مرنے کے بعد تو بعضوں نے یہ سُراغ لگانے کی بھی کوشش کی کہ اسکے ڈرامے دراصل دُوسرے کے لکھے ہوئے تھے۔ یہی حال برنارڈ شا کا رہا لیکن چونکہ زمانہ بدل گیا ہے اِس لئے برنارڈ شا نے بالکل ہی نیا ہتھیار استعمال کیا یعنی نے یہاں خفیہ ہتھیار عمداً نہیں لکھا کہ یہ صنعت محض جنگ میں ڈرانے کیلئے استعمال

بھٹنے لگی ہے)یعنی یہ کہ اگر پبلک نے اس کا خیر مقدم نہیں کیا تو اس نے بھی پبلک کو ٹھکرا دیا۔ حتیٰ کہ عوام اور خواص دونوں اس سے فی الفور مرعوب ہوگئے اور اس کو سر آنکھوں پر لینے لگے لیکن وہ برابر ان کو روند رہا ہے۔

کبھی صادق سوچنے لگتا کہ اس کے دن پھرنے لگے ہیں اور عورت کہ جو دنیا میں ہٹ دھرمی اور ضد کے لئے مشہور ہے وہی سب سے پہلے اسکی دماغی صلاحیتوں کا لوہا مان رہی ہے تو اب مردوں کیلئے کیا باقی رہگیا۔ انکو بھی لامحالہ اپنی گردنیں جھکانی ہی ہوں گی۔

کبھی وہ ڈرامائی فن اور اصول پر رشیدہ سے بحث کرنے لگتا اور دنیا کا سب کچھ بھول جاتا۔ تھیٹر، ڈراما، اداکار اور آرٹ بس ان ہی کے ارد گرد اس کی بحثیں منڈلاتیں، وہ کبھی ایک کا دامن پکڑ کر جھنجھوڑتا اور کبھی دوسرے کا گریبان چاک کرتا۔ بہرحال فن واصول ڈراما کے سارے بخیے اُدھیڑتا۔ رشیدہ شاعر کے میزبان کی طرح واہ واہ کرتی یا میلہ کی گڑیا کی طرح تالیاں بجاتی تو صادق کی طبع کے لئے ایک اور تازیانہ ہوتا۔

صادق کو ابھی تک خودی کا احساس ہی نہ تھا بلکہ اگر کچھ معرفت تھی تو احساس پرستی کی لیکن رشیدہ کے مدعو اُٹھانے نے اسکی دنیا ہی بدل دی۔ اس کی قوت ادراک پرے ہی پرے، بلند سے بلند ساتویں آسمان سے بھی پار ہی پار پہنچ گئی ——— نہ اُسے منزل مقصود معلوم تھی نہ رشیدہ کو اور نہ کسی اور کو۔ نتیجہ یہ ہوا اور یہ ہونا یقینی تھا کہ نہ صرف وہ یہ سمجھنے لگا کہ رشیدہ اس کو بڑا ڈرامانگار سمجھتی ہے بلکہ ساری دنیا بھی اور اگر فلم کمپنی والے اس کو ایسا نہیں سمجھتے تو یہ انکی اپنی غلطی ہے انہیں انکا احساس ہوگا جلد یا بدیر بہرحال یہ اس کا فرض نہیں کہ وہ ان کو اپنی اعلیٰ صلاحیتوں سے آگاہ کرائے بلکہ ان کا اپنا فرض ہے کہ وہ اس کے قدموں تلے آنکھیں بچھا کر فلم اور تھیٹر کی ترقی میں اس کی خدمات سے فائدہ اُٹھائیں۔

فلم کمپنی کے مالک نے صادق کا جو یہ نیا ڈرامہ دیکھا تو اُسکی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کیونکہ اس کا یہ ایمان تھا کہ ایک صادق نہیں بلکہ دنیا بھر کے ڈرامہ نویسوں کو اس کے آستانہ کی مدت العمر جبہ سائی کرنی چاہئے۔ اگر اس دوران میں وہ کسی کے ڈرامے کو منظور کرلے تو یہ اُس کی اپنی نظر کرم اور لطف خاص کا نتیجہ ہے نہ کہ ڈراما کی اہمیت اور ڈرامانگار کی قابلیت کا۔ ظاہر ہے کہ ایک ہی کام پر لگے ہوئے دو کاریگروں میں جب اتنا عظیم اختلاف ہو تو تصادم ضروری تھا چنانچہ صادق پر نظر عتاب ہونی شروع ہوئی اور اس کو اس حقیقت سے آگاہ کردیا گیا اس کے جیسے ڈرامانگار کان پر قلم رکھے روز صبح سے شام تک اُس کے دروازہ پر آتے اور سونے کی زنجیر کھینچکر رحم و کرم کا گھنٹہ بجاتے ہیں۔ اس لئے مالک کمپنی اسی ایک کے بھروسہ پر نہیں ہے جیسا کہ اس سے پہلے کے ڈرامانگاروں کو وہ کہہ چکا ہے۔ "وہ نہ سہی اور سہی اور سہی!" اسی طرح وہ صادق کو بھی الٹیمٹم دیتا ہے۔

متذکرہ بالا واقعہ کے بعد صادق جب گھر لوٹا تو ظاہر ہے کہ دل گرفتہ اور ملول تھا۔ وہ ترقی پسند ادیب تھا وہ چاہتا تھا کہ ادب کے حدود سے آگے بڑھ کر عملی دنیا میں ایک انقلاب برپا کردے، سرمایہ داروں کے قصروں کو ڈھادے بالخصوص ایسے سرمایہ داروں کے قصروں کو جنہوں نے فلم کمپنی کے حصے خرید رکھے ہیں اور اُن تمام مزدوروں کو جن کے اشتراک عمل سے فلم تیار ہوتی ہے عدم تعاون پر آمادہ کرے مگر سوال ان "چوٹی والے فلمی ستاروں" کا تھا جو ظاہر میں مزدور لیکن باطن میں سرمایہ دار تھے اور چوٹی کی نحوست کے کرشمے دکھانکی بجائے اپنے اور اپنی کمپنی کے لئے خوش قسمتی کا بازار تھے۔ وہ یقیناً عدم تعاون پر آمادہ نہ تھے اور نہ ہوسکتے تھے۔ اس کے سوا مزدوروں کا وہ طبقہ بھی جس کو فلمی زبان میں اداکار کہا جاتا ہے اور جو کئی مہینوں کی تنخواہ پائے بغیر نیم فاقہ کی حالت میں کسی حاکم یا سرمایہ دار کا پارٹ ادا کر رہا ہے "جنت الحمقا" میں تھا۔

صادق کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ اس وجہ سے گیا کہ وہ گھر پہنچ گیا تھا دروازے کے آگے اُس نے عذرا کو دُم ہلاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ دروازہ کھول کر وہ اندر پہنچا تو عذرا وہاں بھی نہیں تھی اور دو چار دس پانچ دفعہ آوازیں لگانے پر بھی وہ نہ آئی۔

"ہُوں ——— عذرا کی غیر موجودگی ہی بدنصیبی کا سبب ہوسکتی ہے ——— کہاں مرجاتی ہے کمبخت نہیں معلوم، لاکھ جتن کرو پھر بھی ———" وہ اپنے ذہن میں فقرہ مکمل نہ کرنے پایا تھا کہ سامنے سے رشیدہ مسکراتے ہوئے تیز تیز چلی آئی۔

"سُنا صادق تم نے ——— میں ——— میں، مجھے "خاتون ہند" کے اخبار میں دو کالم روز لکھنے پر مامور کرنے کیلئے پرسوں بلایا گیا ہے۔" رشیدہ نے کہا اور بغیر جواب کا انتظار کئے جلد جلد کہنے لگی "جانتے ہو نا خاتون ہند کو، سارے ہندوستان میں اس سے بہتر عورتوں کا اخبار نہیں ہے۔ خریدار بھی اس کے زیادہ ہیں۔ اسٹاف بھی بہت مشہور لکھنے والی خواتین کا ہے عوام میں پرچہ بہت زیادہ مقبول ہے اور حکومت کا بھی منظور نظر ہے ——— [illegible] سو روپے ماہوار دینگے دن کے بجے سے چار بجے تک دفتر میں رہنا ہوگا اور پھر کوئی جھگڑا نہیں اس [illegible] آزادی۔ رات میں دوسرے پرچوں کے لئے اگر [illegible] ——— سُنتے ہو کچھ سُنا بھی، میں کیا کہہ [illegible] وم ہوا کہ صادق اس کی باتوں پر زیادہ [illegible]

"ہُوں" صادق [illegible]

رشیدہ کو اِس سرد مہری سے آگ ہی تو لگ گئی۔ وہ سمجھتی تھی کہ صادق خوشی سے مر نہ گیا تو نیم دیوانہ ہو کر ناچنے ضرور لگے گا۔ مگر ایک "معنی خیز ہُوں" نے اُس کی اُمیدوں پر اولے گرا دیئے۔

وہ سوچنے لگی کہ مرد حاسد ہوتے ہیں وہ دُوسروں کی کامیابی ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے۔ مرد ہاتھی کے دانت ہیں کہ دکھانے کے اور کھانے کے اور، کل تک صادق اس کی کامیابی کے لئے دست بدعا تھا اور کن کن طریقوں سے کوشش کر رہا تھا کہ اس کو خاتونِ ہند یا صنفِ نازک کی ادارت میں کوئی جگہ مل جائے مگر یہ سب دکھاوا ہی دکھاوا تھا۔ اَب جبکہ وہ خود اپنی ہی کوشش سے خاتونِ ہند جیسے زبردست اخبار میں مُلازم ہونے کو ہے تو وہ ظاہرداری باقی نہ رکھ سکا۔ ایسے آدمی سے اس نے آیندہ کی جو اُمیدیں باندھ رکھی ہیں اُن کے پورا ہونے کی کیا توقع۔ وہ کیسی نادان اور بھولی بھالی ہے خیر یہ بھی اچھا ہُوا جو بات آگے بڑھنے سے پہلے ہی طبیعت کا اصلی رنگ ظاہر ہو گیا ورنہ ——

رشیدہ یہیں تک سوچنے پائی تھی کہ دفعتاً صادق نے پُوچھا "میری عذرا کہاں ہے؟"

"میری لیلیٰ میرے ہاں ہے"۔ رشیدہ نے "میری" پر زور دے کر کہا کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ جنگ کی چھیڑ چھاڑ کی ابتدا ہو جائے"۔

"اوہو —— تو اِسی لئے تمہیں مُلازمت کے لئے بُلایا گیا ہے —— عجیب مشکل ہے، بلّی ایک ہے اور اس سے دو آدمیوں کی قسمتوں کا دامن بندھا ہُوا ہے۔ کل وہ تمہارے ہاں رہی تو تمہیں مُلازمت کے لئے بُلوایا گیا۔ میرے ہاں سے غائب تھی تو مجھے آج نوٹس دیدیا گیا کہ آیندہ شاید میری خدمات کو کمپنی کی ضرورت نہ رہے ——" صادق کی گفتگو نامکمل ہی رہی۔

"اوہو! یہ تو بہت بُری خبر ہے"۔ رشیدہ نے بات کاٹ کر کہا "مگر خیر آج میں عذرا کو تمہارے کمرہ میں بند کر دونگی۔ کل دیکھنا ضرور وہ کایا پلٹ دے گی —— کیا تم اِسی لئے فکرمند تھے؟"

فکرمند کیا معنی میں تو اپنے ہوش و حواس میں بھی نہ تھا —— پہلی مرتبہ فلم کمپنی افسانہ قبول کرے اور میں یہ سمجھ بیٹھوں کہ اَب کاروبار چل نکلا ہی چاہتا ہے عین موقع پر [illegible] کی دیدی جائے تو تو ——"

"توبہ، توبہ! [illegible] فکر نہ کرو میں ابھی دوڑ کر بلّی کو لاتی ہوں"۔

یہ کہکر رشیدہ دوڑتی ہوئی اپنے کمرہ میں گئی اور کہیں سے عذرا کو پکڑ کر لے آئی اور صادق کی گود میں ڈالتے ہوئے کہنے لگی "لو سنبھال کر رکھو —— گلے میں ڈوری باندھ دو، کہیں جانے نہ پائے —— پرسوں ہے نا نمائش تمہارے فلم کی —— بس پرسوں تک اسے اپنے ہاں ہی رکھو۔ یقیناً فلم چل نکلے گا ——"

"مگر پرسوں تمہاری مُلازمت کا بھی تو معاملہ ہے اگر بلّی تمہارے کمرے میں نہ رہے تو کیا معلوم اگر مالکِ "خاتونِ ہند" تمہیں پرسوں کی مُلاقات کے بعد مُلازمت نہ دے —— ہوسکتا ہے کہ قسمت کا پانسہ پھر پلٹ جائے اِس لئے مناسب بلکہ ضروری ہے کہ تم اپنی لیلیٰ کو اپنے ہاں ہی رکھو"۔

"نہیں نہیں یہ نہیں ہوسکتا، میری مُلازمت سے زیادہ ضروری ہے"۔

"نہیں، مَیں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ زبردستی بلّی کو باندھے رکھنے سے مجھے کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا"۔

"نہیں مَیں کبھی تمہاری منطق نہ مانوں گی"۔

"تو پھر ایک کام کرو —— مَیں ایک ایسی تجویز پیش کر رہا ہوں کہ جسکی رُو سے بلّی بیک وقت دونوں کے ہاں رہ سکتی ہے"۔

"کیا کوئی شیخ چلّی کا منصوبہ ہے؟ ایک بلّی دو آدمیوں کے ہاں کس طرح رہ سکتی ہے؟

"اگر ہم دونوں شادی کرلیں اور ایک ہی کمرہ میں رہنے لگیں تو بلّی بھی ایک ہی جگہ بیک وقت دونوں کے قریب رہ سکے گی —— کیوں ہے نا؟ —— تم شرما رہی ہو، اِس میں نہ صرف موجودہ قسمتوں کے سنورنے کا امکان ہے بلکہ آیندہ زندگی کی بھی فلاح مضمر ہے —— کیوں تمہیں منظور ہے؟ نیچی نظریں اور ہلکی مُسکراہٹ کو مَیں قبولیت کی سند سمجھتا ہوں"۔

چٹ منگنی اور پٹ بیاہ۔ فوراً شادی خانہ آبادی بھی ہوگئی اور بلّی کو دونوں کی مشترکہ قسمتوں کو سنوارنے کے فرائض سپرد بھی کر دیئے گئے اور آج ہی آزمائش کا دن بھی آگیا۔ رشیدہ اپنا بہترین ملبوس زیب تن کئے "عذرا لیلیٰ" کو خوب بھینچ بھینچ کر پیار کرکے، آنکھوں میں اُسی کا تصوّر جما کے دفترِ خاتونِ ہند کی طرف چلی اور دل ہی دل میں "عذرا تو لیلیٰ تو' آئی نوکری کو دِلا تو" کا وظیفہ پڑھنے لگی۔

دُوسری طرف صادق اپنا نیا سُوٹ جو اس نے شادی کے لئے سلوایا تھا لیکن بروقت نہ مل سکنے کے باعث پہن نہ سکا تھا زیب تن کئے نشاط ٹاکیز کیطرف وقت سے پہلے ہی جا رہا تھا کہ آج اِس ہال میں اس کے فلم کی پہلی مرتبہ نمائش ہونے والی تھی۔ راستہ بھر وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ خوش قسمتی کا تعلق کالی بلّیوں سے کیوں ہے اور خوش پوشی کا تعلق کالے سُوٹ سے کیوں؟

کالی بلی بیچاری جس کا اَب نام نہ محض عذرا اور نہ محض لیلیٰ رہ گیا تھا بلکہ شادی کے بعد دونوں ناموں کو ملا کر ہندی ہندوستانی کی طرح عذرالیلیٰ رکھدیا گیا تھا۔ جس طرح اول الذکر ہندوستانی کی مشترکہ زبان ہو سکتی ہے اسی طرح آخر الذکر صادق اور رشیدہ کی مشترکہ خوش قسمتی کا باعث ہو سکتی ہے تو کہنا یہ تھا کہ صادق کامیابی کی تلاش میں ایک طرف گیا تھا اور رشیدہ ملازمت کے حصول کے لئے دوسری طرف یعنی جس کی وجہ سے دونوں کو کامیابی کی توقع تھی اس غریب کو دونوں نے مشترکہ کوششوں سے پلنگ کے پایہ سے باندھ کر ڈال دیا تھا کہ کہیں بھاگ نہ جائے اور قسمت کے غلط رُخ کا پانسہ نہ پڑ جائے۔ سائے اتنے طویل ہو چکے تھے کہ اَب کچھ دیر میں صرف سایہ ہی سایہ باقی رہنے والا تھا اور اُجالا بالکل ہی مفقود۔ عذرا لیلیٰ نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور کسی ساحر کی طرح اس نے اپنی قوت ارادی پوری کی پوری رشیدہ اور صادق کے معاملات پر مرکوز کر رکھا تھا۔

رات کی تاریکی عذرالیلیٰ سے زیادہ تاریک ہو چکی تھی۔ پہلے رشیدہ اور بعد میں صادق مکان واپس ہوئے۔ وہ ایک دوسرے کے آگے اُداس اور مغموم بیٹھے تھے۔ بڑی دیر تک چُپ چاپ مُنہ لٹکائے رہنے کے بعد رشیدہ نے پوچھا:۔

"تمہارا فلم کیوں ناکام رہا؟"

"تمہیں مُلازمت کیوں نہیں ملی؟" صادق نے جواب دینے کی بجائے سوال کیا۔

"مالک اخبار کی بدمذاقی ــــ مگر تمہاری ناکامی کا سبب؟"

"مالک کمپنی کی بدمذاقی ــــ مگر کیا تمہیں مُلازمت نہ ملنے کا رنج ہے؟"

"رنج؟ اتنا گہرا رنج ہے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں ــــ مگر کیا تمہیں اپنے فلم کی ناکامی کا رنج نہیں؟"

"نہیں بالکل نہیں"۔

"کیوں نہیں؟"

"اِس لئے کہ جب تم میرے قریب ہوتی ہو تو رنج قریب نہیں پھٹکتا"۔

"یہ اَور بات ہے لیکن میں کہتی ہوں کہ تمہاری تجویز کہ شادی کے بعد عذرالیلیٰ ہماری مشترکہ قسمتوں کو سنوارے گی کس قدر بے پناہ نکلا ــــ کمبخت عذرالیلیٰ، نامعقول کہیں کے ــــ سچ کہتی ہوں کہ اَب مجھے کالی بلیوں پر بالکل اعتماد نہیں رہا۔ بلکہ میں تو ان سے کچھ بدظن سی ہو گئی ہوں اور ان کو بدقسمتی کا ــــ"

"نہیں نہیں" صادق نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا "تم جلد بازی و کمی نہیں ہے جہاں میں کوشش کر سکوں گا"۔

کر رہی ہو ــــ مجھ سے پوچھو تو میں کہوں گا کہ عذرالیلیٰ نے واقعی ہماری قسمتوں کو سنوار دیا"۔

"وہ کس طرح؟" رشیدہ نے بیچ میں دخل دیا۔

"سُنو تو سہی ــــ ہماری قسمت کا دار و مدار جہاں تک کم از کم میری خدمت کا تعلق ہے صرف اس پر تھا کہ دل کا سودا کامیابی کے ساتھ طے ہو جائے۔ کیا تم بھی اپنی مُلازمت کو دل کے معاملہ پر ترجیح نہیں دیتیں؟ شادی کا معاملہ زندگی، پوری زندگی کا ہے اور مُلازمت کا معاملہ ہنگامی اور چند روزہ ہے۔ آج مُلازمت نہ ملی، کل مل جائے گی، یہاں نہ سہی کہیں اور سہی"۔

"مگر ــــ"

"اگر مگر کچھ نہیں۔ فلم ناکام ہوئی، مُلازمت نہ ملی مگر نہ تم کو اس سے اِنکار ہو سکتا ہے کہ تمہیں ایک شوہر، مجھ جیسا شوہر ملا اور نہ مجھے اس سے اِنکار ہو سکتا ہے کہ مجھے ایک بیوی تمہاری جیسی بیوی ملی ــــ اور کیا سب کچھ کالی بلی عذرالیلیٰ کی وجہ سے نہیں ہوا؟ اَب کون کہہ سکتا ہے کہ کالی بلی قسمتوں کو نہیں سنوارتی؟"

"لیکن"

ص

ضرورت — خواب آور — ضرورت

یہ خواب آور خشلینوں کیلئے نہیں بلکہ قوت حافظہ کا بہترین تحفہ ہے، جو ہر قسم کی دماغی کمزوری کو رفع کر کے طاقت بخشتا ہے۔ خشکی نسیان اور نزلے کی تحریک کو زائل کرتا ہے۔ دماغی کمزوری کی حالت میں بیحد مفید ہے۔ کتب بینی کرنے والوں، طالبعلموں، ہیڈ ماسٹروں، وکیلوں، بیرسٹروں، بُجردوں کے لئے بے بہا تحفہ ہے اس کے استعمال سے لاکھوں اشخاص کامیاب ہو چکے اور ہو رہے ہیں قیمت فی شیشی خوردہ کلاں ۱۲ الا علاوہ محصول ڈاک ایک درجن کے خریدار کو پیشگی آنے پر محصول ڈاک معاف

ضرورت ... پاس، ٹائپ اور دفتر کا کام بخوبی ... خط و کتابت کریں۔

فخر جہاں ... کرتا پور ضلع ...

P. O. ... (...)

عالمگیر بکڈپو کی نئی کتابیں!

دنیائے اسلام کا ماضی و مستقبل

موجودہ پُرآشوب زمانے میں اسلامی ممالک کی سیاسی حالت پر زبردست علمی و تاریخی ریسرچ از مولانا اظہر امرتسری سابق مدیر "زمیندار" کتابت وطباعت عمدہ کاغذ نفیس۔ قیمت ... ... ہمر

رُوپ متی اور باز بہادر

تاریخ ہند کا ایک رُومانی واقعہ۔ از محشر عابدی بی۔اے مجلد ... عہ

ماہ و انجم

حضرت کوثر چاندپوری کے وجد آفریں افسانوں کا مجموعہ ... ہمر

تاج شاہی حُسن کے قدموں میں

شاہان یورپ کی عشق و عاشقی کی سچی اور صحیح داستانیں، ہر افسانہ تاریخی حقائق سے لبریز اور سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے آیئے اور وقار شاہی کو حُسن کے قدموں میں سجدہ ریز دیکھئے بلاشبہ قابل دید کتاب ہے ... ہمر

موتیوں کا درخت

علامہ جرجی زیدان کے زبردست تاریخی ناول کا اُردو ترجمہ جس کا پہلا ایڈیشن چند دنوں میں ختم ہو گیا تھا۔ ... ... ہمر

روزنامچے

دور حاضر کی بہترین علمی و ادبی کتاب ہر شخص کے روزنامچے بس پڑھئے اور لُطف اُٹھایئے ادب اور مزاح کا حسین [illegible]، ... ... عہ

خلاصہ ادبیات عالم کا بیش [illegible] ... ... ہمر

کتاب التقدیر

علامہ ابن قیم کی شہرۂ آفاق کتاب کا اُردو ترجمہ۔ اس کتاب میں مسئلہ قضا و قدر کے ہر پہلو پر عقلی و نقلی دلائل اور فلسفہ و شریعت کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ فکر و نظر کی پختگی کا یہ عالم ہے کہ کسی مرحلے پر بھی وہم و تذبذب کے لئے گنجائش نہیں رہی۔ ۸۰۰ صفحات بڑا سائز قیمت صرف ... ۱۲ہمر

شادی

ہندوستان کے مایۂ ناز مزاح نگار حضرت ملا رموزی کی شادی کے دلچسپ حالات خود ملا صاحب کے قلم ظرافت رقم سے لکھے ہوئے ... ۸ہمر

صبح لطافت

حضرت ملا رموزی کے بہترین اور بلند پایہ مزاحی مضامین کا مجموعہ۔ کتاب کا ہر صفحہ زعفران زار کشمیر کی کیاریوں سے کم نہیں ... ... عہ

نوٹ:۔ شادی اور صبح لطافت کے یکجائی خریدار کو ہمر میں ملیں گی،

سلامبو

فرانسی انشا پرداز گستو فلابیئر کا شاہکار ترجمہ مسٹر عنایت اللہ بی۔اے دہلوی۔ اب سے دو ہزار سال پہلے قرطاجنہ قدیم کی تصویر، حسین سلامبو اور شہزور ماتو کی داستان عشق ۔ ... دو جلد ... ہے،

مسلم لیگ

مسلم لیگ کی پچاس سالہ زندگی پر ایک نظر، ہندوستانی سیاسیات کا مطالعہ مسلم لیگ نے مسلمانوں کی کون کون سی نمایاں خدمات انجام دیں؟ قائداعظم مسٹر محمد علی جناح کی مکمل داستان حیات ۔ بیحد معلومات افزا کتاب ہے مولانا اظہر امرتسری نے واقعی دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ مجلد، باتصویر، خوبصورت ٹائیٹل بیحد دیدہ زیب ... ۵ر

ملنے کا پتہ:۔ عالمگیر بکڈپو۔ لاہور

سیر الصحابہؓ

صحابہ کرام جیسی مقدس ہستیوں کے حالات جلد اوّل ۵؍ جلد دوم للعہ

سیرۃ الحسینؓ

حضرت امام حسینؓ کی زندگی کے حالات واقعہ کربلا کا تاریخی مرقع ... ۱۲؍

خاتونِ جنت

حضرت فاطمہ زہرا کی مکمل سوانحعمری ٹائیٹل رنگین خوبصورت ۱۲؍

الفاروق

حضرت فاروق اعظم کے مکمل حالات زندگی علامہ شبلی مرحوم کی زندہ جاوید تصنیف ۱۲؍

ترجمان القرآن

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا بیش بہا علمی کارنامہ جلد ۷؍ جلد دوم ۸؍

شاہنامہ اسلام

حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری کی معرکہ آرا تصنیف جلد اول ۳؍ جلد دوم ۳؍ سوم ۳؍

تاریخ اسلام

مکمل از جناب اکبر شاہ خاں مرحوم جلد اول للعہ جلد دوم ۳؍ جلد سوم ۳؍

غالب

مرزا غالب دہلوی پر ایک لاجواب تنقیدی کتاب جس کا مآخذ خود مرزا مرحوم کی تالیفات ہیں از غلام رسول مہر ... مجلد ... ۳؍

حاجی لق لق کے افسانے

آپ حاجی لق لق کے نام سے ناواقف نہ ہونگے یہ کتاب آپ ہی کے مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ ہے ... ... عہ

پیغمبر صحرا

علامہ خالد لطیف گابا کی مشہور معروف کتاب کا اردو ترجمہ مجلد ۱۲؍

بہارستان

مولانا ظفر علی خاں کے چہل سالہ کلام کا مجموعہ ۸۰۰ صفحات سائز ۲۰×۲۶ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہترین قیمت مجلد ۵؍ بلا جلد ... للعہ

ترکی جمہوریہ

ترکی کی سیاسی داستان انقلاب۔ بہترین تاریخی و معلومات افزا کتاب متعدد تصاویر، لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ ... ۱۲؍

کارزار حیات

حضرت ایم اسلم کی معرکہ آرا تصنیف، قابل دید کتاب ... ۱۲؍

تفسیر حیات

ایم۔ اسلم کے چالیس معرکہ آرا افسانوں کا مجموعہ جس پر حکومت پنجاب نے مصنف کو ۷۰۰ روپیہ نقد انعام دیا۔ ... ۱۲؍

طلسم حیات

رومان اور رنگینی سے لبریز افسانے حضرت ماہر القادری کے بہار آفریں قلم کا شاندار شاہکار نثر میں نظم کا مزا۔ مجلد ... ۱۲؍

لقلقہ

حاجی لق لق کی پولیٹیکل غزلوں اور ماڈرن نظموں کا مجموعہ ... عا

ہلال و صلیب

سلطان صلاح الدین ایوبی کے ولولہ انگیز مستند حالات۔ صلیبی جنگوں کی لرزہ خیز داستان مسلمانوں کا نعرۂ جہاد ... ۱۲؍

میری کہانی

ہر دو حصہ از پنڈت جواہر لال [illegible] کانگرس میں رہکر پنڈت جی کی ملکی خدمات کا مفصل تذکرہ، بہ [illegible] متعدد تصاویر ... للعہ

دنیا کی سب سے [illegible] یری لوئی ... ۱۲؍

ملنے کا پتہ — عالمگیر بکڈپو۔ لاہور

نغمہ و فریاد

اے جرأتِ ناشاد کسے ڈھونڈ رہی ہے

از حضرت ماہر القادری

دُنیا میں یہ کیوں سوزِ محبت کی کمی ہے
شاید مری فریاد کی لَے ٹُوٹ گئی ہے

اے اہلِ جہاں! اب مری دُنیا ہی نئی ہے
مرنے کا مُجھے غم ہے نہ جینے کی خوشی ہے

جب میری نظر اُن کی نگاہوں سے ملی ہے
دُنیائے محبت کی فضا جھُوم گئی ہے

آنکھیں مری نمناک ہیں، ہونٹوں پہ ہنسی ہے
یہ بھی ترے انداز کی فردوس گری ہے

اے دل! تری بے تابیٔ پیہم کے تصدّق
اُن شوخ اداؤں کا بھی انداز یہی ہے

اَب حُسن بھی تکلیفِ تجلّی سے ہے آزاد
اَب عشق وہاں ہے کہ جہاں بے خبری ہے

وہ جا بھی چکے حُسن کی پرچھائیں دکھا کر
اور میری جبیں در پہ جھکی ہے تو جھُکی ہے

فریاد کی فریاد، کہانی کی کہانی!
وہ بات جو بیتاب نگاہوں نے کہی ہے

دریائے محبت میں نہ کشتی ہے نہ ساحل
اے جرأتِ ناشاد! کسے ڈھونڈ رہی ہے

تُو جانِ مسرت ہے، یہ بے جان مسرت
وہ نیر آتش ہے یہ پھُولوں کی ہنسی ہے

اللہ رے! اِک جُرعۂ صہبا کی کرامت
بجلی سی رگ و پے میں مرے دوڑ گئی ہے

کس کام کی میرے لئے دُنیا کی مسرت
اَب میری خوشی، میری خوشی ہی نہ رہی ہے

اس بزم کو یارب نظرِ بد سے بچانا
وہ بزمِ طرب جس میں کہ ماہر کی کمی ہے

شعروشاعری

اُردو کی رُباعیاں

از جناب میرزا محمد بشیر ایم-اے-بی-ٹی

رُباعی کا شمار اُن اصنافِ شاعری میں ہے جنکی ایجاد کا سہرا ایران کے سر باندھا گیا ہے۔ علامہ شبلیؒ نے تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی کے حوالے سے یہ حکایت لکھی ہے کہ "خاندانِ صفاریہ کا بادشاہ یعقوب صفار کا ایک کمسن بچہ ایک دن اخروٹوں سے کھیل رہا تھا۔ ایک اخروٹ لڑھکتے لڑھکتے ایک گڑھے میں جا گرا بچے کی زبان سے بیساختہ یہ مصرعہ نکلا ع

غلطاں غلطاں رود ہمی طالب گو

یعقوب بھی موجود تھا۔ اسکو بچے کی زبان سے یہ موزوں کلام بہت پسند آیا لیکن چونکہ اس وقت تک اس بحر میں اشعار نہیں کہے جاتے تھے شعرا کو بلاکر کہا یہ کیا بحر ہے۔ انھوں نے کہا ہزج ہے اور پھر تین مصرعے اور لگا کر رُباعی کر دیا اور دوبیتی نام رکھا۔ مدت تک یہی نام رہا پھر دوبیتی کے بجائے رُباعی کہنے لگے"۔[1] بعض ادبی محقق محض اس کہانی کی بنا پر ایران کو اس کا موجد قرار دینے میں پس و پیش کرتے ہیں لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اس صنف کو فارسی شاعری کی بدولت فروغ حاصل ہوا۔

اُردو شاعری نے اس پودے کو گلستانِ فارس سے لیکر اپنے سدا بہار چمن میں لگا دیا۔ ابتدا میں اسکو یہاں کی آب و ہوا راست نہ آئی لیکن کچھ عرصے کے بعد اس میں نشو و نما کے آثار پیدا ہوئے اور اب تو چشم بددور اسکی بہار صد گلستان نگاہ کا سامان کئے ہوئے ایک عالم کو اپنا گرویدہ بنا رہی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اردو میں قدما کی رُباعیوں کو انکے دوسرے اصنافِ کلام کے مقابلے میں کوئی خاص مقبولیت حاصل نہیں ہوئی لیکن اس سے انکے کمالِ فن پر حرف نہیں آسکتا۔ اُن کی رُباعیاں فنی و تاریخی حیثیت سے اپنا جواب نہیں رکھتی ہیں۔ اور انکی یہ خصوصیت فراموش نہیں کیجا سکتی کہ وہ اساتذہ کی انفرادیت مخصوص رجحانات کی آئینہ دار ہیں مثلاً میر کی قنوطیت اور انکے اندازِ بیان کی سلاست و دلآویزی انکی رُباعیوں میں بھی ہے۔ یہ میر کی رُباعی ہے ؎

کیا کریے بیاں مصیبت اپنی پیارے دِن عمر کے میری غم میں گذرے سارے
رنج و ضعف و بلا، مصیبت، محنت پہنچا ہی نہیں توان دُکھوں کے مارے

میر صاحب کی رُباعیوں میں زندگی کے مصائب عشق و محبت ہجر و وصل کا ذکر زیادہ پایا جاتا ہے۔ سودا کے زورِ بیان کی ایک اچھی مثال انکی وہ مشہور رُباعی ہے جو انہوں نے دہلی سے نواب اودھ کی خدمت میں بھیجی تھی ؎

سودا پئے دنیا تو بہر سُو کب تک آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی اس سے کہ دنیا ہووے بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

میرا عقیدہ ہے کہ خواجہ میر دردؔ کی غزلیں ہی نہیں بلکہ رُباعیاں بھی "پسی ہوئی بجلیاں" ہوتی ہیں۔ اس صوفی با صفا نے اُردو کی رُباعیات میں خیال و زبان کی رُو سے خاص اضافہ کیا۔ ان کے دیوان کے ایک قدیم نسخے میں سینتالیس[2] رُباعیاں اور قطعات ہیں جنمیں مختلف مضامین ادا کئے گئے ہیں تصوف خواجہ صاحب کا حصہ تھا۔ اسی سبب سے انکی رُباعیوں میں عرفان زار بجلیاں کوندتی نظر آتی ہیں۔ ایک رُباعی میں توحید کے متعلق فرماتے ہیں ؎

اے دردؔ سبھوں سے برملا کہتا ہوں توحید نہیں میں چھپا چھپا کہتا ہوں
مُلا کو بھی کچھ اس میں نہیں چاہئے انکار بندہ بندہ خدا خدا کہتا ہوں

شیفتہ کا مشہور شعر ہے ؎

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ اِک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

یہ وہی آگ ہے جو خواجہ صاحب کے یہاں دبی ہوئی تھی ؎

کیا جانئے کیا دِل پہ مصیبت یہ پڑی ہے اِک آگ سی کچھ ہے کہ وہ سینے میں گڑی ہے
اِس طرح سے اک لخت جو آنسو نہیں تھمتے معلوم ہوا دردؔ کہیں آنکھ لڑی ہے

دِل کی دیوانگی ایک پامال مضمون ہے لیکن طرزِ بیان کی سادگی نے رُباعی میں وہ ندرت پیدا کی ہے کہ سُنئے اور سر دُھنئے ؎

کچھ آپ ہی گِر کے آپ ہی چُنتا ہے کہتا ہے کچھ آپ آپ ہی سُنتا ہے
اے دردؔ ہمیشہ یہ دل دیوانہ کیا کچھ اُدھیڑتا ہے اور بُنتا ہے

میر دردؔ کی ایک رُباعی ہے جو حُسنِ بیان کے اعتبار سے رُباعیاتِ اُردو کی جان ہے ؎

ہم نے بھی کبھو جام و سبو دیکھا تھا [illegible] کہ نہیں ہے روبرو دیکھا تھا
اَن باتوں کو اب جو غور کرتے اے دردؔ کچھ خواب [illegible] تھا کہ وہ کبھو دیکھا تھا

عہدِ درد و میر کے بعد اردو شاعری دربار سے وابستہ ہو کر ذہنی جمود و پستی کا شکار ہو گئی چنانچہ رُباعیوں پر بھی اس کا اثر ہوا اور اس عہد میں

---

[1] شعرالعجم حصہ اول صہ ۱۸
[2] دیوان اُردو خواجہ میر دردؔ۔ سن طباعت ۱۸۹۲ء

اِس صنفِ شاعری نے کوئی ترقی نہیں کی۔ شاعری رئیسوں کے دل خوش کرنیکا کھلونا تھی۔ کہتے ہیں کہ نصیر الدین حیدر کے عہد میں کسی عالم نے اپنے کاغذات میں بجائے "اجناس" کے "اجنا" لکھدیا۔ بادشاہ کی نظر پڑی تو بجائے اپنی غلطی تسلیم کرنیکے اُن عالم صاحب نے قاموس سے تاویلیں پیش کیں۔ اِنشا نے بادشاہ کا اشارہ پاکر ان قبلہ و کعبہ کا ناطقہ بند کردیا۔ فرماتے ہیں ؎

اجناس کے بدلے لکھیے اجنا کیا خوب　　قاموس کی رعد کا گرجنا کیا خوب
از روئے لغت نئی اپج کی لی ہے　　اس تان کے بیچ کا اپجنا کیا خوب

جرأت نے نواب محبت خاں کے مختار کو جو کھری کھری سُنائی ہے وہ سُنتے چلئے ؎

مختاری پہ آپ کیجئے گا نہ گھمنڈ　　کہتے ہیں جسے نوکری ہے بیج اَرنڈ
سرمائی دلائیے ہماری ورنہ　　تم کھاؤگے گالیاں جو ہم کھائینگے ٹھنڈ

قدرت نے اِس ادبی بدمذاقی کی تلافی یوں کی کہ اس عہد کے بعد میر انیس ایسا رُباعی گو پیدا کیا جس نے زبان، طرزِ بیان کے لحاظ سے صنفِ رُباعی کے مارِ راکد میں تموج ہی نہیں بلکہ طوفان پیدا کردیا۔ میر انیس کے کلام میں جو سادگی دسوز و ساز ہے وہ میر حسن کے سلسلے سے خواجہ درد کا فیض ہے لیکن اتنی بات ہے کہ اُس صاحبِ کمال نے درد کے حُسنِ بیان کو چار چاند لگا دیئے۔ درد کی ایک رُباعی ہے ؎

پیری چلی اور گئی جوانی اپنی　　اے درد کہاں ہے زندگانی اپنی
کل اور کوئی بیان کریگا اس کو　　کہتے ہیں آب آپ ہم کہانی اپنی

انیس نے اسی مضمون میں ایک نیا شگوفہ کھلایا ہے لیکن طرزِ بیان دونوں کا مِلتا جُلتا ہے۔ الفاظ کی سادگی اور اثر آفرینی قابلِ تحسین ہے ؎

دُنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی　　ہر شے یاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بُڑھاپا دیکھا　　جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

میر انیس نے فارسی کے اکثر مروج مضامین اُدا کئے لیکن ان کے مسرت آمیز اسلوب اور شاعرانہ استدلال نے انکی رُباعیوں میں جان ڈالدی۔ ان کے اسلوب کی خوبی یہ ہے کہ بقول شبلیؔ "سُننے والے کو اتنا محسوس ہوتا ہے کہ کسی چیز نے چٹکی لی، کیوں لی، یہ کچھ نہیں معلوم" اُن کی یہ رُباعی سُنیئے ؎

سائے سے بھی وحشت ہے وہ دیوانہ ہوں　　جو دام سے بھاگتا ہے وہ دانہ ہوں
دیکھا نہیں جسکو اس کا عاشق ہوں انیسؔ　　جلتا ہے جو بے شمع وہ پروانہ ہوں

میر صاحب نے دُنیا کی بے ثباتی، موت، لحد، رحمت باری، معرفت، اِنکساری، شانِ کرم وغیرہ کو گونا گوں تمثیلوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ' عزت ' کے متعلق فرماتے ہیں ؎

عزت ہے یا رو آشنا کے آگے　　محجوب نہ ہوں شاہ و گدا کے آگے
یہ پاؤں چلیں تو راہِ مولا میں انیسؔ　　یہ ہاتھ جب اٹھیں تو خدا کے آگے

اِسی موضوع پر مرزا دبیر کی ایک رُباعی ان کے مخصوص رنگ میں ہے ؎

قطرے کو گہر کی آبرو دیتا ہے　　قد سرو کو گل کو رنگ و بو دیتا ہے
بے کار تشخص ہے تصنع بے سُود　　عزت وہی عزت ہے جو تو دیتا ہے

مرزا غالبؔ نے بھی اُردو رُباعیاں کہی ہیں اور دیوانِ غالبؔ (نسخہ حمیدیہ) میں ہم کو انکی بائیس ۲۲ رُباعیاں ملتی ہیں جنمیں سے بعض شاہ جہاں کی دال اور سیم کے بیج کے شکریئے اور سالگرہ کی مُبارکباد سے تعلق رکھتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مرزا اِس صنف کے مردِ میدان نہ تھے لیکن اتنا ضرور ہے کہ انکی رُباعیوں سے بھی ان کے طرزِ بیان کی تدریجی ترقی کا اندازہ ہوتا ہے۔ طرزِ بیدل میں انکے ریختے کی عُمدہ مثال یہ رباعی ہے ؎

اے کثرتِ فہم بے شمار اندیشہ　　ہے اصل خرد سے شرمسار اندیشہ
یک قطرہ خون و دعوتِ صد نشتر　　یک وہم و عباداتِ ہزار اندیشہ

انکے نکھرے ہوئے طرز میں انکے معنی آفرینی کی بہار دیکھنا ہو تو یہ رُباعی ہے ؎

کہتے ہیں کہ آب وہ مردم آزار نہیں　　عُشاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اُٹھایا ہوگا　　کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

مولانا حالی جو اُردو نظم کے اولین علمبرداروں میں ہیں صنفِ رباعی کے بھی ناخدا ہیں۔ انہوں نے اُردو رُباعی کے مضامین میں تنوع و وسعت پیدا کی۔ انکی رُباعیاں انگریزی زبان میں ترجمہ ہوچکی ہیں۔ انکی وہ رُباعیاں جن کا موضوع قانون، قومی اصلاح، سیاست وغیرہ ہیں قابلِ دید ہیں۔ قانون کی اصل غایت پر انکی یہ نکتہ چینی کتنی حقیقت پر مبنی ہے ؎

قانون ہیں بیشتر یقیناً بیکار　　حاشا کہ ہو اُس پہ نظمِ عالم کا مدار
جو نیک ہیں انکو نہیں حاجت ان کی　　اور بد نہیں بنتے نیک ان سے زنہار

وہ عام فہم زبان میں عمل و سعی پیہم کی تعلیم بڑی خوبی سے دیتے ہیں ؎

ہے جان کے ساتھ کام انساں کیلئے　　بنتی نہیں زندگی میں بے کام کئے
جیتے ہو تو کچھ کیجئے زندوں کی طرح　　مردوں کی طرح جئے تو خاک جئے

حالی کی یہ مشہور رُباعی زورِ بیان اور سلاست زبان کے اعتبار سے خود ادبِ اُردو کا ایک جزو ہوگئی ہے ؎

بُلبُل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی　　بزمِ شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا　　ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

اکبر الہ آبادی نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں قومی ترقی، بیہوشی اور بیداری کا راگ گایا۔ وہ پدرم سُلطان بود کے نہیں بلکہ عمل کے قایل تھے ؎

اے جد بزرگ کے نواسو پوتو　　تزئین کو تہ کرو زمینیں جوتو
کیا رٹتے ہو اپنی ہسٹری کو ہر وقت　　اللہ مدد کرے گا ویسے بنو تو

شراب کی تعریف تو ہر زبان پر ہے لیکن اسکی مذمت اور اُس سے اجتناب کی

تاکید اکبر سے سُنیئے ؎

پاکیزگیٔ نفس کی دشمن، مے ہے — اِنساں کو خراب کرنیوالی شے ہے
شیطان کی ہے پرائیویٹ سکرٹری — مُسلم اور اس کو مُنہ لگائے ہے ہے

اکبر کا یہ عقیدہ تھا کہ ہندو اور مُسلمانوں دونوں کیلئے اُردو نہایت موزوں زبان ہے چنانچہ اس خیال کی ترجمانی ایک رُباعی میں کس خوش اسلوبی سے کی ہے ؎

اُردو میں جو سب شریک ہونیکے نہیں — اِس مُلک کے کام ٹھیک ہونیکے نہیں
ممکن نہیں کہ شیخ امرا القیس بنے — پنڈت جی والمیک ہونیکے نہیں

یوں تو ہر شاعر نے اپنے انفرادی رنگ میں کثرت سے رُباعیاں کہیں اور بعض اس راہ میں شہسوار نکلے لیکن اُردو کی دُنیا ابھی تک "خیام" نہیں پیدا کر سکی۔ یہاں تک کہ بعض بزرگوں نے رُباعیاتِ خیام کے ترجمے بھی کئے لیکن سفالِ ہند کے مینا و جام اِس "آتشِ سیال" کی گرمی برداشت نہ کر سکے۔ آغا شاعر مرحوم نے خیام کی رُباعیوں کا ترجمہ کیا ہے ہم اپنے بیان کی تائید میں "خمخانۂ خیام" سے ایک رُباعی اور اس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں ؎

گر مے نخوری طعنہ مزن مستاں را — گر دست دہد توبہ کنم یزداں را
تو فخر بدیں کنی کہ من مے نخورم — صد کار کنی کہ مے غلام است آں را

طعنے نہ دے مستوں کو جو مے سے ہے حذر — ہم توبہ بھی کر لیں گے مشیت ہے اگر
ہے فخر یہی نا کہ تو مے خوار نہیں — سو عیب ہیں اور مے سے بدتر بدتر

یاد رہے کہ بےکیف و بےروح ترجمے کسی ادب میں اضافہ نہیں کر سکتے۔

فی زمانہ تو رُباعیوں کی جانب عام رجحان بڑھتا جا رہا ہے اور رُباعی گویوں کی تعداد بھی بڑھتی نظر آتی ہے لیکن اگر غور سے دیکھئے تو آجکل کے رُباعی کہنے والوں میں ایک جماعت تو اُن لوگوں کی ہے جو وزن بے وزن بزعم خود رُباعیاں فرماتے رہتے ہیں، خیر یہ گم کردہ راہ قابلِ اعتنا نہیں، دوسری وہ جماعت ہے جو "سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود" ہے علم عروض کے اعتبار سے انکی رُباعیاں قطعی رُباعیاں ہیں لیکن زبان و اسلوبِ بیان کے لحاظ سے چند محاوروں یا فارسی عربی کے بقول مُلّا رموزی "بلاغت بُو" الفاظ کا بےکیف مجموعے ہیں۔ خیال کے اعتبار سے چند پیش پا افتادہ مقررہ مضامین ادا کئے جاتے ہیں جنکو پڑھکر اُن چار مصرعوں پر چار حرف بھیجئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ رُباعی گویوں کو بھی میر ناصر علی مرحوم کا یہ مقولہ نہ بھولنا چاہئے کہ "زبان اچھی ہو تو کیا کہنا، اگر اچھی نہ ہو تو بھی اگر خیال اچھا ہے تو اُجڑے گھر کا چراغ ہو جاتا ہے" موجودہ زمانے میں بعض اُردو رُباعیوں کے مجموعے شائع ہوئے ہیں مثلاً حضرت آثر صہبائی کا "جامِ طہور" حضرت آثر کی وہ رُباعیاں جو انہوں نے علامہ اقبال کے فلسفے سے متاثر ہو کر کہی ہیں بہت خوب ہیں ایک کا رنگ دیکھئے ؎

رو رو کے عبث شکوۂ بیداد نہ کر — اے ننگِ جہاں رُوح کو برباد نہ کر
ہمت سے ہے رزمگاہِ ہستی میں وقار — کھا زخم پہ زخم اور فریاد نہ کر

حضرت صفی لکھنوی اور حضرت سیماب اکبر آبادی کی رُباعیات کے مجموعے جنکے متعلق مشہور ہے کہ مکمل موجود ہیں افسوس ہے ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔ اسی سبب سے ہم اِس مضمون میں اِن بزرگوں کی رُباعیوں سے مستفید نہ ہو سکے۔ یہ شکر کا مقام ہے کہ حضرت جوش ملیح آبادی نے اُردو کی "تہی دامانی" پر نظر کرتے ہوئے اپنی رُباعیوں کا مجموعہ "جنون و حکمت" شائع کر دیا ہے۔ یہ رُباعیاں حقیقت میں اس قدر انداز کہ وہ زہر میں بجھے ہوئے تیر ہیں جو دلوں میں بغیر پیوست ہوئے نہیں رہ سکتے۔ "جنون و حکمت" میں رُباعیوں کو چند سُرخیوں کے تحت میں پیش کیا گیا ہے مثلاً حقائق، حُسن و عشق، پیراں لوس، خمریات وغیرہ۔ مضامین کی بلندی اور تخیل کی حقیقت آفرینی کے ساتھ ساتھ طرزِ بیان کا جوش و سرمستی دوبیتی کو ایسا دو آتشہ بنا دیتی ہے جس میں بقول غالب ع

شرابِ چشمِ ساقی نیز پیوست

اِس فردوسِ خیال کو دیکھئے ؎

پینے کو مئے ہوش رُبا لائی ہے — نشے کے لئے سرد ہوا لائی ہے
گھبرا گھبرا کے پی کہ تیری تقدیر — اِس رات کو جنت سے چرا لائی ہے

"حقائق" میں کشمکشِ حیات کے عالم کو ایک دلکش پیرایۂ بیان میں پیش کیا ہے ؎

خونی چشمے اُبل رہے ہیں یا رب — خنجر سینوں میں چل رہے ہیں یا رب
تجھ کو بھی خبر ہے کہ تیری دُنیا میں — چھوٹوں کو بڑے نگل رہے ہیں یا رب

غلامی و بغاوت کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک صداقت نفس الامر کا اظہار کتنی بیباکی سے کیا ہے ؎

بگڑی ہوئی عقل سے حماقت بہتر — ہو کے کی محبت سے عداوت بہتر
شیطان و ابوجہل کی عظمت کی قسم — سو بار غلامی سے بغاوت بہتر

یاد رہے کہ اُردو شاعری میں رُباعی گوئی کا رواج قصیدہ گوئی کی طرح اُٹھ نہیں گیا بلکہ قائم ہے اور عروج پر ہے۔ اس کا مستقبل بہت روشن نظر آتا ہے۔ جوش ایسے شورانگیز و آتش نفس شاعر کی رُباعیاں خود رُباعی کی عظمت، مقبولیت اور شہرتِ دوام کی ضامن ہیں کیونکہ یہ قیامت انگیز ترانے نوائے شاعرِ فردا ہیں ؎

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا — آگے کئی صدیوں سے ترانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھ کو صد حیف یہ حکم — بہروں کو سنائے جا فسانہ اپنا

(نقیب)

عورت

نوشتہ: انتھونی ٹرولوپ

ترجمہ جناب عزیز احمد

اُس نے اپنی عمر کے تیسویں برس میں قدم رکھا تھا تاہم ابھی وہ بالکل نوجوان نہیں تو جوان ضرور نظر آتا تھا۔ اُس نے ویسٹ انڈیا اسٹیم بورڈ میں پر سوار ہو کر سوتھیمپٹن کو اس خیال سے خدا حافظ کہا۔ کہ وہ استھیماں پناما سے گذرے گا۔ اور اس کے بعد کیلی فورنیا اور رولینڈ کے جزیروں کی سیر کریگا۔

اس فور دراز بحری سفر کی وجہ تنہا ایک طوالت کا کام ہے اس وقت وہ دنیا میں بالکل تنہا تھا۔ کیونکہ اس کا گھر اس کی نوجوان بیوی کی وفات کے بعد بالکل سنسان ہو گیا تھا۔ جب اس نے جہاز میں قدم رکھا۔ تو اُس نے ایک شریف آدمی کو بھی اسی جہاز میں سوار ہوتے دیکھا جو عمر میں اس سے پندرہ برس بڑا تھا جہاز کی روانگی کے چند ہی گھنٹے بعد دونوں ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔ اور جلد ہی دوست بن گئے اس دوستی سے قبل ہمارا ہیرو رانٹ فارسٹ خود کو بہت تنہا محسوس کر رہا تھا مسٹر مورث ایک پرانا سیاح تھا۔ اور وہ جانتا تھا۔ کہ کس طرح دوران سفر میں اجنبیوں کو دوست بنایا جاسکتا ہے" اب ہمیں اپنی اپنی نشست پر قبضہ کر لینا چاہیئے" مسٹر مورث نے کہا" اگر ہم نے جلدی نہ کی تو جگہ ملنی مشکل ہوگی۔"

"کونسی جگہ" فارسٹ نے پوچھا"

دیکھتے نہیں جہاز بالکل بھر چکا ہے۔ اگر ہم نے جلدی نہ کی تو بہت پریشانی ہوگی۔"

بہتر ہے کہ ہم اس وقت نیچے چلیں" جب یہ دونوں دوست نیچے آئے۔ تو انہوں نے ڈنر ٹیبل کو بالکل بھرا ہوا پایا مسٹر مورث کو ایک خالی کرسی مل گئی اور جب اس کے سامنے والی کرسی پر فارسٹ بیٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ تو ایک شخص نے جو اُس کرسی کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ اُس سے کہا۔ یہ جگہ ایک خاتون کی ہے" لیکن مورث نے اُسے جگہ چھوڑنے سے منع کر دیا۔ عورت چونکہ وہاں موجود نہ تھی۔ اس لئے فارسٹ کو بھی وہاں بیٹھنے میں تکلیف نہ ہوئی۔ تین دن تک وہ عورت کھانے کی میز پر نہ آئی تھی۔ اُس شریف آدمی کا نام مسٹر گرم پی تھا جس نے پہلے دن اُس کی مزاحمت کی تھی۔ ہر ج ناؤن میں وہ کئی مکانوں کا مالک تھا۔

اس کے ساتھ سفر میں کئی عورتیں تھیں۔ پہلے دن اس کی لڑکی میز پر آئی۔ لیکن وہ بہت جلد واپس ہو گئی۔ اس موقع پر نہ صرف مسٹر گرم پی بلکہ اس کے دوست بھی اُس کی اس اچانک واپسی پر حیران تھے۔ پھر اس کے بعد اس کی بیوی اور اس کے بھائی کی بیوی نظر آئی اور چوتھے دن مس ویز جو فارسٹ کے دائیں طرف بیٹھ گئی۔ وہ اُسے پہلے بھی عرشہ جہاز پر دیکھ چکا تھا۔ اس وقت وہ بالکل غیر دلچسپ معلوم ہو رہی تھی۔ شاید پریشان تھی۔ یا شکستہ دل یا شاید وہ سمندر کو پسند نہ کرتی تھی۔ اور خاص طور پر مسٹر گرم پی کو اور اس کی بیوی اور لڑکی کو جنکی نگرانی میں وہ سفر کر رہی تھی۔ کیونکہ یہ لوگ بہت خود غرض معلوم ہوتے تھے۔ مسٹر مورث نے کہا۔" وہ بہت جلد ہنس مکھ اور دلچسپ بن جائے گی۔ پھر وہ تمہیں بُری معلوم نہ ہوگی" فارسٹ نے اُس کی تائید میں سر ہلایا، ان دونوں نے اس کی عمر کے متعلق غلط اندازہ کیا تھا۔ اس کی عمر تیس سے زیادہ نہ تھی! اور وہ آئرلینڈ کی رہنے والی تھی۔ اس کی آنکھیں روشن تھیں اور دانت خوبصورت اور چمکیلے اس کے لمبے بال سیاہ تھے۔ اور اس کے لبوں پر ایک ایسی دلفریب مسکراہٹ جو اس کے حسن کو تحت تنقید سے بچا رہی تھی۔" تمہارا اور اس کا ساتھ بہت دور تک رہیگا۔" مسٹر مورث نے اپنے دوست سے کہا جب وہ کھانے کی میز پر جگہ لینے نیچے اتر رہے تھے۔" استیھما کے قریب پہنچ کو جائے گی" "تمہیں یہ کس طرح معلوم ہوا؟" فارسٹ نے پوچھا "میں نے سُنا ہے کہ وہ مسٹر شریف گرم پی کے خاندان کی نگرانی میں پہنچ رہی ہے اس نے مجھ سے یہی کہا ہے لیکن وہ لوگ خود اس عورت کے متعلق بہت کم جانتے ہیں" مسٹر فارسٹ نے جواب دیا۔" اور نہ مجھے اس امر کی ضرورت ہے کہ میں اس عورت کے متعلق مزید معلومات حاصل کروں لیکن میں اس کی شکل و صورت کے متعلق کوئی رائے ظاہر نہیں کر سکتا۔" اُس نے کھانے کی میز پر اُس سے چند جملے کہے اور اس نے اب محسوس کیا کہ واقعی اس کی آنکھیں روشن ہیں اور آواز سریلی۔

"میں پناما جا رہا ہوں" اس نے مس ویز سے پانچویں دن کہا۔ موسم خوشگوار تھا۔ اور فضا نہایت دلچسپ۔ بحر اطلانتک میں وہ بڑا

جہاز ساکت معلوم ہوتا تھا ۔ حالانکہ وہ چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہا تھا۔ جہاز سے تمام چیزیں اس قدر خوبصورت اور فرحت بخش نظر آ رہی تھیں ۔ کہ مسٹر فارسٹ یہ بھی بھول چکا تھا کہ اس نے کبھی مس ونیر کے متعلق کوئی سخت رائے ظاہر کی تھی ۔ جہاز ایک خوبصورت بندرگاہ سے گزرا لیکن ان دونوں نے ایک جھلک بھی اس مقام کی نہیں دیکھی مگو ان کی یہ بے پروائی ان کے سکون کو برہم نہ کر سکی "میں نیاما جا رہا ہوں"

کیا واقعی تم نیاما جا رہے ہو؟"

اس عورت نے خوش ہو کر کہا "پھر میں یہ خوفناک تنہائی محسوس نہ کروں گی جس کے خیال ہی سے میں خوفزدہ ہو رہی تھی"

"تمہیں اب گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ میں تمہاری ہر طرح سے مدد کرنے کی کوشش کروں گا ۔ اگر میں ایسا کرنے کے قابل ہوا"

"بہت بہت شکریہ"

"یہ واقعی تکلیف دہ بات ہے کہ مسٹر مورث ہمارے ساتھ نہیں جا رہے ہیں"۔

"کون وہ تمہارے دوست ! شاید تم ان کے متعلق کہہ رہے ہو"

"ہاں تمہارا خیال درست ہے ..... لیکن کیا تم یہ خیال کر سکتی ہو کہ میں بھی اسی قدر تنہائی محسوس کرتا ہوں ۔ جتنا کہ تم بلکہ تم سے بھی زیادہ"

"لیکن" اس نے کہا "ایک مرد کبھی تنہائی محسوس نہیں کرتا"۔

"آہ کیا واقعی ایسا ہوتا ہے میرے متعلق کوئی غلط رائے قائم نہ کرنا اگر میں یہ کہوں کہ اس امر میں تم نے سخت غلطی کی ہے"

"شاید نہیں" اس نے کہا ۔ کچھ دیر تک وہ خاموش رہی اور پھر دوسری طرف دیکھتے ہوئے بولی "لیکن مسٹر فارسٹ تنہائی سے زیادہ دنیا میں اور بھی بدترین چیزیں ہیں مثلاً ایک عورت کی قسمت جب وہ تنہا رہنے کی خواہشمند ہوتی ہے"۔ اس کے بعد وہ ان لوگوں میں چلی گئی جن کے ساتھ وہ سفر کر رہی تھی ۔ "مس ونیر تمہاری بہت اچھی گزر رہی ہے" اس کی ہمراہ گرم پی کی بوڑھی عورت نے کہا "ہاں بہت اچھی" مس ونیر نے جواب دیا "شکریہ مسٹر فارسٹ بہت معقول آدمی معلوم ہوتے ہیں ۔ میں امیلیہ سے کہوں گی (امیلیہ اس کی اپنی لڑکی تھی جس سے مس ونیر کو خاص دلچسپی نہ تھی) اُسے شکایت تھی ۔ کہ جہاز پر ایک مرد بھی ایسا نہیں جو محبت بھری نظروں سے نوجوان عورتوں کو دیکھے ۔ میرا خیال یہ ہے کہ امیلیہ کو اس معاملہ میں ڈرنا چاہئیے ۔ کیونکہ اس کا خیال قطعی غلط ثابت ہوا"۔

"لیکن بہتری تو واقعات کے قبول کرنے میں ہے جیسے وہ پیش آتے ہیں"۔ مس ونیر نے کہا "اگر ایک نوجوان عورت یہ سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے کہ وہ کون ہے اور کیا ہے ...... تو پھر اُسے کسی مرد کی بے باک نظروں سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں"

"میں نے امیلیہ سے یہی کہا تھا لیکن پیاری ونیر ابھی امیلیہ اتنی تجربہ کار نہیں جتنی تم ہو ...... اس قسم کی گفتگو ان دونوں کے درمیان ہوئی ۔

"تم مس ونیر کے پیچھے ایک ایسے مکان کی مانند دکھائی دیتے ہو جو شعلوں سے گھرا ہوا ہو" مورث نے اپنے نوجوان دوست سے کہا "لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں ۔ کہ آگ زیادہ تیز نہیں ہے"۔ فارسٹ نے جواب دیا "وہ اتنی بدصورت تو نہیں ہے جتنا کہ تم نے پہلے خیال کیا تھا"۔

"بدصورت ..... ہرگز نہیں ۔ مجھے یاد بھی نہیں ہے کہ میں نے کبھی اس کے متعلق ایسا کہا تھا لیکن یہ صحیح ہے کہ اس کے حسن میں کوئی ناقابل بیان کشش نہیں ہے"۔

"وہ پہلے تین دن تک تو بالکل قابل توجہ نہیں تھی ۔ کیا میں یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں ۔ کہ نیاما پہنچنے تک اس میں وہ سب کچھ پیدا ہو جائے گا ۔ جو ایک عورت کو مایہ ناز اور قابل پرستش بناتا ہے میں اچھی طرح جانتا ہوں ۔ کہ ایسی صورت میں کیا پیش آتا ہے"

"لیکن اس قسم کے واقعات میرے ساتھ پیش نہ آئیں گے مجھے کامل یقین ہے" فارسٹ نے نہایت سنجیدگی سے کہا "مس ونیر ایک دلچسپ نوجوان عورت ہے ! اور چونکہ ہم دونوں کا راستہ کچھ دور تک ایک ہی ہے اسی لئے ہم دونوں ایک دوسرے سے اچھا برتاؤ کرنے پر مجبور ہیں اور کچھ اس لئے بھی کہ وہ لوگ جن کے ساتھ وہ ہے اس سے ہم آہنگ نہیں ہیں"

"واقعی وہ لوگ اس کے ہم مذاق نہیں کیونکہ ان میں کوئی نوجوان مرد نہیں ہے ۔ میں اسباب کو جہاز پر اچھی طرح محسوس کر چکا ہوں کہ وہاں اس کا کوئی ہم مذاق نہیں ہے ۔ کیونکہ وہ سب کے سب شادی شدہ ہیں اور زیادہ عمر کے ...... آج بہت گرمی ہے میں اپنے کمرے میں جا کر گرمی سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں" یہ کہہ کر وہ چلا گیا ۔ فارسٹ نے اس کا ساتھ نہیں دیا ۔ بلکہ وہ جہاز کے کھمبے کا سہارا لئے کھڑا رہا اور اپنی خاموش اور تنہا زندگی کے متعلق سوچنے لگا ۔

"جہاز پر ایک تنگ رستہ تھا جو عرشہ پر آ کر ختم ہوتا تھا اور اُس کے دونوں جانب مسافروں کے کمرے تھے ۔ مس ونیر کے کمرے

کے بازو میں فارسٹ اور موریٹ کے کمرے تھے۔ کھانے کی پہلی گھنٹی بجی اور تمام مسافر ایک جگہ جمع ہونے لگے۔ عورتیں سنگار دان سے اُٹھ کر روانہ ہوئیں۔ آج فارسٹ خلاف معمول عرشہ پر کھڑا تھا۔ تیسری گھنٹی بجی تمام مرد اپنے اپنے جوڑے کے ساتھ کھانے کے کمرے کی طرف روانہ ہوئے۔ فارسٹ نے مس ونیر کو اپنا بازو پیش کیا۔ وہ ایک لمحہ رُکی پھر اس نے قبول کر لیا۔ بوڑھی عورت نے غور سے ان کی طرف دیکھا وہ جانتی تھی۔ کہ وہ غلطی پر ہے۔ لیکن کچھ بھی ہو۔ ایسی غلطی کو دوران سفر میں محسوس نہیں کیا جاسکتا۔ شاید مس ونیر ایسا کرنے میں عقلمند نہ تھی۔ لیکن اس جہاز پر کوئی بھی اس معاملہ میں عقلمند نہ تھا۔ اس کے بازو میں اپنا بازو ڈال کر مس ونیر نے محسوس کیا۔ کہ اب وہ پہلے کی طرح تنہا نہیں ہے

" اتنا تیز نہ چلو" موریٹ نے ہمارے ہیرو سے کہا جب وہ پہلو بہ پہلو کھانے کے کمرے سے واپس ہو رہے تھے" ایک آدمی ایسے معاملات میں پریشان ہوجاتا ہے قبل اس کے کہ وہ کچھ سمجھ سکے۔"

" میرا خیال ہے کہ مجھے کسی خاص چیز سے خوف نہیں ہے" فارسٹ نے جواب دیا" لیکن پھر بھی میں یہ کہنے پر مجبور رہوں۔ کہ ہوشیار رہو" دوران سفر میں تم کئی غیر متوقع باتوں سے دو چار ہوگے۔ کیونکہ اس وقت ہر شخص کی نظر تم پر ہے" ان ناخوشگوار جملوں کو فارسٹ نے محسوس کیا، مس ونیر کو بھی اس کا احساس ہوا اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔

دوسرے دن دوپہر کو وہ عرشہ جہاز پر تنہا نظر آئی۔ فارسٹ اس کے قریب آیا لیکن وہ انجان بنی ہوئی کتاب پڑھنے میں مصروف رہی، اگر وہ لوگوں کی نکتہ چینی سے نہیں ڈرتا تو وہ ایسا کیوں کرے، مس ونیر کے دل میں یہ خیال گشت لگا رہا تھا شام کو جب سورج غروب ہو چکا تھا۔ اور دھندلکا ہر طرف چھا رہا تھا۔ فارسٹ عرشہ جہاز پر ٹہل رہا تھا۔ گرم پی کا خاندان ایک بنچ پر بیٹھا تھا اور وہ ان کے مقابل کے بنچ پر"

مس ونیر! کیا تم آج شام کی تفریح کا لطف نہ اٹھاؤ گی" مسٹر فارسٹ نے اس کے قریب آکر کہا" میرا خیال ہے کہ آج میں تمہارے ساتھ شریک نہ ہوں گی کوئی ہرج نہیں لیکن پھر بھی میں اس وقت تک برابر اصرار کرتا رہوں گا۔ جب تک کہ تم اس بات پر آمادہ نہ ہو جاؤ۔ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے کیونکہ میں نے آج تمام دن تمہیں کمرے سے باہر نکلتے نہیں دیکھا" کیا تم سچ کہتے ہو اچھا میں تمہارے ہمراہ چلنے پر آمادہ ہوں، مسٹر فارسٹ تم نہیں جانتے ایسے خطرناک لوگوں کے ساتھ رہنے میں مجھے کس قدر دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

اسی شام کو ان دونوں کے درمیان ایک ایسا خود اعتمادی کا رشتہ قائم ہو گیا جس کو کبھی دوستی کہتے ہیں اور پھر آپس میں ایسی باتیں کی گئیں جو صرف دوستوں ہی کو زیبا دیتی ہیں۔ اور ایسے ہمدردی کے الفاظ کہے گئے جو صرف گھریلو دوستی ہی کا نتیجہ ہوسکتے ہیں لیکن افسوس! وہ بے وقوف تھے۔ کیونکہ دوستی اور ہمدردی کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں۔ اس نے اپنی زندگی کے تمام حالات اُسے سنائے وہ ہیرو سے باہر ایک ایسے شخص سے شادی کرنے جارہی تھی۔ جو عمر میں اس سے ۲۰ سال بڑا تھا۔ اور یہ دس سال کی طویل دوستی اور شناسائی کا نتیجہ تھا۔ ..... وہ امیر تھا اور یہ کوڑی کوڑی کو محتاج۔ ..... اس نے سفر کا کرایہ تک اُسے بھجوایا تھا۔ اس وقت وہ دنیا میں بالکل تنہا تھی۔ اسی کا وہ محبوب مر چکا تھا جس کے ساتھ اس نے صرف ۲ سال مسرت جاودانی میں گذارے تھے۔ ..... لیکن وہ بھی اس کا رشتہ دار تھا۔ دور کا رشتہ دار جس سے وہ شادی کرنے جارہی تھی۔"

" کیا تم میری باتیں سُن رہے ہو" آخر اس نے اپنی داستان سنانے کے بعد اس سے پوچھا

" کیا تم اس سے محبت کرتی ہو" فارسٹ نے سنجیدگی سے پوچھا"

" محبت! کیا میں اس سے محبت کرسکتی ہوں۔ ایسی محبت جیسی تم نے اس عورت سے کی تھی جو اب مر چکی ہے۔ یا جیسی وہ تم سے کرتی تھی۔

"..... نہیں ہرگز نہیں اس قسم کی محبت کا کوئی ذکر تک نہیں"

" کیا وہ ایک شریف آدمی ہے"

" وہ بہت سخت آدمی ہے۔ لیکن جب لوگ محبت کا سودا کرتے ہیں تو وہ سنگدل ہوجاتے ہیں چنانچہ اُس نے مجھ سے بھی سودا کیا ہے"

" وہ چند منٹ تک خاموش رہے۔

" کیونکہ وہ ٹہلتے ہوئے اب جہاز کے مستول کے پاس پہنچ گئے تھے اور وہ اس کے قریب خالی بنچ پر بیٹھ چکے تھے۔"

" عورت کو مرد کے ساتھ ہرگز شادی نہ کرنا چاہیئے" اس نے سنجیدہ آواز میں کہا۔

یقیناً تم مجھے اس قصور پر ملامت ضرور کرو گے" اس نے عاجزی سے کہا" لیکن مجھ جیسی عورتوں کے ساتھ ہمیشہ اسی طرح کے واقعات پیش آتے ہیں۔ انہیں انتخاب کا موقع ہی نہیں دیا جاتا ہے اور اس پر بھی انہیں بُرا بھلا کہا جاتا ہے۔ کہ انہوں نے انتخاب میں سخت غلطی کی"۔

"تمہیں انکار کر دینا چاہیئے تھا"

"نہیں میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتی تھی۔ میں تمہیں اچھی طرح سب کچھ نہیں سمجھا سکتی۔ کہ کس طرح اس نے شادی کی درخواست کی اور کس طرح میں نے بعض ناگزیر حالات کے تحت اُسے قبول کر لیا۔ وہ حالات کچھ بھی ہوں لیکن اب میں بالکل اس کے قابو میں آ گئی ہوں میں نے اس سے روپیہ لیا ہے جس سے اب چھٹکارا ممکن نہیں۔ یہ کہنا اسی طرح آسان ہے۔ کہ ایک عورت کو بغیر محبت کے کسی کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہیئے جس طرح یہ کہنا کہ ایک مرد کو فاقہ نہ کرنا چاہیئے لیکن دنیا میں بہت سے مرد ایسے ہیں جو سخت محنت اور تکلیف وہ مشقت کے باوجود فاقہ کرتے ہیں"

"میرا مطلب تمہارا امتحان لینے کا نہیں ہے"

"لیکن میں خود اپنے دل کا امتحان لے رہی ہوں اور اسی لئے میں اکثر خود کو ملزم ٹھہراتی ہوں۔ اگر میں سمندر کی موجوں میں کود پڑوں تو میں آدھے گھنٹے کے بعد کہاں رہوں گی۔ میں نے اکثر اس کی خواہش کی ہے۔ کیا تم اس کا اندازہ لگا سکتے ہو۔ کہ مجھے کس چیز نے اس ارادے سے باز رکھا"

"پانی بہت سرد اور خنک ہے، اس کے علاوہ۔۔۔ میں سمندر کی لہروں سے خوف کھاتا ہوں"۔

"میں بھی اسی سے خوف کھاتی ہوں۔ اور یہی ڈر مجھے ایسا کرنے سے باز رکھتا ہے"

"ہم اپنے غموں کو برداشت کرنے پہ مجبور ہیں اور خصوصاً میرے غموں کا بار بہت بھاری ہے"۔

"تمہارا غم، مسٹر فارسٹ! کیا تمہارے حافظے میں گذرے ہوئے دنوں کی یاد نہیں ہے"

"اور کیا تمہیں آئندہ مسرت کی امید نہیں ہے؟"

"میں! آہ میں کسی بات کی اُمید رکھ سکتی ہوں۔ اب ۹ بجے چکے ہیں، خدا معلوم وہ لوگ میرے متعلق کیا رائے قائم کرتے ہونگے لیکن کچھ بھی ہو مجھے اس کی مطلق پرواہ نہیں" یہ کہکر وہ اُٹھی اور جہاز کے دوسرے حصہ پر چلی گئی۔۔۔۔۔۔

اس کے بعد سفر حسب معمول جاری رہا۔ اب سورج بہت گرم ہو چکا تھا۔ اور لوگ گرمی کی شکایت کر رہے تھے مسٹر فارسٹ اور مس وینر کی دوستی حسب سابق تھی جس پر مسز گرم پی بہت برہم ہوتی تھیں اور ایک موقع پر تو اس نے ایک اچھا خاصا لیکچر دیا۔

لیکن وہ جانتی تھی۔ کہ اس کی تقریر سے کیا اثر لیا جائے گا، بہت کم مسافر یہ بات جانتے تھے۔ کہ مس وینر نے کسی سے آشنائی پیدا کر لی ہے، پناما کے ساحل پر جب جہاز لنگر انداز ہوا تو اس جگہ اُترنے والے مسافر بصد حسرت و یاس اپنے دوستوں سے جُدا ہوئے۔ گرم پی کا خاندان بھی اس بندرگاہ پر اتر پڑا "خدا حافظ مس وینر" کہا مسز گرم پی مجھے اُمید ہے کہ تم بخیریت اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاؤ گی لیکن میں تمہیں تھا بہت پہنچا مجھے یقین ہے اور میں اُمید رکھتی ہوں کہ ایسا ہی ہوگا" اس کی لڑکی نے طنزیہ انداز میں رخصت کے وقت کہا "جب تک ہر چیز ٹھیک ہے"۔ مس وینر نے عہد پورا کرتے ہوئے جواب دیا "بہت کچھ اُمید کی جا سکتی ہے۔ تم یقیناً اسی طرح اپنے دوست کے پاس پہنچ جاؤ گی"۔

"شکریہ" اس نے جواب میں کہا اور وہ سب اس سے رخصت ہو گئے۔ "کیا ہم پھر کبھی ایک دوسرے سے ملیں گے" مسٹر مورٹ نے نہایت گرمجوشی سے اپنے دوست سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اُسے بھی اسی جگہ اترنا تھا" اس شریف آدمی کے معاملات میں دخل دینے کی کوشش نہ کرنا۔ جو بیرو میں اس کا منتظر ہے ورنہ۔۔۔۔۔۔ وہ ایک چاقو سے تمہارا استقبال کرے گا"

"لیکن میں تو اس معاملہ میں اس سے لڑنا بھی پسند نہیں کرتا"۔

"ٹھیک ہے اب تم ٹھیک رستہ پر پہونچ گئے ہو۔ اچھا خدا حافظ" اس طرح مورٹ اپنے دوست سے رخصت ہوا

ایک عورت بے یار و مددگار ان حالات میں ایک ایسے آدمی کے ساتھ جو اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہو اپنے وقت کا زیادہ حصہ صرف کرنا یقیناً پسند کرے گی۔ اور اس کے لئے مس وینر پر تہمت نہیں لگائی جا سکتی۔ رات گئے جب جہاز بندرگاہ کو چھوڑ کر بہت دور نکل چکا تھا اس وقت مسٹر فارسٹ اور مس وینر اعرشہ جہاز پہ پہلو بہ پہلو کھڑے سمندر کی بے پناہ موجوں کو دیکھ رہے تھے۔

میری اس آزادی کے اب صرف پانچ دن اور باقی رہ گئے ہیں، مس وینر نے آہ بھر کر کہا "یہ میری تمام زندگی کا سرمایہ ہیں"

"خدا کے لئے ایسے غم بھرے جذبات کا اظہار میرے سامنے نہ کرو"

"لیکن کیا میں جھوٹ بولوں اور ایسی باتیں کہوں جو صحیح نہیں ہیں بالکل خاموش رہوں اور ان قیمتی لمحوں کو جو خدا نے مجھے تمہارے ساتھ رہنے اور تم سے آزادی سے گفتگو کرنے کے لئے عنایت کئے ہیں ضائع کر دوں۔ کیا یہ حقیقت نہیں۔ تم میری کس بات سے ناراض ہو

میں تمہاری کسی گفتگو سے ناراض نہیں ہوا۔"
تمہیں ایسا کرنا بھی نہیں چاہیئے اب جب کہ میں گرم پی کے خاندان سے نجات پا چکی ہوں۔ مجھے آزادی سے سانس لینے دو مجھے تعجب ہے کہ یہ نادر موقع مجھے کیسے مل گیا۔" وہ بچوں کی سی مسرت کے ساتھ کہنے لگی۔ اگر جہاز خراب ہو جائے اور ہم چھ مہینے تک سمندر میں آوارہ پھرتے رہیں۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ یہ خواہش بہت بری ہے"

"ہم سب فاقے سے مر جائیں گے۔ آخر یہی حشر ہوگا۔"

نہیں تو ہمارے جہاز پر ایک دودھ دینے والی گائے ہے۔ ایک درجن بھیڑیں ایک ہزار مرغ اور مرغیاں ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا رستہ میں سینٹی مرتھا کی بندرگاہ ملے گی۔ اگر میں اس بندرگاہ پر اتر جاؤں۔"

"مجھے بھی تمہارا ساتھ دینا پڑیگا"۔

آہ یقیناً تم ایسا ہی کرو گے۔ مگر میرا یہ ارادہ نہیں ہے۔ لیکن اگر جہاز کی کوئی مشین خراب ہو جائے اور دوسرے جہاز کے انتظار تک ہم ہفتوں یہاں رکے رہیں تو کیا ہوگا مسٹر فارسٹ۔"

مس ونیر" اس نے کچھ توقف کے بعد اس کے بالکل قریب آکر کہا۔ "تمہیں دنیا کی تمام حسین چیزوں کی قسم تم اپنے ان خیالات کے ساتھ اگر میں ان کو ٹھیک طور پر سمجھنے لگا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انگلستان واپس جاؤ۔

"تمہارے ان جذبات اور وجدانیات کے لئے تو ایک معمولی گھر بھی انگلستان میں تمہارے لئے جنت کا نمونہ بن سکتا ہے۔ بہ نسبت پیرو میں ایک عالیشان محل کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"لیکن انگلستان کا ہر غریب گھرانہ میرے لئے بند ہے۔ کیا تم نہیں جانتے۔ دوست پیدا کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ ایسے دوست ایسے عزیز دوست جو تمہاری ہر مسرت کا خیال رکھیں کہا جاتا ہے۔ کہ جب مسز ونیر پیرو میں مسٹر گارنیٹ سے شادی کرلے گی تو اس کی تمام مصیبتوں اور غموں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور اس پر کوئی مصیبت نہ آئے گی۔ اگر اس کے برعکس ہوا۔ تو اس کا نام خاندان بھر میں بے عزتی سے لیا جائے گا مسٹر فارسٹ اصل بات یہ ہے۔ کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں۔ جن کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں"۔

"میں انگلستان واپس جاؤں گا" اس نے کچھ وقفہ کے بعد کہا۔ "جب تم پانچ دن تک اسی قسم کی دل آزار گفتگو کرتی رہو گی تو ضرور تم میرے دل کے ٹکڑے کر دو گی۔ لوٹ جاؤ مس ونیر۔ ۔ ۔ ۔

وہ تم سے پناما میں ملے گا۔ ۔ ۔"

"کیا میں انگلستان واپس جاؤں" مس ونیر نے عجیب ناز سے پوچھا

"میں تمام باتوں کو بھولا نہیں ہوں"۔ اس نے جذباتی لہجہ میں کہا۔ زندگی میں کبھی ایسے لمحے بھی آتے ہیں۔ جب ایک آدمی معمولی حالات میں بھی کچھ کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ اس وقت دولت تک اس کے ارادوں میں حائل نہیں ہوتی، اگر تم چاہو تو میں تمہاری کچھ مدد کروں"۔

"مہربانی مسٹر فارسٹ تم کیا سوچ رہے ہو"

"اگر تم سیدھی سادی زبان سمجھ سکتی ہو تو تم نے غالباً میرا مطلب سمجھ لیا ہوگا۔ اس سے زیادہ میرا اور کوئی خیال نہیں"

"دوران سفر میں میرا ارادہ اس آدمی کی امداد کا ہے۔ جس کو میں اچھی طرح جانتی ہوں اور اس آدمی کو فریب میں مبتلا کرنا چاہتی ہوں۔ جس کو میں بالکل نہیں جانتی لیکن پھر بھی جو تم مشورہ دو گے۔ اسی پر عمل کروں گی"۔

"لیکن میں تمہارے اور اس شخص کے جذبات سے لاعلم ہوں اس لئے میں کیا مشورہ دے سکتا ہوں"۔

"نہیں نہیں۔ تم مشورہ ضرور دے سکتے ہو"۔ اس نے کچھ ملال کے ساتھ کہا "میں بھی کس قدر بے وقوف ہوں۔ میں نے تمہاری پیش کش کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ تمہیں میرا شکریہ قبول کرنا پڑے گا۔ میں بیان نہیں کر سکتی اس سے مجھے کس قدر مسرت ہوگی لیکن تم۔ ۔ ۔ ۔ تم مجھے اپنی بہن سمجھو پھر تم ضرور محسوس کرو گے۔ کہ میرا شکریہ کس قدر قابل قبول ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر میں اس آدمی کو فریب دینے کے قابل نہ ہو سکوں یا اگر اسے دھوکہ دے سکوں تب بھی"۔ ۔ ۔ ۔

"اسی طرح کی بے معنی اور جذباتی گفتگو کرتے ہوئے وہ سفر کر رہے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ عورت کافی تعلیم یافتہ ہے۔ آخری دن جب وہ اسپتھما کے قریب پہنچ گئے تھے۔ تو وہ بہت آزادی سے اپنے جذبات کا اظہار کر رہی تھی۔ اور اب اس کی گفتگو میں غم کی جھلک بہت کم پائی جاتی تھی۔ "تو کیا میں اس سے بالکل محبت نہیں کر سکتی" اس نے رازدارانہ طور پر اس سے پوچھا۔ "وہ دور دراز کا سفر طے کر کے مجھ سے ملنے اسپتھما آ رہا ہے۔ کیا کوئی شخص بیوی کی تلاش میں لندن سے ماسکو جا سکتا ہے"۔

"ہاں کیوں نہیں۔ میں ماسکو کے دس چکر لگا سکتا ہوں لیکن اس عورت کے لئے جسے میں فی الحقیقت دل سے چاہتا ہوں"

"لیکن کیا ایک ایسی بیوی کے لئے بھی جس نے اپنی محبت

کا اظہار نہ کیا ہو...... میں نے اپنا بڑا صندوق بند کر دیا ہے اور اس کی کنجی اس مرد کو دے دی ہے۔ اب وہی اسکو کھول سکتا ہے۔ اُسی کو اس بات کا حق حاصل ہے۔ کیونکہ اُسی نے اس کی تمام اُجرت ادا کر دی ہے"

"تم ہر چیز کو دنیا دی نقطہ نظر سے دیکھ رہی ہو"

"ایک عورت کو ہمیشہ مصیبتوں کا سامنا کرنا چاہئیے۔ اور اُسے ایسا کرنا پڑتا ہے...... میں اُس سے تمہارا تعارف کراؤنگی اور اس سے اُن تمام مہربانیوں کا ذکر کروں گی جو تم نے میرے ساتھ کی ہیں"

"میں اُس سے مل کر بہت خوش ہوں گا"

"میں اس سے تمہاری گہری دوستی اور ہمدردی کا ذکر نہ کروں گی لیکن اگر وہ میرے ساتھ آئندہ مہربانی کا برتاؤ کریگا تو میں اس سے سب کچھ کہدونگی۔ مجھے راز چھپانے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے..... وہ دیکھو" اس نے دوربین پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا "میں لب ساحل آدمیوں کو دیکھ رہی ہوں۔ اور ایک جہاز کی چمنی بھی نظر آرہی ہے۔ جس سے دھواں نکل رہا ہے"۔

ایک گھنٹے کے اندر جہاز کولن کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا وہاں اترنے کے ایک گھنٹے بعد اس سامان کروڑ گیری کے دفتر سے چھڑا کر بس میں رکھا گیا جو اسٹیما کو جاتی تھی۔ "کیا وہ اسٹیشن پر ہمارے لئے موجود ہوگا؟" اس نے سوچا جب تین گھنٹے کی مسافت تقریباً طے ہو چکی تھی۔ فارسٹ نے اس بات کا اندازہ لگایا کہ اُس کی آواز دوران گفتگو میں کانپ رہی ہے اور وہ پریشان نظر آرہی ہے۔ "اگر وہ پناما پہنچ چکا ہوگا تو ضرور بس اسٹیشن پر ہم سے ملیگا" جب وہ وہاں پہونچے تو جنوبی امریکہ کا جہاز آچکا تھا لیکن مسافر ابھی ساحل پر نہیں آنے تھے اس لئے فارسٹ مس ونیر کو ایک ہوٹل میں لے گیا۔ کیونکہ ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ ہوٹل میں چار یا پانچ گھنٹے قیام کریں۔ مس ونیر کی آسائش کا جملہ انتظام کرنے کے بعد فارسٹ اس کی تلاش میں نکلا مسافروں کی ایک جماعت ہوٹل کی طرف آرہی تھی۔ فارسٹ نے ان میں ایک شخص کو دیکھا۔ جو گوانج کا ہم عمر معلوم ہوتا تھا لیکن اُس نے دریافت کرنے پر اپنا نام اسپر لوبتایا۔ اس کے بعد ایک دوسرا ہمعمر آدمی اُسے نظر آیا تھا فارسٹ کے سوال پر اُس نے جواب دیا۔ "کیا تم گوانج کے دوست ہو"

"جی ہاں وہ میرا دوست ہے"

"صاحب" اُس نے جواب دیا "مسٹر گوانج کا لیون میں انتقال ہو گیا ہے۔ یہ واقعہ دفعتاً پیش آیا۔ اس بارے میں آپ مسٹر کاکس سے مزید معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ سے ابھی ملیں گے" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ فارسٹ نے اپنے دل میں کہا "وہ مر گیا۔ یہ خبر اس عورت کو کون دیگا۔ اور وہ اُسے کس طرح برداشت کریگی؟ کیا یہ خبر اس کے لئے دل خوش کن ثابت ہوگی؟ وہ ہمیشہ اس سے نجات پانے کا ذکر کرتی رہتی تھی۔ کیا یہ اُس کی دلی خواہش تھی؟ یا ممکن ہے۔ اُس کے یہ جذبات و خیالات سفر کی آسودگی کا نتیجہ ہوں...... کیا وہ رنجیدہ اور مغموم ہوگی...... اب اُسے کیا کرنا چاہئیے۔ اب وہ کس طرح دوستی کا حق ادا کرے"

اُنہی بے شمار خیالوں میں گم ہو کر وہ ہوٹل میں داخل ہوا۔ آنے جانے والوں کی بھیڑ میں سے ایک شخص اُس کے قریب آیا اور اس کا نام دریافت کر کے بولا"— مجھ سے کہا گیا ہے۔ کہ تم مس ونیر کے دوست ہو کیا تم نے وہ رنج دہ خبر سنی ہے"۔ اُس کے بعد اُس نے ایک خط فارسٹ کو دیا۔ جو مس ونیر کے نام تھا۔

وہ ڈرائنگ روم میں آیا۔ اور مس ونیر کو عورتوں کے ایک جمگھٹ میں بیٹھا دیکھا۔ وہ اُس کے قریب پہنچا اور اپنے ہمراہ ایک علیحدہ کمرے میں آنے کا اشارہ کیا۔

"وہ کہاں ہے؟" اُس نے کمرے میں پہونچکر اس سے پوچھا "میرا خیال ہے کہ ضرور کوئی غیر معمولی بات پیش آئی ہوگی" "کیا اُس نے کوئی پیغام مجھے بھیجا ہے۔ کہ اُسے اب میری ضرورت نہیں رہی.... صاف صاف کہو تم بہت سنجیدہ نظر آتے ہو کیا۔ مجھے اس سے نجات مل گئی ہے...."

"مس ونیر اب تم اُس کی دسترس سے باہر ہو"

"اگرچہ اس نے پہلے خود ہی یہ خواہش ظاہر کی تھی لیکن وہ مسٹر فارسٹ کے انداز بیان سے گھبرا گئی "کیا یہ حقیقت ہے؟" وہ بولی "کیا اُس نے ایسا لکھا ہے، در اصل اس نے مجھے خرید لیا ہے۔ کیا میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاؤں۔ کہ وہ جس طرح چاہے میرے ساتھ برتاؤ کرے"۔

"میرے پاس ایک خط ہے لیکن پیاری مس ونیر...."

"مجھ سے صاف صاف کہو کیا بات ہے"۔

"مس ونیر اب تم بالکل آزاد ہو لیکن اگر تمہیں آزادی کا مفہوم معلوم ہوگیا تو غالباً تمہارا دل پاش پاش ہو جائے گا"

"شاید اُسے تجارت میں نقصان ہوا ہے اور ممکن ہے۔ کہ وہ بالکل برباد ہو گیا ہو"

نہیں مس ونیر وہ در اصل یعنی ...... مرگیا ہے۔"

وہ دو تین منٹ تک اُسے گھورتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی باتوں پر یقین نہیں کرتی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چل کر اپنے بستر کے قریب پہونچی اور اس پر بیٹھ گئی "وہ کیا مرگیا۔ مسٹر فارسٹ" اُس نے مدھم آواز میں پوچھا۔ فارسٹ نے کوئی جواب نہ دیا اور وہ خط اس کے ہاتھ میں دیدیا۔ یہ خط مسٹر گوالج کے رشتہ دار کی طرف سے لکھا گیا تھا۔

"کیا میں تم سے رخصت ہو جاؤں؟" جب وہ خط پڑھ چکی۔ تو فارسٹ نے بڑی کشمکش کے بعد اس سے پوچھا۔"

"ہاں مسٹر فارسٹ ...... لیکن نہیں ...... بہتر یہ ہے کہ تم اس وقت مجھے تنہا چھوڑ دو تاکہ میں سوچ سکوں۔ غور کرسکوں افسوس میں نے اس کے متعلق بُرے الفاظ ضرور کہے تھے افسوس منہ سے نکلے ہوئے الفاظ دوبارہ واپس نہیں آسکتے ...... مجھے کچھ دیر کے لئے تنہا چھوڑ دو پھر جلدی مجھ سے ملو میں تمہارا انتظار کروں گی، بہت بے چینی کے ساتھ ....."

اُسے تنہا چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد وہ اس نئے مقام کی سیر کو نکل گیا۔ دو گھنٹے تک وہ گھومتا رہا! اور جب ہوٹل واپس آکر اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا تو مس ونیر نے دروازہ کھولا۔ اُس نے دیکھا۔ کہ سامانِ سفر بندھا ہوا تیار رکھا ہے "میں نے جانے کی تیاری کرلی ہے۔ جہاز پرسوں اسٹیمار روانہ ہوگا۔" مس ونیر نے اطمینان کے لہجے میں کہا۔"

"یہ تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ اب تم مجھے اجازت دو کہ میں تمہاری مدد کروں"

"تم میری مدد کروگے" اس نے فیصلہ کن لہجے میں پوچھا "کیا تم نے اب تک میری مدد نہیں کی۔ اس تنہائی اور بیچارگی میں جو دورانِ سفر میں ......"

"لیکن اب تم مجھے اس بات کی اجازت دو کہ میں خود کو تمہارا نگران کار دوست یا محافظ سمجھوں"

"تم اب تک میرے عزیز دوست نہیں تھے"۔

"اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش نہ کرتے ہوئے اُس نے کہا "تم تنہا واپس نہ جاؤ، میرے سفر کا کوئی مقررہ پروگرام نہیں ہے میں بھی تمہارے ساتھ انگلستان جاؤں گا"

وہ پلٹ کر اس کے قریب آئی اور کہنے لگی "نہیں یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ کیا تم سمجھتے ہو۔ کہ اب جب وہ مرچکا ہے مجھے تمہارے ساتھ جانا چاہیئے میں نے تم سے دورانِ گفتگو میں اس کی برائی کی تھی۔ اس کے متعلق بہت دل آزار جملے کہے تھے۔ اب میرا فرض ہے۔ کہ میں اس کی یاد میں آنسو بہاؤں۔ جب تک وہ زندہ تھا میں اپنے جذبات کا بہت بے باکی سے اظہار کرنا اچھا سمجھتی تھی۔ ...... لیکن اب ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا ہونا چاہیئے۔ اب ہم ایک دوسرے سے کبھی نہ ملیں گے تمہارے ساتھ جانے کی بجائے میں تم سے درخواست کرتی ہوں۔ کہ تم اس بات کو بھلا دو کہ ہم کبھی ملے تھے۔ اور ہم میں کبھی دوستی بھی تھی ......"

"لیکن مس ونیر ...... میں تمہیں کبھی بھلا نہیں سکتا۔" اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"لیکن تم مجھے بھلا ہی دو تو بہتر ہے ...... مسٹر فارسٹ! میں نے شاید تمہارے ساتھ کبھی اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے تمہاری مجھ سے کچھ اُمیدیں وابستہ ہوگئی ہوں۔ اس کے بعد اس نے بتایا۔ کہ مسٹر گارتج نے اس کے لئے اپنی دولت میں سے کچھ حصہ دیا ہے اور کچھ کاروبار کی نگرانی بھی اس کے سپرد کی ہے ......"

"آخر وہ جدا ہوگئے۔ جب وہ اُسے اسٹیشن پر خدا حافظ کہنے آئی تو مس ونیر نے جہاز روانہ ہوتے وقت نہایت گرم جوشی کے ساتھ اس سے ہاتھ ملایا "خدا تمہاری مدد کرے" اس نے کہا۔ "اور خدا تم پر بھی مہربان رہے" فارسٹ نے جواب دیا اس طرح وہ اکیلا اکیلا روانہ ہوا اور وہ دوسرے دن تنہا انگلستان روانہ ہوگئی......!!



"۔۔۔۔ سے"

از سرِ تا بقدم حسن، مجسم خوش بو
میں بھی اک آن کو ممنونِ توجہ ہوتا
خستۂ زیست کو بھی عشرتِ ہستی ہو نصیب
زحمتِ لطف گوارا تو کرے تیری نظر
خرمنِ شوق جو پھنک جائے گا پھنک جانے دے
تیری اک جنبشِ ابرو پہ دو عالم قربان
یوں خیالاتِ پریشاں میں ہے شامل تری یاد
اُف یہ رویدگیِ شوق، یہ دل تنگیِ یاس
آ... کہ بہلائے بہلتی نہیں اب طبعِ حزیں
اب تو ہو دولتِ دیدار اِن آنکھوں کو عطا
کاش ایسی بھی ہو کوئی سحرِ نور فشاں
کاش اِس شان سے بھی جلوہ نما ہو اک شام
تیری سانسوں سے ہم آغوش ہوں میری سانسیں
گل بداماں ہو مرا ہر نفسِ شعلہ اثر
ترے ہونٹوں سے مرے ہونٹ ہوں ایسے پیوست
میرے آغوش میں غلطاں ہو جوانی تیری
خلوتِ حسن و محبت میں نہ پائے کوئی بار
نغمہ زا کیفِ طرب سے ہو دلوں کی دھڑکن
نہ مجھے اپنی خبر ہو، نہ تجھے اپنی خبر
بارِ کونین سے ہو جائے سبکدوشِ خیال
اور کوئی نہ رہے یاد سوائے من و تو

نظم

از حضرت کوکب شاہجہانپوری

جنتِ زیست ہے میرے لئے تیرا پہلو
اے چمن چہرہ و شمامہ تن و غالیہ مو
سرِ آشفتہ کا بالیں ہو... جو تیرا زانو
دلِ مجروح کو منظور ہے ہر زخم رفو
عشوۂ صاعقہ پرور سے جگا تو جادو
مجھ کو اپنی بھی ضرورت نہیں مل جائے جو تو
جیسے برسات کی راتوں میں درخشاں جگنو
مجتمع ایک جگہ رنگِ خزاں جوشِ نمو
آ... کہ اب روح پریشاں ہے، دل بے قابو
کب سے یہ صبح و مسا کرتی ہیں اشکوں سے وضو
جھلملانے لگیں پلکوں پہ خوشی کے آنسو
نازنیں بانہیں کرے پیار سے تو زیبِ گلو
میرے شانوں پہ ہوں بکھرے ہوئے تیرے گیسو
پھول برسائے تری ہر نگہِ صاعقہ خو
وصل ہو جاتے ہیں جیسے لبِ تشنہ لبِ جو
تیرے فردوس سے آسودہ ہوں میرے بازو
بس جوانی ہی جوانی نظر آئے ہر سو
موج زن جوشِ مسرت سے ہو رگ رگ میں لہو
چھائی ہو دونوں پہ کیفیتِ رنگیں خوش بو

راجہ بھاؤ

لوگوں کو فرخ آباد کی وہ اگلی چہل پہل یاد ہو یا نہ ہو مگر تاریخیں او ویرانے ابھی بہت دنوں تک اس کی مٹی ہوئی رونق محفوظ رکھیں گے ابھی کل کا سا واقعہ معلوم ہوتا ہے جب نواب محمد خاں بنگش والی فرخ آباد سریر آرائے حکومت تھے۔ شہر میں ہُن برستا تھا گھر گھر کٹورا کھنکتا تھا۔ نہ چوری ہوتی تھی نہ ڈکیتی۔ لوگ راتوں کو اپنے دروازے کھول کر سوتے جس کا جہاں دل چاہتا سونا اچھالتا نکل جاتا کوئی نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا کہ اس کے منہ میں کتنے دانت ہیں۔ ہندو مسلمان سب ہی تو سلطنت میں آباد تھے مگر نہ کبھی باجے پر جھگڑا ہوا نہ گائے نے سر کٹوائے نواب موصوف بجائے خود سنی تھے مگر شیعہ علما اور فضلا کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ شہنشاہ فرخ سیر نے انتخاب ہی ایسا آدمی کیا تھا جو بہ اعتبار عقل و دانش، علم و فضل، جنگ و پیکار اپنے تمام ہم مرتبہ سرداروں پر فوقیت رکھتا تھا نواب نے اس قدر معقول طریقے پر قرب و جوار کے سرکش پٹھانوں اور راجپوتوں کا تدارک کیا کہ دربار دہلی کے بڑے بڑے ذی ہوش امرا انگشت بدنداں رہ گئے۔

خدا جانے فرخ آباد کی سرزمین میں کیا اثر ہے کہ اعلیٰ طبقہ کے مسلمان اور ہندو تو درکنار وہاں کے کوری اور پاسی بھی بات بات پر آمادہ جنگ و جدال ہو جاتے ہیں مگر جہاں یہ بربریت ان کی فطرت ثانیہ ہے وہاں ان کا بلند اخلاق بھی ضرب المثل ہے۔ مہمان نوازی اور غریب پروری یہ دو خاص جوہر ایسے ہیں جنھوں نے باشندگان فرخ آباد کو قرب و جوار کے باشندوں پر ممتاز کر دیا ہے۔

قسمت نے پلٹا کھایا، نواب رئیس محمد خاں بنگش نے اس دار فانی سے دار البقا کی طرف کوچ کیا۔ نواب محل، سنہری بارہ دری، بڑا محل، کوٹھہ محل، جہاں ابھی کل تک قہقہوں کے سوا کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی ماتم کدے بن گئے۔ ہر چہار طرف سے صدائے نالہ و شیون بلند تھی۔ امرا و وزرائے دربار سے لیکر۔ خاصدان بردار، نقیب، کہار، نوبت والے، خاصہ بردار، نوکر چاکر سب ہی دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ وہی فوجی جن کی ناک پر مکھی بیٹھنا بھی گناہ تھا گریباں چاک بیٹھ رہے تھے بوڑھی بوڑھی عورتیں یوں بین کر کے رو رہی تھیں گویا ان کا اکلوتا لڑکا مر گیا ہے۔ نہ وہ نوبت تھی نہ وہ چہل پہل، ہندو و مسلمان بلا تفریق مذہب و ملت مغموم تھے۔

تاریخ ہند کا ایک گمشدہ ورق

از جناب نوابزادہ جاوید قصری

ڈاکٹر ولیم مارکس جو اس زمانہ میں سیاحت کرتا ہوا فرخ آباد سے گزر رہا تھا اس واقعہ کو جس رقت خیز پیرایہ میں اپنی کتاب ([illegible]) میں بیان کرتا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ وہ لکھتا ہے ــــ "جب نواب کی لاش اٹھ رہی تھی اس وقت یہ معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے آسمان پھٹ پڑے گا یا زمین پھٹ جائیگی۔ نواب کا خورد سال لڑکا گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور صرف وہی ایک بچہ تھا جس کا لباس زرکار تھا ورنہ اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ تک سیاہ لباسوں میں ملبوس تھے یا جن کے پاس کل لباس سیاہ نہ تھا انھوں نے سیاہ صافے باندھ رکھے تھے، آخر شام کے وقت نواب کی لاش بڑے محل سے نکالی گئی۔ نواب کے خاص اعزہ اسے اپنے کاندھے پر اٹھائے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں پرنم تھیں اور ہونٹ آہ زدہ۔ وہ چپکے چپکے مذہبی دعائیں پڑھ رہے تھے۔ جیسے ہی لاش باہر آئی فوجی توپوں نے سلامی دی اور باجہ بجنے لگا۔ آگے ہاتھیوں کی قطار پر سیاہ جھنڈے لہرا رہے تھے اس کے بعد راجپوتی فوج تلواریں سونتے تھی اس کے بعد افغانی فوج نیزے ہاتھوں میں لئے سر جھکائے جا رہی تھی اس کے بعد اور فوجی دستے تھے۔ فوجوں کے آخر میں شاہی خاصہ کے سوار تھے جن کی صورتوں سے ایک خاص جلال ظاہر ہو رہا تھا اس کے بعد امرائے دربار تھے اور سب کے آخر میں شاہی خاندان کے افراد اپنے شیر کو کاندھوں پر اٹھائے ہوئے خاک میں سونپنے جا رہے تھے عماد الملک نواب علی ایاز خاں معتمد خاص مٹھی بھر بھر کر اشرفیاں لاش پر سے نثار رہے تھے، تمام شہر کا گشت کرتے ہوئے لاش کو قبر پر لے گئے جو اس سے قبل ہی تیار کر رکھی گئی تھی۔ اگرچہ اس کے قریب شاہی قبرستان تھا مگر جہاں قبر کھودی گئی تھی وہ جگہ سب سے علیحدہ تھی۔ سب سے پہلے لاش کو چارپائی سمیت جس کے پائے گنگا جمنی تھے اور پٹیاں آبنوس کی فرش پر رکھ دیا گیا۔ سب لوگ صف بصف ہو گئے اور آخر نماز جنازہ پڑھائی گئی اس کے بعد نقیب نے کچھ فارسی میں کہا جو میری سمجھ میں نہ آیا مگر اس کے بعد ہی نواب کا منہ کھول دیا گیا۔ اب بھی اس کے چہرے پر ایک خاص شان ہویدا تھی اور یہ معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ سو رہا ہے اور بیدار ہونے والا ہے اس کے ہونٹوں پر پُر شکوہ تبسم ناچ رہا تھا اور کوئی جری انسان بھی

نگاہ گاڑ کر اس کی جانب دیکھنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔"

چونکہ نواب کا ولیعہد ہنوز کمسن تھا اس لئے حکومت کا کام ان کی بیوہ نواب عالی قدر ثریا جاہ بی بی صاحبہ کے سپرد ہوا۔ لوگوں نے نذریں گذاریں نوبت خانے میں نوبت بجی۔ گانے والوں نے مبارکباد گائی۔ ہر طرف سے شور مبارک سلامت بلند ہوا اور نواب مہابت جنگ، شیر دوراں نواب قائم علی خاں ولیعہد قرار پائے اور قائم گنج ان ہی کے نام پر آباد کیا گیا۔ تیسرے دن دربار کیا۔ محکمہ جات کا معقول انتظام ہوا۔ لوگوں کو خطابات، عطیات اور جاگیروں سے سربلند کیا گیا۔ فقیروں کی جھولیاں بھر دی گئیں اور داد و دہش کا وہ عالم ہوا کہ دور دور سے لوگ آئے اور دامن مراد بھر لے گئے مگر درباری اُمرا جن میں زیادہ تعداد نواب کے اعزہ کی تھی "بی بی صاحبہ" کی حکومت سے خوش نہ ہوئے۔ گناہ صرف یہ تھا کہ وہ عورت کیوں تھیں وہ تو کسی مرد کو اپنا حاکم بنانا چاہتے تھے چنانچہ عورت ہونے کی پاداش میں ان کی تمام ہمدردیاں ختم ہو گئیں۔

راجہ نول رائے والی علاقہ بھوروغیرہ جو نواب بنگش کی حیات میں سر اٹھانے کی جرأت نہ کرتا تھا اس نفاق کا حال سن کر چڑھ دوڑا بیگم تھیں تو عورت ذات مگر مردوں کا دل لے کر پیدا ہوئی تھیں۔ بلخ اور قندھار کے معرکے دیکھے ہوئے فوج اکٹھا کی۔ نواب قائم علی کو نشان دیکر ساتھ کیا اور آپ رتھ پر مردانہ وار سوار ہوئیں۔ گرداگرد جبشنوں کا دستہ ننگی تلواریں لئے ساتھ تھا۔ بیگم نے فتح گڑھ کے قریب راجہ نول رائے سے ٹکر لی۔ فوجوں کی ترتیب ہوئی۔ ادھر میمنہ ادھر میسرہ، ادھر قلب ادھر توپ خانہ، ادھر ہاتھی ادھر سوار غرض یوں لڑائی کا نقشہ جما۔

بیگم پھر عورت ذات تھیں۔ امرائے دربار آنکھیں چرا گئے تھے، اضلاع فرخ آباد کے پٹھان لڑنے ہی نہیں آئے تھے آخر معرکہ ہوا اور بیگم کی فوج بھاگی اور ایسی بھاگی کہ نواب قائم علی خاں کو بھی بھگا لے گئی۔ مگر واہ رے بیگم جمی رہیں اور برابر تیر پر تیر چلاتی رہیں جب کل جبشنیں کٹ گئیں تو نول رائے نے ہاتھی پر سے آواز دی کہ بس بیگم صاحبہ بس! آپ خوب لڑیں مگر اب آپ تلوار سپرد کر دیجئے مگر بیگم نے تلوار سپرد کرنے سے انکار کر دیا ادھر راجہ نے اشارہ کیا اور رتھ ہانک دی گئی۔

فتح اور نصرت کی خوشی میں ایک بہت بڑا جشن راجہ نول رائے نے برپا کیا۔ بیگم صاحبہ کو ایک بڑے محل میں معہ ان کی رتھ اور رتھ بان کے نظر بند کیا گیا۔ قدرت کے کھیل بھی کیا ہیں ادھر تو فتح کے شادیانے بج رہے تھے۔ شراب پر شراب لنڈھائی جا رہی تھی۔ لوگ نصرت کی مسرت میں پھول گئے تھے ادھر بیگم کو وہ محل زندان آہنی سے کم نہ معلوم ہو رہا تھا روتے روتے برا حال ہو گیا تھا۔ آنکھیں پھول پھول گئی تھیں۔ عزیز و اقربا یاد آ رہے تھے۔ آخری عمر میں یہ ناموسی، نواب محمد خاں کی صورت بار بار آنکھوں میں پھر جاتی گویا وہ غصہ میں کہہ رہے ہیں کہ لعنت ہے اے پٹھانو تمہاری بہادری پر کہ تمہارے گھر میں گھس کر تمہاری ماں کو پکڑنے گئے آخر روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ گاڑی بان "بھاؤ" نے لاکھ سمجھایا مگر بیگم کے آنسو کہاں تھمتے تھے۔ آخر وفادار بھاؤ نے پاسبان کو اپنی کرد ھنی رشوت میں دیکر بخشی منسا رام کو بلوایا۔ کسی زمانہ میں اس کے آبا و اجداد نواب محمد خاں کے نمکخوار رہ چکے تھے۔ بھاؤ کو خیال ہوا کہ شاید وہ اس موقع پر کچھ حق نمک ادا کرے۔ خبر پاتے ہی بخشی جی دوڑے آئے آکر آداب و مجرا بجا لائے پہلے جیسا بلکہ اس سے بھی زیادہ آداب ملحوظ رکھا۔ بھاؤ نے کہا بخشی جی کیا نواب کے نمک کو تم نے اتنی جلدی بھلا دیا اللہ نے تم کو اس وقت صاحب اثر کیا ہے رہائی دلوا دو تو حق نمک سے ادا ہو جاؤ گے۔

بخشی جی نے اجازت چاہی رات کا وقت تھا کہتے گئے کہ رتھ تیار کرو۔ چھ گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں اگر اس میں بیگم کو بچا لے گئے تو خیر ورنہ گردن ماردی جائیگی میں جاتا ہوں اور اجازت لیکر اُلٹے پاؤں واپس آتا ہوں۔

دربار میں پہنچا موقع سے عرض کیا کہ حضور عورت کو گرفتار کر لائے ہیں تمام لوگ مضحکہ اڑا رہے ہیں اگر آپ اجازت دیدینگے اور رہا فرما دینگے تو بڑا نام ہوگا۔ نشہ کی ترنگ میں راجہ نے رہائی کی اجازت پر دستخط کر کے پروانہ بخشی کو دے دیا۔ بخشی جی سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے رہائی دلوا کر بیگم کو سوار کرا دیا۔ بخشائن نے الم غلم دنیا کی نعمت ایک پوٹلے میں باندھ دی تھی وہ بھی اس میں رکھ دیا۔ بھاؤ نے گاڑی ہانک دی بیل ہوا سے باتیں کرنے لگے ابھی قنوج سے آگے ہی گئے تھے کہ پیچھے سرپٹ گھوڑوں کی آواز آئی معاملہ یہ ہوا کہ فوراً ہی راجہ کو اپنی غلطی کا احساس ایک طوائف نے کرا دیا، حکم ہوا کہ بیگم بھاگی جا رہی ہیں پکڑ لاؤ۔

خدا کی قدرت، نواب محمد خاں بنگش کی آبرو باقی تھی آگے کالی ندی پڑتی تھی جو اگرچہ خشک تھی مگر پھر بھی آٹھ نو گز کا پاٹ تھا۔ یا علی کہہ کر ہندو بھاؤ نے بیلوں پر چابک رسید کی۔ پیر جوڑ کر بیل جو اڑے تو اس پار تھے۔ سوار ادھر رہ گئے اور بھاؤ یہ جا وہ جا ——

بھاؤ کی خدمت ظاہر تھی اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر بیگم کی جان بچائی تھی۔ راستہ میں بیگم نے پوچھا۔ "کیوں رے بھاؤ بتا تجھے کیا انعام دوں؟" عقلمند بھاؤ نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ یوں تو عالیجاہ کے عطیات ہی کیا کم ہیں، گھر میں کیا نہیں مگر ایک التجا ہے کہ میرے نام پر فرخ آباد میں

کوئی محلہ آباد کرا دیجئے تاکہ میرا اور میرے آبا و اجداد کا نام بھی زندہ رہے ورنہ کوئی اس غریب گاڑی بان کو کیا جانے گا؟ بات معقول تھی بیگم اس خیال سے بیحد متاثر ہوئیں۔ "نیم کرڑوڑی" کا پورا علاقہ اسی گاڑیبان بھاؤ کو دے دیا۔ بھاؤ سے راجہ بھاؤ ہو گئے اور اس کے نام پر فرخ آباد میں آج تک بھاؤ ٹولہ آباد ہے۔

مردہ مرا تو اچھا ہوا فرشتوں نے گھر دیکھ لیا یہ بُرا ہوا۔ نول رائے کا دل ایک بار کی فتح سے بیوں بڑھ گیا تھا اس کے نزدیک فرخ آباد کے بنگش "تال گاؤں" کے بھانڈوں سے بھی زیادہ ذلیل تھے۔ اسی ترنگ میں پھر با افواج بیشمار چڑھ دوڑا۔ ادھر بنگشوں کی رگ حمیت میں جوش آیا۔ راجپوتوں سے کہا تم پہلے ہار کر بھاگے ہو ابکی ہم جان دیکر بھاگیں گے اگر دل چاہے تو مردوں کی لڑائی دیکھنے آجانا تمام قرب و جوار کے پٹھان اکٹھا ہوئے۔ احمد خاں جو فنون سپہ گری میں طاق تھے قائم گنج سے چل کر آئے، انہی کو سالار لشکر کیا اگرچہ ایک ٹانگ کسی جنگ میں کھو بیٹھے تھے۔ مگر بڑے جی دار تھے اپنی کانی گھوڑی سمیت فتح گڈھ کے میدان میں آجمے ادھر بھاگے ہوئے راجپوت بھی جوش میں آگئے تھے وہ بھی اپنی پوری جمعیت ساتھ لیکر میدان میں آگئے۔ بیگم کی گود میں نواب قائم علی خاں بیٹھے ہوئے پورا معرکہ دیکھا کئے۔ پٹھانوں نے اپنی داڑھیاں دانتوں سے دبالی تھیں اور تیروں، تلواروں، گولیوں اور گولوں کو آندھی اور پانی سے زیادہ ہیچ سمجھ کر دندناتے ہوئے قلب تک گھس چکے تھے کہ ایک تیر نول کے ہاتھی کے ایسا کاری لگا کہ اس کا مہاوت بھی گرا اور ہودہ میں پیوست ہو گیا اس غیبی چوٹ سے ہاتھی ایسا متاثر ہوا کہ سر پر پیر رکھ کر بھاگا۔ اس کا بھاگنا تھا کہ فوج میں بھگدڑ پڑ گئی۔ ادھر احمد خاں جو بعد کو نواب احمد خاں مشہور ہوئے اس کے تعاقب میں چلے۔ آگے بڑھ کر ہاتھی کو روک لیا۔ گھوڑے کو اشارہ کیا اس نے اپنی دونوں ٹانگیں اٹھا کر ہاتھی پر ٹیک دیں احمد خاں نے نیزہ مار کر راجہ نول رائے کو چھید دیا۔ سر کاٹ کر چلے ہی تھے کہ ان کو بھی کسی نے قتل کر دیا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ قائم علی خاں کے ہمدردوں نے اس خوف سے کہ کہیں یہ تخت پر قابض نہ ہو جائیں قتل کر دیا تھا اور کچھ کا خیال ہے کہ نول رائے کی فوج کے کسی سید نے قتل کر دیا بہر حال واقعہ جو کچھ بھی ہو احمد خاں مرنے کے بعد ضرور نواب کے معزز خطاب سے سربلند کئے گئے مگر وہ میدان سے زندہ واپس نہیں آئے تھے۔

بی بی صاحبہ جن کی مسجد۔ محل، بازار ہنوز باقی ہے مرگئیں نوابیت کا دور دورہ ختم ہو گیا اور فرخ آباد بھی اجڑا ہی سمجھئے مگر "بھاؤ ٹولہ" ہنوز اس ہندو وفادار کی یاد تازہ کرتا ہے۔



BEST TONIC
BRAIN & NERVES

شاہی رجسٹرڈ

شاہی:- اپنی چند خصوصیات کی وجہ سے مقویات میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے اور ہر استعمال کرنے والا اس کے بہترین فوائد کا مداح ہے۔

شاہی:- افزائش خون کیلئے بہترین دوا ہے اس کا استعمال بدن میں نیا خون، طبیعت میں جوش و امنگ اور چہرے پر تازگی پیدا کرتا ہے۔

شاہی:- مضعف امراض مثلاً جریان، دل کی دھڑکن، سوئے ہضمی، تفکرات اور کسل و ماندگی وغیرہ رفع کر کے از سر نو طاقت پیدا کرتی ہے۔

قیمت فی شیشی دو روپے ۲؎

مزید معلومات کے لئے فہرست دواخانہ مفت

طبی دواخانہ یونانی

۶۶۔ محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳ ٹیلیفون نمبر ۲۶۹۸۳

چوک بازار "اندور"

تار کا پتہ۔ "شاہی" اندور

واردات

اک اور ہی جہان بسانے لگا ہوں میں!

از جناب اصغر حسین خاں نظیر لودھیانوی

سوزِ نوا سے آگ لگانے لگا ہوں میں ۔۔۔ گلشن کے خار و خس کو جلانے لگا ہوں میں
اسرارِ زندگی کے بتانے لگا ہوں میں ۔۔۔ اک اور ہی جہان بسانے لگا ہوں میں
پردہ تری جبیں سے اُٹھانے لگا ہوں میں ۔۔۔ ماہِ فلک کو چاند دکھانے لگا ہوں میں
نغمے ترے وصال کے گانے لگا ہوں میں ۔۔۔ ارض و سما کو وجد میں لانے لگا ہوں میں
پھر ایک بار دیکھ مجھے چشمِ مست سے ۔۔۔ یہ جام پی کے ہوش میں آنے لگا ہوں میں
گلشن میں تذکرہ ترے گیسو کا چھیڑ کر ۔۔۔ خوشبو میں ہر کلی کو بسانے لگا ہوں میں
دکھلا کے تیری چشمِ فسونگر کی گردشیں، ۔۔۔ جی بھر کے آسماں کو ستانے لگا ہوں میں
کھولا ہے شیشۂ مئے شیریں کنار جو ۔۔۔ غمہائے دو جہاں کو مٹانے لگا ہوں میں
سجدے میں سر نہیں ہے ترے در کے سامنے ۔۔۔ گردوں تک اس زمیں کو اُٹھانے لگا ہوں میں
پائی ہے تیرے سایۂ دیوار میں جگہ ۔۔۔ کیا گردشِ فلک سے ٹھکانے لگا ہوں میں
اے عرصۂ حیات کے شیرِ شکستہ پا ۔۔۔ اب جاگ ورنہ حشر اُٹھانے لگا ہوں میں
پیمانۂ سحر اُبلنے لگا ہے نور ۔۔۔ توحید کے رباب پہ گانے لگا ہوں میں
آنے لگی ہے دُور سے تکبیر کی صدا ۔۔۔ افلاک کی فضاؤں پہ چھانے لگا ہوں میں
گرنے لگے ہیں لالہ و گُل تیری راہ میں ۔۔۔ فردوس کو زمین پہ لانے لگا ہوں میں
دل کے نہاں کدے سے اُٹھا کر صدائے حق ۔۔۔ باطل کے لشکروں کو ڈرانے لگا ہوں میں
روحِ نشاط ڈال کے رگہائے شعر میں ۔۔۔ سرمایۂ حیات لُٹانے لگا ہوں میں

یا سُن چکے ہیں خامۂ اقبال سے نظیر
یا غیب کے پیام سُنانے لگا ہوں میں!

پاگل پریمی

سنسکرت ادب کی رومانی داستان

نوشتہ
ایف - ڈبلیو - بین

مترجمہ
جناب علی احمدؔ بی - اے

ابتدائیہ

شمال کے گھنے جنگلوں سے پرے ایک عظیم الشان پہاڑ واقع تھا اتنا اونچا اور اتنا بڑا کہ اس سنسار کی ماتا پاربتی بھی اُسے اپنا باپ کہتی تھی۔ اُس کی برف سے لدی ہوئی چوٹیاں اس قدر شفاف اور سفید دکھائی دیتی تھیں کہ جھیل مانسیر میں بہنے والی چاندی جیسی سپید بطخیں بھی ان کو دیکھ کر شرماتی تھیں جسامت اور وسعت میں اتنا بڑا کہ طلوع اور غروب ہونیوالا سورج اُس کا سایہ آسمان پر پھینکتا تھا اور آکاش کے ساتوں رشی ہر صبح اور شام عبادت کرتے وقت اپنی نگاہیں اُس "شعلہ فشاں زبان" کی طرف حیرت و تعجب سے اُٹھاتے تھے اس پہاڑ کے عین شمال میں دُنیا کے سب سے بڑے دیوتا کا مکان تھا۔ ایک شام جبکہ دن کی روشنی وادیوں اور پہاڑوں کے بہتے ہوئے سایوں میں رفتہ رفتہ غائب ہو رہی تھی ہمالیہ کی بیٹی پاربتی اپنے مالک مہیشور کے ساتھ چوسر کھیل رہی تھی اور وہ اُس سے جیت گئی اور تب وہ بولی "اب کے میں اس شرط پر کھیلونگی کہ تم مجھے وہ چیز دیدو گے جسے اپنے بالوں میں سکھتے ہو"۔ مہیشور اُس کا مطلب سمجھ گئے لیکن کہا "اچھا مجھے منظور ہے"۔

کھیل شروع ہوا اور جیت پھر دیوی ہی کی رہی۔ وہ خوش ہو کر چلائی۔ "اہا میں جیت گئی اپنا وعدہ پورا کرو"۔ مہیشور نے اپنا چاند اُسے دیدیا لیکن پاربتی جی غصہ میں آکر بولیں "تم دھوکہ باز ہو تم سے گنگا دینے کی شرط ٹھہری تھی اور اب تم صرف اپنا چاند دیکر مجھے بہلانا چاہتے ہو۔ میں تمہارے چاند کی پروا نہیں کرتی"۔ تب دیوتا نے کہا "آخر تم ناراض کیوں ہوتی ہو۔ کیا چاند اُن چیزوں میں سے نہیں جو میرے سر میں ہیں"۔ لیکن اوما نے بگڑ کر اپنا مُنہ پھیر لیا۔ تب دیوتا نے جو صرف اُس کے حُسن کا لطف غصہ کی آمیزش کے ساتھ اُٹھانا چاہتا تھا اسکی توجہ کو پھر اپنی طرف منعطف کرنے کیلئے کہا "کھیل اور اُس کے ساتھ ساتھ مذاق بھی ختم ہو گیا۔ اب لاؤ میرا چاند مجھے واپس دیدو جو تمہارے لئے بالکل بیکار ہے اس لئے کہ خود تمہارا چہرہ جو ہمیشہ چودہویں رات کا چاند رہتا ہے چاند سے چمک دمک چھین کر اس کو بے نور کر دیگا۔ علاوہ اس کے میں اُس کے بغیر رہ بھی نہیں سکتا"۔ دیوی نے کہا "چاند کے بغیر تم کیوں نہیں رہ سکتے"۔ اور مہیشور نے جواب دیا۔ "اگر چاند میرے سر سے غائب ہو جائے تو یقین مانو میری ساری خدائی جاتی رہے"۔ تب اوما بولی "ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" اور دیوتا نے کہا "سنسار کی تمام پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے چاند ہی سب سے زیادہ خوبصورت شے ہے اور اسی لئے میں اعزاز کے طور پر اس کو اپنے بالوں میں رکھتا ہوں۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ میں دُنیا کی تمام جاندار اور بے جان چیزوں کا مالک ہوں اور یہ صرف اس لئے کہ "حُسن" ہی دُنیا پر حکومت کرتا ہے اور بغیر اس کے دُنیا تاریک اور بے کیف ہے اور ایک قصہ اس سے متعلق ہے"۔ تب پاربتی نے سُننے کا شوق ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "وہ قصہ مجھ سے کہو اور میں تمہیں تمہارا چاند واپس کر دونگی اور تمہارے اس فریب کو بھی معاف کر دونگی"۔ مہیشور راضی ہو گئے اس لئے کہ وہ یہی چاہتے تھے۔

اوما نے چاند دیدیا اور مہیشور نے اُسے اپنے زرد بالوں میں لگا لیا۔ پھر ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور اس کو اپنی گود میں بٹھا لیا۔ پاربتی اپنے سر کو مہیشور کے سینے کا سہارا دیکر قصہ سُننے کے لئے تیار ہو گئی۔

لیکن عین جب دیوتا قصہ شروع کرنے والا تھا اُس نے نیچے دھرتی کی طرف دیکھا — اور دیکھا کہ دُور — بہت دُور — نیچے ایک پہاڑ کے دامن میں ایک تنہا آدمی سفید سر برف پر تکلیف کے ساتھ رینگ رہا ہے۔ وہ اُس وسیع میدان میں بڑے بڑے ٹیلوں کے درمیان چیونٹی کی طرح نظر آرہا تھا۔ تب دیوتا نے اوما سے کہا "دیکھو! نیچے یہ آدمی کیا کر رہا ہے یہاں تک تو کسی جاندار کی رسائی بھی نہیں۔ بہتر ہو گا کہ ہم انتظار کریں اور دیکھیں یہ کیا کرتا ہے"۔ دیوی نے فوراً کہا "تم پھر مجھے دھوکا دینا چاہتے ہو۔ یہ ایک ترکیب اور بہانہ ہے تاکہ میں قصہ سُننے نہ پاؤں"۔ اور مہیشور نے کہا "نہیں دیوی میں تجھے قصہ ضرور سناؤنگا لیکن پہلے ہمیں یہ تو معلوم ہو جائے کہ آخر یہ چاہتا کیا ہے"۔ اور دیوتا نے وہیں سے اُس آدمی کو آواز دی "تو کون ہے؟ اور کیوں پہاڑ کی برفانی چوٹی پر پہنچنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے"۔ اس آواز کو سُنکر جو دیر تک پہاڑوں میں بادل کی گرج کی طرح گونجتی رہی وہ شخص سر کے بل زمین پر گر پڑا اور پھر اُٹھتے ہوئے کہا "اے روزی دینے والے مہیشور یقیناً یہ تو ہی ہے جسکی آواز میں سُن رہا ہوں۔ میں تیرے حضور ایک عرض لیکر آیا ہوں اور میری ساری آشائیں تجھی سے وابستہ ہیں۔ میں پاٹلی پتر راجہ کے دربار کا قصہ گو ہوں اور ہر رات جب وہ سونے کا قصد کرتا ہے تو اُس کے سُلانے کیلئے میں ایک قصہ کہتا ہوں۔ چودہ سال تک میں برابر قصے کہتا رہا، ہر رات ایک نیا قصہ — آخر کار ایک رات جب راجہ کے سونے کا وقت آیا تو میں نے کہا "اے راجہ میرے تمام قصے ختم ہو گئے، اور میرا "تخیل" خالی ہو گیا اور اب میں کوئی نیا قصہ نہیں بیان کر سکتا"۔ راجہ برہم ہو گیا اور سُرخ آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "اے گستاخ یہ کیا بکتا ہے کیا تیرا مطلب یہ ہے کہ آج مجھے نیند نہ آئے صرف اس وجہ سے کہ تیرے تمام قصے ختم ہو گئے؟" یہ سُنکر میں اُس کے قدموں پر گر پڑا اور عاجزی سے کہا "راجہ مجھے معاف کر میں مجبور ہوں میرے قصوں کا چشمہ خشک ہو گیا ہے"۔ تب

اُس نے کہا "آج سے تو میرے دربار کا قصہ گو نہیں رہا تیری جگہ دوسرے کو دیجائیگی اور سُن میں تجھے آج سے تین ماہ کی مُہلت دیتا ہوں اگر اس مُدّت تک تو مجھے ایک ایسا قصہ جو تیرے تمام قصوں سے بہتر ہو نہ سُنا سکا تو یقین رکھ تیرا سر گردن سے جُدا کر دیا جائیگا اور صرف یہی نہیں بلکہ تیرے خاندان کے تمام لوگوں اور تیرے رشتہ داروں کے ساتھ وہ سلوک کرونگا جو برسات کی طُوفانی ہوا درختوں اور جنگلوں کے ساتھ کرتی ہے"۔ اور فوراً اُس نے میرے تمام رشتہ داروں کو پکڑ منگایا جنہیں وہ میری واپسی تک اپنے پاس قید رکھے گا۔ کوئی چارہ کار نہ پا کر میں تیرے قدموں میں آیا ہوں اس لئے کہ تو ماضی حال اور مستقبل سب کچھ جانتا ہے اور اب میں تیرے ہی کرم کا محتاج ہوں"۔

تب مہیشور نے اپنی پتنی سے کہا "تم نے دیکھا ہمارا انتظار کرنا کتنا اچھا ہوا۔ یہ مظلوم قصہ گو ٹھیک وقت پر آپہنچا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم اسے بھی اپنے قصہ میں شریک کرلیں۔ یہ اس کیلئے فائدہ مند ہوگا یا مضرت رساں، اس کا تصفیہ خود وقت کریگا"۔ تب اُس نے قصہ گو کو اُٹھا کر اپنے گھنے بالوں میں رکھ لیا۔ مہیشور کا ہاتھ لگتے ہی قصہ گو ہوا کے ساتھ اُڑ کر ایک لمحے میں اُس کے بالوں کے سائے میں پہنچ گیا۔ اور اُسکی تکان اور تھکن بالکل غائب ہو گئی۔

تب دیوتا نے اپنی داستان شروع کی اور جونہی اُس کے مُنہ سے الفاظ نکلے گندھروا، کنّارا، سدھا اور ودیا دھرا سب کے سب شور مچاتے ہوئے آپہنچے اور ہوا میں مہیشور کے اِردگرد قصہ سُننے کے لئے جمع ہو گئے۔

آغازِ داستان

جگ کنول

(۱) خُدا کا مُنکر

بہت بہت دِن ہوئے دُنیا ابھی اپنے ابتدائی دَور سے گزر رہی تھی۔ آکاش کے دیوتا ابھی جوان تھے۔ شمال کی پہاڑیوں کے دامن میں ایک خوبصورت شہر آباد تھا۔ جب وہاں کا راجہ مرا تو اپنی راج گدی اپنے بیٹے کو سونپ گیا۔ اس نئے وارث کے بالوں نے ابھی اٹھارہ ہی گرمیاں دیکھی تھیں اس کا نام رنگا تھا۔ اگرچہ وہ شکل و شباہت اور رنگ اور رُوپ میں محبّت اور جنگ کے دیوتاؤں کے مانند تھا اور اپنی پرجا میں بڑی عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا لیکن اپنی کمسنی اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے اُصولِ دُنیاداری سے واقف نہ تھا اور یہی وجہ ہوئی کہ وہ بہت جلد اپنے بدخواہ رشتہ داروں اور عزیزوں کی مخالفانہ سازشوں اور گھاتوں کا نشانہ بن گیا اور آخر کار اُس کے ماموں نے فریب دیکر پہلے تو اُس سے تخت چھین لیا پھر اپنی مہربانی سے اُسکی جان بخشی کرکے راج کی حدود سے باہر نکلوا دیا۔

رنگا بہت دنوں تک تو ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا پھر آخر ایک ہمسایہ ریاست میں جا کر پناہ لی۔ خانہ بدوش راجپوت راجہ جس کے پاس ایک تلوار کے سوا کوئی چیز نہ تھی بھوکوں فاقے کرنے لگا۔ وہ اپنی اس بدحالی کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا اور تینوں دُنیاؤں کے دیوتاؤں سے بدظن ہو گیا۔

پہلے تو خود کو بہت بُرا بھلا کہتا رہا پھر اپنے ماموں اور رشتہ داروں کو گالیاں دیں۔ اور آخر میں مقدس دیوتاؤں کو بُرے ناموں سے یاد کرنے لگا۔ اُس نے دیوتاؤں کو مخاطب کرکے کہا "میں نے تم سب کو چھوڑ دیا اور تمہارا ادب جو کچھ میرے دل میں تھا جاتا رہا اس لئے کہ میں اپنی تمام زندگی بھر پاکدامن رہا۔ تمہاری پُوجا کرتا رہا۔ اور تمہاری تعریف میں بھجن گاتا رہا جس کا بدلہ شاید یہی ہے کہ تم دیوتاؤں نے مجھے بھول کر بھی نہ دیکھا اور مجھے ذلّت و گمنامی کے گڑھے میں ڈال دیا اس لئے اب میں تمہارا پُجاری نہیں رہا بلکہ باغی اور تمہاری شکتیوں کا مُنکر ہوں۔ آج سے میں تم میں سے کسی کو بھی دیوتا ماننے کو تیار نہیں بجز اُس مقدس دیوی کے جو حقیقت میں تعریف و تحسین کے قابل ہے اور جو قسمت، دولت اور حُسن کی دیوی ہونیکے علاوہ تینوں دُنیاؤں پر حکومت کرتی ہے"۔

اِسی طرح وہ ہر وقت اُس کی پُوجا کرتا اور کہتا "او سمندر سے نکلنے والی اور سمندر سے زیادہ حسین دیوی، کملا، پدما، شری، لکشمی اور حسینوں کی سرتاج، کنول کے پھول سے زیادہ سُندر اپنے پُجاری پر ترس کھا۔ تو سارے سنسار کی جان اور رُوح ہے۔ تیری ساخت سمندر کی لہریں، حبابوں، بجلی کی چمک، بہتی ندیوں کی روانی، شعلوں کی لپک اور تیرتے ہوئے بادلوں کے لہجر سے ہوئی ہے۔ اے خوبصورت شوخ اور نظر فریب دیوی تو اٹھتی ہوئی جیسا جی چاہتا ہے گھومتی ہے۔ جہاں جی چاہتا ہے چلی جاتی ہے۔ تجھے دم بھر کیلئے قرار نہیں۔ تیرا ارادہ قانون ہے۔ صرف تیرا ابھرکا دہیم ایک کو امیر اور دوسرے کو غریب بنا سکتا ہے۔ ایک کو

راجہ یُودھسرے کو بھکاری۔ تیری مرضی کو کسی سبب یا پناہ کی ضرورت نہیں۔ صرف تجھ پر میرا عقیدہ ہے۔ درصل تو ہی حقیقی "داتا" ہے۔ مجھے اپنے چرنوں میں جگہ دے اور میں ساری عمر تیری ہی پُوجا کرتا رہوں گا۔

اے نسوانی حُسن کے مرقع! چنچل! شوخ! ضدی! سمندر کے جھاگ کی طرح نظر فریب! تحیر زا! جادو اثر! معصوم! ریت کے ٹیلوں کی طرح متزلزل! غیر فانی! اور اے حسین سینوں والی! میں تیری پرستش تیرے حباب کی طرح نازک اعضا اور تیری فریبی متوالی آنکھوں کے رنگوں میں کرتا ہوں۔ میں تیرے پوتر چرنوں میں خود کو ایک جان نثار اور مجرم کی حیثیت سے پیش کرتا ہوں۔ جیسا جی چاہے تو میرے ساتھ سلوک کر۔ میری سہایتا کر کے مجھے آکاش تک بلند کر دے یا زمین کی آخری گہرائیوں تک گرا دے۔ میں سب کچھ سہنے کو تیار ہوں اس لئے کہ میری عبادت اور میرا عزم استوار ہے۔ تیری ہی ذات سے میری جیون آشا جیتی ہے اور تیری خوشی ہی میرا بھاگ ہے۔"

جس وقت رانگا یہ کہہ رہا تھا خوش قسمتی سے "حُسن کی دیوی" سب کچھ سُن رہی تھی ــــ اور جب اُس نے نوجوان سے اپنی غیر معمولی تعریف سُنی ــــ اتنی تعریف کہ کبھی کسی اِنسان نے اُس کے حق میں نہیں کی تھی ــــ تو بہت خوش ہوئی اور اُسے اپنی کنول جیسی آنکھوں کے گوشے سے دیکھا۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کا پُجاری نوجوان اور خوبصورت ہے۔ اُس کا نازک دل دیا اور کرپا سے بھر گیا ــــ اور جب رانگا نے اپنا کہنا ختم کیا تو دیوی نے مُسکراتے ہوئے پسندیدہ نظروں سے، ایک خاص ادا کے ساتھ، اُس پر بھرپور نگاہ ڈالی اور دل میں کہا۔ "میں اِس سندر نوجوان اور بہادر راجپوت کو یہ ثابت کر دکھاؤں گی کہ اس نے تمام دیوتاؤں کی شکتی کو ٹھکرا کر صرف میری ذات کو اپنے پُوجنے کے قابل سمجھنے میں غلطی نہیں کی ہے۔"

دیوی نے رانگا کی مدد کرنے کا اٹل فیصلہ کر لیا چنانچہ اُسی رات رانگا کے دل میں ایک عجیب بات ڈال دی۔ رانگا نے خود سے کہا۔ "اب میں قسمت کا پُجاری بن گیا ہوں اور جواری بھی اور اب میں اُسے آزماؤں گا، دیکھوں وہ میرے لئے کیا کرتی ہے۔" وہ جانتا تھا کہ اپاہج بیٹھنے والوں پر دیوتا اور دیویاں کرپا نہیں کرتیں اس لئے وہ شہر کی گلیوں اور بازاروں میں بے مقصد گشت لگانے لگا۔ وہ قسمت کی ہر ستم ظریفی سہنے کو طیار تھا اور جب وہ رانا کے محل کے تلے سے گزرا تو اوپر دیکھا۔ مینار کے آخری حصے کے قریب ایک کمرہ تھا جس کی کھڑکیاں تھیں جس وقت وہ کھڑا اوپر دیکھ رہا تھا ایک پہرہ دار نے کہا۔ "یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اس کمرے کی طرف نظر اُٹھانا منع ہے اس لئے کہ اس میں راجہ کا سب سے قیمتی ہیرا ہے۔" رانگا نے خود سے کہا۔ "ضرور وہ کسی قسم کا ہیرا ہوگا کہ اسے چھپانے والی دیوار کی طرف بھی دیکھنے کی اجازت نہیں۔" اور حیرت کرتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا اور جب وہ جا رہا تھا، "جل دیوی" نے اُس کے دل میں کچھ پھونک دیا۔ اُس کی رُوح اِس نامعلوم راز کو حل کرنے کے لئے بیچین ہو گئی اور اُس نے اٹل فیصلہ کر لیا کہ وہ آج ہی رات وہاں جائے گا اور جیسے بھی ممکن ہوگا وہاں پہنچے گا اور اُس نایاب موتی کو اپنی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کریگا۔

اِس مقصد کیلئے اُس نے ایک تیر و کمان، دو لانبی ڈوریاں اور ایک مضبوط رسّی فراہم کی۔ یہ سب لیکر وہ آدھی رات کو پہنچا اور سڑک پر سائے میں چھپ گیا۔ چاندنی رات میں محل کے مینارے چمک رہے تھے اور اُن کے طویل سائے سڑک کی دُوسری طرف رات کی تاریکی میں اضافہ کر رہے تھے۔ وہ دیر تک وہاں کھڑا اِنتظار کرتا رہا یہاں تک کہ پہرہ دینے والے محل کا چکر لگاتے ہوئے دُوسری طرف چلے گئے۔ رانگا آہستہ آہستہ تاریکی سے نکلا اور تیر کے ایک سرے کو ڈوری سے باندھ کر کمان کے ذریعے اوپر پھینکا جو مینار کے کلس کے پیچھے سے ہوتا ہوا پھر زمین پر آ رہا۔ ڈوری کے ایک طرف اُس نے رسّی باندھ دی اور کھینچنا شروع کیا یہاں تک کہ رسّی کے دونوں سرے اُس کے ہاتھ میں آ گئے۔ پھر وہ تیزی سے ہاتھ پاؤں مارتا ہوا کھڑکی تک پہنچ گیا اور رسّی کو اسی طرح لٹکتا چھوڑ کر کمرے کے اندر کُود پڑا۔

(۲)

راجپوت شادی

کمرے میں چند قدم چلنے کے بعد وہ یکایک حیرت سے رُک گیا۔ اُس کے عین سامنے سونے کی جڑاؤ مسہری پر ایک نوجوان عورت سو رہی تھی جیسے یاسمین کے پتّوں سے پٹے ہوئے تھالے میں کوئی یاسمین کا تازہ پھول پڑا ہو۔ کیونکہ کھڑکی سے آنے والی چاند کی کرنوں نے اُسے روپہلی چاندنی میں لپیٹ دیا تھا۔ وہ نسوانی حُسن کا ایک مکمل نمونہ تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کا خوابیدہ حُسن سارے سنسار کو فتح کر کے اب تھک کر سو گیا ہے۔ اسکی بند آنکھوں کی دراز مژگاں اسکے گالوں پر اپنے طویل سائے اُن ہونٹوں تک بکھیر رہی تھی جو سوتے وقت بھی مُسکرا رہے تھے۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور آنچل جو اس کی گردن تک آ کر رُک گیا تھا ہٹ گیا۔ گردن کا حُسن اُبھرے ہوئے سینوں کی مُڑتی ہوئی لکیروں کے ساتھ عُریاں ہو گیا جو ہر سانس کے ساتھ اُبھرتا اور پست ہو جاتا تھا۔ ایک ہاتھ اس کے سر کے نیچے تھا اور دُوسرا گلاب کی شاخ پر کھلے ہوئے پھول کی طرح مسہری کے کنارے لٹک رہا تھا۔

رانگا اُس مجسمۂ حُسن کو دیکھتا ہوا خاموش اور بےحس کھڑا تھا کہ

یکایک وہ جاگی جیسے کوئی محبت کی پہلی چوٹ کھا کر چونک پڑتا ہے۔ کیونکہ سپنے میں "جل دیوی" ایک تصویر دکھا کر اُسے کہہ رہی تھی "اُٹھ دیکھ میں تیرے لئے کتنا سُندر پتی لائی ہوں جو کاما کی کلیوں سے بھی زیادہ نازک ہے"۔ اور جب اُس نے اپنی گھنی پلکوں والی آنکھیں کھولیں تو وہ اُسکے سامنے کھڑا تھا۔ وہ حیرت اور خوف سے چونک پڑی اور اپنے سپنے کے سُندر پتی پر نظر جمائے ہوئے اُٹھ بیٹھی اِس لئے کہ اُس کا یہ خواب اتنا سچا تھا کہ اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا۔ اُسے شبہ تھا کہ شاید وہ ابھی خواب سے بیدار نہیں ہوئی۔ تب کچھ دیر کے بعد وہ بولی "کیا در اصل تم کوئی آدمی ہو، یا یہ صرف میرا خواب ہے؟" اور اُس نے جواب دیا "حُسنِ خوابیدہ! میں تیرا وہم نہیں میں حقیقت ہوں لیکن میں چاہتا تھا کہ کاش ایسا نہ ہوتا۔ تیرا خواب بننے کیلئے میں اپنی جان بھی دیکر دُکھی نہ ہوتا"۔

وہ بولی "آخر تم ہو کون؟ اور یہ کیسے ممکن ہوا کہ تم میرے کمرے تک پہنچ سکے جہاں میری سکھیوں اور ہوا میں اُڑتے ہوئے پنچھیوں کے سوا کسی کو آنے کا حوصلہ نہیں ہو سکتا"۔

اُس نے جواب دیا "خواب سے بیدار ہونے والی دیوی! میں رانگا ہوں اونتی کا راجہ جسے اُسکے رشتہ داروں نے اپنے راج سے نکال دیا ہے۔ لیکن اب مجھے اس کا غم نہیں کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو میری آنکھیں تجھے کبھی نہ دیکھتیں"۔

لیکن جب اُس نے رانگا کا نام سُنا تو وہ چونکی اور اپنے کانوں پر بھروسہ نہ کر سکی۔ پھر بولی "اپنا نام پھر بتاؤ"۔ اُس نے اپنا نام پھر بتایا۔ وہ بولی۔ "شاید میں ابھی سپنے ہی میں ہوں یا تمہیں ضرور کسی دیوتا نے بھیجا ہے۔ اچھا تم اپنی داستان شروع سے کہو"۔ اُس نے ایسا ہی کیا جبتک وہ کہتا رہا، رانی اُسے گھورتی رہی کیونکہ "جل دیوی" نے رانگا کے حُسن سے رانی کی نظروں کو خیرہ کر دیا تھا اور اُسکی آواز میں جادو سمو دیا تھا۔

جب وہ اپنی داستان کہہ چکا تو وہ بولی "راجکمار اس میں کوئی شک نہیں پرمیشور ہی نے تمہیں یہاں بھیجا ہے اِس لئے کہ اس معاملہ میں ایک بات جو تم سے بالکل پوشیدہ ہے وہ اتنی عجیب ہے جو انسانی قیاس کی حدوں سے باہر ہے۔ لیکن سُنو مجھے تم سے ایک معاہدہ کرنا ہے۔ راجہ ـــــ میرا باپ ـــــ اپنی سلطنت کی طاقت بڑھانے کیلئے پڑوس کے ایک راجہ کے ساتھ میرا بیاہ کرنے والا ہے۔ اُس راجہ کی پتنی بننے سے پہلے میں خود کو اس کھڑکی سے نیچے گرا کر جان دینے کا ارادہ کر چکی ہوں کیونکہ اُس بدصورت کی تصویر کو بھی میں ایک لمحہ تک دیکھنا گوارا نہیں کر سکتی اور اب تم آگئے ہو گویا اسی کام کے لئے کہ یہاں سے بھاگ نکلنے میں میری مدد کرو۔ میں جانتی ہوں تم غریب ہو، نہ راج ہے نہ راجدھانی اور تم اُنہیں واپس بھی نہیں لے سکتے لیکن تم ذات میں میرے برابر ہو اور جبتک تمہارا دل ساتھ ہے میری آتما، میرا جسم سب کچھ تمہارا ہے۔ کیا تم مجھے اپنی پتنی بنا کر اپنے چرنوں میں جگہ دوگے؟ میں تم کو اپنا جیون ساتھی بنانا چاہتی ہوں جس رسّی کی مدد سے تم آئے ہو اُسی سے مجھے لیچلو۔ کیونکہ میں اپنی آزاد مرضی سے تم کو اپنا پتی قبول کرتی ہوں اور وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری غربت اور بے سروسامانی میں سیتا کی طرح سیوا کرونگی۔ مجھے قول دو کہ تم زندگی بھر میرے ساتھ وفادار رہوگے۔ میں پھر کہتی ہوں تمہارا دُکھ سُکھ میرا دُکھ سُکھ ہوگا اور خدا نے چاہا تو آخری سانس تک تمہارا دامن میرے ہاتھ سے نہ چھوٹے گا۔ ہو سکتا ہے کہ میں تمہارے بھاگ کی پریشان لفوں کو سُلجھا سکوں اور اگر ایسا نہ کر سکی تو بہرحال اسے صبر سے برداشت کرنے میں تمہاری مدد کرونگی اور اب کہو، کیا یہ تمہاری مرضی کا سودا نہیں۔ جواب دینے سے پہلے سوچ لو۔ مجھے تمہاری آتما کے سوا دُنیا کی کوئی دولت نہیں خرید سکتی"۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنی خوبصورت بڑی بڑی آنکھیں اسکی طرف اُٹھائیں جن میں نہ تو خفت تھی اور نہ ڈر۔ رانگا کی آنکھیں چار ہوئیں اور اُس کا دل سینے میں لرز اُٹھا۔ کیونکہ عورت کی مقدس روح اُسکی آنکھوں سے اُبل کر اُس کے دل کی گہرائیوں تک پہنچ رہی تھی وہ خوشی سے ہنس پڑا اور بولا "سُن! آکاش پر رہنے والی اپسرا! تو کتنی نازک اور کتنی سُندر ہے۔ تیرا پتی مجھ سے بھی بہتر ہونا چاہیئے پھر بھی اگر تیری نظریں مجھ ہی یہ اعزاز بخشنا چاہتی ہیں تو میں تجھ سے بیاہ کر کے سارا جیون تجھ سے پریم کرنے میں گزار دونگا۔ تو دیوی اور میں پجاری"۔ وہ جھک گیا اور اُس کے ہاتھوں کو ایک نرم بوسہ دیا۔ پھر اُسکی داسی نے پریم بھری نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا "تم ہی کو میں نے اپنا جیون ساتھی بنایا ہے میں دیکھتی ہوں کہ میرا خواب سچا ہو گیا ہے۔ آج سے میں تیری پتنی اور تیری داسی ہوں"۔

تب اُس نے کہا "میری رانی! اس سے پہلے کہ کوئی ہمیں دیکھ لے ہمیں نیچے اُتر چلنا چاہیئے۔ اگرچہ تو بانس کے پتوں سے زیادہ سبک ہے پھر بھی یہ ایک جان جوکھوں کا کام ہے۔ کیا تجھ میں اتنی ہمت ہے؟"

رانی نے گردن کو نیہوڑا کر کہا "اس میں ڈرنے کی کونسی بات ہے۔ گر پڑینگے تو ہم دونو گرینگے اور مرینگے تو ایک ساتھ مرینگے لیکن ڈرو نہیں میں گردن میں باہیں ڈال کر تم سے لپٹی رہونگی"۔

رانگا ہنسا اور کہا "میں اپنے قیمتی ہیرے کی حفاظت کا بھروسہ تیری نرم اور نازک باہوں پر نہیں کرونگا"۔

پھر اُس نے مسہری پر سے ایک ریشمی کپڑا اُٹھایا اور رسّی کی طرح بٹ کر پہلے اُسکی کمر سے باندھ دیا پھر اپنی کمر سے۔ تب دونوں کھڑکی کے قریب آئے۔

پچھواڑے کے ٹوٹے ہوئے دروازے سے وہ باہر نکلے اور جب وہ گزر گئے تو وہ بولی "اب تم اچھا، لیکن ٹھہرو! مجھے اپنی ساری دولت ساتھ لے چلنا ہے"۔ اُس نے کپڑے کی ایک پوٹلی باندھی اُس میں اپنے تمام زیورات رکھے اور کھڑکی سے نیچے پھینک دیا۔

تب رانگا نے پوچھا "کیا تو ڈر رہی ہے؟"

وہ بولی "ہاں میں ڈر رہی ہوں لیکن صرف تیرے لئے"۔

اُس نے کہا "آنکھیں بند کر لو اور اپنی باہیں میری گردن میں ڈال کر لپٹ جاؤ"۔ شرماتی اور گھبراتی ہوئی دوشیزہ نے ایسا ہی کیا۔ نڈر رانگا نے رسی اپنے ہاتھ میں مضبوط تھام لی اور آہستہ آہستہ پھسلنے لگا اور جب وہ محل کے پائیں میں پہنچے تو اس کا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔

رانی نے اپنے قدم زمین پر ٹیکتے ہوئے کہا "تم جتنے بہادر ہو اُتنے طاقتور بھی ہو۔ یقیناً دیوتا ہی نے تمہیں میرے پاس بھیجا ہے"۔

رانگا نے اپنی باہوں کی گرفت ڈھیلی نہ کی اور اُس کے یاقوتی لبوں سے اپنے لب ملا دیئے۔ پھر بولا "اب میں تجھے پیار کر سکتا ہوں کیونکہ ہم نے مل کر موت کا مقابلہ کر لیا ہے اور تو میری ہو چکی ہے لیکن ہمیں یہاں ایک منٹ کیلئے بھی نہیں ٹھہرنا چاہیئے۔ تب پوٹلی اٹھا کر وہ جلدی جلدی چلے ایسے وقت سنسار کی تمام عظمت ان کے نزدیک ایک تنکے سے زیادہ قوت نہ رکھتی تھی۔ وہ چلتے رہے۔ راجکماری نے کہا "اس شہر کے قریب ایک ویران بستی ہے جہاں کوئی آدمی نہیں رہتا۔ جہاں صرف طوطے اور بندر بستے ہیں۔ ہم کو وہیں چلنا چاہیے وہاں ہمیں کوئی تلاش نہ کر سکے گا چلو میں تم کو راستہ بتاتی ہوں"۔

ویران بستی آ گئی اور وہ ایک منہدم عمارت کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ اندر جانے پر معلوم ہوا کہ وہ بیلوں کے باندھنے کی جگہ تھی جہاں کثرت سے گھاس پڑی ہوئی تھی۔ رانگا نے ایک طویل سانس لیکر کہا "افسوس میں تجھے کسی بڑے عالیشان محل میں لیجانے کے بجائے ایک ویرانے میں لایا ہوں"۔

وفادار پتنی نے جواب دیا "جہاں شوہر ہے وہیں بیوی کی جنت ہے"۔

وہ پھر بولا "افسوس! میں ایک جلاوطن اور در در کی ٹھوکریں کھانے والا تجھ کو تیرے گھر تیرے خاندان سے چھڑا کر یہاں اٹھا لایا ہوں"۔

داسی نے فوراً کہا "کیا پتی اپنی پتنی کے حق میں ماتا اور پتا کے برابر نہیں ہوتا اور اُسے اب کس محل کی ضرورت ہے جب اُس نے اپنے مالک کے دل میں اپنا گھر بنا لیا ہے"۔

تب مرد نے اپنا دایاں ہاتھ اُسکی کمر میں حمائل کرتے ہوئے اُس کے بائیں ہاتھ کو ایک گرم بوسہ دیا اور پوچھا "تیرا نام کیا ہے سجنی!"

عورت نے لجاتے ہوئے کہا "سب مجھے جنگلی پھول کہتے ہیں"۔

وہ جلدی سے بولا "اوہو کتنا پیارا نام ہے اچھا اب میں تیرے لئے ایک کمرہ بنا دوں جو حجلۂ عروسی کا کام دے اور اس میں جانتی ہے بستر کس چیز کا ہوگا۔ گھاس اور پھوس کا۔ کیونکہ آج ہماری سہاگ کی رات ہے اور وہ دیکھ دور آکاش پر قطب[۱] تارہ چمک رہا ہے"۔

~ (۳) ~

جل کنول

لیکن اس وقت تک آکاش کے سارے دیوتاؤں[۲] تک یہ خبر پھیل چکی تھی کیونکہ رانگا نے اُنہیں جو گالیاں دی تھیں اُن کو وہ بھی سن چکے تھے اور جب انہوں نے دیکھا کہ "جل کنول"[۳] کی مدد سے اُس نے "جنگلی پھول" کو حاصل کر لیا ہے تو وہ اُس دیوی اور رانگا دونوں سے بہت ناخوش ہوئے اور سب کے سب اندر دیوتا کے بڑے ہال میں جمع ہو کر یہ غور کرنے لگے کہ اب اُنہیں کیا کرنا چاہیئے لیکن میں (مہیشور ——— جو قصہ بیان کر رہے ہیں) وہاں نہ تھا اِس لئے کہ مجھے رانگا سے کوئی شکایت نہ تھی۔ اُسکی جوانی اور بے بسی کا خیال کر کے میں نے اُسے معاف کر دیا تھا۔ ناراض بھی موجود تھے کیونکہ رانگا کی گالیوں کے قطع نظر وہ خوش تھے کہ اُس نے اُسکی بیوی کی غیر معمولی تعریف کی ہے جو اُنکی جیون کا ادھار ہے جیسے تم میرے (مہیشور) لئے ہو۔ غرض وہ غصہ کی باتیں ایک دوسرے سے کہنے لگے "یہی بات ہمیں بھڑکا دینے کیلئے کافی ہے کہ ایک ادنیٰ فانی انسان ہمیں گالیاں دے کر ہماری بے عزتی کرے۔ صرف اس لئے کہ اُس کا بھاگ اُس کیلئے ناسازگار تھا۔ گویا ہم اپنے پجاریوں کے غلام ہیں۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ "جل کنول" نے اس ابرا ہی کو تینوں جگ کی سب سے حسین عورت کا شوہر بنا کر اُس سے اپنی ہمدردی کا ثبوت دیا ہے۔ درحقیقت اُسے سزا دینے کے بجائے بہت بڑے انعام سے سرفراز کیا ہے۔ یہ معاملہ اگر یونہی چلتا رہا تو ہم بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جائینگے اور سنسار کے سارے اصول و قوانین ٹوٹ جائیں گے کیونکہ سنسار کا انحصار بھجن پوجا اور بھینٹ پر ہے لیکن اگر لوگ اس کے بغیر ہماری دیا کے مستحق ہونے لگیں تو ہم دیوتاؤں کی پوجا کرنے کی تکلیف کون برداشت کریگا؟ مانا کہ گستاخ رانگا سزا کے قابل اور ہمارا گنہگار ہے لیکن "جل کنول" کی خطا اُس سے

---

[۱] قطب تارہ ہندؤں میں بیاہ کا پیامی سمجھا جاتا ہے۔

[۲] دیوتاؤں کا لفظ جب استعمال ہوتا ہے تو عام طور پر اس سے مراد برہما، وشنو اور شیو کے علاوہ تمام دیوتا مراد ہوتے ہیں کیونکہ ان تینوں کا درجہ سب سے بڑا ہے۔

[۳] وشنو دیوتا کا نام ہے۔ "جل کنول" اُن کی بیوی ہے۔

بڑی ہے اس لئے کہ دیوی ہو کر اُس نے ایک آدم زاد کی طرفداری کی ہے اور وہ بھی دیوتاؤں کے مقابلہ میں۔ صرف اِس وجہ سے کہ وہ اُس کے گُن گاتا ہے۔"

"جل کنول" نے اپنی حسین آنکھوں کے دراز کناروں سے دیوتاؤں کی طرف دیکھتے ہوئے ایک طویل قہقہہ لگایا اور کہا: "اگر اپنے پجاری کی مَیں نے کوئی مدد کی ہے۔ تو مجھے یقین ہے کہ مَیں نے کوئی پاپ نہیں کیا تم لوگوں نے بھی متعدد مرتبہ ایسا کیا ہے۔ اگر ہم دھرتی کے ان باسیوں کے ساتھ غصّہ سے پیش آیا کریں اور انکی خبر نہ لیں تو وہ ہمیں چھوڑ دینگے اور ہماری تنہائی پر ہنسیں گے اور تب ایکدن وہ آئیگا کہ سارے سنسار میں ہمارا نام جپنے والا کوئی نظر نہ آئیگا اِس لئے صرف مَیں ہی نہیں بلکہ اُسے تنہا چھوڑ دینے کا الزام تم سب پر ہے۔ علاوہ اس کے وہ غلطی پر نہیں کیونکہ وہ میری شکتی اور میری خدائی کو سب سے زیادہ طاقتور سمجھتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔"

"جل کنول" کے یہ الفاظ سُنکر سارے دیوتا جل گئے۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ وہ غلطی پر ہے اور اُسے اسکی سزا ملنی چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اندر دیوتا بھیس بدل کر زمین پر اُتریں اور تلاش کر کے اُسے سمجھائیں لیکن چالاک "جل کنول" نے خود ہی کہا: "اب مَیں تمام دیوتاؤں اور خصوصاً اندر کو دکھاؤنگی کہ قسمت اور حُسن دونوں ایکدوسرے کے دُشمن ہیں اور دیوتا بھی ان پر قابو نہیں پا سکتے۔" تب اُس نے مکر کیا اور ایک فریب آمیز تبسّم کے ساتھ دیوتاؤں سے کہا: "جب غلطی ہو گئی ہے تو مجرم کو چاہیئے کہ وہ اسکی تلافی کرے۔ اندر دیوتا ضرور دھرتی پر جائیں مَیں خود آپ لوگوں کی مدد کرونگی اور اپنا انعام اُس سے چھین لونگی یعنی راجہ کو یہ بتا دونگی کہ اُس کی بیٹی اور رانگا کہاں پوشیدہ ہیں۔"

دیوتا خوش ہو گئے کیونکہ دیوی اپنے کئے پر نادم ہو رہی تھی۔ انہوں نے آپس میں کہا "وہ جوان ہے اس لئے ناتجربہ کار ہے تاہم وہ ایک عورت ہے، اور یقیناً وہ اُس گستاخ کے حُسن اور خوشامد سے اپنے فرائض بھول گئی تھی لیکن اب اُس نے اپنا خیال بدل دیا ہے جو اُسی سمندر کی موجوں کی طرح متزلزل تھا جس میں وہ رہتی ہے۔ اِس لئے اب ہمیں اپنا دِل اُس کی طرف سے صاف کر لینا چاہیئے۔"

(۴)

دیوتا اور انسان

سُہاگ رات بسر ہو گئی اور دونوں پریمی اپنے گھاس پھُوس کے بستر سے اُٹھے جسے "جل کنول" نے امرت سے زیادہ میٹھا اور شاہی بطوں کے پروں سے زیادہ نرم بنا دیا تھا۔ تب دیوی کی ترغیب سے "جنگلی پھُول" نے اپنے شوہر سے کہا "پتی مہاراج! ہم سو سکتے ہیں لیکن اس سوکھی گھاس اور تنکوں کے بستر پر دن کیسے گزارا جا سکتا ہے اور اب تمہیں کچھ دیر کیلئے مجھے چھوڑنا پڑیگا۔"

پھر اُس نے لعل و یاقوت سے بنا ہوا ایک جڑاؤ کنگن دیتے ہوئے کہا۔

"لو اسے شہر میں بیچکر کچھ کھانے کے لئے لاؤ اور دیکھو ایک بانسری بھی لیتے آنا لیکن جس قدر جلد ممکن ہو واپس آؤ کیونکہ مَیں تمہیں زیادہ دیر کیلئے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں کر سکتی۔ مگر کوئی خطرہ یا گھبرانے کی بات نہیں ہے، اِس لئے کہ تمہیں کسی نے مجھے یہاں لاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جبتک تم نہ آؤگے اِس سنسان بن میں بیٹھ کر مَیں تمہارا انتظار کرونگی اور جس راستہ سے تم پلٹنے والے ہو اُس طرف سے نظریں پل بھر کے لئے بھی نہ ہٹیں گی۔"

رانگا نے کہا "مَیں تجھے ایک پل کیلئے بھی چھوڑنا گوارا نہیں کر سکتا لیکن گایوں کی طرح پتے کھا کر بھی ہم جی نہیں سکتے۔ مجھے کھانا لانا ہی ہوگا اور مَیں تجھے ساتھ لے جا بھی نہیں سکتا۔" پھر وہ کنگن لیکر یہ کہتا ہوا شہر کی طرف چل دیا: "مَیں جانیسے پہلے ہی تیرے پاس پہنچ جاؤنگا۔"

جب وہ چلا گیا تو جنگلی پھُول نے اپنے دِل میں کہا: "اب مَیں اپنا بناؤ سنگار کروں گی ــــ اُس سہاگن کی طرح جس کا پتی ایک عرصہ کے بعد پردیس سے واپس آیا ہو۔" اور اُس نے اپنے کپڑوں کی پوٹلی میں سے سب سے بہتر جوڑا پسند کیا۔ پھر چشمے میں غسل کیا اور اُسی سے آئینہ کا کام لیکر بالوں کو سنوارا جب بن سنور چکی تو شفاف پانی میں اپنا دمکتا ہوا مکھڑا دیکھ کر اپنے آپ سے کہنے لگی۔ "اب وہ مجھے دیکھے گا تو بہت خوش ہوگا اور مَیں اُس کے مسرور چہرے کو دیکھ کر خوش ہونگی۔" بھولی رانی کو کیا معلوم تھا کہ "جل کنول" اُسے بننے سنورنے کی ترغیب دیکر اُس کے حُسن کو حسین ترین بنا رہی تھی اُس کے شوہر کیلئے نہیں بلکہ کسی اور کے لئے۔ جب وہ نکھرنے سے فراغت پا چکی تو برگد کے سائے تلے بیٹھ گئی جو چشمے کے قریب کھڑا لہلہا رہا تھا اور اُس راہ کی طرف نظریں جما دیں جس طرف سے اُس کا رانگا آنے والا تھا۔

عین اُس وقت جب "جل کنول" کی تدبیر سے رانگا دُور شہر میں تھا اور جنگلی پھُول اپنے بے پناہ سنگار کے ساتھ مصروفِ انتظار تھی اندر دیوتا زمین پر اُترے اور ایک بوڑھے برہمن کے رُوپ میں اُس ویران بستی کی طرف چلے جہاں دونوں پریمیوں نے رات بسر کی تھی۔ "جنگلی پھُول" نے دُور سے اُسے آتے دیکھا اور دل میں کہا۔ "کوئی بوڑھا برہمن معلوم ہوتا ہے۔ مجھے اِس سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔" یہ سوچکر وہ اُسی جگہ برگد کے ٹھنڈے سائے میں اُبلتے ہوئے چشمے کے پاس بیٹھی رہی۔ بوڑھا برہمن قریب آ گیا اور جب وہ قریب پہنچا تو اُس نے "جنگلی پھُول" کو دیکھا۔ وہ اُسی طرح بیٹھی تھی۔ برہمن اُسکی خوبصورتی کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ "جل کنول" نے

اُسے حیران کرنے کیلئے "جنگلی پھول" میں اپنا حُسن سمو دیا ہے دیوی اُس کے حُسن کو آرائش کار بنانا چاہتی تھی کیونکہ اُس کے خوبصورت تناسب اعضا کچھ تو نظر آرہے تھے اور کچھ روپہلی پوشاک تہوں اور شکنوں میں چھپے ہوئے ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے گنگاوتری کی آبشار سے اُٹھتی ہوئی چاندی کی کُہر ان چٹانوں کو چھپاتی اور دکھاتی ہے جن پر پانی گرتا ہے۔ پاؤں ننگے تھے جن میں ایک نازنی پازیب تھا اور سونے کی بڑی بڑی چوڑیاں اُس کے چھوٹے ہاتھ کو اور چھوٹا بنا رہی تھیں۔ جڑاؤ بازو بند جو ٹھیک کہنی کے اوپر بندھے تھے اُس کے گداز بازوؤں کو اور سڈول ظاہر کر رہے تھے۔ گلے میں ہیروں کی قیمتی مالا اور سیاہ بالوں کے نشیب میں ایک بڑا سبز زمرد چمک رہا تھا۔ "جنگلی پھول" نے جب گردن میں ایک لطیف سا خم دے کر اپنی دراز مژگاں اُٹھاتے ہوئے اُسے دیکھا تو دیوتا کے جذبات میں ایک طوفان سا اُٹھا اور اُس کے دل کا زہد و تقدس جاتا رہا۔ اور اُس نے خود سے کہا "یہ فانی عورت میرے دربار کی کنواریوں سے کتنی زیادہ حسین ہے تعجب ہے کہ "جل کنول" اس کے حُسن کو دیکھ کر رشک سے مر کیوں نہ گئی" پھر "جنگلی پھول" سے مخاطب ہو کر بولا "خوبصورت آنکھ والی عورت! کیا تو ناانگاہی کی بیوی ہے جس سے میں ملنے آیا ہوں"۔

"جنگلی پھول" نے جواب دیا "ٹھیک ہے میں اُسی کی بیوی ہوں لیکن حیرت ہے تجھے اس قدر جلد یہ بات کیسے معلوم ہو گئی کیونکہ کل تک میں کنیا تھی سہاگن نہ تھی اور گذشتہ رات میرے سہاگ کی رات تھی"۔

اندر نے کہا "اے نازِ سراپا! عبادت کی شکتی سے یہ تمام باتیں معلوم کی جا سکتی ہیں۔ اور منہ کو دیکھ کر یہ بات جان لینا تو بہت آسان ہے کہ تو کل ہی سہاگن بنی ہے کیونکہ تیری کنول جیسی آنکھیں ایک نئی چمک اور ایک عجیب سکون سے معمور ہیں۔ کنواری عورتوں کی طرح نہ تو انہیں ہراس ہے نہ خوف"۔

"جنگلی پھول" بولی "برہمن! اگر تو میرے پتی سے ملنے آیا ہے تو سُن وہ کسی کام سے باہر گئے ہوئے ہیں اور میں اُسکی واپسی کا انتظار کر رہی ہوں ایک شریف گھرانے کی عورت کا کسی اجنبی سے باتیں کرنا اچھا نہیں اسلئے میں تجھ سے التجا کرتی ہوں کہ یہاں سے جلد جا پھر کسی وقت آنا"۔

اندر نے کہا "چندر مکھ کے رُوپ والی موہنی! بڑھاپا عُمر کا سب سے بُرا حصہ ہے اس لئے کہ یہ گناہوں سے بھرا رہتا ہے۔ جیون کے اس دَور کو گزارنا بہت مشکل ہے لیکن اس میں کچھ فائدے بھی ہیں مثلاً ایک بوڑھا شخص بغیر کسی ناجائز خیال کو دل میں جگہ دیئے ایک غیر عورت سے بات کر سکتا ہے کیونکہ جب آگ ہی بجھ گئی تو ایندھن سے کیا ڈر۔ اور تیرے سِن کا لحاظ کرتے ہوئے میں تیرے باپ کے برابر ہوں اور اگر میری عُمر تجھ سے صرف دوگنی ہی ہوتی تب بھی کیا تھا۔ اِس لئے اب جبکہ خوش قسمتی سے تیرے شوہر کے بجائے تو خود مجھے مِل گئی ہے تو میں اِس موقع سے فائدہ اُٹھا کر اسکی غیر موجودگی میں تجھ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ آخر تجھے ایک دیوتاؤں کے ٹھکرائے ہوئے شخص سے بیاہ کرنے کے لئے کس شیطانی جذبے نے اُبھارا تھا۔ اُن کے انتقام کی آگ اچانک تجھ پر مصیبت بنکر نازل ہو گی کیونکہ دیوتا جب کسی سے ناراض ہوتے ہیں تو اُسے سزا دے کر ہی چھوڑتے ہیں اِس لئے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ اب جبکہ موقع بھی ہے اور تیرا شوہر بھی موجود نہیں تو اپنے کئے پر نادم ہو کر اُسے اُسکے بھاگ پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لے تجھے اپنا جیون پیارا ہے تو ایسے پاپی سے اپنا رشتہ توڑ کر اپنے باپ کے گھر واپس چلی جا جہاں سے وہ تجھے چُرا لایا ہے۔

(۵)

مردکا نصف دیگر

"جنگلی پھول" سُنتی رہی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ برہمن اُس سے اُس کے شوہر کو چھین لینا چاہتا ہے۔ اُس نے اپنے دِل میں کہا "یہ کون ہے جو ہمارے متعلق سب کچھ جانتا ہے۔ کیا یہ میرے باپ کا بھیجا ہوا کوئی جاسوس ہے جو مجھے صُورت سے پہچانتا ہے؟ یا برہمن کے رُوپ میں یہ کوئی دیوتا ہے جو میرے پتی سے انتقام لینے کیلئے آکاش سے دھرتی پر اُتر آیا ہے؟ ایسی باتیں ہمیشہ سُننے میں آتی ہیں"۔ پھر اُسکی طرف نگاہوں کو اُٹھا کر بولی "برہمن! تیرا مشورہ مجھے پسند نہیں پتنی اپنے پتی سے الگ ہو کر کبھی سُکھی نہیں ہو سکتی اور میں اپنے شوہر کو کیسے چھوڑ سکتی ہوں جس کیلئے میں نے اپنے ماتا پتا کو چھوڑ دیا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا یہ ساری باتیں تجھے کیسے معلوم ہوئیں تاوقتیکہ تو کوئی دیوتا نہ ہو۔ لیکن اگر تو وہی دیوتا ہو تا رہے اگر تو سچ کہہ رہا ہے) میرے پتی نے صلواتیں سُنائی تھیں تو میں تجھ سے کہونگی کہ اُس نے ایک ایسے دیوتا کی حقارت کر کے بڑا اچھا کام کیا جو خود بُرائیوں اور گناہوں میں گھِرا ہوا ہے اور جو ایک بھولی بھالی پتنی کو اُس کے دھرم کے خلاف پتی سے جُدا ہونے کی ترغیب دے رہا ہے۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ ایک دھرم پتنی کیلئے اُس کا شوہر دیوتا ہوتا ہے اور اگر ایسا ہی ہے جیسا کہ تو کہتا ہے کہ میرے شوہر نے اپنے دیوتاؤں کو بُرے ناموں سے یاد کر کے پاپ کیا ہے تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ میں اُسکی خطاؤں کو معاف کر دوں جو میرا ہے؟"

تب اندر نے کہا "اے محبت کی ماری بدقسمت عورت! افسوس کیا تو ایک دیوتاؤں کے ٹھکرائے ہوئے مجرم کا ہاتھ تھام کر اپنے خداؤں سے

مخالفت مول لینے پر تیار ہو گئی ہے؟ کیا تو نہیں جانتی کہ مجرم کی مدد کرنے والا خود مجرم ہوتا ہے؟ یاد رکھ خداؤں کی مخالفت کر کے تو انکی توہین کر رہی ہے۔"

"جنگلی پھول" بولی "میرے پتی کے سوا اور میرا کوئی دیوتا نہیں اور میں بغیر کسی سبب اور بغیر کسی سوال کے اُس کے پیچھے پیچھے جاؤں گی جیسے رات کے پیچھے دن۔ خواہ میں غلط راستہ ہی پر کیوں نہ چل رہی ہوں لیکن یہ استری کا دھرم ہے جو ازل سے چلا آرہا ہے اور جو عورت کی فطرت اور اُسکی رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے کیونکہ ایک وقت وہ بھی تھا جب نہ کوئی عورت تھی اور نہ کوئی مرد۔ صرف سنسار تھا۔ اور ایکدن جبکہ دیوتائے اعظم مزید تخلیق کیلئے سر جھکائے خیالات میں مستغرق تھا اُس نے اپنے آپ سے کہا "میری بنائی ہوئی موجودات کی تکمیل کیلئے کسی چیز کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ یہ اندھی ہے۔ ابھی یہ اپنی بہار اور اپنے حسن کی نمائش سے ناآشنا ہے۔ پھر اُس نے مرد کی تخلیق کی۔ اُسے پیدا کر کے دیوتائے اعظم حیران و پریشان ہوا کیونکہ وہ دنیا کا پہلا مرد مجسم حیرت و حسن بنکر سنسار میں اکیلا پھرنے لگا۔ آخر پھولوں، درختوں اور جانوروں میں گھومتا ہوا وہ ایک چشمے پر آیا اور جب اُس نے وہاں اپنا عکس دیکھا تو اُسے اپنی صورت نظر آئی۔ تب وہ حیرت سے چلا اُٹھا۔ "یہ خدا کی سب سے بہتر اور سب سے خوبصورت مخلوق ہے" پھر اسکی تلاش میں اُس نے سنسار کا کونا کونا چھان مارا۔ اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ خود اپنی تلاش کر رہا تھا اور جب پیہم کوششوں کے بعد اُسے یہ معلوم ہوا کہ وہ "تخلیق" بجز چشمے کی سطح کے اور کہیں نظر نہیں آتی تو وہ مایوس ہو گیا۔ دیوتائے اعظم نے اسکی افسردگی دیکھی اور اپنے دل میں کہا "اس مشکل کے متعلق تو میں نے پہلے غور ہی نہیں کیا جو میری "تخلیق" میں خود بخود پیدا ہو گئی ہے لیکن اب کیا کرنا چاہیئے جس مرد کو پیدا کر کے میں اپنی دنیا کا آئینہ بنانا چاہتا تھا وہ اپنے حسن کے آئینہ میں خود پھنس گیا۔ اب مجھے کسی نہ کسی طرح اس مشکل کو آسان کرنا ہوگا لیکن میں دوسرے مرد کی تخلیق نہیں کر سکتا کیونکہ اس صورت میں دنیا کے محیط کے دو مرکز ہو جائیں گے اور نہ ہی میں قدرت کے اس محیط میں کچھ اضافہ کر سکتا ہوں کیونکہ وہ بجائے خود مکمل ہے اس لئے اب کسی ایسی تخلیق کی ضرورت ہے جو "اصل" نہ ہو کیونکہ وہ دنیا کا توازن درہم برہم کر دے گی اور "بے اصل" بھی نہ ہو کیونکہ وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ لہٰذا میری یہ "تخلیق" وجود اور عدم وجود کے بین بین ایک ہستی ہوگی وہ ایک ایسا سایہ ہوگی جس کا کوئی اصل نہ ہوگا۔ اس لئے سنسار کے پیدا کرنے والے نے چشموں کی سطح پر سے کرنوں کو جمع کر کے اُس سے ایک مخلوق پیدا کی۔ دستِ قدرت کی یہ انوکھی تخلیق عورت تھی لیکن جیسے ہی وہ وجود میں آئی رونے لگی اور سسکتی ہوئی بولی "افسوس! افسوس! میں ہوں بھی اور نہیں بھی"۔ تب خدا نے کہا۔

"اے بیوقوف درمیانہ مخلوق! جب تو اکیلی ہو تو تیرا وجود عدم وجود کے برابر ہے اور جب مرد کے ساتھ ملے تو اُس کے وجود کا ایک جزو ہو گی، اور اسی طرح اے برہمن شوہر سے جُدا ہو کر عورت عورت نہیں رہتی اس کا وجود جیسے بغیر اصل کے سایہ جیسے فریب آئینہ کی منعکس کرن ——!!"

(۶)

خودرو پھول

تب اندر نے کہا "اے نازک کلائیوں والی عورت تو بیویوں کے عام فرائض سے اچھی بحث کرتی ہے لیکن یہ استدلال تیرے اپنے حالات کی تائید نہیں کرتے خصوصاً جب کہ تو نے ایک پاپی کو اپنا جیون ساتھی بنا لیا ہے افسوس! تو نے اپنے کنوارے حسن کی کلیوں کو ایک ایسی قربان گاہ پر چڑھایا جو تیرے پھول کے لائق نہ تھی اور رانی کے مرتبہ کو چھوڑ کر ایک ایسے خانہ بدوش کی بیوی بنگئی جو ہرگز تیرے درجہ کا نہ تھا۔

"جنگلی پھول" بولی "اے برہمن ہر پھول دیر یا سویر مرجھانے والا ہے کیونکہ اُسے اسی لئے پیدا کیا گیا ہے اور یہی اس کے آغاز کا انجام ہے اُسے ایکدن مرجھا کر ضرور فنا ہونا ہے خواہ وہ عالیشان محل میں کسی رانی کے سر کی زینت ہو یا بن کی سنسان کھائیوں میں کہیں تنہا پڑا ہو اور کون نہیں کہے گا کہ پھول کیلئے بن میں مرجھا کر فنا ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی رانی کے گلے کا ہار ہو۔ اس لئے اب اگر میں نے اپنے شاہی محل کو ٹھکرا دیا ہے اور خود جنگل کی تنہائیوں میں اپنے پتی کے ساتھ آگئی ہوں تو اس میں کونسی قباحت اور بُرائی ہے۔ کیا تجھے اچھی طرح یقین ہے کہ پھول کی طرح جنگل میں بکھر کر مرجھانے میں میرا فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہے کیونکہ کہتے ہیں کہ ایک راجہ تھا جو اپنی بیوی کے فریب کا شکار ہو گیا تھا اس غم میں اس نے اپنی ریاست چھوڑ دی جیسے سانپ اپنی پرانی کینچلی کو چھوڑ دیتا ہے وہ اپنا تمام مال و زر گھاس کی طرح لٹا کر آخر دنیا سے کنارہ کش ہو گیا پھر اُس نے گنگا کا رخ نہیں کیا بلکہ دور بہت دور جنوب کے بڑے وسیع جنگلوں کی طرف چلا کیونکہ وہ اب نہ تو انسان کی صورت دیکھنا چاہتا تھا اور نہ انسان کی آواز سننا چاہتا تھا۔ وہ خوفناک جنگلوں کی گہرائیوں میں بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ گھنے پیڑوں کے درمیان وہ اپنے سائے کے ساتھ خود کو بالکل تنہا محسوس کرنے لگا تب جاکر درختوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور راجہ نے خود کو ایک بڑی جھیل کے کنارے کھڑا ہوا پایا جس کا پانی تاحدِ نظر نیلے کنول کے پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ہر کنول پر ایک سنہرا بھونرا اپنی بھنبھناہٹ سے پریم کے میٹھے راگ الاپ رہا تھا جیسے گوپیوں کے درمیان کرشن مراری۔ گویا ہر پھول خود کو تنہا مرکزِ محبت سمجھ رہا تھا۔ راجہ کی نظریں چندھیا سی گئیں۔ نیلے کنولوں کا

دلفریب منظر، بھونروں کے تانوں جیسی گنگناتی ناری اسکی روح پر کیف بن کر چھا گئی۔ پھر وہ جبتک زندہ رہا وہیں رہا۔ اور اگر خدا ان خوبصورت نیلے کنول کے پھولوں کو جنگل کی گھنی دیواروں کے اندر پیدا کرتا اور بغیر کسی آنکھ کے دیکھے ان کو فنا کر دیتا تو میں کہتی ہوں کہ یقیناً وہ پھول ان کنول کے پھولوں سے بہت بہتر ہیں جو رانیوں اور راجکماریوں کے بالوں میں مرجھا جاتے ہیں۔ علاوہ اس کے جہاں میرا شوہر ہے وہاں میں تنہا نہیں کیونکہ اس کے سوا اور میں کسی چیز کو نہیں جانتی۔

(۷)

اگلے جنم سے

تب اندر نے کہا "اے کالے بالوں والی عورت! تو اپنے شوہر کے متعلق یوں گفتگو کرتی ہے گویا تو اسے اپنے جنم دن سے جانتی ہے۔ حالانکہ تم نے اپنی زندگی میں کل رات پہلی مرتبہ اسے دیکھا ہے۔ پھر تو یہ کیسے کہہ سکتی ہے کہ وہ تیری آتما کو سکھ اور شانتی میں رنگ دیگا اور کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ تجھ سے بہت جلد بیزار ہو جائے اور تجھے بے پروائی کے ساتھ ٹھکرا دے کیونکہ وہ پھر بھی ایک اجنبی ہے جس کی ملاقات تجھ سے اتفاقیہ ہو گئی ہے۔"

"جنگلی پھول" نے جواب دیا "برہمن! تو صرف مجھے بہکانے کے لئے ایسی باتیں کر رہا ہے یا تو کوئی ایسا پنڈت ہے جو دنیاوی لذات اور نفسانی خواہشات کا شکار ہو گیا ہے۔ تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر عورت خوش قسمتی سے بیاہ سے پہلے اپنے پتی کو دیکھ سکے تو وہ صرف پہلی ہی نظر میں یقین کے ساتھ جان لیتی ہے کہ وہ اس کا جیون ساتھی بننے کے قابل ہے یا نہیں کیونکہ انسان کی چند خاص اشیاء کا انحصار روزمرہ زندگی کے مشاہدات و تجربات پر نہیں بلکہ پہلے جنم کے دھندلے نقوش پر ہے جو کہ رہبری کرتے ہیں اور وقت کی چند خاص گھڑیاں ایسی بھی ہیں جو وجوہ و نتائج کی حامل ہوتی ہیں اور ان کا سلسلہ ایک طرف تو ازل اور دوسری طرف ابد تک پہنچتا ہے ان میں سے ایک تو بیج ہے اور دوسرا اس کا پھل۔ اور بعض اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ آنکھ کی ایک جھپک بھی روح کی قسمت کا فیصلہ کر دیتی ہے اور یہی میرا معاملہ تھا جب سے میں نے اپنے پتی کو دیکھا ہے میں وہ نہیں رہی جو پہلے تھی اور روحی ملاپ کی مدیرا میری رگ رگ میں دوڑ رہی ہے۔ کیا سنسار کے پیدا کرنے والے نے ہر شے کی سرشت میں خواہ وہ نامیاتی ہو یا غیر نامیاتی برائیاں اور اچھائیاں جمع نہیں کر دی ہیں جو انکی قسمت کا آئینہ ہوتی ہیں اور جن پر نہ تو قابو ہی پایا جا سکتا ہے اور نہ ہی انکی تعمیل سے انکار۔ جیسے ایک مگھیا عورت تھی جس نے اپنے من کے خلاف مجبوراً ایک راجہ سے بیاہ کر لیا تھا اور جب یہ بندھن ہو گیا تو نفرت اور حقارت نے اس کے دل میں گھر کر لیا۔ اور راجہ جب کبھی اس کے قریب جاتا تو وہ بیہوش ہو جاتی اور اس پر موت کی سی غشی طاری ہو جاتی۔ راجہ بہت حیران و پریشان ہوا اس لئے کہ اس کے قریب وہ جا نہ سکتا تھا۔ اس نے اپنے دل میں کہا "اس غیر معمولی نفرت کا کوئی خاص سبب ہے جو ماضی کی گہری تاریکیوں میں مدفون ہے کیونکہ دوسری تمام عورتیں میرا حسن دیکھ کر میری باہوں میں آنے کیلئے بیتاب ہو جاتی ہیں اور میری خاطر ابھیساریکا[1] بن جاتی ہیں" چنانچہ وہ مہیشور کے مندر میں گیا پھول چڑھاتے اور مورت کے آگے کھڑا ہو کر کہنے لگا "اے ماضی، حال اور مستقبل کے جاننے والے اگر تو مجھے اس نفرت کا سبب مجھ پر ظاہر کریگا تو میں اسی وقت اپنا گلا کاٹ کے جان دیدوں گا۔" تب دیوتا کی مورت نے ایک طویل قہقہہ لگایا اور کہا۔

"اے بیوقوف راجہ! یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ سُن بہت دن ہوئے پہلے جنموں میں تو اور وہ دونوں ایک بڑے گناہ کے مرتکب ہوئے اور اس لئے حیوانوں کے روپ میں تحویل کر دیئے گئے۔ وہ سانپ بنگئی اور تو مور۔ اسے اپنے مقابل میں تیرے مور بنجانے کا اعزاز بہت ناگوار ہوا وہ یہ سہن نہ کر سکتی تھی اور اس لئے تجھ سے رشک اور نفرت کرنے لگی اور تو بھی اسے حقارت کی نظر سے دیکھنے لگا۔" راجہ نے پوچھا، "لیکن میرے دل میں اسکی طرف سے نفرت کیوں پیدا نہیں ہوتی؟" دیوتا نے کہا "اس لئے کہ اس کے بعد کے جنم میں تو گرودا کی نسل سے ایک پرندہ تھا جو سانپوں کو کھاتا ہے علاوہ اس کے محبت و نفرت کے نقوش مرد سے زیادہ عورت کے دل میں بہت گہرے رہتے ہیں۔ کیونکہ جذبہ ان کی روح کا نچوڑ ہے اور یہ چشمہ ہمیشہ ان کے دل کی گہرائیوں سے ابلتا رہتا ہے" راجہ جب اس حقیقت سے آگاہ ہوا تو اپنی رانی کو چھوڑ دیا اور دوسری شادی کر لی۔ اور اسی طرح اے برہمن میں پہلی ہی نظر میں اپنے شوہر کیطرف اس طرح کھچی چلی گئی جیسے کہربا گھاس کو اپنی طرف کھینچتا ہے گویا میں اور وہ پہلے جنم میں بھی پتی اور پتنی تھے اور اب اس جنم میں بھی میں نے اسی کو اپنا جیون ساتھی بنا لیا ہے۔"

(۸)

حسن کا فریب

تب اندر نے کہا "اے بڑی آنکھوں اور دراز مژگاں والی عورت!

---

[1] ابھیساریکا سنسکرت میں ایسی عورت کو کہتے ہیں جو بغیر کچھ سوچے سمجھے خود کو اپنے چاہنے والے کے حوالے کر دیتی ہے۔

تو ایک نامنصف کی طرح اپنے ہی بیان کی تائید میں گفتگو کرتی ہے لیکن تیرا یہ عمل ایک فوری جذبہ کا نتیجہ ہے تیری دوشیزیت کی حیا کو چھین لیا ہے اور تو ابھیساریکا کی طرح بغیر سوچ وچار کئے خود کو اُسکے چرنوں میں گرائے دے رہی ہے۔ تجھ میں شریف گھرانے کی عورت کا جذبہ نہیں۔ تو اپنی رائے اور اپنی خود غرضی سے اپنے شوہر کے حُسن کی پجاری بن گئی ہے۔

"جنگلی پھول" بولی۔ "اے برہمن! اپنے ذات کی دوشیزاؤں کی طرح میں نے کوئی پاپ نہیں کیا ہے کیونکہ راجکماریوں کو ہمیشہ سے یہ حق حاصل رہا ہے کہ وہ اپنے شوہروں کا خود انتخاب کر لیں، بلکہ وہ اپنی خاندانی شرافت اس طرح بتاتی ہیں کہ ایکبار جسے اپنا جیون ساتھی بنا لیا پھر اس کا دامن تک نہ چھوڑا۔ اور جیسا کہ تیرا خیال ہے اگر شوہر کے حُسن سے متاثر ہو کر میں نے یہ غلطی کی ہے تو اس کا دوش مجھ پر نہیں بلکہ پیدا کرنیوالے پر ہے کیا تو شہد کی مکھیوں کو موہ لینے کا الزام کنول پر لگا سکتا ہے۔ اور کیا خدا نے عورت اور مرد کو صرف اس لئے حُسن نہیں دیا ہے کہ وہ ایکدوسرے کے جمال میں پھنس جائیں؟ اور خود دیوتا بھی تیری اس ملامت میں آجاتے ہیں کیونکہ ان میں سے کوئی ایسا نہیں جو اپنی بیوی کے حُسن کا پرستار نہو؟ بلکہ ان میں بعض ایسے ہیں جو اس حد سے بھی بڑھ کر دُوسری ذات والوں کے حُسن سے متاثر ہو گئے ہیں۔ پھر تو مجھے عورت کی فطرت کے خلاف کیوں تہمت لگاتا ہے اور ایک مرد کے حُسن کی توجہ سے کیوں روکتا ہے جو میری تخلیق کا مقصد حقیقی ہے۔ کیونکہ تینوں عالم صرف میری حرکت کا آئینہ ہیں اور تیرا یہ دعویٰ اس حرکت اور زندگی کسک کو چھین لیگا جو صرف باہمی اتحاد پر قائم ہے کیونکہ حُسن اپنی سحر سے آنکھوں کو چوندھیا دیتا ہے اور چونکہ یہ صرف ایک فریب ہے، اس لئے بانسری کی سُریلی آواز کی طرح ہر چیز کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور آخر کار اُس بے معنی لیکن خوش آیند عشرت گاہ پہنچا دیتا، جس کو عقلمند دُنیا کہتے ہیں اور جو بغیر کسی علت فانی کے سپنے کی طرح فنا ہو جائیگی اور ہم سب ایک نہ ختم ہونیوالے چکر میں حرکت کر رہے ہیں جیسے کسی آبشار میں پانی کے قطرے جو دیکھنے والے کی آنکھ میں دوام کا نقش پیدا کر کے تھم ہوئے غائب ہو جاتے ہیں لیکن کیا یہ دوام بھی ایک فریب نہیں جو اپنے دائمی بہاؤ اور تند و تیز بھاگتے ہوئے جوہروں کے ذریعہ سے مکر کا دام پھیلاتا ہے۔ اور ہماری روزمرہ زندگی میں ایک چیز بہت ضروری ہے وہ پریم کی مدیرا کا چکھنا ہے اور یہ ہر ذرے کیلئے ممکن ہے بشرطیکہ اُسکی نظروں کے سامنے وہ خاص حُسن آئے جو اُسکی رُوح کا موضوع ہے۔ اس لئے اے برہمن مجھے اپنے پتی کے حُسن کی پوجا کرنے میں کوئی [illegible] خاص اعزاز اور ایک خاص مسرت محسوس کرتی ہوں مانو جیسے کوئی اپنی جیون کا مقصد پا کر خوش ہوتا ہے یا جیسے پروانہ دیئے پر اپنی خوشی سے گرتا ہے اور جان دیدیتا ہے اور اس انتخاب کی وجہ سے جو نتائج اور نقصانات بھی پیش آئیں میں برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ اور پوجا کے سمے جب میں اپنے دیوتا کے چرنوں میں کھڑی ڈگمگاؤں گی اُس وقت اے برہمن تیری غلط بیانی کا بھرم کھل جائیگا۔"

(۹)

دُو راجے

تب نارد نے کہا "کمزور آواز والی عورت! عورت کب اپنے پریمی کے غلط برتاؤ کے متعلق عذر لنگ کرنے سے چوکتی ہے؟ یقیناً تیری فراست تیرے ہمجنسوں میں سے کسی سے بھی کم نہیں پھر بھی جو کچھ تو کہنا اور کرنا چاہتی ہے اس معاملہ میں تیرا باپ تیری رائے سے اتفاق نہیں کریگا۔ اُسے تیری اِس کمینگاہ کی خبر ہو گئی تو تیرا اور تیرے شوہر کی اس جلد بازی کا بہت بُرا انجام ہوگا۔"

"جنگلی پھول" نے کہا "برہمن! تیرا یہ کہنا ٹھیک ہے، ممکن ہے کہ فوری غصے میں میرا باپ ہم پر کوئی آفت ڈھا دے لیکن سمے وقت بتا دے گا کہ تو غلطی پر تھا۔ اِس لئے کہ کچھ دن کے سوچ وچار کے بعد ضرور راجا ہم دونوں کو معاف کر دیگا۔ یا جو کچھ بھی وہ چاہے کرے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا کیونکہ میرے شوہر کو وہ زندہ رکھے یا مار ڈالے کسی صورت میں بھی ہمارا ساتھ نہیں چھوٹ سکتا اور نہ ہی وہ مجھے میرے حقوق سے محروم کر سکتا ہے خواہ میں اُس کے حکم کی تعمیل کروں یا نہ کروں کیونکہ پتنی پر باپ کا نہیں شوہر کا حق ہوتا ہے وہ رہتے ہیں تو ایک ساتھ رہتے ہیں اور مرتے ہیں تو بھی ایک ہی ساتھ مرتے ہیں موت کوئی بری چیز نہیں صرف ایک تبدیلی کا نام ہے اور اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ یہ زندگیوں کو ختم کرنے کے بجائے انہیں سکھی بناتی ہے جیسے کہتے ہیں ہایا اور گاجا دو راجے ایکدوسرے کے بڑے دشمن تھے۔ گاجا نے ہایا پر چڑھائی کی اور اُس کے بیٹے کو قتل کر کے اُسکی بیویوں اور راجہ کو بھگا کر اُسکی راجدھانی پر قبضہ کر لیا۔ جب ہایا کو بالکل شکست ہو گئی تو وہ بھیس بدل کر گاجا کے مُلازموں میں داخل ہو گیا۔ ہایا، گاجا سے انتقام لینے کے لئے کسی مناسب موقع کا منتظر تھا اسی درمیان میں ایک تیسرے راجہ نے اسکی سلطنت پر چڑھائی کی اور فوج کی شکست کے بعد گاجا زخمی ہو کر ریگستان کو بھاگ نکلا۔ اس حالت میں اُس کے ساتھ صرف ہایا تھا۔ گاجا چاہتا تھا کہ وہ ریگستان کو عبور کر کے اپنی راجدھانی میں پہنچ جائے۔ وہ دونوں مل کر ریگستان کو عبور کر رہے تھے

اور چونکہ پانی کی صرف ایک ہی چھاگل تھی اس لئے گھوڑوں کو پانی نہ دیا جا سکا جو پیاس سے مر گئے۔ اور انہیں پیدل اپنے سفر کو جاری رکھنا پڑا۔ تب گاجا نے ہایا سے کہا: "چھاگل میں مشکل اتنا پانی ہے کہ ایک آدمی ریگستان کو عبور کر سکے اس لئے ہمارا انجام ظاہر ہے۔" وہ چلتے گئے اور رفتہ رفتہ پانی ختم ہوتا گیا۔ چھاگل ہایا کے پاس تھی اور ایک رات جب گاجا ریت پر سو رہا تھا ہایا کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اس نے پانی کی چھاگل کی طرف دیکھا اور کہا "صرف ایک آدمی اس پانی کی مدد سے ریگستان کو عبور کر سکتا ہے۔ اس وقت میرا دشمن میرے سامنے پڑا سو رہا ہے۔" اسی کشمکش و پیچ میں وہ ننگی تلوار ہاتھ میں لئے تنہا خاموش ریگستان کے چمکتے ہوئے ستاروں کے نیچے گاجا کو بیٹھا دیکھتا رہا اور جب صبح ہوئی تو ان دونوں نے مل کر پھر سفر شروع کیا۔ جوں جوں آفتاب کی تمازت تیز ہوتی گئی زخموں کی وجہ سے گاجا کی حالت خراب ہوتی گئی اور اس نے ہایا سے کہا "ہمیں پانی پی لینا چاہئے خواہ ہم مر ہی کیوں نہ جائیں۔" پس دونوں نے پانی پیا۔ لیکن ہایا نے پیتے وقت اپنے ہونٹ بند کر لئے اور ایک قطرہ بھی گلے سے اترنے نہ دیا اور اسی طرح وہ ہر روز چلنے لگے۔ گاجا پانی پیتا رہا۔ ہایا بھی چھاگل کو منہ سے لگاتا اور اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے پانی کو دیکھتا لیکن اس کے ہونٹ موت کے دروازے کی طرح ہمیشہ بند رہتے۔ آخر کار ایک دن ایسا آیا کہ گاجا نے کہا "میرے زخموں نے میری ساری طاقت چھین لی ہے اور اب میں آگے نہیں چل سکتا۔ علاوہ اس کے پانی بھی ختم ہو گیا ہے۔" تب ہایا نے کہا "ہمت سے کام لو سفر ختم ہونے کو صرف ایک دن اور باقی رہ گیا ہے۔" لیکن گاجا نے کہا "تو چلا جا اور اپنی زندگی بچا لے مجھے یہاں مرنے کیلئے چھوڑ دے۔" یہ کہتے ہوئے وہ ریت پر گر کر بیہوش ہو گیا۔ تب ہایا نے اسے اٹھایا اور اپنے کاندھے پر رکھ کر ڈگمگاتا ہوا چلا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتا سر چکراتا ہوش اڑتے اور ریگستان آنکھوں کے سامنے ناچتا نظر آتا۔ اس کے کانوں میں پانی کے چھلکنے کی آواز اور اس کے سر میں ریگستان کے ڈھول بج رہے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کے پیچھے موت کے خطوں میں رہنے والی پلید روحیں آپس میں سرگوشیاں کر رہی ہوں جیسے اس پر ہنس رہی تھیں اور طرح طرح کی ڈراؤنی آوازیں نکال رہی تھیں۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا ایک ایک قدم بڑھتا گیا اور اس کی زندگی ختم ہوتی گئی جیسے کوئی پھول سورج کی دہکتی ہوئی کرنوں سے جھلس جائے۔ اور یکایک جیسے اس نے سپنے میں ایک آواز سنی۔ یہ آواز گاجا کی تھی جو اس کے سر کے اوپر کہہ رہا تھا "وہ شہر آ گیا اور اب ہم بچ گئے۔" ہایا نے اسے زمین پر اتار دیا اور کہا "اے راجہ میں ہایا ہوں اور میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔" یہ کہتا ہوا وہ منہ کے بل ریت پر گر پڑا اور اس کی روح دوسری دنیا میں پہنچ گئی۔ لیکن آکاش کے پاملا نے اس کی قربانی دیکھ لی اور یاد رکھا۔" اور دوسرے جنم میں ہایا اپنی ہمدردی کے صلہ میں ہوا کی روح بنایا گیا۔"

(۱۰)

بیمار کتا

تب اندر نے کہا "اے کمان دار ابرو والی عورت! یقیناً وہ بہادر راجپوت اسی انعام کا مستحق تھا لیکن اس کا کونسا وصف تجھ میں اور تیرے پتی میں مشترک ہے؟"

"جنگلی پھول" نے کہا "برہمن! انہیں جو چیز مشترک ہے وہ ہمارا انعام ہے میں اپنے شوہر سے ملنے کو پرماتما کی طرف سے ایک بڑا صلہ سمجھتی ہوں ہایا کی قسمت سے بھی بڑا۔ یقیناً ہم نے اپنے جنموں میں کوئی بڑا نیک کام انجام دیا ہے لیکن ہماری اس زندگی کے اعمال کے لئے اب بھی وقت باقی ہے، اور میں کوشش کروں گی کہ میرے اس عمل میں جو کچھ خود ستائی اور خود رائی ہو اسے آئندہ اپنی اطاعت اور عبادت کی مدد سے مٹا ڈالوں۔ اور اس لئے ماضی کے پرتو سے تو ہمارے مستقبل کے تاریک ہونے کی پیشینگوئی نہ کر کیونکہ جب زندگی ہے تو اس میں تبدیلیاں بھی ممکن ہیں اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ زندگی کے ختم ہوتے ہوتے آخری لمحات میں کوئی ایسا نیک کام ہو جاتا ہے جو جیون بھر نہ ہوا تھا جیسے ایک کتا تھا جس کا کوئی مالک نہ تھا۔ نہ تو اس کے رہنے کی کوئی جگہ تھی اور نہ اسے کہیں کھانے کو ملتا تھا لیکن موقع بے موقع وہ نالیوں اور سڑکوں سے کچھ کھا پی کر اپنا گزارا کر لیتا۔ اس لئے وہ ہمیشہ نحیف لاغر اور زخموں سے چور رہتا کیونکہ ہر شخص اسے لکڑی یا پتھر کا نشانہ بناتا تھا۔ گویا اسکی زندگی ایک چلتی پھرتی موت تھی اور اس کی ملتجی نگاہوں میں بھوک ہمیشہ خوف اور شرم سے لڑتی رہتی۔ چار ناچار وہ چلتا رہا یہاں تک کہ اس کا آخری وقت قریب آ گیا اور ایک روز جبکہ وہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ بمشکل چل پھر سکتا تھا اس طرف سے ایک بیل گاڑی گزری جس میں بہت سی عورتیں کسی شادی کی تقریب سے واپس ہو رہی تھیں، کتے کی اس حالت کو دیکھ کر وہ اس پر ہنسیں اور اسکو منہ چڑانے لگیں لیکن ان میں سے ایک عورت نیچے اتر آئی اور کتے کے پاس آ کر بڑی محبت اور پیار سے اسے ایک روٹی کا ٹکڑا دیا۔ کتے نے ملتجیانہ نظروں سے اسکی طرف دیکھا اور یہ محسوس کر کے آج تک کسی نے اس کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں کی دم ہلانے لگا۔ اور اس طرح اے برہمن زندگی کے آغاز کو دیکھ کر اس کے انجام کے بارے میں کوئی یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے اور میرے پتی کو ایسا موقع ملے کہ ہم نیک کام انجام دے کر اپنے الزاموں اور تہمتوں کو ملامت کی رو سے نکال لیں۔"

(۱۱)

سُرخ کنول

تب اندر نے کہا "اے شہابی ہونٹوں والی عورت! وہ تمام باتیں جو تو نہیں کہہ سکتی یا نہیں کہنا چاہتی اُن کے متعلق تو مجھے یہ غلط باور نہیں کرا سکتی کہ تو نے ایک اجنبی کی آغوش کی خاطر اپنے باپ کو چھوڑ کر کوئی پاپ نہیں کیا ہے۔ کیا تو اپنی دلیلوں سے یہ ثابت کر سکتی ہے کہ تمام راجکماریوں کا یہی شیوہ رہا ہے کہ وہ ان چوروں کو جو رات کو چوری کی غرض سے مکان میں آئیں اپنا جیون ساتھی بنا کر اُن کے ساتھ بھاگ جائیں؟"

"جنگلی پھول" نے کہا "اے برہمن! میرا معاملہ مستثنیات میں سے ہے کسی قاعدے یا کلیہ کے تحت نہیں کیونکہ کوئی اصول مستثنیات سے خالی نہیں۔ علاوہ اس کے ممکن ہے تجھے یقین نہ آئے۔ سُن! مَیں نے خود ایسا نہ کیا ہوتا جیسا مَیں کر چکی ہوں۔ لیکن چونکہ مَیں نے کیا ہے محض اپنے پتی کی خاطر کیا ہے کسی اَور کی خاطر نہیں۔ کیونکہ گو بظاہر مَیں نے اپنی کمزور طبیعت کی وجہ سے ایسا کیا ہے لیکن یہ کام میری فطرت کے ہرگز مطابق نہیں ہے بلکہ اُس کے خلاف ہے، اور اس لئے اِس مسئلہ کو کسی اصُول کی ضرورت نہیں ہے خواہ وہ کوئی دُوسرا شخص ہو یا خود مَیں ہی ہوں۔ کیونکہ بعض اوقات بُزدل بھی بہادر اور کنجوس بھی سخی ہو سکتا ہے، ایک عقلمند، بیوقوف، اور ایک صحیح عقل پاگل ہو سکتا ہے اور اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ایک عورت بغیر اِس بات کی پرواہ کئے کہ اس کا نام دُنیا کی شریف عورتوں میں ہو یا نہ ہو خود کو ایک ایسے شخص کے حوالے کر دے جس نے اُس کے خوابیدہ جذبات کو بیدار کر دیا ہو اور جس نے اس کی رُوح کو ازلی آگ کے نُور سے چمکا دیا ہو۔ میرا خیال ہے کہ میرا معاملہ بھی ایسا ہی ہے کیونکہ میرا ضمیر مطمئن ہے اور مجھے ملامت نہیں کرتا اور وہ عورت جو اپنے سینے میں پُرسکون دل رکھتی ہے اسے اپنی پاکدامنی ثابت کرنے کیلئے کسی گواہ کی ضرورت نہیں جیسے کہتے ہیں ایک راجہ تھا، اُسکی بہت سی رانیاں تھیں ان میں سے سوائے ایک کے سب کی سب بیوفا تھیں، اور ایک دن جب وہ جنگ پر جا رہا تھا اُس نے اپنی رانیوں کو بُلا کر ان میں سے ہر ایک کو ایک کنول دیا اور بولا "اس سُرخ کنول کو اپنے پاس رکھو اور جب مَیں آؤں تو مجھے دکھاؤ اور اس کا رنگ تمہاری وفاداری کا شاہد ہوگا کیونکہ اِن کنول کے پھُولوں کو مَیں نے دیوتا سے پایا ہے اور یہ اُس وقت تک نہ مُرجھائیں گے جبتک تم میں سچائی اور وفاداری باقی ہے۔" اور پھر وہ چلا گیا اُس کے جاتے ہی بجز ایک رانی کے تمام رانیاں اپنے اپنے پریمیوں کے ساتھ عیش کرنے لگیں اور پھر جب اُنہوں نے اپنے اپنے کنول کے پھُولوں کو دیکھا تو نہیں مُرجھایا ہوا پایا اور وہ سب کی سب راز فاش ہو جانے کے خوف سے گھبرا گئیں۔ جب راجہ واپس آیا تو تمام رانیاں بن ٹھن کر اُس سے ملنے آئیں۔ راجہ نے کہا "اپنے اپنے کنول دکھاؤ۔" وہ سب لائیں۔ اور وہ اُسی طرح تازہ اور سُرخ تھے جس طرح راجہ نے اُنہیں دیئے تھے۔ صرف وفادار رانی کا پھُول خشک اور مُرجھایا ہوا تھا اور وہ بولی "راجن! مَیں نہیں جانتی کہ ان لوگوں کے پھُول اسقدر تر و تازہ اور خشک کیوں ہیں میرا پھُول تو مُرجھا کر خشک ہو گیا ہے حالانکہ میرے دل میں سوا تمہارے کسی اور کا خیال تک نہیں آیا۔" تب تمام رانیوں نے اُس پر تہمتیں لگانا شروع کیں کیونکہ وہ سب اُس سے جلتی تھیں، اور اُس کے ساتھ عداوت رکھتی تھیں۔ اُنہوں نے کہا "مہاراج! یہ بدکار ہے اسے ہم سب جانتے ہیں۔ اور یہ اسی کا ثبوت ہے۔" لیکن راجہ نے اُنکی طرف دیکھ کر ایک قہقہہ لگایا اور بولا "اے بیوقوف عورتو! کنول ایک مہینے تک کس طرح تازہ رہ سکتا ہے۔ آج تم نے خود اپنی بیوقوفی سے اپنے جرم کا ثبوت دیدیا ہے۔ صرف اس رانی کا دِل مطمئن تھا اور اُسے اپنی پاکدامنی پر اعتبار تھا یہی وجہ تھی کہ اسے اپنے کنول کے مُرجھانے کا کوئی ملال نہ ہوا۔ یہ اکیلی ہی پاکدامن ہے اور میری رانی بننے کے لائق ہے کیونکہ وہ کنول جو مُرجھا نہ سکا وہ اسکے دل کا کنول تھا۔"

(۱۲)

آندھی اور پتّے

تب اندر نے کہا "بکاؤلی کے رکھے ہوئے پھُول کی طرح ہنسنے والی عورت! اگر تیرے بھولے دل کی معصومیت اور نزاکت پردہ پوشی رکھ کر تجھے موردِ الزام نہ ٹھہرایا جائے تب بھی چوروں کی طرح مکان میں گھُسنے اور تجھے چُرانے والے شخص کو تو تُو بے جُرم ثابت نہیں کر سکتی۔ ممکن ہے کہ تو یہ کہے کہ پروانے کی طرح دیوانہ وار شمع پر گر کر تُو نے اپنے ریشمی پر جلا لئے ہیں۔"

"جنگلی پھُول" نے کہا "برہمن! ایک کمزور عورت کس طرح اپنے بھاگ سے لڑ سکتی ہے جس کا مقابلہ بڑے بڑے دیوتا بھی نہیں کر سکتے؟ کیا پریم کا دیوتا خود بڑے دیوتا کی شُعلہ بار آنکھوں کے سامنے تتلی کی طرح نہیں لرزتا؟ تو پھر مَیں اُسکی آنکھوں کی آگ سے کیسے بچ سکتی ہوں جو میرے حق میں بڑے دیوتا کے برابر ہے۔ اِدھر آ مَیں ثابت کروں گی کہ میرے پتی نے پاپ نہیں بلکہ نیکی کی ہے۔ کیا تجھے نہیں معلوم پریمی پتّے کی مانند ہیں اور پریم تو آندھی ہے جو درختوں کے درمیان اِدھر اُدھر اپنی مرضی کے مطابق چلتی ہے وہ ہر پیڑ کے پاس آتی ہے اور اُس کے پتّوں کو زور سے ہلاتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ اِس طُوفان میں بعض پتّے تو اُسی وقت گر جاتے ہیں اور بعض شاخ پر کچھ دیر کیلئے اور قائم رہ جاتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ ایک ایک کرکے جلد یا دیر سے سب

گر جاتے ہیں بجز اُن کے جنہیں بیدرد قسمت غیر فطری طور پر درخت سے جُدا نہیں ہونے دیتی اور شاخوں پر ہی پژمُردہ کر کے فنا کر ڈالتی ہے۔ لیکن وہ پیڑ پر رہیں یا گر جائیں انجام ایک ہی ہے۔ مآلِ کار فنا ہے۔ پس اُس پتّے کا کیا فائدہ ہوا جو درخت پر رہ گیا تھا؟ کیا اِس سے یہ بہتر نہیں تھا کہ وہ خود صندل کی خوشبو میں بسی ہوئی ملایا کے پہاڑوں کی آندھی کے حوالے کر دیتا' تیز جھونکوں کے پیہم تھپیڑوں کی زد میں لرزتے رہنے سے فائدہ؟ اب مجھے بتا اگر تو بتا سکتا ہے کہ کیا اِس سے بہتر کوئی اور شوہر میرے یا کسی عورت کیلئے ہو سکتا ہے جو مجھے میرے درخت سے چُرا لایا ہے۔ کیونکہ میں نے ہزاروں آدمیوں کو اپنے جھروکے میں سے دیکھا ہے لیکن ان میں سے ایک کا بھی اُس سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس لئے کہ اس کا باپ راجہ تھا اور اسی طرح میرا بھی باپ راجہ ہے' وہ خوبصورت ہے' اور میں تمام مردوں کی آنکھوں میں اور تیری آنکھوں میں بھی پڑھ سکتی ہوں کہ میں بھی حسین ہوں کیونکہ دل ہمیشہ حُسن سے لرز اُٹھتا ہے خواہ وہ مرد کا دل ہو یا عورت کا اور اگر حُسن کا جادو زیادہ طاقتور ہو تو وہ دل سے بندھی ہوئی تمام ڈوریوں کو جلا کر اُسے لے بھاگتا ہے اور یہی حال میرا ہے اور اسی طرح عورت کا دل تڑپ کر اُٹھتا ہے اور پریمی کے پاس چلا جاتا ہے اور وہ جہاں چاہتا ہے اُسے لیجاتا ہے اور وہ لوگ جو ایسا کرتے ہیں وہ کوئی پنڈت نہیں ہوتے کیونکہ میرا دل تاریکیوں کی بے پناہ چادروں کے اندر دفن تھا: مانو جیسے زمین رات کی ظلمت میں۔ تب میرا شوہر کھڑکی میں سے اندر داخل ہوا گویا سُورج اُفق سے طلوع ہوا اور ایک لمحہ میں میرا دل پریم کی خوشی سے بھر گیا اِس لئے اصولاً اب میری رُوح اسی کی ہے کیونکہ یہ جو کچھ ہے اُسی کی وجہ سے ہے۔ اِس آتما کی شانتی اور رنگینی اُسی کے پرتو سے ہے تو اُسے چھین لیگا تو گویا میری ساری دُنیا ختم ہو جائیگی اور کیا تو اُس سُورج پر الزام لگا سکتا ہے جو سنسار کے ہر ذرّے کی تاریکی کو سُنہرے اور گلابی دُھندلکے میں تحویل کر دیتا ہے"۔

(۱۳)

راجہ اور رانی

تب اندر نے کہا "اے کافور کی خوشبوؤں میں بسی ہوئی عورت! تو اپنے پتی اور خود اپنے لئے جو استدلال پیش کر رہی ہے اُسے راج ہنس کے پچھلے اُس عکس سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو ٹھہرے ہوئے پانی میں پڑتا ہے یہ خوبصورت پر رنگا رنگ کے ہوتے ہیں لیکن انہیں سحر فریب اور کوئی اصلیت نہیں ہوتی' اسی طرح محبت کی پہلی کرن نے تیری آنکھوں کو چوندھیا دیا ہے اور یہ ہی چیز ہے جس نے تیری زبان میں تقریر بھر دی اور جس نے تجھے ایک خانہ بدوش راجپوت کو اپنا مجازی خدا سمجھنے پر مجبور کر دیا۔

"جنگلی پھول" نے کہا "اے برہمن یہ سارا سنسار ایک فریب ہے لیکن باوجود اس کے سنسار کی بعض چیزیں زیادہ دیر تک قائم رہتی ہیں اور اس لئے جیسا کہ تیرا خیال ہے اگر میرا عقیدہ اپنے شوہر کے ساتھ محض ایک فریب ہی ہے تو کیا یہ فریب کم از کم اتنا طویل نہیں ہے کہ میری زندگی کی آخری گھڑیوں تک قائم رہے۔ سپنے سے بڑھکر بھی کسی چیز کا فریب ہو سکتا ہے؟ لیکن آنکھ کُھلنے سے پہلے اسے پہچان ہی کون سکتا ہے؟ کیا سراب اتنا حسین جتنا کہ اصل' تاوقتیکہ اس کا فریب ظاہر نہ ہو جائے؟ اِس لئے تیرے الفاظ کے اس وقت تک کوئی معنی نہیں جبتک کہ میرا فریب تباہ و برباد نہ ہو جائے لیکن یہ ممکن نہیں کیونکہ وقت ہمیشہ اسکو آزماتا رہیگا۔ یہ ایک کامیابی ہے خواہ وہ ایک ہی دن کی کیوں نہ ہو اور یقین کے ساتھ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کل پچھم سے طلوع ہوتے ہوئے سورج کو دیکھ سکیگا؟ مثلاً ایک راجہ تھا۔ وہ ایک گرم دوپہر کو اپنی رانی کے ساتھ پانی میں کھیل رہا تھا۔ پہلے چمکتے ہوئے شفاف پانی میں کھڑے ہو کر وہ رانی کے مختلف انداز کے عکس پانی میں دیکھتا رہا اور پھر اُس پر پانی اُچھالنے لگا یہاں تک کہ رانی ایسی نظر آنے لگی جیسے بادلوں کی اوٹ میں سرما کا چاند کیونکہ بھیگے کپڑے بدن سے اِس طرح لپٹ گئے تھے کہ جسم صرف ایک ہالہ نظر آ رہا تھا اور اُس کے کالے اور نیلے بالوں والا جوڑا کھل کر اُس کے سر پر بادل کی طرح چھا گیا تھا جس سے پانی برس رہا تھا۔ کھیلتے کھیلتے جب راجہ اور رانی دونوں تھک گئے تو ایک پُرانے منڈپ کے سائے میں بیٹھ گئے جو چشمے کے قریب تھا۔ راجہ رانی کے زانو پر سر رکھ کر لیٹتے ہی فوراً سو گیا اور اُس نے ایک سپنا دیکھا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک سہانی صبح وہ شکار کھیل رہا ہے اور جب آگے بڑھا تو اُس نے ایک برہمن کو ایک پیڑ کے نیچے سوتا ہوا پایا۔ وہ گزر گیا اور جب شام کو واپس لوٹا تو برہمن اُسی طرح محوِ خواب تھا۔ راجہ نے اُسے جگانے کے لئے اپنے نوکر بھیجے۔ کچھ دیر بعد وہ لوٹے اور کہا۔

"مہاراج یہ برہمن نہیں اُٹھیگا خواہ ہم کچھ ہی کریں۔ اور وہ مرا بھی نہیں کیونکہ اُس کے جسم میں حرارت موجود ہے اور سانس بھی چل رہی ہے'۔ راجہ اُسے اپنے محل میں اُٹھوا لایا اور پلنگ پر لٹا دیا اور وہ سونے والا اُس بستر پر سات سال تک سوتا رہا۔ آخر ایکدن وہ برہمن اچانک اُٹھا اور چاروں طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا' میں یہاں کیسے آیا ابھی ابھی تو میں ایک درخت کے نیچے سو رہا تھا'۔ راجہ نے کہا' برہمن تو اِس بستر پر سات سال سے سو رہا ہے اور اِس طویل مدت میں میں اپنے سلطنت کے فرائض انجام دیتا رہا جنگیں بھی ہوئیں اور صلحیں بھی۔ لڑکیاں اور لڑکے بڑے ہو کر سیانے ہو گئے اور تو اسی جگہ سوتا رہا'۔ برہمن کچھ

کہنے والا ہی تھا کہ راجہ کی آنکھ سپنے سے کُھل گئی اور اُس نے اپنی راج پتنی کو یہ کہتے سُنا۔ "آریا پتر! کیا تم جاگ اُٹھے"۔ راجہ نے پُوچھا "مَیں کتنی دیر تک سوتا رہا"۔ اور وہ بولی "راجن تم نے ابھی تو میرے زانو پر سر رکھا ہے"۔ راجہ اسکی طرف کچھ دیر تک حیرت سے دیکھتا رہا پھر اچانک بولا "یہ سب سپنے کا فریب تھا۔ وقت کیا اور سپنا کیا۔ یہ سب لمحہ بھر کے ہیں؟ مَیں سات سال تک سوتا رہا اور تیرے بھیگے کپڑے ابتک تیری چھاتیوں سے لپٹے ہیں جو تیرے سینے پر چڑھکر علانیہ تجھ سے بغاوت کا اعلان کر رہے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ تُو اور مَیں اب بھی خواب دیکھ رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ خواب مختصر ہو۔ رانی وقت نہ گنوا اِدھر آ ہم پیار اور پریم کی باتیں کریں اب بھی وقت باقی ہے"۔ رانی نے خیال کیا کہ وہ پاگل ہو گیا ہے لیکن فرمانبردار پتنی کی طرح وہ اُس کے چہرے پر جُھک گئی اور اپنے مرمریں لب اُس کے لبوں کے قریب کر دیئے اور ٹھیک اس وقت منڈپ گر گیا اور وہ دونوں اُسی جگہ دفن ہو گئے۔ تُو نے دیکھا برہمن! راجہ کا خوف ٹھیک تھا اور اب کون کہہ سکتا ہے کہ ہماری قسمت میں ایسا ہونا نہیں لکھا ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ فریب محبت سے آگاہ ہونے سے پہلے ہم اپنی زندگی کے سپنے سے بیدار ہو جائیں"۔

(۱۴)

ماہی گیر کا عشق

تب اندر نے کہا "اے ناگن کی سی لچک والی عورت! تیرے الفاظ حکیمانہ ہیں لیکن یہ تیرا خواب بہت ہی مختصر ثابت ہونیوالا ہے تو کچھ دیر کے لئے اس خواب سے بیدار تو ہوگی لیکن کڑوی بیداری کے ساتھ اس لئے کہ ہو سکتا ہے تیرا پتی تجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلا گیا ہے اور اب کبھی واپس نہ آئیگا"۔

"جنگلی پھول" نے ایک لطیف تبسم کے ساتھ کہا "اے برہمن! کیا تُو نے کبھی اُن ماہی گیروں کو نہیں دیکھا جو گنگا کے کنارے چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو پکڑتے ہیں؟ ایک مرتبہ چارہ نگلا اور ہمیشہ کیلئے مقید ہو گئیں اور پھر ان مچھلیوں کو ماہی گیر آگ کے شعلوں پر بھُون کر کھا جاتے ہیں۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ محبت کے دیوتا کے جھنڈے پر مچھلی کا نشان ہوتا ہے؟ تو کیا وہ خود بھی ایک ماہی گیر نہیں جو لوگوں کے دلوں کو پکڑتا ہے اور عورت کو بطور چارہ کے استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح کل رات اُس نے میرے شوہر کو تاکا اور میری مدد سے اُسے جال میں پھانس لیا۔ اب وہ مچھلی نکل کر کہیں جا نہیں سکتی اس لئے کہ وہ چارہ نگل چکی ہے اور محبت کی مضبوط ڈوری اُسے جکڑے ہوئے ہے۔ اور جس آگ سے وہ دیوتا مچھلیوں کو بھُونتا ہے اُسکی آنچ خوشگوار ہوتی ہے جس میں محبت کی چھیڑ اور عشق کا سوز و ساز ہوتا ہے اس لئے اے برہمن میرا پتی مجھ سے جس قدر دُور ہوتا جائیگا اُسی قدر اُس کی واپسی یقینی ہوتی جائیگی اور جُدائی کا ہر لمحہ اُس پر بار ہوتا جائیگا۔ اُسکی حالت اس وقت یوں سمجھنی چاہیئے جیسے کوئی شخص ہمالیہ کی برف کے نیچے دفن ہو گیا ہو اور بہت جلد سردی سے منجمد ہو کر فنا ہو جانے والا ہے تاوقتیکہ وہ جلد واپس آکر اپنے سرد اور کپکپاتے ہوئے جسم کو میری محبت کی گرمی سے حرارت نہ پہنچا لے کیونکہ اے برہمن! ایک وفادار پتنی کا دل محبت کی عبادتگاہ ہوتا ہے جس میں گھر کی مقدس آگ ہمیشہ جلتی رہتی ہے۔ یہ تاریکی کو منور بنا دیتی ہے اور پردیسی پیا کو گھر تک آنے کیلئے راہ دکھاتی ہے اور اُسکی غیر موجودگی میں اُسکی پاک کرن تاریک رات میں ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ایمانداری کی سیاہ کسوٹی پر سونے کی لکیر کھینچ دی گئی ہو۔ اور یہ آگ اس وقت تک نہیں ختم ہو سکتی جبتک کہ اس کو جلانے کے لئے ایندھن باقی ہے اور کم از کم اپنے متعلق تو مَیں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ میرا ایندھن ابھی ختم نہیں ہُوا۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ مَیں اتنی ناسمجھ اور بیوقوف تھی کہ بغیر ضمانت لئے اپنے شوہر کو جانے کی اجازت دے دیتی۔ اے برہمن! اُس خالق کی پیدا کی ہوئی تمام خلقت میں سے صرف دو ایسی ہیں جنہیں اپنے شکار کے لئے شکار نہیں کھیلنا پڑتا۔ وہ صرف خاموشی سے بیٹھی انتظار کرتی ہیں اور شکار خود آکر اُنکے جال میں پھنس جاتا ہے۔ اِن میں سے ایک تو مکڑی ہے اور دُوسری عورت"۔

(۱۵)

عورت کا سرتاج

تب اندر نے کہا "اے حسین عورت! پریم نے تجھ پر اپنا جادُو کر دیا ہے یا جیسے تو کہتی ہے تجھے اپنے جال میں پھنسا لیا ہے اور اب تیری حالت اُس انسان کی طرح ہے جو دُور سے چمکیلے ریگستان کو دیکھ کر اُس کے فریب دینے والے حُسن سے خوش ہوتا ہے کیونکہ وہ ناتجربہ کار یہ نہیں جانتا کہ دُور سے نظر آنیوالا چشمہ صرف سراب ہے۔ اور یقیناً تو ٹھیک کہتی ہے تیرا پتی اُس وقت تک تجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتا جبتک کہ تیرے حُسن کا پھُول اپنی بہار دکھا رہا ہے اور جب تک تیری دوشیزہ جوانی صُبح کے شبنم کی طرح دلآویز ہے لیکن دن کی گرمی جب تیرے سیانے پن کی تازگی چھین لے گی اور تیرے حُسن کی بہار خزاں کی گود میں سو رہی ہوگی تو یاد رکھ وہ تجھے سانپ کی کینچلی کی طرح نکال کر پھینک دے گا۔ تُو جانتی ہے کہ ایک ظالم پتی کی استری کا انجام ہمیشہ کیا ہُوا کرتا ہے؟"

تب "جنگلی پھول" نے کہا۔ برہمن! وہ عورت جو اپنا پتی آپ پسند کرتی ہے، وہ ایک منڈھ جواری کی طرح ہے جو وقت آنے پر اپنی جان تک ہار دینے میں تامل نہیں کرتی۔ اور اگر اُس کا یہ انتخاب خود غرضی اور نفسانی خوشی پر مبنی ہے تو اس ابھاگن ناری کے بھاگ میں سوائے دُکھ درد اور بدی کے اور کچھ نہ ہوگا۔

لیکن اگر اُس کا انتخاب اسکے ضمیر کی بیجا ہمبری پر نہیں ہوا بلکہ شوہر کی مقدس روح نے خود اُسے اپنی طرف کھینچ لیا ہے تو ایسی صورت میں عورت کا تامل اور تساہل خود اُس کی ذات کیلئے مضر ہے کیونکہ وہ جو اپنے پیچھے سب کچھ چھوڑ کر اپنے پتی کی آواز کیطرف دوڑتی ہے وہ کسی غیر معمولی جذبۂ مسرت کے تحت ایسا نہیں کرتی بلکہ اُس کے دل کے عین خلاف ہوتا ہے لیکن یہ سب صرف اس لئے ہوتا ہے کہ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور ضمیر کی سچی پکار کو دبا نہیں سکتی اور یہی وجہ ہے کہ کوئی چیز اس کے نقصان کا باعث نہیں ہو سکتی کیونکہ یہی اُس کے جنم کا مقصد تھا۔ اِس لئے کسی اجنبی کو اپنے گلے کا ہار بنا لینے سے تو یہی بہتر ہے کہ عورت خود اپنا بر تلاش کرلے خواہ آگے چل کر وہ اُس کے ساتھ بُرا برتاؤ ہی کیوں نہ کرے اور چھوڑ ہی کیوں نہ دے کیونکہ مالک کی ضرورت تو ہر عورت کو ہوتی ہے لیکن بہت سی عورتیں اُسکی تلاش نہیں کرسکتیں لیکن ایکبار جب وہ پا جاتی ہے تو پھر وہ ہر حال میں اُسی کی ہو جاتی ہے لیکن اگر وہ غلط شخص کا انتخاب کرلے خواہ وہ اس کے ساتھ رانیوں کا سا ہی برتاؤ کیوں نہ کرتا ہو اور خواہ وہ اُسے دیوی کی طرح پوجتا ہی کیوں نہ ہو پھر بھی وہ اُس سے کبھی پریم نہیں کرے گی اور اُس کا دل کبھی شانت نہ ہوگا اِس لئے کہ فطرتاً وہ اُسکی مَیں ہے اور وہ اُس پر حکومت نہیں کرسکتا کیونکہ ہاتھی کو زنجیروں سے جکڑ کر رکھا جاتا ہے اور عورت کو اُس کے دل سے۔ اور اُسکی محبت اسکی فرمانبرداری کا احساس ہے کیونکہ عورت کبھی کسی شخص سے محبت نہیں کرتی تاآنکہ وہ یہ نہ سمجھے کہ اس کا شوہر اُس کا مالک بھی ہے اور اُس کے ہر حکم کی تعمیل اُس کا دھرم ہے۔ لیکن اے برہمن! یہ کوئی غلامی نہیں کیونکہ وہ اپنی ہی جکڑی ہوئی زنجیروں سے محبت کرتی ہے اور اُسکی فطرت بیقرار رہتی ہے کہ اس کا پریم پجاری اُس پر حکومت کرے۔ کتنی دُکھی ہے وہ عورت جس کا پتی اس کا حقیقی مالک نہیں لیکن یہی دُکھ اُس کیلئے سُکھ ہے اگر اُس کا پتی پتی ہونے کے ساتھ ساتھ اُس کا مالک بھی ہو۔ اے برہمن اُس بے پایاں مسرت کا اندازہ عورت ہی لگا سکتی ہے جو اُسے اپنے شوہر کی فرمانبرداری میں ملتا ہے کیونکہ یہ اُسکی فطرت کی ایک نیرنگی ہے جس کا شریک مرد نہیں ہو سکتا اور اِس طرح اے برہمن! میرا شوہر میرا مالک ہے اور میں اُسکی ایک ادنیٰ داسی ہوں اور اگر وہ مجھ سے ہمیشہ محبت کرتا رہیگا تو اچھا ہے اور اگر نہیں تو بھی اچھا ہے اِس لئے کہ وہ مجھے اپنی پرستش کرنے سے تو نہیں روک سکتا۔ کیونکہ اگر پیدا کرنے والا چاہے تو بلخ کو کنول کے پھولوں سے بھرے ہوئے حسین چشمے سے نکال سکتا ہے لیکن وہ اپنی تمام مطلق العنانی کے باوجود اسکے دل سے چشمے کی محبت نہیں چھین سکتا اور نہ ہی کوئی "قسمت" بیوی کو وفاداری سے محروم کرسکتی ہے کیونکہ جس کی شوہر پرستی کا جوہر حالات اور واقعات کی تبدیلیوں کی وجہ سے کم ہو جائے وہ بیوی کہلانے کی مستحق نہیں بلکہ ہوں

سمجھنا چاہئے کہ اسکی ملاقات اتفاق اور غلطی سے اُس شوہر کے ساتھ ہو گئی ہے اور جو ایسے نام سے پکاری جا رہی ہے جو اس کا نہیں ہے۔"

(۱۶)

دیوتا کی شکست

تب اندر نے کہا "اے اُبھرے ہوئے سینے اور بلند رُوح والی عورت! اگرچہ تیرے شوہر نے تجھ جیسا قیمتی موتی بغیر کسی اپنی قابلیت کے حاصل کرلیا ہے لیکن تو اس بات سے انکار نہیں کرسکتی کہ وہ دیوتاؤں کا ٹھکرایا ہوا اپرادھی ہے اور اس لئے یقیناً وہ اپنے ساتھ تجھے بھی دیوتاؤں کے غصہ کی آگ کے نذر کردے گا۔"

"جنگلی پھول" اُس کے سامنے ایک لطیف لوچ کے ساتھ کھڑی ہو گئی اور لانبی گھنی پلکوں کو اپنی آنکھ پر جھکا لیا۔ "برہمن! اس سمے میں بیوی ہوں اور ہو سکتا ہے کہ بہت جلد ایک بچے کی ماں بھی بن جاؤں آج میں اُن ساری باتوں سے واقف ہوں جنہیں کل تک نہیں جانتی تھی اور آپ مجھے اجازت دے کہ میں تجھ سے ایک سوال کروں۔ اگر میرے ہاں کوئی لڑکا ہو اور وہ بڑا ہو کر سیانا ہونے پر اپنی تمام بدقسمتیوں اور بُرائیوں کا سبب میری ذات کو ٹھہرائے اور مجھے بددعا دے تو اُس وقت کہہ میرا کیا فرض ہوگا؟ کیا میں اُسے چھوڑ دوں اور نکالدوں یا یہ سمجھکر درگزر کردوں کہ اس کا یہ برتاؤ کسی بڑے مجرم ہونے کی دلیل نہیں غصہ میں لوگ بعض اوقات ایسا ہی بک جاتے ہیں۔"

یہ کہکر اُس نے اپنی گھنی پلکوں کے اوٹ سے برہمن کو اس دلفریب نظروں سے دیکھا کہ وہ اسکی رُوح میں پیوست ہو گئیں اور جواب کا انتظار کرنے لگی۔ برہمن کچھ جھینپ سا گیا وہ اُس سے آنکھیں نہ ملا سکا۔ پھر ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "اے چالاک عقل اور شیریں بانوں والی سُہاگن! تیرا بے پناہ حُسن تیری جوان عمر کو آنکھوں میں پریم کی ٹھنڈی روشنی کے ساتھ منعکس ہو رہا ہے۔ سُن! میں ہارا اور تو جیتی اور تیرا پتی بھی تیرے ساتھ بخشا گیا سچ ہے وفادار عورت دیوتاؤں سے زیادہ شکتی رکھتی ہے۔ سُن میں تیرے شوہر کو سزا دینے کے لئے آیا تھا لیکن تُو نے اُس کے اور دیوتاؤں کے درمیان حائل ہو کر اُسے چھڑا لیا۔ جا اپنے پتی کو اور اُسے اچھا راستہ دکھا وہ تیرا ہے اور اُسے اپنے پتا کے انتقام سے بچانے کی کوشش کر جس طرح تُو نے اُسے میرے ہاتھ سے بچا لیا ہے۔"

اور وہ فوراً اُس کی آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو کر آکاش کی طرف اُڑ گیا۔ "جنگلی پھول" نے اُسے جاتے ہوئے دیکھا اُس وقت اُسکی بادام جیسی آنکھوں میں کامیابی کھیل رہی تھی اور اُس کے یاقوتی لبوں پر تبسم رقص کر رہا تھا لیکن اُس کے اچانک غیب ہو جانے سے "جنگلی پھول" چونکی اور ایک طویل سانس لی۔

گھبرائے ہوئے ہرن کی طرح اُس کے گالوں پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا پھر اُس نے خود سے کہا "میرا گمان ٹھیک نکلا۔ یہ کوئی دیوتا بوڑھے برہمن کے بھیس میں تھا جو میری آزمائش کیلئے انسان کے بھیس میں آیا تھا کیونکہ اُسکی پلکیں جھپکتی نہ تھیں اور اُس کا جسم بے سایہ تھا اور وہ تمام باتیں جانتا تھا جو ہم پر بیت چکی ہیں۔ یہ کسی انسان کا کام نہیں لیکن اُس کے آخری الفاظ مجھے یاد رکھنا چاہئیں جو میرے کانوں میں ابتک گونج رہے ہیں۔ "اُسے اپنے پتا کے انتقام سے بچانے کی کوشش کر جس طرح تو نے اُسے میرے ہاتھ سے بچا لیا ہے" وہ ابھی یہی کہہ رہی تھی کہ اُس نے دیکھا دُور سڑک پر اُس کا پریمی تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔

~~~(۱۷)~~~

مُقدّس شراب

اور تب وہ خوشی کی ایک چیخ کے ساتھ دوڑی اِس سمے سارے جسم کا لہو اس کے چہرے میں سمٹ آیا تھا۔ رانگا جب قریب پہنچ گیا تو بولا "دیکھ یہ کھانا ہے یہ شراب اور تیرا دل بہلانے کیلئے یہ بانسری۔ لیکن اوہ تو بن سنور کر کتنی خوبصورت ہو گئی ہے۔ اِدھر آ میں تیرے آغوش کی فردوس کا بھوکا اور تیرے ہونٹوں کی شراب کا پیاسا ہوں" جنگلی پھول نے اپنی دراز باہیں پھیلائیں اور بیقراری سے پتی کو ان میں گھیر لیا۔ پھر کچھ دیر دونوں یونہی کھڑے رہے۔ جُدائی کے بعد انکی رُوحیں انکے ہونٹوں کے درمیان دیوانہ وار مِل رہی تھیں۔ پھر اس نیم بیداری کے عالم میں وہ بولی "ہاں تم بھی بھوکے ہو اور میں بھی، آؤ پہلے کھانا کھالیں پھر تم چاہو تو میرا پیار لے سکتے ہو۔ لیکن رانگا نے بوجھ کو نیچے رکھدیا اور اُسے اپنے قوی بازوؤں میں بھینچ کر ایک طویل بوسہ لیا یہانتک کہ اُس کے یاقوتی ہونٹ زرد ہو گئے۔ شاید وہ ڈر رہا تھا کہ اسکی رُوح اس کے جسم کو چھوڑ کر نکل جائیگی۔ پھر دونوں اُبلتے ہوئے چشمے کے قریب بیٹھ گئے، کھاتے پیتے رہے اور چھیڑ چھاڑ کرتے رہے۔ ان کے خوشی کے آنسوؤں سے بھرے قہقہوں نے اپنا اپنا نام تک بھلا دیا تھا۔

جب وہ کھا پی چکے تو باہوں میں باہیں ڈال کر اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔ طوطے انجیر کے درخت پر بیٹھے بول رہے تھے۔ بندر ویران گھروں پر چھلانگیں مار رہے تھے۔ وفورِ مسرت سے یہ جوڑا یہ سب کچھ دیکھتا اور سُنتا رہا۔ وہ بات بات پر ہنستے اور بغیر کسی سبب کے قہقہے لگاتے رہے یہانتک کہ سارا دن بجلی کی چمک کی طرح ختم ہو گیا۔ سُورج پچھم کے اونچے اونچے پربتوں کے پیچھے چھپ گیا اور چاند نمودار ہوا۔ تب جنگلی پھول اُٹھا

"آؤ پریتم! اب ہم واپس چلیں۔ ہم پہلے کھانا کھائیں گے، پھر شراب پئیں گے؟ پھر میں بانسری پر تیرے لئے کوئی میٹھا گیت چھیڑونگی اور اپنے ساجن کیلئے ناچونگی۔ تب چاندنی رات کی یہ دلفریبی اور زیادہ دلفریب ہو جائیگی" انہوں نے ایسا ہی کیا۔ رانگا سُرخ شراب سے چھلکتا ہوا ایک جام لے کر پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا۔ اور "جنگلی پھول" نے بانسری بجانا اور ناچنا شروع کیا۔ اُس وقت چاند کی روشنی میں وہ کافوری شمع نسوانی حُسن کا ایک کامل نمونہ دکھائی دے رہی تھی۔ چاند کی ساری نرم ہتیاں کاش سے اُتر کر رانگا کی رُوح میں سما گئی تھیں اور اُسے سنسار کا سب سے زیادہ بے فکر انسان بنا دیا تھا۔ رانگا والہانہ نظروں سے عورت کی ہر ہر ادا کو دیکھتا رہا اور اپنے دل میں بولا "یقیناً یہ آسمانی مسرت کا کوئی تبرک جُزو ہے جس نے عورت کا قالب اختیار کر لیا ہے یا فردوسی بلور کا کوئی ٹکڑا جو اتفاق سے زمین پر گر گیا ہے" رانگا اس گرد وپیش کے مسحور کن مناظر میں حل ہوا جا رہا تھا۔

اسی طرح دونوں ویران شہر میں خوشیاں مناتے رہے۔ وہ چاندنی راتوں میں نہاتے اور پریم کے جھولوں میں جھولتے لیکن دوسری طرف قسمت اپنا کھیل کھیل رہی تھی۔ وہ جوہری جس کے ہاتھ رانگا نے "جنگلی پھول" کا کنگن فروخت کیا تھا، حیران تھا کہ اس مفلس اچھوت نے یہ نایاب اور نادرِ روزگار زیور کہاں سے پایا۔ اِس لئے معمولی قیمت پر خریدنے کے بعد چُپکے چُپکے رانگا کا تعاقب کیا وہ دُور ہی دُور اُس کے پیچھے چلتا رہا یہانتک کہ وہ ویران شہر میں داخل ہو گیا اور جب وہ دونوں پریمی مِل رہے تھے اُس وقت جوہری سڑک کے موڑ سے جھانک رہا تھا لیکن وہ اُسے نہ دیکھ سکے کیونکہ وہ اپنے سوا سنسار کی ہر چیز کو بھول گئے تھے۔

جوہری یہ دیکھ کر پہلے سے زیادہ متحیر ہوا اور اپنے دل میں کہا "یہ عورت غیر معمولی حسین ہے اور اِس نایاب کنگن کی طرح اُس کا حُسن بھی لاجواب ہے یقیناً یہ کنگن اُسی کا ہے کیونکہ اُس کے دُوسرے زیورات بھی ایسے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ ہو نہ ہو اِس میں کوئی دلچسپ راز ضرور ہے" پھر وہ واپس ہو گیا اور جب شہر پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ چاروں طرف ایک ہنگامہ برپا ہے، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل رات کوئی شخص بادشاہ کے محل میں آیا اور راجکماری کو اُٹھا لیگیا۔ راجہ نے اعلان کیا ہے کہ جو کوئی اِس مجرم کا کھوج لگائیگا اور لڑکی کی نشاندہی کریگا اُسے بہت بڑا اِنعام دیا جائیگا۔

جوہری نے جلدی سے کنگن لیا اور راجہ کے پاس دوڑ گیا پھر اُس کے دربار میں باریاب ہو کر وہ سارا قصہ دُہرایا جو اُس پر گزرا تھا۔ پھر اپنے بیان کی تصدیق کے لئے جوہری نے کنگن بھی دکھایا۔ راجہ نے
~~~

اُسے پہچانا وہ اُسکی لڑکی ہی کا تھا۔ شاہی سپاہیوں کو فوراً جوہری کے ہمراہ روانہ کیا گیا اور جس قدر جلد ممکن ہوا اُس ویران بستی میں پہنچے اور جب دونوں پریمی دنیا سے بے خبر چاندنی رات کی گود میں مصروف رازونیاز تھے، اچانک ایک شور سنائی دیا۔ راجہ کے سپاہی گھس آئے اور دونوں کو گرفتار کر لیا۔

"جل کنول" نے انہیں جاتے ہوئے دیکھا اور اپنے خوبصورت ہاتھوں کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ "میں نے دیوتاؤں سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا اور ان پاگل پریمیوں کا پتہ بتا کر انہیں گرفتار کرا دیا۔ اس شخص کیلئے میں نے بہت کچھ کیا اور اب میں اس سے اُکتا گئی ہوں۔ حیرت ہے یہ فانی انسان مجھے اس قدر جلد بھول گئے۔ وہ کسی چیز کے ساتھ ہمیشہ دلچسپی نہیں رکھتے اور اب ان سے جو ہمدردی کا خیال میرے دل میں آتا ہے وہ سایہ کی طرح گزر جاتا ہے، لیکن پھر بھی اتنا بہادر اور اتنا خوبصورت انسان میں نے کبھی نہیں دیکھا اس لئے میں ایکبار اس کی اور مدد کرونگا۔ پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ دونگی۔"

(۱۸)

قسمت کا کھیل

راجکماری کو اپنے پریمی پتی کے ساتھ راجہ کے سامنے لایا گیا۔ راجہ نے انہیں دیکھا تو خوش ہو کر کہا۔ "ہا ہا! اُڑتی ہوئی چڑیا اور اُس کا شکاری دونوں گرفتار ہو گئے۔ اب اس بھاگی لڑکی کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے جس نے ایک اجنبی راجپوت کے ساتھ فرار ہو کر شاہی خاندان کی عزت کو خاک میں ملا دیا ہے اور اُس چور کا کیا انجام ہونا چاہیئے جو رات کی تاریکی میں محل کے اندر داخل ہو کر راجہ کی لڑکی اور اُس کا سب سے قیمتی ہیرا اُٹھا لیجاتے ہے؟"

"جنگلی پھول" نے کہا۔ "پتا جی! غصہ میں آ کر انصاف کا خون نہ کیجئے۔ میں مانتی ہوں میں نے اپنی مرضی سے خودمختارانہ سب کچھ کیا ہے لیکن میں نے کوئی ایسا پاپ نہیں کیا جس سے مجھ پر یا آپکے خاندان پر کوئی دھبہ آئے۔ سنیئے یہ میرا پتی ہے اور میری طرح یہ بھی ایک راجہ کا بیٹا ہے بلکہ خود راجہ بھی ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں اپنے متعلق یہ کہتی ہوں کہ کیا دروپتی اور دمینتی نے اپنا اپنا پتی خود نہیں پسند کر لیا تھا؟ اور کیا شکنتلا اور دشینت کا بیاہ گندھرو طریقہ پر نہیں ہوا بھارت جن کا پتر تھا؟"

لیکن راجہ نے کہا۔ "بس کر گستاخ لڑکی۔ سن خواہ بات کچھ ہی ہو تیرا پتی صبح سورج نکلنے سے پہلے مار دیا جائیگا۔"

"جنگلی پھول" بولی۔ "تو کیا آپ اپنے گوشت اور اپنے ہی خون کے قاتل بنیں گے کیونکہ وہ میرا شوہر ہے اور میں بھی اسکے ساتھ مر جاؤنگی۔"

راجہ ہنسا اور بولا۔ "میری لڑکی اب تو میری لڑکی نہیں رہی کیا تو حقیقت میں مجھے بہکانا چاہتی ہے کہ میں تیرے بھگا لیجانیوالے اس راجپوت کو معاف کر دوں یا تجھے چھوڑ دوں جو خودمختار عورتوں کی طرح اپنی مرضی سے ایک اجنبی کے ساتھ بھاگ جانے کو پاپ نہیں سمجھتی تھی۔"

"جنگلی پھول" نے کہا۔ "پتا جی! پہلے میری سن لیجئے پھر آپ چاہیں تو دونوں کو موت کے گھاٹ اتار سکتے ہیں۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں اور مجھے یقین ہے کہ اس میں دیوتاؤں کا ہاتھ بھی ہے۔ آپ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں اُن کنواریوں میں سے تھی جو اخلاق کی ہلکی ہوتی ہیں۔"

راجہ نے ترشروئی سے کہا۔ "کیا یہی تیرے کرتوت ہیں جن سے تیرے اخلاق کی پاکیزگی ظاہر ہوتی ہے۔ میں تجھے دوسری سیتا سمجھتا تھا لیکن افسوس! تو کھڑکی میں سے ایک خانہ بدوش راجپوت کے آغوش میں کود گئی۔ عورت کی فطرت کو کون سمجھ سکتا ہے یا اسکے مکر کی گہرائیوں کو کون ناپ سکتا ہے۔ وہ ایک سے بات کرتی ہے لیکن اسکی نگاہ دوسرے پر ہوتی ہے اور دل میں تیسرے کا خیال ہوتا ہے۔ عورت سراپا فریب ہے جو انسانی قالب میں مجسم کر دیگئی ہے۔ کیونکہ چار چیزیں چار چیزوں کی مریض ہیں۔ سمندر ندیوں کا لالچی۔ زندگی فنا کی شائق۔ آگ ایندھن کی دشمن اور عورت مرد کی۔"

راجکماری نے کہا۔ "لیکن مجھے آپ سے ایک آخری سوال کرنا ہے جس کے ساتھ آپ مجھے بیاہنے والے تھے کیا وہ اونتی کا راجہ نہیں؟" اور راجہ نے کہا "ہاں"۔

تب "جنگلی پھول" نے اپنے پتی کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔ "وہ یہی ہے اور اب میں اس کی بیوی ہوں اور یہ سب کچھ خدا ہی کی طرف سے ہوا اس لئے کہ گزشتہ رات یہ میرے کمرے میں آیا اور میں نے اپنے نگہبانوں کو خبردار کرنے سے پہلے کچھ توقف کیا کیونکہ اس کے حسن اور اسکی جوانی پر ترس آ رہا تھا اس لئے میں نے اس سے پوچھا۔ "تم کون ہو؟" اور اس نے جواب دیا۔ "میں اونتی کا راجہ ہوں"۔ میں یہ سنکر حیران ہوئی اور اس سے ساری داستان بیان کرنے کو کہا اور جب میں سن رہی تھی اس نے میرا دل میری آنکھوں اور کانوں کے ذریعہ اُڑا لیا اور میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا کہ وہ شخص جو قانون کی نگاہ میں بڑا مجرم تھا میری نظروں میں پریم کا دیوتا تھا جس نے انسانی قالب اختیار کر لیا تھا اور اس لئے بجائے اسکے کہ میں اس شخص سے بیاہ کرتی جس نے میرے شوہر کو نکال دیا اور زبردستی اسکی حکومت پر قابض ہو گیا۔ میں خود کو کھڑکی سے نیچے گرا کر ہلاک کر لیتی کیونکہ میں جانتی تھی کہ حکومت کی گتھیوں کو سلجھانے میں ضرور مجھے بھینٹ چڑھایا جائیگا۔ اس لئے میں نے اُسکی طرف دیکھا جو میرا شوہر ہے اور اُس کا حال سنا، مجھے ایسا معلوم ہوا گویا ایشور نے اُسے خود میرے پاس بھیجا ہے کیونکہ اتفاق میری کھڑکی میں اُسی راجہ کو کیسے لا سکتا تھا جس سے میں منسوب تھی تاوقتیکہ اس کی تہ میں کوئی آسمانی ہاتھ اور غیبی تائید نہ ہو۔ اس کے علاوہ اس طرح آپکے اور بھی بہت سے

(باقی برصفحہ ۲۲۱)

فولادی

رستم کو رستم زماں بنانیوالی اکسیر

مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کی بیاض کا نادر نسخہ

جسے

عالیجناب مسیح الملک حکیم جمیل خاں صاحب رئیس اعظم نے
جدید سائنٹیفک طریقہ پر ترمیم کر کے سہل الاستعمال اور پُراثر بنا دیا ہے مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم
نے اپنی سیاحت عالم کے دوران میں ایک عجیب و غریب نسخہ کا پتہ لگایا ہے

جو

رستم اور سہراب کی طاقت کا ضامن ہے

اور سلاطین اعظم کی لاثانی قوت کا موجب تھا اجمل خانِ اعظم نے اس نسخہ کے نادر اجزا سے ایک معجون تیار کی

یہ

نواب صاحب رامپور اور مہاراجہ پٹیالہ کی پسندیدہ معجون تھی جو اکثر والیان ریاست کے استعمال میں رہی۔ مسیح الملک حکیم
جمیل خانصاحب رئیس اعظم نے اس معجون کو جو صرف رؤسا کے استعمال کیلئے خاص طور پر تیار ہوتی تھی۔ جدید اصول پر ترتیب دیکر
زیادہ پُراثر بنا کر قرصوں کی شکل میں تبدیل کر دیا اور رفاہ عام کیلئے ہندوستانی دواخانہ کو مرحمت فرما دی۔ اب یہ

فولادی قوت پیدا کرنے والی اکسیر

جو قوت باہ کی لاثانی دوا ہے اعضائے رئیسہ میں حیرت انگیز کام کرتی ہے
اعصاب کو طاقتور بناتی ہے بدن میں قوت، دل میں جوش، جسم میں چستی اور چہرہ پر رونق پیدا کرتی ہے

سال نو کا لاثانی تحفہ

فولادی ہے جو زندگی، طاقت، ولولہ اور جوش سب ہی کچھ پیدا کرتی ہے اس سے جوانی کی امنگیں از سر نو پیدا ہوتی ہیں
اس کے چند روزہ استعمال سے

بوڑھے بھی جوان ہو جاتے ہیں

قیمت فی قرص دو آنے (۲ر) پندرہ یوم کی مکمل خوراک ۳۰ قرص کی سربند شیشی ہے۔ صبح دو قرص، دودھ کیساتھ کھائے جاتے ہیں۔

تار کا پتہ: ہمدرد کیمسٹ دہلی

مینجر ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس ۲۲ دہلی

عورت کا سینہ

عورت کا سینہ (یعنی پستان) بہت بدنما ہو کر نیچے کو ڈھلک جاتے ہیں۔ ان میں نرمی پیدا ہو جاتی ہے ایسی حالت میں مشہور دوا "پستین" کا استعمال کرنا چاہیئے پستان اپنی اصلی حالت پر آ کر گول اور سخت ہو جائینگے۔ اور عورت از سر نو جوان معلوم ہوگی۔ بے حد قیمتی دوا ہے۔ اور بہت جلد اثر کرنے والی ہے۔ اس دوا کے استعمال سے دودھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا یعنی گود کا بچہ برابر دودھ پی سکتا ہے۔ ایک شیشی پستین کی قیمت چار روپے پندرہ آنے ہے اور محصولڈاک اس پر سات آنے لگتا ہے۔

منگانے کا پتہ

جنرل منیجر زنانہ دواخانہ اے۔ بی نمبر ۳۴ دہلی

آپ کو دمہ کا مرض ہے

مگر آپ ناحق تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ دوا "سانسول" نے ہزاروں مریضوں کو تندرست کر دیا۔ دمہ کا دورہ سانس کی پریشان کن تکلیف اور بلغم اور کھانسی کی زیادتی سے آپ کو یہ دوا بہت جلد چھٹکارا دلا سکتی ہے۔ اس دوا کے ہزارہا سارٹیفکیٹ ہمارے پاس موجود ہیں۔ ورملک میں سالہاسال سے ڈاکٹر اور طبیب دمہ کے مریضوں کو اکثر یہی دوا استعمال کرا کے مکمل تندرست کر دیتے ہیں۔ ایک شیشی سانسول کی قیمت صرف ایک روپیہ چھ آنے ہے اور اس پر محصولڈاک سات آنے لگتا ہے۔ تین شیشی ایک ساتھ منگانے پر محصولڈاک معاف۔

جنرل منیجر زنانہ دواخانہ اے۔ بی نمبر ۳۴ دہلی

کے پتہ پر خط لکھکر بذریعہ وی پی پارسل منگا لیجئے اور ترکیب کے مطابق استعمال کریجئے دمہ کا مرض اس دوا کے استعمال سے دیکھتے دیکھتے ختم ہو جائے گا۔

۲ روپے میں فوٹو کیمرہ

ہزاروں آدمی یہ فوٹو کیمرہ خرید چکے ہیں۔ اتنا سستا اور ایسا کارآمد فوٹو کیمرہ صرف دو روپے میں فروخت ہو رہا ہے۔ یہ انتہائی حیرت کی بات ہے۔ ہر قسم کی تصویر جب چاہو لے لو۔ گھر میں بچوں کے بڑوں کے جیسے چاہو فوٹو خود اتار لو۔ ترکیب استعمال بےحد آسان ہے۔ سیکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کیمرے کے ہندوستان میں آنے کے بعد بڑی قیمتوں کے فوٹو کیمرے بکنے یقیناً کم ہو جائینگے اگر آپ کو فوٹو لینے کا شوق ہو تو

منیجر کامیاب بکڈپو اے۔ بی نمبر ۳۴ دہلی

کو ایک خط لکھکر فوٹو کیمرہ بذریعہ وی پی پارسل منگا لیجئے۔ کیمرہ کے ساتھ فلم کارڈ فوٹو دھونے کا مسالہ اور ترکیب استعمال وغیرہ سب کچھ مفت ملتا ہے یعنی یہ کیمرہ مکمل روانہ کیا جاتا ہے۔ قیمت مکمل کیمرہ دو روپے محصولڈاک سات آنے لگتا ہے۔

(دو فوٹو کیمرے ایک ساتھ خریدنے پر محصولڈاک معاف کر دیا جاتا ہے)

سفید بال سیاہ ہو گئے

ہندوستان کے متعدد ڈاکٹر حیران ہیں کہ ایک ہندوستانی نے عجیب و غریب خضاب ایجاد کر دیا۔ جس سے سفید بال ایک ہفتہ میں سیاہ ہو جاتے ہیں۔ یہ خضاب لگایا نہیں جاتا کھایا جاتا ہے یعنی کھانے کی دوا ہے۔ اس دوا کے استعمال سے سر اور ڈاڑھی کے بال بھی رفتہ رفتہ کالے ہو جاتے ہیں۔ جن لوگوں نے ابھی تک اس حیرت انگیز دوا سے فائدہ نہیں اٹھایا وہ فوراً منگا کر دیکھیں۔ صرف ایک ہفتہ کے استعمال کے بعد اس دوا کا زندہ ثبوت وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے یعنی جو بال اب تک سفید ہو گئے ہیں۔ ان کی جڑیں بھی سیاہ ہو جائیں گی اور آئندہ سے بال سیاہ پیدا ہوں گے ہندوستان کے ہزاروں مرد اور عورتیں اس عجیب ایجاد سے فائدہ اٹھا چکے ہیں اور ہر جگہ اس دوا نے زندہ ثبوت پیش کیا ہے۔ اس دوا کا نام "کیشول" ہے ایک شیشی میں پورا کورس دوا ہوتی ہے۔ قیمت فی شیشی چار روپے دو آنے محصولڈاک گیارہ آنے جن لوگوں کو ضرورت ہو وہ آج ہی

منیجر صاحب زنانہ دواخانہ اے۔ بی نمبر ۳۴ دہلی

کے پتہ پر خط لکھ کر کیشول کی ایک شیشی بذریعہ وی پی پارسل منگا لیں۔

(بقیہ صفحہ ۲۲۰)

معاملات سُلجھ رہے ہیں لہذا مَیں نے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ آپ کی مدد کی ہے۔ آخر اُس ظالم سے میرا بیاہ کرنے میں یہی مطلب تھا تاکہ دونوں سلطنتیں ایک ہو جائیں پھر آپ کس خسارہ میں رہے جبکہ آپ نے اپنی لڑکی کا حقیقی شوہر پالیا ہے۔ دیا سے کام لیجئے پتاجی اور میرے شوہر کے ساتھ انصاف کیجئے۔ اُسے موت کے گھاٹ اُتارنے کی بجائے اُسکی امداد کیجئے تاکہ وہ اپنا کھویا ہوا راج حاصل کرلے اور اس طرح دو سلطنتوں میں سچا اور صحیح اتحاد قائم ہو سکے جیسا کہ مجھ میں اور میرے پتی میں ہوا ہے۔"

راجہ نے کہا "یہ ایک جھوٹی کہانی ہے جو مجھے دھوکا دینے کیلئے بنائی گئی ہے۔"

اور تب اَنگا نے کہا "اے راجہ اب تک مَیں نے کچھ نہیں کہا کیونکہ مَیں اپنی زندگی کی بھیک نہیں مانگتا اور نہ مجھے اسکی پرواہ ہے لیکن سُنئے آپ کی لڑکی نے جو کچھ میرے متعلق کہا ہے وہ سچ ہے لیکن اِس قصہ کی دوسری کڑیاں اُس نے مجھے بھی نہیں بتائیں اس وقت مَیں نے اپنے چچا، آپ اور آپ کی لڑکی کے متعلق سُنیں اس سے قبل اِن کا مجھے بھی علم نہ تھا۔ اب آپ اسے غلط سمجھیں یا سچ جانیں۔ آپ معاملات کی تحقیقات کر سکتے ہیں غلط ثابت ہونے کی صورت میں ایک نہیں سَو بار مجھے موت کی سزا دیجائے۔ یا اگر مجھے تھوڑی فوج دیدی جائے تو آپ دیکھیں گے کہ مَیں کتنی جلد اپنا کھویا ہوا راج حاصل کرلیتا ہوں کیونکہ میری پرجا مجھ سے محبت کرتی ہے اور زبردستی میرے چچا کی مطیع ہو گئی ہے۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ وہ آپ سے اِس لئے دوستی کرنا چاہتا ہے کہ وہ کمزور ہے اور جانتا ہے کہ بغیر کسی سلطنت کی مدد کے وہ زیادہ دِن تک راج گدی پر نہیں بیٹھ سکتا۔ لہذا جو آپ بہتر سمجھیں کریں لیکن اپنی لڑکی کو اپنے غصہ کا شکار نہ بنائیں کیونکہ اس میں ساری خطا میری ہے لیکن میرا خیال ہے کہ مَیں بے قصور نہیں ہوں، سُنئے ہمارا ملاپ قصداً نہیں بلکہ اتفاقاً ہوا کیونکہ محل کی کھڑکی پر چڑھتے وقت مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ وہاں کون تھا اور اب مَیں تیرے اختیار میں ہوں۔"

اور جب یہ باتیں وہ کر رہا تھا حُسن کی دیوی جل کنول نے اُسکی آواز میں دلکشی اور اُس کے اعضاء میں حُسن سمو دیا تھا۔ راجہ اپنی مرضی کے خلاف اُسے پسندیدگی نظروں سے دیکھتا رہا اور دل میں بولا "یہ ٹھیک کہتا ہے کیونکہ میری لڑکی اسکی پرستش سے بہت عقلمند ہو گئی ہے اور وہ خود اتنا حسین ہے کہ عورت کو اس سے پریم کرنے کیلئے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ مَیں نے آج تک اتنا زیادہ خوبصورت آدمی نہیں دیکھا۔ کاش یہ قصہ صحیح ہوتا کیونکہ میری لڑکی کیلئے یہ بہترین داماد ہے۔ اور جب اَنگا نے اپنی گفتگو کا سلسلہ ختم کیا تو راجہ اُسے دیر تک آنکھیں بھینچے ہوئے دیکھتا رہا۔ اُس کا دل غصہ، نفرت، محبت اور قصہ کے اثرات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور جب وہ خاموش کھڑا تھا

راجکماری اُس کے چرنوں میں جھک گئی اور بولی "پیارے باپ! اس کے قتل کا حکم دینے کے بجائے اسکی مدد کیجئے اسی میں آپ کا بھلا ہے اور میرے ساتھ آپ جو چاہیں کریں کیونکہ مَیں نے حقیقت میں جلد بازی کی اور اسی لئے سزا اور ذلت کی سزاوار ہوں۔ مَیں ایک کمزور عورت ہوں اُس کے حُسن نے مجھے کھینچا اور مَیں کھنچی چلی گئی۔ لیکن سُنئے آپکی نسل میری ذات میں ہے اور اِدھر وہ آپ کے پوتے کا باپ کھڑا ہے اور کیا آپ کا خیال ہے کہ ایسے شخص کی اولاد ایک ایسے بچے کو جنم دے گی۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے باپ سے نگاہیں چار کیں اُس وقت اُس کی خوبصورت آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ یہ گرم آنسو راجہ کے غصے پر گرے اور اُسے پگھلا دیا اور اُس نے اپنی لڑکی کو پہلو میں لیکر اُسکی پیشانی کو بوسہ دیا اور اُس کے بکھرے ہوئے بالوں کو چہرے سے ہٹاتے ہوئے کہا "پیاری بیٹی! اگر مَیں چاہوں بھی تو تیرا دشمن نہیں ہو سکتا۔ تیرے آنسوؤں نے میری آنکھوں کو بھی اشکوں سے بھر دیا ہے اور اگر تو نے بہت جلد بازی کی ہے تو مَیں ایسا نہیں کرونگا۔ تیرا پتی میرے پاس رہے گا تاوقتیکہ مَیں حقیقت معلوم نہ کرلوں اور اگر ایسا ہی ہے جیسا کہ تو کہتی ہے تو پھر وہی ہوگا جو تو چاہیگی۔"

راجکماری ایک چیخ کے ساتھ باپ سے لپٹ گئی اور اُس کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی —— پھر راجہ کی مدد سے اَنگا نے اپنا کھویا ہوا راج حاصل کیا اور "جنگلی پھول" اس کی رانی بنی۔ سچ ہے شوہر کی قسمت بیوی کے مُبارک قدم سے بنتی ہے۔

(۱۹)

حُسن کی فتح

تب "جل کنول" اُسے چھوڑ کر زمین سے آسمان کی طرف اُڑ گئی جہاں اُس نے دیکھا تمام دیوتا اندر کے اکھاڑے میں جمع ہیں وہ انپر حقارت سے ہنسی اور پھر بولی "اب آپ لوگوں نے دیکھا کہ ایک یا سب کی کوشش بھی میرا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ آپ لوگوں کی نفرت اور مخالفت کے باوجود میری طرفداری نے اس راجپوت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اور اندر نے تو ایک آدم زاد کے رُوپ میں میرے حُسن سے بڑی شکست کھائی۔"

حُسن کی دیوی اِس طرح اُنکی توہین کرکے فاتحانہ انداز میں ہنستی ہوئی چلی اور جاتے جاتے کاندھوں پر سے مُڑتے ہوئے گوشہ چشم دبا کر دیوتاؤں کو اس والہانہ انداز سے دیکھا کہ اُن کے دلوں میں ہزاروں شوشیاں بھڑکنے لگیں۔

تب انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور کہا "بغیر "جل کنول" ہم سب کو بیوقوف بنا گئی اور یہ بات اب ناقابل برداشت ہو گئی ہے۔

(باقی صفحہ ۲۲۳)

یہ ایک معجزہ ہوا ہے

میرے محترم جناب عامل حکیم کریم الدین صاحب لاہور

السلام علیکم ۔ میری بیوی عرصہ سے بیمار تھی ۔ علاج معالجہ حکمت اور ڈاکٹری ہر قسم کیا گیا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا ۔ مریضہ کی دونوں ٹانگیں جڑ گئیں تھیں ۲۰ اردسمبر ۱۹۳۵ئہ کو میں آپ کے دفتر میں آیا اور حالات بتائے ۔ پانچ عدد عملیات بتیاں عنایت ہوئیں ۔ اور طریقہ استعمال بتایا گیا ۔ کیا عرض کروں ۔ پہلی ہی بتی جلانے سے مریضہ کی ٹانگیں سیدھی ہو گئیں ۔ یہ ایک معجزہ ہے ۔ جس نے اس علاقے میں ہر چہار طرف ان عمل بتیوں کا شہرہ کر دیا ہے ۔ میں نے تقریباً پندرہ سو روپیہ مریضہ کی بیماری پر خرچ کیا تھا اور مایوس ہو گیا تھا ۔ اخباروں میں آپکا شہرہ سن کر آیا تھا ۔ واقعی آپکا علاج اعلیٰ ہے ۔ مریضہ ہر وقت آپکو دعائیں دیتی رہتی ہے ۔ لوگ باہر سے آکر دریافت کرتے رہتے ہیں جو کچھ ہم نے دیکھا ہے کہہ دیا کرتے ہیں ۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو تحریر فرمائیں ۔ اگر میرے حالات مشتہر کرنا چاہیں تو اجازت ہے ۔ کیونکہ ہم آپ کے مداح ہیں ۔

چوہدری منظور حسین ذیلدار چک نمبر ۳۶ جنوبی ڈاکخانہ خاص ضلع سرگودہا ۔

علاوہ ازیں دنیا کہتی ہے کہ عامل حکیم کریم الدین طبیب روحانی اپنے علم و عمل میں ماہر ہیں ۔ جناب ملک محمد نور رسالدار پنشنر آئی ۔ او ۔ ایم کنڈال ضلع شاہ پور جناب خانچند رام دیو ڈیرہ اسمٰعیل خاں جناب عباد اللہ ریلوے سٹور کیپر لاہور جناب ترلوک سنگھ شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی لاہور جناب کرم چند و دیارتھی جنرل سیکرٹری منیجر بھارت بیمہ کمپنی لاہور جناب پورٹ سنگھ صاحب پٹواری ضلع لاہور جناب میاں جگدیش سنگھ صاحب مجسٹریٹ درجہ اول دہلی جناب ملک شیخ چشتی پیر سکندر ریاست بہاولپور جناب خان محمد خاں ریٹائرڈ سب جج آنریری مجسٹریٹ راولپنڈی ۔ جناب آغا جعفر ایس ۔ ڈی او راولپنڈی جناب مرزا مظفر علیخاں صاحب جج ہائیکورٹ جناب نفیس الحسن صاحب پیشکار سپیشل مجسٹریٹ خورجہ ضلع بلند شہر ۔

یہ سب صاحبان تحریر فرماتے ہیں کہ جناب عامل حکیم کریم الدین انارکلی لاہور کے علم و عمل کی آزمائش کی آپ اپنے علم و عمل میں ماہر ہیں علاوہ ازیں اگر حضرات شریف و النساء اپنی قسمت کا صحیح حال معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آجکل کیا حالت گزر رہی ہے اور کب تک رہے گی یا اس سے بلند ہو گی یا کمی میں ہو گی اس کا کوئی تدارک بھی ہو سکتا ہے یا نہیں ۔ یا کسی ایسی بیماری کا دفعیہ چاہتے ہیں جس پر دوائی وغیرہ اثر نہ کرنے کی وجہ سے لاعلاج قرار دی گئی ہے باوجود کسی لائق حکیم یا ڈاکٹر کے علاج کرنے سے مرض بڑھتا جا رہا ہو ۔ یا کسی نے جادو ٹونہ سحر وغیرہ کر کے بیماری لگا رکھی ہے جس لئے باوجود شفایاب ہونے کے بیماری بگڑتی جا رہی ہے یا کسی مقدمہ سے حیران ہیں یا کسی عزیز دوست سے ناچاقی رہتی ہے یا میاں بیوی کے تعلقات ناخوشگوار ہو رہے ہیں یا کسی کی محبت میں گرفتار ہیں یا بیروزگار ہیں ۔ ملازمت نہیں ملتی یا مقروض ہیں ۔ قرضہ سے نجات نہیں ملتی ۔ یا نتیجہ امتحان قبل از وقت معلوم کرنا چاہتے ہیں ۔ غرض کہ دنیا بھر کی کوئی تکلیف ہو مشورہ کیجئے ۔ لاکھوں ذی عزت شرفا اور افسران آزمائش کر چکے ہیں ۔

منہ مانگی مراد مل سکتی ہے ← بشرطیکہ آپ ← عملیات روحانی معجزہ ۔

تعویذ منگوا کر اپنے پاس رکھیں ۔ ہزارہا بندگان خدا کامیاب ہو چکے ہیں اور عملیات کی تعریفیں کر رہے ہیں ۔ جن کی تحریریں دفتر میں تشریف لا کر ملاحظہ فرما سکتے ہیں ۔ عرصہ تیس سال سے لاہور میں دن دگنی اور رات چوگنی شہرت ہو رہی ہے ۔ آپ بھی کسی تکلیف میں ایک مرتبہ آزمائش کیجئے ۔ اگر لاہور آنے سے معذور ہیں تو خط و کتابت جوابی کریں ۔ عید تک ہدیہ نصف لیا جائے گا ۔ یعنی پانچ روپے کے بجائے ۲؍ ۸ کسی قسم کی تکلیف کے متعلق مشورہ مفت ۔ صرف خط و کتابت جوابی کا جواب دیا جائیگا ۔

وقت ملاقات صبح ۱۰ بجے سے ۶ بجے شام تک

منیجر دفتر عامل حکیم کریم الدین طبیب روحانی رجسٹرڈ ۔ انارکلی ۔ لاہور

اندر نے کہا۔ "اگرچہ وہ اپرادھی انسان جس کو میں نے اسکی بیوی کی خاطر بخش دیا تھا سزا کا مستوجب تھا لیکن اس نے اسکی کوئی پرواہ نہ کی لہٰذا اس معاملہ میں اب اصل مجرم یہ بیوی ہے کیونکہ اس نے ہم سب کو نیچا دکھایا اور ایک آدمزاد کا ساتھ دیا۔ جو ہماری برائی کرتا اور اس کی تعریف کے گن گایا کرتا تھا اس لئے ہم سب کو مل کر اس "جل کنول" کے خلاف احتجاج کرنا چاہیئے اور اُسے سزا دلوانی چاہیئے۔ کیونکہ اگر اسے یونہی چھوڑ دیا جائے تو خدائی اور انسانی معاملات میں ہمیشہ کے لئے پیچیدگیاں پیدا ہو جائینگی۔ وہ ابھی ناتجربہ کار ہے اور اصلاح قبول کر سکتی ہے اور اگر اس کی روک تھام نہ کیگئی تو وہ روز بروز خراب ہوتی جائیگی۔ لہٰذا اب ہم کو وقت ضائع نہ کرنا چاہیئے"۔

تب سب دیوتا مل کر ایک مجمع کی صورت میں میرے (مہیشور کے جو قصہ بیان کر رہے ہیں) پاس آئے۔ لیکن میں نے کہا۔ "یہ معاملہ مجھ سے تعلق نہیں رکھتا۔ اگر تمہیں "جل کنول" سے کوئی شکایت ہے تو نارائن کے پاس جاؤ کیونکہ بیوی کو سزا دینے کا حق سوا اُس کے شوہر کے اور کسی کو نہیں"۔ یہ کہکر میں نے انہیں واپس کر دیا۔ تب وہ ایک عرصہ تک نارائن کو سارے سنسار اور آکاش میں تلاش کرتے رہے لیکن اُن کا کھوج نہ لگا۔ اور پھر وہ آخر کار سمندر کے بیچ میں ایک کنول کے پتے پر لیٹے ہوئے ملے جو سمندر کی موجوں میں بہتا چلا آرہا تھا وہ تفکر میں غرق تھے اور اپنا بایاں انگوٹھا چوس رہے تھے اور جب سب دیوتا آکر خاموشی سے اُن کے گرد جمع ہو گئے تو اُنہوں نے منہ سے انگوٹھا نکالتے ہوئے سب کو حیرت اور مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھا گویا وہ اُن سب کے آنے کا سبب دریافت کر رہے تھے۔ تمام دیوتا جس میں اندر بھی تھے تعظیم سے آداب بجالاتے ہوئے بولے۔ "اے دیوتا! ہم سب آپکے آپ کی بیوی کی شکایت کرنے آئے ہیں جس نے ایک ایسے آدم زاد کی طرفداری کر کے ہم سبکو ذلیل کیا ہے جو دیوتاؤں کو گالیاں دیا کرتا تھا اور اُسکی تعریف کے خوشامدانہ گیت گاتا تھا۔ اور اس معاملہ میں وہ ہماری ہنسی اُڑاتی ہے اگرچہ عمر میں وہ ہم سب سے چھوٹی ہے اور اب اُس نے خود کو کہیں چھپا لیا ہے باوجود تلاش کے اس کا کوئی پتہ نہ ملا۔ اس لئے ہماری پرارتھنا ہے کہ آپ اُسے صلاحیت و شائستگی کا سبق اور بڑوں کی تعظیم کرنیکی ترغیب دیں کیونکہ اُس کے ناتجربہ کارانہ افعال ہماری بے عزتی اور توہین کا باعث بن رہے ہیں"۔

تب حسن کی دیوی "جل کنول" کے پتی نارائن کے لب ہلے اور اُنہوں نے اپنی بیوی کا نام لے کر آہستہ سے پکارا۔ یہ آواز تینوں سنسار کی فضاؤں میں پھیل گئی اور ایسی گونج اُٹھی جیسے بربط کے تار ہوا کے جھونکوں سے مرتعش ہو کر بجنے لگیں اور جب اس سنسناہٹ کا طوفان تھم گیا تو سمندر جھاگ سے سفید نظر آنے لگا اور دفعتاً اس جھاگ میں سے حسن کی دیوی دوسری مرتبہ نکلی (پہلا وقت وہ تھا جب "جل کنول" سمندر کی متھانی میں پیدا ہوئی تھی) وہ کھڑی ہوئی تھی اور اس کے ننھے خوبصورت پاؤں کچھوے کی پیٹھ پر ٹکے ہوئے تھے۔ سمندر کا پانی اُس کے اعضا سے ٹپک رہا تھا جس کے نمک کے ذرّے روشنی میں ایک خاص چمک پیدا کر رہے تھے۔ اس کی گردن سیپی کی طرح تھی اور اُس کے سر کے جواہرات سبز زمرد ونکے تاریک سایوں کو منعکس کر رہے تھے جو گردن میں پڑے تھے۔ اُس کے ایک ہاتھ میں ایک سیاہ نیلگوں کنول تھا جو اس کی دراز مژگاں والی سایہ دار آنکھوں سے ہمرنگی کا دعویٰ کر رہا تھا۔ بازوبند گداز بازوؤں پر دلفریب حلقے بنا رہے تھے۔ شفاف اور چکنے پاؤں جو گھٹنے کے قریب ایک خاص انداز سے خم ہو گئے تھے سُرخ مونگے کے ٹکڑوں سے لدے تھے اور انکا رنگ اُن ہونٹوں کے شہابی رنگ کے آگے پھیکا پھیکا ہو رہا تھا جو غرور سے مسکرا رہے تھے۔ سینے کے دونوں کٹورے ایک دوسرے سے کچھ ہی پرے تھے جیسے دو بہنیں لڑ کر الگ ہو گئی ہوں۔ اور ان کا مدہم مدّوجزر سمندر کے راگ سے ہم آہنگ ہو رہا تھا۔ بائیں ہاتھ میں نیلے بالوں کی ایک لٹ تھی جو سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی سمندر کی موجوں پر لوٹ رہی تھی۔ اسی طرح وہ خاموش کھڑی رہی۔ اُس کے نرم لباس کی سلوٹوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اُس کی نازک کمر تین جگہ سے خم تھی۔ سمندر کا کف بدستور کچھوے کی پیٹھ سے آ آکر ٹکرا رہا تھا اور اُسکی قوس بناتی ہوئی انگلیوں کو چُھونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا اور اُسکی نظریں سمندر کے میدان میں دُور اُفق کی لکیروں پر جمی ہوئی تھیں۔

دیوتاؤں کی متحیر نظریں جب اُس پر سے ہٹیں تو وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ گو سب خاموش تھے ہر ایک دوسرے کے دل کی بات سمجھ رہا تھا یعنی کہ "ایسی حسین ہستی پر الزام لگا کر اُسے سزا کے قابل ٹھہرانا کس طرح ممکن ہے"۔ اس لئے وہ حیرت سے ایک دوسرے کو کھڑے دیکھتے رہے "جل کنول" بھی اسی طرح انکے سامنے انتظار کرتی کھڑی تھی۔ وشنو نارائن نے اپنی خوابیدہ آنکھیں اُٹھائیں، پہلے سب کو دیکھا پھر اُسے دیکھا۔ اور وہ سب بغیر کچھ کہے نہایت سنجیدگی کیساتھ اُٹھ گئے اور پرندوں کی ٹکڑی کی طرح دیکھتے دیکھتے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

تب وشنو نے اپنی پتنی کی طرف پریم میں ڈوبی ہوئی نظروں سے دیکھا اور ایک لطیف تبسم کے ساتھ اُسے قریب آنیکا اشارہ کیا۔ "جل کنول" آئی اور اپنے مالک کے چرنوں میں بیٹھ گئی اور اُنکے پاؤں اپنے کنول سے زیادہ نرم ہاتھوں سے دبانے لگی۔ وشنو اپنی نیم باز آنکھوں سے اُسے گھورتے رہے اور سمندر کی موجیں اُنکے کنول کے بستر کو جھولا جھلاتی رہیں یہانتک کہ سورج رات کی تاریکی میں اُنکو سمندر کے سینے پر بہتا ہوا چھوڑ کر غروب ہو گیا۔

اِختتامیہ

اِس کے بعد مہیشور خاموش ہوگئے پھر اپنے بالوں سے "قصہ گو" کو نکالا اور نیچے زمین پر رکھدیا اور کہا "تو نے ساری داستان سُن لی ہے اب جا اور اپنے راجہ سے بیان کردے"۔

لیکن قصہ گو پہاڑ سے نیچے اُترنے کی بجائے اُسی جگہ مُنہ کے بل برف پر گر پڑا اور بولا۔ "اے مہیشور! اے شامبو! اے تین آنکھیں اور ترسول رکھنے والے! اے روزی دینے والے سب سے بڑے دیوتا! تُو نے اپنے قصہ کی پوتّر شرائے سے میرے کانوں کو مقدس بنا دیا لیکن میری ایک پرارتھنا اور ہے"۔ مہیشور نے پوچھا "کہہ اور کیا چاہتا ہے"۔ اور قصہ گو نے کہا "مجھے سمندر کی جھاگ سے پیدا ہونے والی اُس "جل کنول" کی ایک جھلک دکھا دے جب وہ سارے دیوتاؤں کے سامنے سمندر سے طلوع ہو رہی تھی"۔

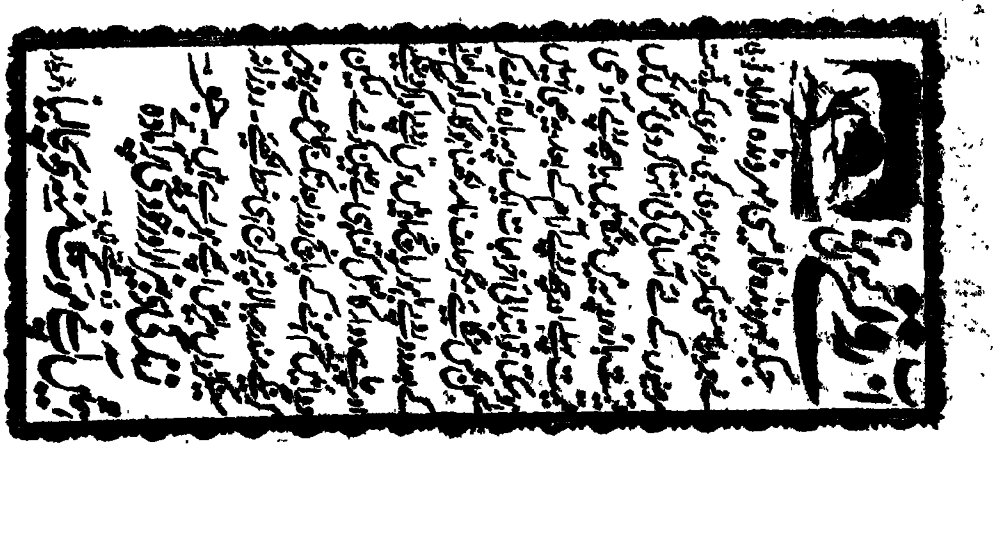
تب اُس بڑے دیوتا نے چپکے سے اپنے بیوی کے کان میں کہا۔ "دیکھو یہ کوتاہ نظر بیوقوف اِنسان بغیر سوچے سمجھے سوال کر بیٹھتے ہیں اور اپنے ہاتھ سے اپنی ہی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔ پھر داستان گو سے پُوچھا "کیا حقیقت میں تو اِس لازوال حُسن کو دیکھنا چاہتا ہے؟" قصہ گو نے جوابدیا "ہاں"۔ تب مہیشور نے اوما سے کہا "جاؤ اور تلاش کرو "جل کنول" کہاں ہے۔ اُس سے کہو میں اُسے بُلاتا ہوں"۔ یہ سُنتے ہی اسکی بیوی بجلی کی طرح فضا میں غائب ہوگئی۔ دیوتا اور آدم زاد دونوں انتظار کرتے رہے۔ مہیشور کا تاج برف سے لدی ہوئی چوٹیوں پر چمکتا رہا اور کچھ دیر بعد پربت کی بیٹی "جل کنول" کو لیکر آئی اور اُس حسن مجسم نے کہا۔

"میں حاضر ہوں وہ کونسا معاملہ ہے جس کے مشورے کیلئے بیٹھے تو نے مجھے بلایا ہے؟"

مہیشور نے کہا "نارائن کی جیتی! یہ ایک فانی اِنسان ہے جسے میں نے ایک سچن دیا ہے۔ اسمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تم اُسے اپنے حسن کی ایک جھلک دکھا دو"۔ پھر اُس نے قصہ گو سے کہا "گردن اوپر اُٹھاؤ اور دیکھو"۔

قصہ گو نے سر اُٹھایا اور پربت کی برفانی چوٹی سے اوپر آسمان کے تاریک خلا میں دیکھا اور یکایک دیوی نے اپنے آپ کو ظاہر کیا جیسے کوئی تصویر دیوار پر کھینچ جاتی ہو۔ اور اُس کی آنکھوں میں ایک جھپک کے ہزارویں حصہ کیلئے ایک بجلی سی کوندی اور برف سے لدے ہوئے پہاڑ کی چوٹی پر سیاہ نیلگوں آنکھوں کا ایک جوڑا چمکا جس نے اُس کے دل کو اُس گھاس کی پتی کی طرح جلا ڈالا جو جنگل کی آگ میں خود بخود جھلس کر ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاتی ہے۔ قصہ گو نے ایک چیخ ماری اور دونوں ہاتھوں سے دل کو تھام کر برف پر گرا اور مر گیا۔

تب مہیشور نے کہا "ایک فانی اِنسان تیرے جلوے کی تاب کیونکر لا سکتا ہے لیکن یہ لاش یہاں پڑی نہ رہنی چاہیئے"۔ تب انھوں نے پاؤں کا سہارا دیتے ہوئے اُسے ہاتھ سے اُٹھا کر نیچے پھینکدیا اور وہ لاش برف کی سرد فضا میں سیٹی کی آواز کے ساتھ گزرتی ہوئی ہردوار کے قریب گنگا میں جا گری لیکن بدقسمت قصہ گو کی رُوح فوراً زمین پر آئی اور پھر پیدا ہوئی اور اِس دوسرے جنم میں وہ شاعر تھا جو ہمیشہ دھرتی کے سینے پر ان دو آنکھوں کی جستجو میں گھومتا رہا جنھیں وہ کبھی نہ پا سکا۔



اک پیکرِ جمیل سے

نظم

از حضرت جلال ملیح آبادی

اللہ رے یہ شوخیاں اے دلبرِ بیباک گُل ریز تبسم سے اک عالم ہے طربناک
ہیں پائے حنائی سے معطر خس و خاشاک اِس مست خرامی سے ہے مسرور دلِ خاک
اے غیرتِ ناہید یہ انگڑائیاں توبہ
چہرے پہ ہیں فردوس کی پرچھائیاں توبہ

یہ کُندنی ماتھے پہ مچلتا ہوا آنچل جیسے شبِ مہتاب میں جھومے ہوئے بادل
یوں نغمہ سناتی ہوئی ہر گام پہ چھاگل جس طرح بجے موسمِ برسات میں جنگل
ہے خوابِ شبِ ماہ ترا روئے جمالی
یہ چاندنی عارض کی' یہ ابروئے ہلالی

یہ پیکرِ گُل پیرہن و رُوئے کتابی تقریر میں اک سحرِ لب و لہجہ ربابی
اک موج سی رخسار پہ ہلکی سی گلابی ہلکی سی ادائیں ہر اک انداز شرابی
اے پیکرِ گلنار یہ رعنائیاں توبہ
دزدیدہ نگاہی یہ دل آرائیاں توبہ

ہیں نازنیں باہوں میں جھلکتے ہوئے کنگن یا شاخِ صنوبر پہ یہ ہے پرتوِ گلبن!
زلفوں کی گھنی چھاؤں میں عارض ہیں کہ گلشن ساون ہیں کہ زلفیں ہیں یہ زلفیں ہیں کہ ساون
ہر لمحہ مرے دل کی گرہ کھول رہی ہے
تو چُپ ہے مگر تیری نظر بول رہی ہے

آ خلوتِ شاعر میں بھی' اے رشکِ زلیخا تو پیکرِ انساں میں ہے گردوں کا ستارا
ہوں کتنے شب و روز میں غرقِ تمنا اک روز تو آ کوچۂ شاعر میں خدارا
اللہ کرے تیرا شباب اور چمک جائے
ساغر میں جوانی کے شراب اور چھلک جائے

یہ زلفِ رسا تا بہ کمر عطر فشاں ہو پہلو پہ ترے وادیٔ ایمن کا گماں ہو
مہتاب ترے حُسن کی جانب نگراں ہو پیشانی پہ زہرہ' اس طرح ابرو کی کماں ہو
پھر مصر میں اک غلغلۂ حُسن و نظر ہو
طالع تری برنائی کی اس طرح سحر ہو

مفتاح العلوم شرح مثنوی مولانا روم

اُردو میں مثنوی مولانا روم کی یہ جدید شرح کہ جو حال ہی میں تیار ہوئی ہے اور جس کے مقبول عام اور بہترین ہونے کے متعلق صرف اسی قدر لکھ دینا کافی ہے کہ اس کے خریداروں میں والیان ریاست جاگیردار کونسلوں کے پریذیڈنٹ و ممبر ہائیکورٹ کے جج بیرسٹر وکیل محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر کالجوں کے پرنسپل سکولوں کے ہیڈ ماسٹر اسلامی درسگاہوں کے مدرس اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر مشہور علما خطیب مفتی نامور واعظ و لیکچرار قابل مصنف اور ہندوستان کے پیشوائے طریقت نیز ہر مذہب و ملت کے صوفیانہ خیال کے لوگ شامل ہیں پس اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ جس کتاب کے خریداروں میں ایسے ایسے معزز اور باکمال حضرات موجود ہوں وہ کسی مزید تعریف کی محتاج ہو سکتی ہے تاہم آپ کے مزید اطمینان کیلئے شرح کی

چند خوبیاں درج ذیل ہیں

۱. مثنوی شریف کا اصل فارسی متن اعلیٰ قلم سے نہایت خوشخط مع بعض بعض اعراب دیکر لکھا گیا ہے۔
۲. مشکل الفاظ کی لغوی و اصطلاحی تشریح وضاحت کے ساتھ کی گئی ہے ......
۳. ہر شعر کی صرفی نحوی ترکیب جامع اختصار کے ساتھ لکھی گئی ہے ......
۴. ہر شعر کے اندر علم معانی۔ علم بیان۔ علم بدیع کے جو نکات مضمر ہیں ان کو ظاہر کر دیا گیا ہے ......
۵. ہر شعر کا ترجمہ اس خوبی کے ساتھ سلیس اردو میں کیا گیا ہے کہ جو تحت لفظی بھی ہے اور بامحاورہ بھی۔
۶. ہر شعر کا مطلب قرآن و حدیث و اقوال ائمہ کے حوالہ جات سے مفصل طور پر لکھا گیا ہے ......
۷. مثنوی کے ہر شعر کے مطابق تمثیلاً مشہور شعرائے صوفی مشرب کے فارسی و اردو اشعار لکھے گئے ہیں ..
۸. شرح کے حاشیہ پر اکثر اشعار کے مطلب کا خلاصہ لکھ دیا گیا ہے تاکہ کسی مضمون کے تلاش کرنے میں دقت نہ ہو ..
۹. ہر حصہ شرح میں ایک ایسی جامع فہرست مضامین لگا دی گئی ہے کہ جس کے مطالعہ کر کے ہر قسم کا مضمون فوراً دیکھا جا سکتا ہے۔
۱۰. لکھائی چھپائی۔ کاغذ بہترین و اعلیٰ۔ ......

مزید اطمینان کی ضرورت ہو تو تین پیسہ کے ٹکٹ بھیجکر شرح کے چند ورق منگا کر مطالعہ فرمائیں قیمت جا بجا کی خوبیوں کے لحاظ سے بالکل کم ہے جو درج ذیل ہے

حصہ اول بلا جلد [illegible] حصہ دوم بلا جلد [illegible] حصہ سوم بلا جلد [illegible] حصہ چہارم بلا جلد [illegible]
حصہ پنجم بلا جلد [illegible] حصہ ششم بلا جلد [illegible] حصہ ہفتم بلا جلد [illegible] حصہ ہشتم بلا جلد [illegible]
مجلد بطرز ولایتی جس پر سنہری حروف میں کتاب کا نام درج ہو فی حصہ آٹھ آنے زائد
حصہ اول و دوم یکجا مجلد [illegible] روپے۔ حصہ سوم و چہارم یکجا مجلد [illegible] روپے۔ حصہ پنجم و ششم یکجا مجلد [illegible] روپے
حصہ ہفتم و ہشتم یکجا مجلد [illegible] روپے ہر قسم کی کتابیں قریشی بک ایجنسی لاہور سے منگائیں فہرست مفت

منگانے کا پتہ | محمد حفیظ اللہ قریشی تاجر کتب و مالک قریشی بک ایجنسی لاہور

قرآن داں انگریز لڑکی

۱۴۵۶ء کا ایک جگر پاش واقعہ

از جناب امداد علی مضطر میرٹھی

کہتے ہیں کہ ہنری ہشتم شاہ انگلستان کے عہد میں سر ولیم اسکیو ایک نہایت دولتمند، پاک طینت اور اپنے مذہب کے پکے شخص تھے۔ اُن کی ایک بیٹی تھی این اسکیو۔ این اسکیو بھی اپنے باپ کی طرح بہت شریف الطبع اور نیک تھی۔ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ قرآن کریم کی تعلیم خاص طور پر حاصل کی تھی۔ وہ نہایت توجہ سے روزانہ تلاوت کرتی۔ یہی نہیں بلکہ قرآن مجید کے ہر ایک نکتہ کو پوری طرح سے سمجھنے کی کوشش کرتی۔ اُس نے اپنی زندگی کے بیشتر اُصول قرآن حکیم کی تعلیم کے مطابق بنا رکھے تھے۔ سر ولیم اسکیو ایک قدامت پسند آدمی تھے۔ اُنہوں نے این اسکیو کی شادی اس کی صلاح کے بغیر ایک متمول شخص کے ساتھ کردی۔ سوء اتفاق سے این اسکیو اور اس کے شوہر کے خیالات میں بُعد المشرقین تھا۔ اسکیو جسقدر پاکباز اور صاحب اصول لڑکی تھی اس کا شوہر اسی قدر کمینہ خصلت اور بے اُصول شخص واقع ہوا تھا۔ اسکیو کو اگرچہ اپنے شوہر کی جانب سے سخت تکالیف پہنچتی تھیں لیکن اُس شریف لڑکی نے کبھی اپنے باپ سے ذکر تک کرنا گوارا نہ کیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ باپ سے ایسے شخص کی برائیاں بیان کرے جس کو خود اُس کے والد نے اس کیلئے منتخب کیا تھا۔

این اسکیو کیلئے شوہر کی ہر قسم کی سختیاں قابل برداشت تھیں لیکن صرف ایک بات نہایت تکلیف دہ تھی۔ اور وہ یہ کہ اس کا شوہر رومن کیتھولک عقائد کے بموجب اُسے تلاوتِ قرآن مجید سے روکتا تھا۔ اوّل اوّل تو وہ اس کو معمولی بات سمجھکر ٹالتی رہی اور حسبِ دستور تلاوت کرتی رہی۔ مگر جب اس کے شوہر کی تنبیہہ ناقابل برداشت ہوگئی تو ایک دن اس نے اپنے شوہر سے صاف کہدیا کہ "تمہارا ہر حکم میرے سر آنکھوں پر مگر میں اس بات کو منظور نہیں کرسکتی"۔ چنانچہ وہ بدستور اپنے کام میں مصروف رہی۔ اُدھر مذہبی ٹھیکیداروں نے اس کے شوہر کو پریشان کرنا شروع کیا۔ ہر جائز و ناجائز طریقہ سے اُس پر دباؤ ڈالا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اسکیو کو فوراً گھر سے نکل جانے کی دھمکی دی۔ اسکیو نے بخندہ پیشانی شوہر کے اس سخت حکم کو سُنا اور اپنے دونوں بچوں کو لے کر اپنے باپ کے گھر چلی آئی۔ یہاں آکر وہ اطمینان کا سانس لینا چاہتی تھی مگر لوگوں نے اُسے وہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور اسکیو ایک شب خفیہ طور پر لندن روانہ ہوگئی۔ لندن پہنچنے پر اسے کسی قدر سکون میسر ہوا مگر چند ہی دن بعد شریروں نے اس کا پتہ لگالیا اور اس کے پیچھے خفیہ جاسوس لگا دیئے۔ اور ساتھ ہی لندن کے پادری صاحب کو اسکیو کے بدعتی ہونے اور اپنا دیس چھوڑ کر لندن میں پناہ گزیں ہونیکی اطلاع دیدی گئی۔

کچھ عرصہ بعد این اسکیو کو پادری کے حضور میں طلب کیا گیا۔ تاکہ وہ اپنے خیالات کے متعلق جواب دہی کرے۔ پادری نے اسکیو سے متعدد ایسے سوالات کئے جن کا جواب کمسن لڑکی کیلئے مشکل ہی نہیں قطعی ناممکن تھا۔ لیکن وہاں تو کوئی دوسری طاقت کام کر رہی تھی۔ پادری کے ہر سوال کا اسکیو نے اسقدر معقول جواب دیا کہ نہ صرف پادری بلکہ تمام اہل مجلس دنگ رہ گئے۔ آخر کار جب پادری سوالات کرتے کرتے تھک گیا۔ نہیں بلکہ اسکیو کے جوابات سے لاجواب ہوگیا تو اسکیو کو حاکم شہر کے پاس بھیجدیا گیا۔ حاکم کے حکم سے اُسے زیر حراست رکھا گیا۔ اس کی سخت نگرانی کی گئی اور بشپ کے حکم سے ایک پادری این اسکیو کے پاس بھیجا گیا تاکہ وہ اس کے خیالات میں تبدیلی پیدا کرسکے۔ مگر پتھر میں جونک نہیں لگ سکتی۔ پادری صاحب اسکیو کو اس کے عقائد سے ایک انچ نہ ہٹا سکے۔

جب کوئی شخص کسی طریقہ سے اسکیو کو گمراہ کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا تو اس معاملہ کو لندن کے بشپ بونر نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ سُنتے ہیں کہ بشپ بونر نہایت عقلمند، سنجیدہ اور عالم فاضل شخص تھا۔ بونر نے اسکیو سے ملاقات کی اور دورانِ ملاقات میں اس سے بہت سے سوالات کئے لیکن ہر سوال کا جواب ایسا بے نقط پایا کہ بونر اپنی ناکامی پر جھلا اُٹھا اور غصہ میں بھرا ہوا وہاں سے واپس چلا آیا۔ تھوڑے دن بعد اسکیو کو رہا کردیا گیا۔

ایک سال گذر گیا۔ کوئی خاص واقعہ ظہور میں نہ آیا۔ حسن اتفاق سے ملکہ کیتھرائن اور این اسکیو میں بڑی محبت ہوگئی۔ ہر وقت اسکیو ملکہ کے ساتھ رہنے لگی۔ یہ دیکھ کر حاکمانِ شرع کو خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں ملکہ کیتھرائن کا ایمان بھی متزلزل نہ ہو جائے۔ اُنہوں نے اسکیو کو پھر گرفتار

کرکے شاہی مجلس کے روبرو پیش کیا۔ اس سے پہلے کی طرح بہت سے سوالات کئے گئے لیکن ہر سوال کا معقول جواب پایا اور اس مرتبہ بھی اسکیو کو سزا دینے کا موقع ہاتھ نہ لگا۔ بالآخر اس سے خاوند کی علیحدگی کا سبب دریافت کیا گیا اور کہا گیا کہ بادشاہ سلامت چاہتے ہیں کہ تم خود ہی صاف صاف اپنے خاوند کی علیحدگی کی وجہ بتاؤ۔ اسکیو نے برجستہ جواب دیا کہ "اگر یہ خواہش بادشاہ کی ہے تو وہ خود مجھ سے تنہائی میں دریافت فرما سکتے ہیں۔" دو دن تک بادشاہ کے سامنے اسکیو کا بیان ہوتا رہا لیکن معاملہ جہاں تھا وہیں رہا۔ اسکیو سے دریافت کیا گیا کہ یہ عقائد تم نے کہاں سے حاصل کئے۔ اسکیو نے کہا: "قرآن شریف سے۔" اتنا سننا تھا کہ بشپ غصہ سے تھرا اُٹھا اور بولا "تم کو زندہ جلایا جائے گا" اور اس کے بعد اُسے پھر جیلخانہ میں بھیج دیا گیا۔ اُسے ملکی مجرم ٹھہرایا گیا اور اس کے خلاف مقدمہ چلایا گیا۔ حاکم نے حکم دیا کہ اُسے زندہ جلا دیا جائے۔ اس حکم کو آئین اسکیو نے نہایت دلیری سے ہنستے ہوئے سُنا۔ اسکیو کے مخالفین کو کامل یقین تھا کہ اسکیو اس حکم سے خائف ہو کر اپنے خیالات سے باز رہنے کا وعدہ کرلے گی لیکن اُن کو اس کی یہ جرأت ایمانی دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی۔ اسکیو کو سب سے محفوظ اور مضبوط قیدخانہ میں بند کر دیا گیا۔ ایک مرتبہ پھر اس کے پاس مذہبی ٹھیکیداروں کا ایک وفد پہنچا اور ہر طرح سے بہکایا مگر بےسود۔ حاکم نے داروغہ جیل کو حکم دیا کہ اس کو شکنجہ میں کھینچ کر سخت ترین اذیت پہنچائی جائے۔ داروغہ جیل کو اسکیو کی حالت پر ترس آیا۔ اوّل تو وہ اس حکم کو ٹالتا رہا۔ آخرکار اس نے یہ کہکر حکم ماننے سے انکار کر دیا کہ "لڑکی بےحد کمزور ہے۔" جب حاکمان شرع نے دیکھا کہ داروغہ حکم ماننے سے انکار کرتا ہے تو اُن میں سے دو شخص خود ہی شکنجہ پکڑ کر کھڑے ہو گئے اور شکنجہ کو اپنی پوری قوت سے دبا دیا جس کی وجہ سے اسکیو کے بدن کا ہر عضو الگ ہو گیا۔ اس قدر تکلیف کے بعد پھر ان پادریوں نے اسکیو سے اپنے خیالات درست کرنے کو کہا۔ مگر اسکیو کے صاف جواب سے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ آخر اسکیو کے جلائے جانے کی تاریخ مقرر کی گئی۔ تاریخ مقررہ پر اسکیو کو ایک کرسی پر بٹھا کر لے گئے۔ ایک ستون سے اس کو باندھ دیا گیا اور جلانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ لوگوں کو حیرت تھی کہ اسکیو کے چہرے پر مطلق افسردگی نہ تھی۔ وہ نہایت خوشی سے آنے والے واقعہ کا انتظار کر رہی تھی۔ بشپ نے اُس پر اس مرتبہ بھی اپنی تمام تر کوششیں ختم کر دیں۔ اور ساتھ ہی بادشاہ کا معافی نامہ دکھلایا۔ اور کہا اگر اب بھی وہ سیدھے راستہ پر آجائے تو اُس کی زندگی بچائی جا سکتی ہے۔ اسکیو نے بلیاختہ جواب دیا۔ "میرا سیدھا راستہ یہی ہے جس پر گامزن ہونے کیلئے تیار بیٹھی ہوں۔"

حکم ہوتے ہی لکڑیوں میں آگ لگا دی گئی اور تھوڑی دیر میں ایک حق پرست جسم باطل پرستی کی آگ میں جلکر ختم ہو گیا۔

اِن کتابوں میں طب اور سائنس کی رُو سے ایسے ایسے خفیہ راز درج ہیں جو اکثر تجربہ کار خاوندوں کو بھی معلوم نہیں اور جنہیں جاننے کے بعد آپ کو شادی کی اصلی مُسرتیں اور لذتیں حاصل ہوں گی

گربھ شاستر	کام شاستر	پریم شاستر
اُردو ایک روپیہ	اردو ۱۲؍	اُردو ایک روپیہ
ہندی سوا روپیہ	ہندی ایک روپیہ	ہندی سوا روپیہ

یہ کتابیں ہر شادی شُدہ نوجوان کو پڑھنی چاہئیں

مختصر سے عرصہ میں اِن کتابوں کی دو لاکھ سے زائد جلدیں فروخت ہو چکی ہیں

یہ حقیقت ہے کہ کوئی چیز کسی خاص خوبی کے بغیر اتنی بھاری تعداد میں فروخت نہیں ہو سکتی۔

پریم شاستر بک ڈپو۔ بالمقابل اڈہ شاہ عالمی دروازہ لاہور

دُلّا بھٹی

پنجاب کا دلگداز رومان

از جناب احمد شجاع پاشا جالندھری

۱- باغی

"آج وہ دِن آپہنچا ہے جب مَیں اپنے والد کے خُونِ ناحق کا لرزہ خیز انتقام لُونگا۔" دُلّا نے اپنی والدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اسکی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ آواز گلوگیر تھی۔

"بیٹا۔ شاہین اور کنجشک کبوتر اور باز کا کیا مقابلہ۔ شاہِ وقت کے خلاف بغاوت کرنا موت کو دعوت دینا ہے مَیں جانتی ہوں وہ جابر ہے، قہرمان ہے، اور ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔" رحموں کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے نِکل کر رُخساروں کو تر کرتے ہوئے مٹّی میں جذب ہو کر رہ گئے۔

"ماں" دُلّا نے بات کاٹ کر کہا "روتی ہو۔ میرے دل کی آگ ان آنسوؤں سے سرد نہیں ہو سکتی۔ اسے خُون چاہیئے خُون۔ اُس نا ہنجار کا خون جس نے میرے باپ کے خُون سے ہولی کھیلی۔ اُس عاقبت نا اندیش کا خُون جو رعایا کا خُون پانی کی طرح بہا رہا ہے ۔ ۔ ۔"

رحموں بولی "مجھے علم ہے۔ لال تیری بیباک جوانی ایسی فضا میں پلی جو غلامی برداشت نہیں کر سکتی۔ تیری رگوں میں تیرے باپ کا لہُو دوڑ رہا ہے، مگر حاکم اور محکوم کا کیا مقابلہ۔ سمندر کی شور انگیز اور سہمگیں لہریں چٹانوں سے آ آ کر سر پھوڑتی ہیں۔ چھینٹے اُڑتے ہیں۔ واپس ہو جاتی ہیں۔ کیا آج تک یہ بھی دیکھا کہ کوئی موج اپنی طرح چٹان کے بھی پُرزے اُڑا دیتی ہے"۔

"ماں۔ بہادر ایسی باتیں نہیں سُنا کرتے منزل کی جستجو میں سرگرمِ سفر ہونا ضروری ہے۔ آلام و حوادث سے ڈٹ کر مقابلہ کرنا لازمی ہے۔ پھر اوّل تو کوئی ناکام نہیں پھرتا اور ایسی ناکامی بھی کامیابی کے مُترادف ہے۔ ظلم کی بھی حد ہوتی ہے۔ ماں۔ ہمیں شرم آنی چاہیئے۔ ہماری بہو بیٹیوں کی یوں عزت تباہ کیجائے اور ہم مُنہ تکتے رہیں۔ وہ مدد کیلئے چلّائیں۔ سر پیٹیں اور ہم دیکھا کریں۔ وہ درد و غم سے مجبور ہو کر رو دیں اور ہم ہنسا کریں۔ ہر جگہ صفِ ماتم بچھی ہوئی ہو اور ہم رنگ رلیاں منائیں۔ ہماری غیرت کو کیا ہوا۔ اَب تو مجھ سے نہیں رہا جاتا۔" دُلّا کے خوبصُورت چہرے کا رنگ سُرخ ہو گیا۔ آنکھوں میں خُون اُتر آیا۔ فرطِ غم سے اسکی آواز حلق میں پھنسنے لگی اور وہ خاموش ہو گیا۔

رحموں نے مایُوس نگاہوں سے بیٹے کی طرف دیکھا اور مغموم ہو کر گردن جھکالی۔

دُلّا پنجاب کے ایک گاؤں کا خوش رو نوجوان تھا فراخ و کشادہ سینہ بھرے بھرے بازو، ستواں ناک، تیکھے نقش گاؤں کی لڑکیاں اسے دیکھکر مُسکرا دیا کرتی تھیں۔ اس کے ہمجولی اوائل عُمر ہی سے اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتے تھے۔ دُلّا کا بچپن اپنی گوناگوں دلچسپیاں لئے گزر گیا۔ وہ گاؤں کا سب سے چالاک۔ ہوشیار، خوبصورت اور نڈر لڑکا تھا۔ دلیرانہ کاموں میں ہمیشہ سب سے بڑھکر حصّہ لیا کرتا تھا۔ اسے بچپنے ہی سے تیر اندازی اور شمشیر بازی کا شوق تھا۔ بڈّھے بوڑھے اور مشاق شمشیر باز بھی اسکی قابلیت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ مظلوموں کی حمایت کرنا وہ اپنا فرضِ اوّلین سمجھتا تھا۔ اوائلِ شباب میں ہی اسکی شہرت گرد و نواح کے دیہات میں پہنچ چکی تھی۔ اس کا نام زبان زدِ خاص و عام تھا۔ دُلّا ابھی یہاں سات سال کا ہُوا تھا کہ حاکمِ وقت نے بعض وجوہ کی بنا پر اسکے باپ کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ ایک دفعہ شاہ کے چند ایک سردار سیر و تفریح کی غرض سے اُدھر آ نکلے۔ دُلّا کا باپ چونکہ اچھا کھاتا پیتا زمیندار تھا۔ بدیں وجہ اُمرا کی خوشنودی کے لئے اس نے کوئی کسر باقی نہ رکھی ان کی ہر طرح خاطر تواضع کی شاہ کے حضور بھی تحفے تحائف بھیجے۔ مگر عیش پرست سردار اس پر راضی نہ ہوئے۔ گاؤں کی معصُوم دوشیزاؤں پر ڈورے ڈالنے شروع کئے غیور اور شجیع زمیندار یہ کسی طرح برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اور پھر ان اچھے وقتوں میں جب آن کے بدلے جان دینا ایک حقیقت تھا۔ سردار اس دخل در معقولات پر تنگ آ گئے۔ کچھ جھڑپ سی ہو گئی جس میں دو تین سردار کام آئے۔ باقی جان بچا کر دار السلطنت کی طرف بھاگ گئے۔ دُلّا کے باپ کو دربار میں طلب کیا گیا۔ غریب کو صفائی پیش کرنے کا موقع بھی نہ ملا اور اُمرا کی خوشنودی کے لئے اُسے تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ گاؤں میں اس ظلم و تشدد کے خلاف نفرت کا اظہار کیا گیا مظاہرے کئے گئے مگر کچھ پیش نہ چلی۔

دُلّا اُس وقت ان باتوں کو سمجھنے سے قطعاً قاصر تھا۔ جب اس نے کچھ ہوش سنبھالے اور گاؤں کے بڑے بوڑھوں سے اپنے والد کی موت کا حسرت آگیں افسانہ سُنا تو اس کا خُون جوشِ غضب سے اُبلنے لگا۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ مظلوم رعایا کو پنجۂ استبداد سے نجات دلائے گا اور اپنے باپ کے خُون کا بدلہ ضرور لے گا۔ اس کی ماں ہندوستان کے جفاکش صُوبہ

پنجاب کی رہنے والی بہادر عورت تھی وہ جانتی تھی کہ دلّا جوان ہے وہ اپنا کہا کر کے رہے گا۔ پھر بھی سمجھانا بجھانا اس کا فرض تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ دلّا کا جوش فرو ہونے والا نہیں تو کچھ توقف کے بعد بولی "دلّا.. تو مُصر ہے بیٹا.. تو آ.. اُٹھ میں تجھے تیرے والد کے اسلحہ خانے میں لیچلوں۔ وہاں زنگ آلود تلواریں تیری اور تیرے ساتھیوں کی منتظر ہیں...." دلّا اُٹھ کھڑا ہوا۔ رحموں آگے آگے چلنے لگی۔ سُورج غروب ہو رہا تھا اور اسکی زرد کرنیں ہر چیز پر سُنہری رنگ پھیر رہی تھیں۔ کھیتوں سے واپس آنیوالے کسانوں کے پُرسوز گیت فضا میں گونجتے جا رہے تھے۔ چرواہوں کی بانسریوں کی آوازیں فضائے بسیط میں ارتعاش سا پیدا کر رہی تھیں۔ گاؤں کی فضا میں نغمے ہی نغمے تیرتے پھرتے تھے۔ یُوں معلوم ہوتا تھا گویا دُنیا کے سب شور و شغب اور ہنگامے سمٹ کر ایک ہی گوشے میں سما گئے ہیں۔ ہر طرف مسرت رقص کر رہی تھی۔ مگر دلّا اور رحموں کی آنکھوں میں مستی بدلیاں لہرا رہی تھیں۔ رحموں نے اسلحہ خانہ کا کواڑ کھولا۔ دلّا بعجلت اندر داخل ہوا۔ رحموں حیران نگاہوں سے اسکی طرف دیکھ رہی تھی۔ دلّا نے کمرے کی ہر ایک چیز کا جائزہ لیا۔ زنگ آلود تلواریں۔ ٹوٹے ہوئے تیر۔ سب چیزوں پر اِک حسرت برس رہی تھی۔

"یہ تیرے ابا کی تلوار ہے۔" رحموں نے زرّیں غلاف سے ایک تلوار نکالتے ہوئے کہا۔

دلّا نے تلوار اُس کے ہاتھ سے لیکر چومی۔ آنکھوں سے لگائی۔ پھر کہنے لگا۔ "ماں جبتک ہاتھ میں یہ تلوار ہے۔ دم میں دم ہے۔ بدن میں سکت ہے دلّا باغی رہے گا۔ ظلم و استبداد کا دُشمن رہے گا...."

سُورج غروب ہو چکا تھا۔ مغربی آسمان کے دامن پر خونِ بیگناہ کے دھبے ابھی تک موجود تھے۔ قُدرت اندھیرے اور تاریکی کی سیہ چادریں انہیں چھپانے کی سعیٔ مشکور کر رہی تھی۔

۲۔ جنگ

شیدے نے کہا "دلّا! گاؤں کے لوگ ابھی تمہارے پاس آئے تھے۔ تم کہاں تھے؟"

"جو ہر سال اس بار ایک شاہی قافلہ خیمہ زن ہے نا" دلّا نے جواب دیا۔ "ہاں اُدھر ہی گیا تھا۔ مگر شیدے بات کیا ہے؟" اُس نے مستفسرانہ مخاطب کی طرف دیکھا۔

"اُسی قافلے کے متعلق کچھ کہنا تھا۔" شیدے نے جواب دیا اور زمین پر نظریں گاڑ دیں۔

"کیا ہوا؟" دلّا نے جلدی سے پُوچھا۔

"جو اُمرا اکثر کیا کرتے ہیں دلّا.. ظلم.. ستم.."

"جلدی کہو۔ کیا بات ہے؟"

"قافلے والے گاؤں میں آ کر بہت سے کسانوں کو زبردستی پکڑ کر لے گئے ہیں۔ مدافعت پر اُنہیں کوڑے لگائے گئے۔ بے طرح زدوکوب کیا گیا۔ بوڑھے میاں کریم تو جانبر نہ ہونگے۔"

جوشِ غضب سے دلّا کے نتھنے پھُولنے لگے۔ چہرے کا رنگ سُرخ ہو گیا۔ "معلوم ہوا اس قافلے کا سالار کون ہے؟"

"شاہزادی اور ملکہ کے ہمراہ راجدھانی کی طرف جا رہا ہے۔"

"شیدے اپنے ساتھیوں کو اطلاع دیدو کہ وہ تلواریں لے کر میدان میں آجائیں۔"

"مگر دلّا انکے ساتھ فوج کا ایک آدھ دستہ بھی موجود ہے۔ پھر؟.."

"تم جاؤ شیدے میرے حکم کی تعمیل کرو۔"

شیدے کے جانیکے بعد دلّا ماں سے اجازت طلب کرنے گھر چلا آیا۔ گاؤں میں شاہی قافلہ کی آمد کی خبر سے اُداسی اور سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ اُمرا کے ناقابلِ برداشت ظلم زبان زدِ خاص و عام تھے۔ چھوٹے بڑے اپنی جان بچانے کے لئے چھپتے جا رہے تھے۔ اِنسان تو کیا حیوانوں کو سپاہیوں کی نظر سے بچایا جا رہا تھا۔ گلی کی نکڑ پر دلّا کی ایک بوڑھے سے ٹکر ہو گئی۔ بوڑھا ہراساں و پریشان بھاگا جا رہا تھا۔ اسکی حرکات سے خوف و ہراس مترشح تھا۔ "کدھر جا رہے ہو بڑے میاں" دلّا نے پوچھا۔

"دلّا.. بیٹا.. شاہی فوج کچھ پرے خیمہ زن ہے تم جانتے تو ہو۔ بیگار کے لئے ہماری شامت آنا ضروری ہے۔ میں بیچارہ بوڑھا کیا کر سکتا ہوں.." بوڑھے نے جرأت آزما لہجے میں جواب دیا۔

"بڑے میاں ابھی تو میں موجود ہوں میرے ساتھیوں کے ہاتھوں میں تلواریں ہیں۔ فکر نہ کیجئے۔"

"گاؤں والوں کی نظریں تم ہی پر لگی ہوئی ہیں دلّا.." بوڑھے نے قدرے اطمینان اور تسلی سے کہا۔ "تمہارے ابا بھی ہمارے آڑے وقتوں میں کام آتے تھے۔"

دلّا آگے بڑھا۔ وہ گاؤں والوں کی اس پریشانی پر دل ہی دل میں مُسکرا رہا تھا اور شاہی فوج کی دیدہ دلیری پر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ گھر پہنچ کر اس نے ماں سے اجازت طلب کی۔ اُس کے پاؤں چھُوتے اور اپنے ساتھیوں کو ساتھ لیکر قسمت آزمائی کے لئے روانہ ہو گیا۔ اس سے پہلے دلّا بہت سے بہادروں کے ساتھ لڑ چُکا تھا۔ استبداد کے خداؤں کے خلاف شمشیر کے جوہر دکھا چکا تھا۔ مگر شاہی فوج کے خلاف

نبرد آزمائی کا اسے آجتک موقع نہ ملا تھا۔ وہ خوش تھا کہ اس کے انقلاب انگیز خیالات رنگ لا رہے ہیں اور اپنی دلیری کا سکہ بٹھانے کیلئے اُسے عظیم المرتبت شخصیتیں ملی ہیں۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو اُبھارا۔ جوش دلایا۔ ناموس پر مر مٹنے کے لئے اُکسایا۔ وہ خود دائیں ہاتھ میں تلوار لئے گھوڑے پر سوار سب سے آگے تھا۔ اس کے عقب میں دیہاتی نثار۔ دُلّا کی آمد کی خبر شہزادی اور اہل کارواں کو مل چکی تھی۔ اُس کے شاہانہ استقبال کے لئے فوج کے سپاہی صف بصف کھڑے تھے۔ سالار نے دُور سے غبار اُڑتا ہوا دیکھا۔ غبار کا دامن چاک ہونے پر قطار اندر قطار سوار نظر آنے لگے۔ چمکتی ہوئی تلواروں سے آفتاب کی شعاعیں شعلے بلند کر رہی تھیں۔ سالار نے فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ دُلّا اور اُس کے ہمراہیوں کے گھوڑے سرپٹ دوڑے چلے آ رہے تھے۔ اُس نے اپنے گھوڑے کو کاوا دیا اور جوش و خروش سے اعدا کی صفوں پر ٹوٹ پڑا۔ برق افشاں تلواریں میانوں سے نکل آئیں۔ اُٹھیں اور خون کے سمندر میں ڈوب گئیں۔ خون پانی کی طرح بہنے لگا۔ موت کی دہشتناک دیوی انگڑائیاں لینے لگی۔ ہر طرف شورِ محشر بپا تھا۔ ایکدوسرے پر ٹوٹا پڑتا تھا۔ باغیوں کے جمے ہوئے قدم اُکھڑنے میں نہ آتے تھے۔ شاہی فوج کا حوصلہ پست ہوا جا رہا تھا۔ دُلّا کی تلوار بجلی کی طرح تڑپتی نظر آ رہی تھی۔ مقابلہ برابر کا تھا۔ ایک ناموس کے لئے جان دینے کو بر سرِ پیکار تھے دُوسرے جان بچانے کیلئے، مدافعت کے لئے لڑ رہے تھے۔ دو گھنٹے تک گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی۔ شام کے قریب شاہی فوج نے امکانات کی وسعت پر غور کرنے کے بعد ہتھیار ڈالدیئے۔ فاتح نے کسی کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا جوانمردی کے خلاف سمجھا۔ ڈوبتے ہوئے سورج نے میدانِ جنگ میں مقتولین کی بے گور و کفن لاشوں۔ خون کے دھبوں اور ٹوٹے ہوئے ہتھیاروں کے سوا کچھ نہ دیکھا۔

۳۔ حملہ

شاہ نے وزیرِ سلطنت سے کہا "دُلّا نے اپنے باپ کی طرح بغاوت کا جھنڈا بلند کیا ہے۔ اس سرکش کی سرکوبی ازبس ضروری ہے"۔

"بیشک" وزیر نے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے جواب دیا "بہت سی مخدوش خبریں سننے میں آتی ہیں۔ دُلّا شاہی افسران کے ساتھ سختی سے پیش آتا ہے۔ ملکہ معظمہ کے قافلے پر دھاوا بول کر اُسے لُوٹ لیا۔ لگان وصول کرنے والوں کو مار پیٹ کر نکالدیا۔ آپکا فرمانا بالکل بجا ہے"۔

"تو پھر کیا کیا جائے" شاہ نے مستفسرانہ نائب کی طرف دیکھا۔

"آپ حکم دیں لشکر کشی کر دی جائے۔ اس کے گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے" وزیر نے ایک تمکنت ریز سکون کے ساتھ جواب دیا۔

بادشاہ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اسکی نگاہیں دُور افق پر جمی ہوئی تھیں جیسے اپنی بساط سے بڑھ کر سوچ رہا ہو۔

"تو پھر دیر کس بات کی ہے" کچھ توقف کے بعد اس نے کہا "کمان اپنے بیٹے کے ہاتھ میں دید یجئے گا۔ وہ دُلّا سے اچھی طرح واقف ہے اور جنگ کے داؤ پیچ سے کُلّی واقفیت رکھتا ہے"۔

"جو حکم . . ." وزیر نے سر جھکا دیا اور اُلٹے پاؤں دیوانِ خاص سے باہر نکل گیا۔

حیدر وزیر کا اکلوتا لڑکا تھا۔ فنِ شمشیر زنی میں چاک و چوبند۔ طریقِ حرب و ضرب سے بخوبی واقف۔ وہ دُلّا کا دوست تھا۔ دوست کیا قرابت داری سمجھئے۔ دونوں ایکدوسرے کیلئے ہمیشہ سر بکف رہتے تھے۔ پچھلے دنوں میں حیدر کو چند ایسے واقعات پیش آئے جن سے وہ دُلّا کا گرویدہ بنگیا۔ ایک دفعہ اسے حکومت کی طرف سے لگان کی فراہمی پر مقرر کیا گیا۔ دُلّا اور اس کے ہمراہیوں نے اس کام میں اسکی بہت مدد کی۔ انکی شمولیت سے دیہاتیوں نے بغیر چون و چرا کئے جو کچھ بھی بن آیا حیدر کے آگے لاکر رکھدیا۔ حیدر چونکہ عوام کی حالت سے بخوبی واقف تھا اس لئے اس نے بھی کسانوں کو زیادہ تنگ نہ کیا۔ زمیندار جو کچھ بھی خوشی سے دیتے قبول کر لیتا۔ ایک رات اس کے خیمہ پر بہت سے وحشی انسانوں نے لُوٹ مار کی غرض سے دھاوا بول دیا۔ بیچارہ تو کیا وہ خود ان خونخواروں کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھا۔ اسکی زیرِ کمان فوج کسی دُوسرے گاؤں میں مقیم تھی۔ مقابلہ سخت تھا۔ حیدر کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ دُلّا کو خبر ملی وہ بعجلت اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کرکے وہاں پہنچا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ بالآخر حملہ آوروں کو بھاگنا پڑا۔ دُلّا اس لڑائی میں بری طرح زخمی ہوا۔ اس نے برق افشاں تلواروں کے وار اپنے سینہ پر لئے مگر حیدر پر آنچ نہ آنے دی۔ یہ واقعہ حیدر کے دل پر اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے دُلّا کا شکریہ ادا کیا۔ دونوں نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے یک جان دو قالب ہوگئے۔ حیدر نہ چاہتا تھا کہ اپنے دوست کے خلاف تلوار اُٹھائے۔ مگر باپ نے بہت اصرار کیا۔ بڑے بڑے عہدوں کی لالچ دی۔ ڈرایا دھمکایا فرض کا احساس دلایا غرضیکہ حیدر کو پیشقدمی کرنے پر رضامند کر لیا۔ حیدر عجب کشمکش و پیچ میں تھا۔ دُلّا اس کا دوست تھا مگر باغی۔ اس کا باپ شاہ کا نمکخوار تھا اور وہ اپنے باپ کا بیٹا۔ باپ کا حکم۔ دُلّا کی دوستی۔ تخت و تاج کا احترام اس کے دل میں توہم انگیز خیالات کا ایک ہنگامہ برپا تھا۔ وہ مجبور تھا۔ فرض اسے پیشقدمی کرنے پر اُکسا رہا تھا۔ محبت اس کے دل میں گدگدی پیدا کرکے اسے باز رہنے کی تلقین کرتی تھی۔ اس کے دل میں دو متضاد عناصر میں خوفناک

جنگ ہو رہی تھی۔

"کیوں حیدر کسی فیصلے پر پہنچے" اس کے والد نے پوچھا۔

حیدر نے وارفتگی کے عالم میں گھبرا کر گردن اُٹھائی۔ باپ کی طرف دیکھا۔ اسکی آنکھوں میں محبت پرفشاں تھی۔ مگر اس پر دۂ شفقت میں کیا تھا۔ حکم۔ دُلّا کے گاؤں پر چڑھائی کرنے کا حکم۔ اُسے موت کے گھاٹ اُتارنے کا مشورہ۔

حیدر نے پھر گردن جھکا لی۔

"حیدر . ." وزیر نے تڑخ کر کہا "باپ کا حکم ٹھکراتے ہو . ."

"جی نہیں ابا جان" اس کے مُنہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے "میں تیار ہوں . ."

دُوسرے دِن شاہ کی دست بوسی کے بعد حیدر اس اہم مہم پر روانہ ہو گیا۔ چار پانچ دِن کی مسافت کے بعد اُس نے دُلّا کے گاؤں کے قریب خیمے نصب کر دیئے۔

۴۔ دوست

حیدر کی آمد کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ لوگ جوق در جوق مشورہ طلب کرنے دُلّا کے پاس جانے لگے۔ آس پاس کے گاؤں بھی ہوشیار ہو گئے۔ دُلّا خود حیران تھا اُسے حیدر سے یہ توقع نہ تھی اس نے حیدر کو کئی دفعہ موت کے چنگل سے چھڑایا تھا۔ اس کے لئے اپنا سینہ سپر کر دیا تھا۔ مگر اب . . . وہ اس گتھی کو سُلجھانے کیلئے قطعاً قاصر تھا۔ جان سے عزیز دوست کے خلاف ہاتھ اُٹھانا، محبت کا مُنہ چڑانا محبت کی تضحیک کرنا تھا۔ مگر جنگ کے میدان میں پیٹھ دکھانا بھی مردانگی اور جوانمردی کی تضحیک کرنا تھا۔ گاؤں کی پری تمثال دوشیزاؤں نے اسے پنگھٹ پہ بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اسکی آنکھوں میں تصورات کا لوح نظر آ رہا تھا بھویں سکڑی ہوئی تھیں۔ چہرہ غمناک تھا اور ہاتھ تلوار کے دستے پر۔ ایک نے پُوچھا "کس سوچ میں بیٹھے ہو دُلّا اِس سے پہلے تم اس قدر ہراساں نہ تھے . ."

دُلّا نے جواب دیا "سیراں تم نہیں جانتیں میرے سامنے اک عقدۂ لاینحل موجود ہے جسکی کشود ممکن نہیں۔"

"تو کیا آج گاؤں والوں کو تم سے کوئی توقع نہ رکھنی چاہئے" دُوسری نے سوال کیا۔

"نہیں بہن ایسا مت کہو" دُلّا کی آواز گلوگیر تھی "گاؤں والوں کیلئے میری جان حاضر ہے۔"

ہمیں اُمید ہے کہ دُلّا شاہی افواج سے ڈر کر پیٹھ نہ دکھائیگا" ستے بانو بولیں "ورنہ تمہاری نوراں ہدفِ ملامت بنجائیگی سہیلیاں طعن و تشنیع سے اس کا ناک میں دم کر دیں گی۔"

نوراں! ـــــ ایک آہِ سرد دُلّا کے سکونِ قلب کو چیرتی ہوئی سانس تلے دَب کر رہ گئی۔ نوراں گاؤں کی ایک ماہ وش دوشیزہ جسکی پیشانی چودھویں کے چاند کی طرح منوّر تھی جسکی آنکھیں پھول کی طرح خمار آلود اور مست تھیں جسکی بھویں دو تیغ آختہ کی طرح تنی ہوئی تھیں جس کے دانت موتیوں کی طرح چمکیلے اور خوبصورت تھے۔ سیاہ لٹیں گلابی شاداب رخساروں پر پڑی ہوئی یوں معلوم ہوتی تھیں جیسے سُرخ پھول کے گرد بلے انتہا بھونرے کھیل رہے ہوں۔ نوراں . . وہ اس کے ساتھ کی کھیلی ہوئی تھی۔ دونوں بچپن ہی سے اکٹھے رہے۔ جوان ہونے پر ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنستے رہے۔ چاندنی راتوں میں جوہڑ کے کنارے بیٹھکر پہروں باتیں کرتے رہے۔ گزرے ہوئے واقعات ایک ایک کر کے اسکے سامنے آ رہے تھے! اس کا خون اُبل رہا تھا اور چہرے کا اُتار چڑھاؤ اندرونی جذبات کا مظہر تھا کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے کہا "دُلّا . ." اور نوراں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ دُلّا بھی مسکرانے لگا۔

"تم اس وقت پنگھٹ پر بیٹھے ہو کیا بات ہے" نوراں نے پوچھا۔

"معلوم نہیں دُشمن کی فوجوں نے گاؤں کو گھیر لیا ہے"۔

"ہاں نوراں، اسی سوچ میں بیٹھا ہوں" دُلّا نے دھیرے سے جواب دیا۔

"سوچ ؟ ۔ یہ وقت سوچنے کا ہے۔ اُٹھو نا۔"

"نوراں حیدر میرا دوست ہے میں اُسکے خلاف لڑنا نہیں چاہتا۔"

"مگر ہمارا گاؤں . . تمہارا فرض۔"

"میں مجبور ہوں۔"

"مجھے یہ مجبوری پسند نہیں . . اُٹھو . ."

"حیدر نے مجھے پیغام بھیجا تھا وہ ابھی پنگھٹ پر آئے گا۔"

"پھر کیا کرنیکا ارادہ ہے۔ دُلّا تمہیں میری محبت کا پاس نہیں گاؤں کی عورتیں طعن و تشنیع سے میری زندگی اجیرن کر دیں گی۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز کانوں میں آنے لگی غبار اُڑتا ہوا دکھائی دیا اور چشم زدن میں حیدر، دُلّا کے پاس کھڑا تھا۔ دُلّا کا چہرہ فرطِ مسرت سے کھل گیا۔ "حیدر" اس نے بآوازِ بلند کہا اور اپنا آغوش کھول دیا . . . مگر حیدر . . . اس وقت کسی اور دُنیا میں تھا کسی اور دُنیا میں۔ وہ گھوڑے کی لگام تھامے نوراں کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ دُلّا نے پھر کہا "حیدر"۔ حیدر چونک گیا۔ دونوں بغلگیر ہوئے۔ دُلّا نے گھوڑے کو شیشم کے درخت سے باندھ دیا اور کنوئیں کے پاس چٹائی بچھا دی۔ دونوں اس پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تو اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ بالآخر حیدر نے کہا "دُلّا تمہیں میری مجبوریوں کا تو علم ہوگا۔ ابا کا حکم ـ فرض کا احساس اور تمہاری محبت"

"بعینہٖ یہی میری حالت ہے حیدر" دُلّا نے جواب دیا۔ فرض اور محبت

بڑی خوفناک جنگ ہے۔ خدا خیر کرے۔"

"میرا خیال تھا میں جنگ سے پہلے تم سے ملاقات کر کے سمجھوتا کر لوں۔ کیا ہرج ہے۔"

"ہرج کیا ہو سکتا ہے۔ تم میرے دوست ہو۔ خدارا ایسی بات نہ کر بیٹھنا جس پر میں کاربند نہ رہ سکوں۔"

"بڑی معمولی شرائط ہیں دلا۔ شاہ کے خلاف سرکشی کی مہم چھوڑ دو۔"

"کیا کہتے ہو، کیسے چھوڑ دوں میرے باپ کا خون ناحق مظلوموں کی چیخ پکار۔ میں اس کام سے باز نہیں رہ سکتا۔"

"دلا۔ اتنی سختی ٹھیک نہیں۔"

"حیدر خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو۔ میں نے تمہیں دوست بنایا ہے تم عمر بھر میرے دوست رہو گے۔ میرے جانثار تمہاری افواج سے نبرد آزما ہونگے مگر میں تمہارے خلاف ہاتھ نہ اٹھاؤں گا۔"

"دلا . . ." حیدر کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے "میں جنگ کو روکنے کی کوشش کرونگا۔ تم بھی میری مدد کرو۔"

"مجھے معلوم ہے کہ دارالخلافے میں بغاوت ہونے والی ہے۔ عوام اس سختی سے تنگ آ چکے ہیں۔ اس کے عواقب و نتائج دیکھنے کیلئے کچھ دیر ٹھہر جاؤ۔ اگر بغاوت فرو ہو گئی تو بس ہو نگا۔ تم ہو گے۔ تلوار ہو گی اور میدان جنگ۔ اگر نہ ہوئی اور باغیوں کا پلڑا بھاری رہا۔ تو پھر صلح و آشتی سے کام لیں گے۔"

"بہت بہتر میں ٹھہر جاتا ہوں۔ مگر دلا بھائی ابا وغیرہ وہیں ہیں۔ انہیں تو کوئی گزند نہ پہنچے گی۔"

"بے فکر رہو۔ وہ بالکل صحیح و سلامت تمہارے پاس آ جائیں گے۔"

حیدر نے اجازت طلب کی اور بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیوں کی طرف اداس نگاہوں سے دیکھتا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اسکی وہ رات آنکھوں ہی آنکھوں میں گزری۔ شوخ و چنچل نوراں کا تصور اس کے سامنے رقص کرتا رہا۔ خیالات کا ایک بے پناہ ہجوم اسکے دل و دماغ کے پردے پر سر سراتا ہوا گزر رہا تھا اسکی فوج میں طرح طرح کی افواہیں گشت کر رہی تھیں۔ وہ لوگ دلا کی طرف سے بالکل مطمئن تھے۔ زیادہ تر خطرہ انہیں دارالسلطنت کی طرف سے تھا۔ وہاں دلا کی لگائی ہوئی آگ ہلاکت آفریں صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ دلا کے کارندے سرگرم کار تھے۔ بغاوت قریب قیاس تھی۔ اس نے کمان اپنے دوست شیدے کے سپرد کی اور خود راجدھانی کی طرف چلا گیا۔ اس کی آمد سے لوگوں کے حوصلے بڑھ گئے۔

۵۔ بغاوت

کچھ دن گزر گئے حیدر خاموش بیٹھا رہا کبھی کبھار نوراں کو دیکھنے کیلئے گاؤں ہو آیا۔ دلا گاؤں میں موجود نہ تھا۔ اگرچہ حیدر جانتا تھا کہ وہ باغیوں کا سردار بن کر شاہ کے خلاف مصروف جنگ ہے۔ تاہم وہ اس راز کو اپنے ساتھیوں پر آشکار کرنے کیلئے تیار نہ تھا۔ اُدھر راجدھانی میں آئے دن کے لڑائی جھگڑوں سے تنگ آ کر حاکم نے سختی برتنی شروع کی۔ نفرت کے خس و خاشاک کو چنگاری پھینکی گئی۔ دلا نے دلیری کے دامن سے اسے ہوا دی اور عوام نے دلا کی سرکردگی میں علم بغاوت بلند کر دیا۔ گلی گلی۔ کوچے کوچے میں لڑائیاں ہوئیں طرفین کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ خون کے دریا بہہ گئے۔ عوام نے شاہی محل کا محاصرہ کر لیا۔ فوجیں بگڑ گئیں۔ دارالخلافے کی سرزمین میدان حشر بن گئی۔ اس افراتفری کے عالم میں حاکم بھی مارا گیا۔ عوام اس کے خون کے پیاسے تھے۔ اسکی موت سے سب کے زخموں پر پھاہے رکھے گئے۔ دلا وزیر اور اس کے کنبے کو لیکر گاؤں چلا آیا۔

۶۔ محبت اور نفرت کے درمیان آخری جنگ

حیدر اور دلا بغلگیر ہوئے۔ دلا نے کہا "اب تو کوئی جنگ کی وجہ نہیں حیدر۔"

"نہیں دلا۔" حیدر نے مسکرا کر جواب دیا۔

"پھر؟"

"صرف ایک بات رہ گئی ہے دلا۔"

"وہ کیا ہے۔"

"تم میرے دوست ہو۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

"تمہارے لئے جان حاضر ہے حیدر۔ زہے قسمت جو میں تمہارے کام آ سکوں۔"

"تمہیں برا معلوم نہ ہو۔"

"ہرگز نہیں۔ تم کہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ اور پھر میرے وعدے پہاڑوں کی طرح غیر متزلزل ہوتے ہیں۔"

"تم نے وعدہ کیا ہے تو بتلائے دیتا ہوں۔ اس دن وہ لڑکی کون تھی۔ جو تمہارے پاس کھڑی تھی۔"

"کیا کہتے ہو۔" دلا کچھ گھبرا سا گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سانس پھول گئی۔

"تم گھبرا کیوں گئے۔" حیدر نے کہا۔

"نہیں گھبرانا کس بات کا۔"

"تو سنو دلا۔ مجھے وہ لڑکی چاہئے۔ اس کا نام نوراں ہے۔ اگر میرے دوست ہو تو اتنا کام کر دو۔" دلا یوں اس کے آگے سپر ڈال بیٹھا ہو۔

تمہارے گاؤں میں رہتی ہے۔۔۔ دُلّا۔ میری طرف دیکھو۔ تمہیں میری آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسوؤں کا واسطہ۔ تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں کی قسم۔ دُلّا خاموش کیوں ہو گئے۔"

دُلّا کے ہوش و حواس پر ایک بجلی سی گری۔ آنکھوں کے سامنے سُرخ سُرخ دھبے رقص کرنے لگے۔ پیروں تلے کی زمین نکلتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ سر چکرانے لگا۔

حیدر اس کی دگرگوں حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔

اُس نے پوچھا "یہ تمہیں کیا ہو گیا دُلّا"

"مطمئن رہو حیدر" دُلّا نے بمشکل مُسکرا کے کہا "میں نے تم سے وعدہ کیا ہے نبھاؤں گا"

وہ وہاں سے اُٹھ آیا۔ آنکھوں میں آنسو۔ دل میں تڑپ اور لب پر آہیں۔ اُسے نوراں سے محبت تھی۔ وہ اُسے دل و جان سے زیادہ عزیز تھی۔ تھوڑے دنوں میں انکی شادی ہونے والی تھی۔ وہ اُسے کیونکر چھوڑ سکتا تھا۔

دُوسری طرف حیدر۔ وہ بھی اس کا دوست تھا۔ اُس نے دُلّا کے لئے بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی۔ وہ نوراں کو چاہتا تھا۔ اُسے بھی نوراں سے محبت تھی۔ دُلّا حیران تھا کہ کیا کرے۔ نوراں اور حیدر کی محبت آمادہ بجنگ تھیں۔ وہ محبت اور نفرت کے درمیان ـــــ قلعے میں محصور ہو گیا تھا جس پر دونوں جانب سے سخت حملے کئے جا رہے تھے۔ وہ رات بھر سوچتا رہا۔ صبح محبت اور نفرت کی کشمکش ختم ہو چکی تھی۔ نوراں پنگھٹ پہ آئی تو دُلّا نے مُنہ پھیر لیا۔ اُس نے دل میں کہا۔

"میں رنج و غم برداشت کر سکتا ہوں۔ مجھے عمر بھر ان کا واسطہ رہا ہے میں نوراں کو حیدر کیلئے چھوڑ سکتا ہوں۔ میں اُسے چھوڑ دوں گا۔ تاکہ آنے والی نسلیں جانثار دوستوں کی فہرست میں میرا نام بھی شامل کر لیں تاکہ پانچ دریاؤں کی سرزمین میں دُلّا کا نام ادب و احترام سے لیا جائے۔ تاکہ پنجاب والے تا قیامت مجھے نہ بھول سکیں۔۔۔"

نوراں نے مٹکا منڈیر پر رکھکر دُلّا کو گدگدایا "دُلّا ہم سے نہیں بولتے" دُلّا نے حسرت بھری نظروں سے نوراں کی طرف دیکھا۔ آنسو کے دو موٹے موٹے قطرے اس کے رخساروں کو تر کرتے ہوئے مٹی میں جذب ہو کر رہ گئے۔ دو۔۔ آنسوؤں کے دو بے حقیقت قطرے۔ پرے حیدر آ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر مسرت رقص کر رہی تھی۔ نوراں نے پہلے حیدر کی طرف پھر دُلّا کی طرف دیکھا۔ وہ کیا جانتی تھی کہ دُلّا کی آنکھوں میں آنسو کیوں چھلک رہے ہیں اور حیدر کی آنکھیں غیر معمولی طور پر کیوں چمک رہی ہیں۔ وہ اِس راز سے بے خبر تھی۔

حیدر نے پاس آ کر کہا "دُلّا۔۔۔" دُلّا نے یاس انگیز نگاہیں حیدر کے چہرے پر گاڑ دیں۔ بمشکل تمام مُسکرایا۔ اس کے ہونٹ تھرتھرائے۔ ٹھوڑی کپکپائی۔ بھویں سکڑ گئیں۔ پیشانی تاریک ہو گئی۔ نتھنے پھڑکنے لگے۔ اور آنکھوں کے پیمانے چھلک پڑے۔ اس نے پھر ہنسنے کی کوشش کی۔ آنسو پینے چاہے مگر ضبط نہ ہو سکا۔ وہ رو پڑا۔ اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا۔ میخواروں کی طرح لڑکھڑاتا۔ بھنور میں پھنسی ہوئی ناؤ کی طرح ڈگمگاتا ایک طرف کو چل دیا۔ حیدر اور نوراں حیران نگاہوں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔

حاصلِ عشق

از جناب لطیف [illegible]

غم و اندوہ سامانِ نشاطِ دل نہ بن جائے
یہ سامانِ نشاطِ دل ہی اک مشکل نہ بن جائے

میں جرأت کر نہیں سکتا ہوں اظہارِ تمنا کی
کہیں یہ پستیٔ ہمت سکونِ دل نہ بن جائے

مری کم مائگی، یہ خستہ حالی، یہ پریشانی
مرا ٹوٹا ہوا دل یار کی منزل نہ بن جائے

مری اس گریہ و زاری پہ کلیاں مسکراتی ہیں
کہ یہ قسمت کا مارا رحم کے قابل نہ بن جائے

کہا میرے شکستِ دل نے میری چشمِ پُرنم سے
مجھے ڈر ہے ترا ہر اشکِ خونیں دل نہ بن جائے

لطیف اُن کے لئے میں نوچ لاؤں گا ستارے بھی
کہ صرف اختر شماری عشق کا حاصل نہ بن جائے

رُباعیاتِ شاکر

از:۔ جناب پیارے لال شاکر میرٹھی

کیا شان ہے اور کیا ہے قدرت تیری کثرت سے عیاں ہوئی ہے وحدت تیری
ظاہر بھی تو ہی ہے اور باطن بھی تو ہی معنی میں نہاں ہوئی ہے صورت تیری

کب کون و مکاں نمود کی ہے تصویر اک وہم و گماں شہود کی ہے تصویر
ہوتا نہ اگر تُو تو نہ ہوتی دنیا یہ خود ہی ترے وجود کی ہے تصویر

خلوت میں نہ پھر کوئی دراندازہُوا گم کر کے خودی کو ترا ہمراز ہُوا
پردے میں حجابات کے جب تو نہ رہا دل میرا ترا جلوہ گہِ ناز ہُوا

ظاہر کہیں پایا، کہیں پنہاں پایا جلوہ ترا ہر شے میں نمایاں پایا
ڈھونڈا دیر و حرم میں ہر چند تجھے پایا تو حریمِ دل میں مہماں پایا

کثرت سے عیاں ہے شانِ وحدت تیری ہر انجمنِ دہر ہے خلوت تیری
پردہ ہے نظر کا درمیاں میں ورنہ ہر شے میں ہے بے نقاب صورت تیری

پھیلی ہوئی ہر جگہ ہے تنویر تری ہر آئینۂ دل میں ہے تصویر تری
ہے لیل و نہار سے عیاں جلوہ ترا پردے سے ہوئی ہے اور تشہیر تری

خلوت میں بھی اک انجمن آرائی ہے جلوت ترے جلوہ کی تماشائی ہے
کثرت ہے تری مُرقّعِ بزمِ خیال وحدت تری نقشِ نازِ یکتائی ہے

ہر شے میں ہے نور جلوہ گستر تیرا رتبہ ہے مرے وہم سے برتر تیرا
ڈالا ہے تحیّر میں کرشموں نے ترے دیدار ہو کیا مجھ کو میسّر تیرا

دریا میں گُہر کو آبرو دی تو نے گلزار کو رنگ، گُل کو بُو دی تو نے
اک مضغۂ گوشت تھی زبانِ الکن لیکن اُسے تابِ گفتگو دی تو نے

وہ ذات منزّہ ہے جو آب و گِل سے خلوت سے الگ ہے نہ جُدا محفل سے
نام آتا ہے ورد پردہ زباں پر شاکر رہتا ہے کہاں؟ پوچھ یہ میرے دل سے

زندگی کی جدوجہد میں بام ترقی تک پہنچنے کیلئے دین و دنیا میں قابلِ رشک کامیابی حاصل کرنیکیلئے اپنے پرائے کی نظر میں عزت قائم کرنے کیلئے خدا کی اعلیٰ ترین نعمت کے حصول کیلئے علم حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور علم بہترین کتابیں پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے اور بہترین کتابیں صرف

پنجاب کتاب گھر (رجسٹرڈ)

موہن لال روڈ لاہور سے دستیاب ہو سکتی ہیں:

ون ویک انگلش ۶ر	ون ویک ارتھمیٹک ۶ر
ون ویک سائنس ۶ر	ون ویک جنرل نالج ۸ر
ون ویک ہائی جین فزیالوجی ۸ر	ون ویک اردو ۶ر
ون ویک ہندی ۶ر	ون ویک سنسکرت ۶ر

دیگر ہر قسم کی تعلیمی کتب مل سکتی ہیں

پنجاب کتاب گھر (رجسٹرڈ) موہن لال روڈ۔ لاہور

نلنی کا راز

افسانہ

از جناب محمد امام الدین رامنگری

نلنی ایک نہایت متین و سنجیدہ اور مہذب و شائستہ لڑکی تھی، رائے بہادر امرناتھ کے دو بیٹوں کے درمیان یہی ایک بیٹی تھی۔ اس لئے بڑے لاڈ پیار اور ناز و نعم کے ساتھ پلی تھی۔ نلنی کچھ بہت خوبصورت نہ تھی پھر بھی اس کی شکل و شباہت اور اس کے طور و طریق میں کچھ ایسی کشش و جاذبیت تھی۔ کہ شہر کے اکثر نوجوان اس کے والہ و شیدا تھے۔

سڑک کے عین کنارے پر رائے بہادر امرناتھ کے بنگلے کے سامنے باغ تھا۔ اور باغ میں ٹینس گراؤنڈ، شام کو اس باغ میں عورتوں اور مردوں کی ایک بھیڑ جمع ہو جاتی کچھ ٹینس کھیلتے، کچھ تماشا دیکھتے، کچھ پیانو بجاتے جن لوگوں کو ان تفریحات سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر مطالعہ کرتے، اس طرف سے گزرنے والے اور نہیں تو چند منٹ کے لئے ہی بنگلے کے سامنے کھڑے ہو جاتے۔

رائے بہادر امرناتھ کی بیوی سروجنی نہایت خوش طبع اور زندہ دل خاتون تھیں۔ وہ خوب ٹینس کھیلتی اور اپنے ساتھی نوجوانوں سے خوب ہنس ہنس کر باتیں کرتی۔ ان کے مزاج میں کسی طرح کا تکلف نہ تھا۔ لیکن رائے بہادر ایسے ہی کبھی کھیل تفریح میں حصہ لیتے بنگلے سے کچھ ہی دور ایک لائبریری تھی۔ وہ اپنا بیشتر وقت اسی میں گزارتے۔ انہیں دنیا کی تمام تفریحات میں سب سے زیادہ دلچسپی کتابوں سے تھی۔

رائے بہادر کے ہاں نہ عورتوں کا پردہ تھا۔ نہ عورتوں کو مردوں سے ملنے جلنے کی ممانعت، ان کے خاندان کے ہندو ہونے میں کوئی کلام نہیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس پر مغربی تہذیب کا گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ ایسے ماحول کی پرورش یافتہ نلنی میں نہ جانے کہاں کی متانت و شائستگی پیدا ہو گئی تھی۔ کہ نہ وہ فیشن اور بناؤ سنگھار کو پسند کرتی اور نہ کھیل تفریح میں حصہ لیتی۔ ماں اس طرح زیب و زینت کرتی جیسے وہ سولہ برس کی دوشیزہ ہو مگر نلنی سیدھی سادی وضع میں رہتی۔ ماں کبھی اس کے لئے کہتی بھی تو جواب دیتی۔ ماں مجھے گڑیوں کی طرح بننا سنورنا اچھا نہیں معلوم ہوتا اور یہی صحیح بھی ہے۔ کہ انسان کو جیسا ایشور نے بنایا ہے ویسا ہی اچھا ہے۔ رنگ سازی اور ملمع کاری کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

ماں بیٹی کے اس جواب کو سن کر خاموش ہو جاتی۔

شام کا وقت تھا۔ رائے بہادر امرناتھ کے بنگلے کے ٹینس گراؤنڈ میں عورتوں اور مردوں کی بھیڑ جمع تھی۔ کھیل ہو رہا تھا، خود سروجنی ایک نوجوان کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ اور تماشائیوں سے داد وصول کر رہی تھیں لیکن نلنی اپنے کمرے میں بیٹھی اپنے بھائی کا سوئیٹر بن رہی تھیں، نریندر دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا اور چپکے چپکے نلنی کے پیچھے جا کر دونوں ہاتھوں سے اس کی آنکھیں بند کر لیں۔

نلنی نے مترنم آواز میں کہا "کون ہے؟ سونیل بابو؟"

نریندر خاموش تھا، نلنی برہم ہو کر بولی "جو صاحب بھی ہوں میری آنکھیں کھول دیں، مجھے ایسا مذاق پسند نہیں"

نریندر نے سامنے آکر کہا "کیوں نلنی! پہچان نہیں سکیں!"

نریندر کو دیکھ کر نلنی کی طبیعت اور بھی مکدر ہو گئی، اس نے کہا "آپ نے میری آنکھیں کیوں بند کر لیں؟ مجھے اس طرح کا مذاق اچھا نہیں معلوم ہوتا"

"بہت بہتر! لیکن اگر میری بجائے سونیل ہوتا؟"

نریندر کا یہ طنزیہ جملہ حقیقت سے معرا نہ تھا۔ پھر بھی نلنی اُسے برداشت نہ کر سکی، وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی۔ مگر پھر نہ جانے کیا سوچ کر خاموش رہ گئی،

نریندر نے کہنا شروع کیا "ہاں ہاں نلنی کہو تو چپ کیوں ہو گئیں؟ سونیل کو تم اس لئے پسند کرتی ہو کہ وہ ایک بڑے باپ کا بیٹا ہے دیکھنے میں خوبصورت اور ذی وجاہت ہے۔ بی۔ اے میں تین تین بار ناکام ہونے کے بعد اس نے شراب خوری کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے۔ وہ بیسویں صدی کا گھنا ہے ہزاروں گوپیوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا ہے، شریف لڑکیوں پر ڈورے ڈالتا پھرتا ہے۔ موٹر پر بیٹھ کر سینما جاتا ہے۔ ہے نا؟"

"بس نریندر...... کسی کی غیبت میں اسے برا بھلا کہنا اچھا نہیں، اگر کہنا ہی ہو تو اس کے سامنے کہنا چاہیے" — نلنی نے کبیدہ ہو کر کہا۔ وہ سونیل کو ایک نہایت مہذب، خلیق اور شریف نوجوان سمجھتی تھی۔

"واقعی حق کڑوا ہوتا ہے۔ میں نے سچی بات کہدی تو تم ناراض ہو گئیں کیوں نلنی؟"

نلنی نریندر کو جواب دینا چاہتی تھی۔ کہ اتنے میں سروجنی دیوی بن سنور کر آگئیں۔ انہوں نے کہا۔ "ارے تو ابھی اس طرح بیٹھی ہے! سینما کب چلے گی؟ اچھا ابھی تو مجھے دیر ہے۔ جب تک میں چلتی ہوں۔ تو سونیل کے ساتھ آجانا۔"

نلنی اٹھ کر کپڑے بدلنے چلی گئی۔ نریندر واپس چلا گیا،

سونیل کا بنگلہ کیا تھا۔ محل تھا۔ پیش باغ تھا پائیں باغ تھا گھر میں خدمت کے لئے نوکر تھے۔ بہت سی نوکرانیاں تھیں۔ دو موٹریں تھیں۔ اس کی سواری کی الگ، اس کے باپ کی سواری کی جدا۔

سونیل اپنے باغ میں بیٹھا تھا۔ نلنی اس کے پاس کھڑی تھی۔ دونوں کے چہرے اداس ہو رہے تھے۔ سونیل نے کہا "میں نے ماں سے کہا نلنی، انہوں نے پتا جی کو بہت کچھ سمجھایا مگر وہ کسی طرح رضامند نہ ہوئے۔"

نلنی حسرت بھری نظروں سے سونیل کی طرف دیکھتی رہی۔ سونیل کہتا رہا۔ پتا جی نے صاف کہدیا کہ نلنی سے سونیل کی شادی نہیں ہو سکتی۔ ایسی بے جوڑ شادی کر کے میں سماج میں بدنام ہونا گوارا نہیں کر سکتا۔

نلنی نے حیران ہو کر سوال کیا "بے جوڑ شادی کیسی؟"

سونیل نے جواب دیا "تم برہمن ہو اور میں کائستھ ہوں۔ میں تو ان باتوں کو مانتا نہیں۔ لیکن رسم و رواج کے غلام بوڑھوں کا کیا علاج کیا جائے؟"

نلنی آزاد فضا میں پل کر جوان ہوئی تھی۔ اس کے خواب میں بھی یہ خیال نہ گزرا تھا۔ کہ اس کی زندگی میں ایسی لغو اور لایعنی چیزیں بھی سدِ راہ ہو سکتی ہیں۔ وہ دنیا میں سونیل سے اور صرف سونیل سے محبت کرتی تھی۔ اسے سونیل کے بغیر دنیا ویران معلوم ہوتی تھی۔

نلنی کے بنگلے کے پاس ہی سونیل کی کوٹھی تھی۔ اور کوٹھی کے پاس باغ سے نلنی کے بنگلے کا راستہ تھا۔ نلنی اور سونیل ساتھ ہی کھیلتے، دونوں نے ساتھ ہی لکھا پڑھا۔ دونوں ساتھ ہی جوان ہوئے اور ساتھ ہی روزانہ سینما جاتے تھے نلنی کے باپ ماں سونیل کو اپنے لڑکے کی طرح سمجھتے تھے۔ انہوں نے سونیل کے ساتھ نلنی کے ملنے جلنے میں کبھی کسی طرح کی روک ٹوک نہیں کی۔

سونیل نے نلنی کو اس طرح غمگین اور افسردہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسے دل سے پیار کرتا تھا۔ سونیل کی یہ حالت دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ اس کے ہاتھ بے اختیار نلنی کی طرف بڑھ گئے اور اس نے چاہا کہ نلنی کو اپنے سینے سے لگا کر کہے۔ "نلنی! تم اس قدر مایوس نہ ہو۔ دنیا خواہ کچھ کہے۔ مگر میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتا۔" مگر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے اپنے ہاتھ کھینچ لئے اور کہا "نلنی! تم رنجیدہ نہ ہو۔ میں ہمیشہ تمہارا ہوں۔"

نلنی کا گلا آنسوؤں سے بھر آیا۔ وہ ایک لفظ نہ بول سکی۔

"چلو نلنی!" سونیل نے یکایک کہا۔

"کہاں؟" نلنی بولی۔

"کہیں بھاگ چلیں،"

نلنی سوچ میں پڑ گئی۔

سونیل نے کہا "اگر تمہیں یہ پسند نہیں تو ایک صورت اور ہے!"

نلنی نے بڑے اضطراب کے ساتھ پوچھا "کیا؟"

"دونوں چل کر اطمینان سے گنگا میں سو رہیں"۔

"بس بس یہ صورت بہت مناسب ہے" نلنی نے اسی اضطراب سے کہا

۳

نلنی اور سونیل کی کہانی ختم نہ ہو سکی۔ دونوں دریا سے زندہ نکال لئے گئے۔ نلنی اور سونیل کا ملنا جلنا بند کر دیا گیا۔ نلنی بیمار پڑ گئی۔ مہینے بھر کے بعد کچھ تندرست ہوئی تو آب و ہوا کی تبدیلی کے خیال سے رائے بہادر امرناتھ اسے باہر لے گئے اور وہیں ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سے اس کی نسبت طے کر دی۔ نلنی کو معلوم ہوا تو اس نے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ امرناتھ نے کہا۔ "اگر تو میری بات نہ مانے گی تو میں اور تیری ماں تیرے سامنے خودکشی کر لیں گے۔ سماج میں رسوا اور ذلیل ہو کر جینے سے مر جانا ہزار درجہ بہتر ہے۔"

نلنی کو خود گھل کر . . . مر جانا منظور تھا۔ مگر اسے یہ گوارا نہ تھا کہ اس کے باپ ماں اس طرح جان دیدیں۔ اس نے اپنی زبان پر قفل سا لگا لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ وہ پھر بیمار پڑ گئی لیکن اس کی شادی رکی نہیں۔ وہ رخصت ہو کر ڈپٹی رام پرشاد کے گھر چلی گئی اور امرناتھ سروجنی کو لے کر اپنے وطن لوٹ آئے۔

خدا نے جتنی چیزیں پیدا کی ہیں۔ ان میں انسان کے دل سے زیادہ عجیب چیز شاید دوسری نہیں ہے۔ نلنی رفتہ رفتہ رام پرشاد سے محبت کرنے لگی۔ اور اسی کی ہو کر رہ گئی۔ جیسے رام پرشاد کے سوا اس نے کبھی دوسرے مرد کو جانا ہی نہیں۔ اس نے جس کے ساتھ ایک روز دریا میں کود کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دینا

چاہتا تھا۔ جیسے اب اسے یاد تک نہ رہا۔ رام پرشاد کے گھر واپس آنے میں ذرا سی بھی دیر ہوتی تو وہ پریشان ہو جاتی۔ اس کی موٹر کے ہارن پر کان لگائے اس کے آنے کی راہ دیکھا کرتی بار بار کھڑکی سے جھانک کر دیکھتی۔

ایک روز رام پرشاد چار بجے کی بجائے پانچ بجے گھر واپس آیا تو دیکھا نلنی کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی ہے۔

رام پرشاد نے پوچھا نلنی! تمہارا یہ کیا حال ہے؟

نلنی منہ بنا کر بولی "نہ جانے اتنی دیر تک کہاں رہے۔ میرا حال پوچھ رہے ہیں"

رام پرشاد نے نلنی کو کھینچ کر اپنے پہلو میں لے لیا۔ کہا۔ ایک گھنٹے کی دیر میں تمہاری یہ حالت ہو گئی کہیں میں مر جاؤں تو رو رو کر تم بھی جان ہی دے دو گی؟"

رام پرشاد نے تو یوں ہی ایک بات کہدی۔ مگر نلنی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ رام پرشاد نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "تم بھی کتنی پاگل ہو نلنی۔ جیسے میں مرا ہی تو جا رہا ہوں۔ جاؤ ناشتہ لاؤ"

نلنی جا کر ناشتہ لے آئی۔ رام پرشاد ناشتہ کرنے لگا۔

نلنی نے پان بناتے ہوئے کہا "آج کل تم روز ہی کچھ نہ کچھ دیر کر کے آتے ہو آخر بات کیا ہے؟"

رام پرشاد بولا "وہی بم کیس کا معاملہ ہے۔ کمشنر کی جان لینے کی کوشش کوئی معمولی بات تو ہے نہیں جسے آسانی سے نظر انداز کر دیا جائے۔ بہت سے آدمی گرفتار ہو چکے ہیں مگر مجرم جماعت اب تک ہاتھ نہیں آئی ہے۔

۴

دن کے تین بجے تھے۔ رام پرشاد کی موٹر بنگلے کے باہر آکر رکی اور رام پرشاد اتر کر اندر آیا..... اس کی پریشان صورت کو دیکھ کر نلنی کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے آج جب ڈاک آئی تھی۔ اسی وقت سے نلنی اپنے شوہر کو اس حالت میں دیکھ رہی تھی۔ آج کی ڈاک میں ایک نیلا لفافہ تھا جس کے اندر ایک لمبا خط تھا۔ رام پرشاد خط پڑھتا جاتا تھا۔ اور اس کا چہرہ ہجوم غم سے متغیر ہوتا جاتا تھا نلنی کے دریافت کرنے پر کہ کس کا خط ہے وہ صرف اس قدر کہہ کر خاموش ہو گیا تھا کہ ایک دوست کا۔ واقعہ بھی یہی تھا۔ وہ خط رام پرشاد کے ایک دوست ہی کا تھا۔ اور اسی خط نے رام پرشاد کے دل میں ایک ہلچل برپا کر رکھی تھی۔ وہ جس نلنی سے اس قدر محبت کرتا تھا جس نلنی کو پا کر وہ اپنے کو دنیا میں سب سے زیادہ خوش نصیب سمجھتا تھا۔ جو نلنی اُسے اپنی جان سے بھی زیادہ پیاری تھی۔ وہ اس پر کیسے شبہ کرے؟ اسے کس طرح شک کی نظروں سے دیکھے! اسے کیونکر ناقابل اعتبار سمجھے! ایسی صورت میں تو اس کی زندگی ہی وبال ہو جائے گی۔ لیکن وہ کرے تو کیا! اس کے دوست نے نلنی اور سوشیل کی مفصل داستان محبت لکھ بھیجی تھی۔ وہ اپنے دوست کے شریفانہ اخلاق سے بخوبی واقف تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ ایک عفت مآب اور شریف خاتون پر اس قدر بہتان باندھے۔ اور اس کے عشق و محبت کی ایک مکمل کہانی لکھ بھیجے۔ مکمل کہانی نہیں تو اتنا کیا ہے کہ نلنی سوشیل کے ساتھ گنگا میں پھاند پڑی تھی۔ لیکن ان تمام حقیقتوں کے باوجود رام پرشاد نلنی کے آنسوؤں کو نہ دیکھ سکا۔ اور اس نے اپنے دل پر جبر کر کے مسکراتے ہوئے کہا "کیوں نلنی آخر آج دن بھر روتی رہی ہو؟"

رام پرشاد کی ایک مسکراہٹ نے نلنی کے تمام اندوہ و غم کو زائل کر دیا۔

رات کو رام پرشاد ایک دوست کے ہاں دعوت میں گیا۔ نلنی کے سر میں زور کا درد تھا اس لئے وہ نہ جا سکی۔ رام پرشاد بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ مگر نلنی کے مجبور کرنے سے گیا۔ کلاک نے ٹن ٹن کر کے آٹھ بجائے نلنی سوچنے لگی۔ ابھی تو ان کو گئے ایک ہی گھنٹہ ہوا۔ ابھی نہ جانے کتنی دیر میں آئیں گے۔ اسے وحشت سی ہونے لگی اسی حالت میں نوکر نے ایک کارڈ دیا۔ کارڈ پر "سوشیل" لکھا ہوا تھا۔ وہ پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ نظر اوپر اٹھائی تو سوشیل سامنے کھڑا تھا نلنی اسے حیرت و استعجاب سے دیکھنے لگی۔

سوشیل بولا "تمہیں تعجب ہو رہا ہے نا نلنی میں ایک ضرورت سے آیا تھا۔ سوچا ذرا تم سے مل لوں۔ تمہارا مزاج کیسا ہے! کچھ ناساز ہے کیا؟"

نلنی نے کہا۔ "اچھی تو ہوں! بیٹھو۔ کہاں ٹھہرے ہو! وہ آتے ہی ہوں گے"

سوشیل نے اپنا پتہ بتا کر کہا۔ "نہیں نلنی میں بیٹھ نہیں سکتا۔ بہت ضروری کام ہے"

نلنی بولی۔ ایسا کون سا کام ہے تمہیں کہ تھوڑی دیر بیٹھ نہیں سکتے!

دوسری جگہ ٹھہرے ہو۔ یہیں ٹھہرتے تو ایسا کون سا حرج تھا؟
" سوشیل نے مسکرا کر کہا " کہاں یہاں؟ اس کی وجہ تمہیں کل بتاؤں گا۔"
" اچھا تو کل پھر آؤ گے نا۔ دیکھو کھانا یہیں کھانا ہوگا۔"
" دن کو تو نہیں آ سکتا۔ اسی وقت آجاؤں گا۔"
ادھر سوشیل باہر گیا ادھر رام پرشاد اندر آیا۔
رام پرشاد نے درشت لہجے میں پوچھا " یہ کون صاحب تھے؟"
" ان کا نام سوشیل ہے۔ کل میں دن کو تمہارا تعارف کرا دوں گی انھوں نے میری دعوت منظور کر لی ہے " نلنی نے جواب دیا۔
" اچھا تو کل وہ پھر میرے گھر آئے گا۔ جونی بدمعاش کہیں کا! یہی تو ہے انارکسٹ پارٹی کا لیڈر جس کی تلاش میں پولیس سرگرداں ہے"
رام پرشاد ایک سانس میں اتنا کہہ گیا۔
نلنی بولی " تو تم کیس کے مجرم بھی ہیں۔ تم انہی کو گرفتار کرنا چاہتے ہو؟"
" ہاں یقیناً انہی کو " ـــــ رام پرشاد نے پر استقلال لہجے میں جواب دیا۔
" نہیں یہ ناممکن ہے " نلنی نے بھی اسی لہجے میں کہا۔
" ہاں ہاں یہ کیسے ممکن ہے۔! تم رات کو تنہا مکان میں اسے اپنے پاس بلا کر باتیں کرتی ہونا" ـــــ رام پرشاد کچھ طنز اور کچھ غصے کے ساتھ بولا۔
نلنی شوہر کا منہ تکتی رہ گئی۔ اس نے کچھ جواب نہیں دیا۔
رام پرشاد نے پھر کہا " میں اسے کل گرفتار کئے بغیر نہ چھوڑوں گا"
دوسرے روز رام ناتھ گیارہ بجے رات تک سوشیل کے انتظار میں بیٹھا رہا۔ مگر جب وہ اتنی رات گئے بھی نہیں آیا تو اس نے نلنی کے کمرے میں جا کر اس سے پوچھا۔ سوشیل آیا نہیں۔ تم نے اسے آنے سے منع کر دیا کیا؟
" ہاں "
" کیوں؟"
" مہمان کے ساتھ دغا کرنا انسانیت سے بعید ہے"
" تمہیں اس کا پتہ معلوم ہے وہ کہاں ٹھہرا ہے؟"
" ہاں معلوم ہے"
" مجھے بتاؤ۔"
" یہ نہیں ہو سکتا "
" تم سے یہ نہیں ہو سکتا لیکن تم شوہر کے قتل میں مدد دے سکتی ہو [illegible] تم کو؟...."

ہاں مجھ کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لو ان کا خط دیکھ لو۔ آج شام کی ڈاک سے ملا ہے۔"
نلنی اس گمنام خط کو پڑھ کر کانپ اٹھی۔
رام پرشاد نے کہا " اب بھی اس کا پتہ بتاؤ گی یا نہیں؟"
نلنی بولی " نہیں اب بھی نہیں۔"
رام پرشاد غصے میں بھرا گھر سے باہر نکل گیا۔ نلنی کا دل فکر و تشویش سے لبریز ہو گیا۔ وہ اسی طرح بیٹھی شوہر کی خیر منانے لگی۔ اس نے سوچا وہ سوشیل سے اپنی نیکی کے عوض اپنے شوہر کی زندگی مانگے گی۔ کہے گی میں نے تمہارا پتہ نہیں بتایا۔ تم میرے شوہر کے قتل کے ارادے سے باز آجاؤ۔ سوشیل اس کی بات ضرور مان لے گا۔ مانے گا کیسے نہیں۔ اگر فرض کیا وہ نہیں مانا تو وہ سوشیل کے سامنے ہی خودکشی کر لے گی۔ وہ اسی وقت سوشیل کے پاس جائے گی۔ اور اس سے سوشیل کی جان بخشی کے لئے کہے گی۔
نلنی نے جو کچھ سوچا وہی کیا۔ وہ چپکے سے دروازے سے باہر نکل گئی

(۵)

رات کو سہ پہر کا وقت تھا۔ کمرے میں رام پرشاد اور نلنی ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ رام پرشاد نے کرخت لہجے میں پوچھا " تم پچھلی رات کہاں سے آ رہی تھیں؟
نلنی نے بڑی بیباکی کے ساتھ جواب دیا۔ سوشیل بابو سے ملنے گئی تھی۔
رام پرشاد ایک طنز آمیز ہنسی ہنستا ہوا بولا۔ بے حیا کہیں کی میں تو پہلے ہی سمجھ چکا تھا۔ کہ ایک عفت باختہ عورت کا میرے گھر میں گذر نہیں ہو سکتا۔
نلنی کا دل غم و غصے سے لبریز ہو گیا۔ اس نے کہا " تم مجھے اور جو چاہو کہہ سکتے ہو۔ مگر میں اپنی نسبت عفت باختہ کا لفظ سننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"
رام پرشاد پھر اسی طرح طنز آمیز لہجے میں بولا ـــ ہاں۔ ہاں، تم سے زیادہ پاکباز عورت اور کون ہو سکتی ہے! لیکن تم ایک بار کس کی محبت میں دیوانی ہو کر گنگا میں پھاند پڑی تھیں؟
" سوشیل کی محبت میں"؟
" اچھا، اور اس روز یہاں آنے سے کیسے منع کر دیا تھا؟"
" سوشیل کو"
" بہت خوب، اور آج کس سے ملنے گئی تھیں اور کس کا پہلو گرم کر کے آ رہی ہو"



مراکش کی مسجد میں

"کسی کا نہیں، میرا جسم ایک پہاڑی پھول کی طرح پاک اور اچھوتا ہے۔"

"نلنی بس، تمہاری عفت مآبی اور پاکبازی کی حقیقت مجھ سے پوشیدہ نہیں رہی۔ اب تم مجھے اتنا بتادو کہ تم کہاں جانا چاہتی ہو؟ اپنے میکے؟" —— رام پرشاد نے سخت لہجے میں سوال کیا۔

نلنی کا دل پاش پاش ہو رہا تھا۔ مگر اس نے ضبط کر کے صرف اتنا جواب دیا —— نہیں۔

رام پرشاد نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ اچھا اگر یہیں رہنا چاہتی ہو تو تمہیں ایک کمرہ مل جائے گا۔

نلنی کا بے جان جسم ہسپتال کے ایک سنسان کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ وہ دق میں مبتلا ہو کر ایک سال سے اسی ہسپتال میں پڑی تھی۔ مہینے کے آخر میں ایک منی آرڈر اس کے نام آجاتا تھا۔ اور بس، اس سے زیادہ اس کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ اسی بے چارگی اور بیکسی کے عالم میں رات کو نہ جانے کس وقت اور کن اذیتوں سے اس کی جان نکلی تھی کہ تمام بستر خون سے لت پت ہو رہا تھا۔

نازونعم میں پلی ہوئی ایک بڑے باپ کی بیٹی اور ایک بڑے اعلیٰ سرکاری عہدیدار کی بیوی کے باوجود اس کا کوئی عزیز اور رشتہ دار موجود نہ تھا جو اسکی میت کے مراسم ادا کرتا۔ . . . جب ڈاکٹر لاش کا معائنہ کرنے لگا تو لاش میں پہنے ہوئے کپڑوں کے اندر دو تصویریں نکلیں۔ ایک کے نیچے لکھا تھا۔ "سونیل" اور دوسری کے نیچے۔ "رام پرشاد"

ڈاکٹروں کی نظروں سے ہر طرح کے واقعات گذرتے رہتے ہیں۔ اس لئے ان کا دل بہت سخت ہوتا ہے لیکن اس صورت حال نے ڈاکٹر کو بھی بے چین کر دیا۔ مگر بہت غور کرنے کے بعد بھی یہ راز اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ ایک عورت ایک وقت میں صرف ایک مرد سے محبت کر سکتی ہے۔ ان دو تصویروں کے کیا معنی؟

عاشقِ جانباز

از جناب اندرجیت شرما

سنسناتی ہوئی طوفاں کی ہوا آتی ہو
حشر ڈھاتی ہوئی ظلمت کی گھٹا آتی ہو
آگ برسانے کو گو برقِ بلا آتی ہو
—— لیکن آگے ہی پڑیگا مری ہمت کا قدم
—— عشق صادق ہے میرا عاشقِ جانباز ہوں میں

راہِ پُرخار میں آجائیں اگر لاکھوں غار
یا فلک بوس ہمالہ کی ہو آگے دیوار
پار کرنا ہی پڑے یا کوئی بحرِ ذخار
—— ننگ ہے میرے لئے بیٹھ کے لینا کہیں دم
—— عشق صادق ہے میرا عاشقِ جانباز ہوں میں

لشکروں کے کہیں چھا جائیں اگر دل پہ دل
پشتے کشتوں کے لگانے لگے طوفانِ اجل
خوف سے لرزہ براندام ہوں صحرا و جبل
—— جوشِ غیرت مرا ہو سکتا نہیں پھر بھی کم
—— عشق صادق ہے میرا عاشقِ جانباز ہوں میں

گلی کتب خانہ

تاریخ عالم کے کرم خوردہ صفحوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے مصری اور بابلی ہی نے لباس تمدن زیب بدن اور انسانی دماغ کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کیا لیکن مصریوں نے کوئی باقاعدہ کتب خانہ قائم نہ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے یہاں علمی ترقی کا دارومدار مذہبی پیشواؤں پر تھا۔ اور یہ پیشوا اپنی گرم بازاری کی ذہنی فتوحات کو چھپا کر رکھتے تاکہ عوام کی نگاہوں میں وہ معمہ بنی رہیں۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج اُن کے کارنامے دنیا سے پوشیدہ ہیں۔ اس کے برخلاف اہل بابل نے جو قدامت میں اہل مصر سے کم نہ تھے۔ ابتدا ہی میں ترویج علوم کی طرف توجہ کی۔ ہر زمانے میں چونکہ ہر قوم اپنی ضرورتیں انہی چیزوں سے پوری کرتی ہیں جو آسانی سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ سرزمین بابل میں دجلہ و فرات کی طغیانی کی بدولت عمدہ قسم کی مٹی بکثرت موجود تھی۔ اس لئے انہوں نے مٹی کی کچی اینٹوں کے چاروں طرف خشک ہونے سے پہلے لوہے یا پیتل کے نوکدار قلم سے لکھ کر اور خشک ہونے کے بعد اُن کو آوے میں پکا کر تحفظ و ترویج علوم کا ذریعہ بنایا اور اس قسم کی گلی کتابوں سے بڑے بڑے کتب خانے قائم کئے۔

اب اگر ان جواہر بے بہا پر ایک تفصیلی نظر ڈالی جائے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تختوں میں سے بعض پر قدیم سلاطین کے کتبوں کی نقول ہیں جو ان کے حالات پر گہری روشنی ڈالتی ہیں۔ اور بعض پر عہد ناموں، فرمانوں، اور احکام شاہی کی نقول ثبت ہیں۔ اس کتب خانہ میں صرف سرکاری تحریروں کی حفاظت نہیں کی گئی بلکہ رعایا کے فرائض اور ان لوگوں کی باہمی خانگی خط و کتابت کا بھی ایک بڑا ذخیرہ جمع کیا گیا تھا جس سے اُس زمانے کی معاشرت اور تمدن کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

کتب خانے کی ایک بڑی شاخ قوانین سے تعلق رکھتی ہے۔ ان میں سے بعض تختیوں پر قوانین نافذہ کی نقول موجود ہیں جغرافیہ بھی اُس زمانہ میں ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ چنانچہ کسی تختی پر شہروں، قصبوں، دریاؤں اور پہاڑوں کی فہرستیں درج ہیں۔ تو کسی پر مختلف مقامات کے مواقع اور خصوصیات اور پیداوار وغیرہ کے حالات ثبت ہیں۔

ایک اہم صحیفہ روایات مذہبی سے متعلق تھا جس میں بہت سی روایتیں دوسری قوموں سے لی گئی تھیں۔ ان روایات میں سب سے زیادہ قابل ذکر گلگامیش کا قصہ ہے

ایک تاریخی انکشاف

از — جناب محمد وصی الحسن

جو غالباً حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے دو ہزار سال قبل مرتب ہوا تھا یہ قصہ بارہ (۱۲) جلدوں میں تھا۔ اور ہر جلد کا نام کسی نہ کسی کے نام پر رکھا گیا تھا گیارہویں عہد میں جس کا نام دیوتا تھا طوفان نوح کے متعلق وہ روایت درج تھی۔ جو اہل بابل میں مشہور تھا اس سے طوفان نوح کے اُس قصے کی جو عہد قدیم میں درج ہے۔ پوری تصدیق ہوتی ہے۔ اسی طرح بہت سی تختیوں پر مختلف قسم کی روائتیں اور حکائتیں درج تھیں، اور بعض پر بھوت پریت کے قصے اور اُن کے آتارنے کے منتر بھی ثبت تھے۔

کتب خانہ کی ایک شاخ دیومالائی سے تعلق رکھتی تھی۔ اور اس کے متعلق جو تختیاں تھیں۔ اُن پر دیوتاؤں کی فہرستیں اور اُن کے اسما اور صفات اور مندروں کی تفصیل مندرج تھی۔ اُن کا علمی تجسس صرف زمین تک ہی محدود نہ رہا بلکہ ان کی فکر بلند پرواز نے آسمان تک بھی رسائی پیدا کر لی تھی۔ چنانچہ اُن گلی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ علم ہیئت سے متعلق تھا جن میں اجرام فلکی کی اشکال اور گردشوں کی کیفیت تحریر تھی۔ اور مختلف آثار و مناظر فلکی کی بھی توضیح کی گئی تھی۔ جوتش یا نجوم بھی چونکہ علم ہیئت کی ایک شاخ سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے اُس کے متعلق بھی بہت سی تختیاں تھیں جن میں ثوابت اور ستاروں کی تاثیرات پر بحث کی گئی تھی۔

ایک نہایت دلچسپ صحیفہ حیوانات و نباتات و معدنیات سے متعلق تھا جس میں چوپایوں پرندوں، حشرات الارض، گھاسوں اور جڑی بوٹی وغیرہ کی فہرستیں اور اُن میں سے ہر ایک کی تاثیرات پر بھی بحث کی گئی تھی۔ دھاتوں کی فہرستیں بھی بعض تختیوں پر درج تھیں کہ وہ کس کام آتی ہیں اور بعض پر مختلف قسم کے کھانے پہننے کی چیزوں کی فہرستیں درج تھیں۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹی سی شاخ ریاضی و حساب سے بھی تعلق رکھتی تھی۔

یہ گلی کتب خانہ زیادہ تر کلدانیوں اور بابلیوں کی جولانی طبع کا نتیجہ تھا۔ اور خط دہی قدیم میکانی تھا۔ جو زمانہ قدیم میں کلدانیا، اور بابل، اور ایران میں رائج تھا۔ اس قسم کی تیس ہزار سے بھی زیادہ تختیاں نینوا کے کتب خانہ میں جمع کی گئی تھیں۔ اور ان میں سے بہت سی ابھی تک برٹش میوزیم اور یورپ و امریکہ کے دوسرے ملکوں کے عجائب خانوں میں آج تک دنیا کے قدیم تمدن پر گہری روشنی ڈالنے کے لئے موجود ہیں

———— ٭ ————

کتاب خانۂ پنجاب کی نئی مطبوعات

بہارِ داغ —— مرتبہ سیّد نذیر نیازی

فصیح الملک داغ دہلوی کا کلام آجتک اس اہتمام سے شائع نہیں ہوا - اسمیں داغ کی رندی اور شوخی - فلسفہ شبابیات اور اسرارِ عشق و محبت عیاں کئے گئے ہیں - قیمت بلا جلد ایکروپیہ مجلد ایکروپیہ آٹھ آنے -

جمہوریت و آمریت —— از سید نصیر احمد بی - اے

ایک دلچسپ تمثیل کے ذریعہ جمہوریت و آمریت کو از روئے عدل ہیں تولا گیا ہے - موجودہ جنگ کی ہولناکیوں ہیں اس کتاب کا مطالعہ صحیح سیاسی شعور کی تخلیق ہیں معاون ثابت ہوگا - قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے -

ہوائی قلعے —— مصنّفہ کرشن چندر ایم - اے

کرشن چندر ایم - اے کے لطیف افسانوں کا نیا مجموعہ - ہوائی قلعے کے مضامین اور افسانے انسانی فطرت کے عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہیں - قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے -

موپاساں کے افسانے —— مترجمہ سید نصیر حیدر

ان افسانوں ہیں موپاساں کی حقیقت نگاری کو آپ عریانی کا نام دے لیں - لیکن بے حیائی نہیں کہہ سکتے - قیمت مجلد ایک روپیہ -

اُس نے کہا —— از قاضی عبد الغفار

قاضی عبد الغفار مصنّف "لیلےٰ کے خطوط" نے مشہور مفکر خلیل جبران کے افکار و خیالات کو اُردو کا جامہ پہنایا ہے ایک دلکش رومان - قیمت ایک روپیہ چار آنہ -

پتہ ہے :- اردو بک اسٹال بیرون لوہاری دروازہ لاہور

ایک بوڑھے گداگر کا تحفہ

آسکر وائلڈ کا ایک افسانہ

ترجمہ جناب محمد اسحٰق میر

"غریب انسان کے لئے اُسکی خوبصورتی بھی بیکار ہوتی ہے۔ عشق و محبت غریبوں کا پیشہ نہیں بلکہ ایک مشغلہ ہوتا ہے۔ غریب کیلئے لازم ہے کہ سیدھی سادی اور عملی زندگی بسر کرے۔ کیونکہ دلکشی و خوبصورتی سے ایک مستقل آمد کہیں بہتر ہوتی ہے"

اور موجودہ زندگی کے یہی چند تلخ تجربات ہیں جن سے بدنصیب ہیگی ارسکائن عملاً ناواقف تھا۔ لیکن اگر اس پہلو سے قطع نظر کرتے ہوئے ہیگی ارسکائن کے اخلاق کا جائزہ لیا جائے تو اعتراف کرنا پڑیگا کہ وہ ایک غیر معمولی شخصیت کا مالک تھا۔ اور اُس نے آج تک اپنی تمام عمر میں قولاً یا فعلاً کوئی نازیبا حرکت نہ کی تھی۔ وہ اپنے گھنگریالے بھورے بالوں نیلگوں آنکھوں اور خوبصورت چہرے کے باعث حیرت انگیز طور پر حسین بھی تھا اور وہ جس طرح مردوں میں ہر دلعزیز تھا اسی طرح عورتوں میں بھی ایک خاص ہر دلعزیزی کا مالک تھا۔ نیز ان خوبیوں کے علاوہ اور بھی بہت سی ایسی خوبیاں تھیں جو اُس میں پائی جاتی تھیں لیکن "روپیہ کمانا" اُس کے لئے ایک ایسی مصیبت تھی جس پر وہ اپنی تمام خوبیوں کی موجودگی میں بھی غلبہ حاصل نہ کر سکا تھا۔

اُسے اپنے باپ کی جانب سے ایک تلوار اور جنگ "پینسولا" کی ایک طویل تاریخ ورثہ میں ملی تھی جس کی کم و بیش پندرہ علیحدہ علیحدہ جلدیں تھیں۔ ہیگی نے تلوار کو اپنے آئینہ کے اوپر آویزاں کیا ہوا تھا۔ اور تاریخی کتب کو دوسری کتابوں کے ہمراہ ایک خوبصورت "شیلف" میں رکھا ہوا تھا۔ سر دست وہ بیکار تھا۔ اور اُس کا گزارا صرف دو سو پونڈ سالانہ پر تھا۔ جو اسے اپنی پھوپھی کی جانب سے باقاعدہ مل رہا تھا۔ اگرچہ اُس نے تلاش روزگار میں بھی کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا تھا۔ لیکن اس تمام تگ و دو کا ابھی تک کوئی بھی تسلی بخش نتیجہ برآمد نہ ہو سکا تھا۔ چنانچہ مثال کے طور پر پہلے پہل اُس نے چھ ماہ تک "سٹاک ایکسچینج" میں کام کیا۔ لیکن وہاں اُسکی حیثیت ہمیشہ وہی رہی جو ایک دنبوں کے غول میں بکری کی ہوتی ہے۔ پھر معمولی عرصہ کیلئے اُس نے چائے کی تجارت شروع کی لیکن بعد میں جلد ہی اس پیشہ سے بیزار ہو کر اسے ترک کر دیا۔ اس کے بعد اس نے شراب فروخت کرنا شروع کی لیکن اسمیں بھی اُسے کوئی کامیابی نظر نہ آئی۔ اور بالآخر ان تلخ تجربات کے بعد وہ صرف —— ایک بااخلاق اور خوبصورت لیکن بیکار انسان —— بن کر رہ گیا۔

مصیبت بالائے مصیبت یہ بھی تھی کہ بدقسمتی سے مرضِ محبت میں بھی مُبتلا تھا۔ لوجس دوشیزہ سے اُسے محبت تھی۔ اُس کا نام "لارا مرٹن" تھا۔ لارا کا باپ کسی زمانے میں ہندوستانی فوج کا کرنل رہ چکا تھا۔ لیکن ہندوستان میں وہ طویل عرصہ تک رہکر آب و ہوا کی ناموافقت کے باعث "مزاج" اور "معدہ" دونوں سے ہاتھ دھو چکا تھا۔ لارا کو اگرچہ ہیگی سے بیحد محبت تھی اور ہیگی بھی لارا کی ہر ممکن نازبرداری کے لئے تیار تھا۔ لیکن بوڑھا کرنل ان دونوں کی شادی کی تجویز کو بعض وجوہ کی بنا پر سُننے کا روادار نہ تھا۔ چنانچہ وہ اکثر ہیگی سے کہا کرتا تھا۔ "جب تمہارے پاس دس ہزار پونڈ جمع ہو جائیں تو اُس وقت میرے پاس آنا۔ پھر میں شادی کی تجویز پر غور کر سکتا ہوں۔"

انہی وجوہ کی بنا پر ہیگی بھی آجکل متفکر سا رہا کرتا۔ اور وہ اپنی طبیعت کو بہلانے کے لئے لارا کے پاس بلاناغہ جایا کرتا تھا۔

ایک دن جب ہیگی لارا کو ملنے کے لئے ہالینڈ پارک کی جانب جا رہا تھا۔ تو وہ راستہ میں چند لحظوں کے لئے اپنے ایک قدیمی دوست ایلن ٹریور سے ملنے کیلئے رُک گیا۔ ٹریور ایک مصور تھا۔ علاوہ اپنے مخصوص فن میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا۔ ویسے ذاتی طور پر تو وہ ایک بدصورت سا انسان نظر آتا تھا۔ لیکن جب وہ اپنے ہاتھ میں موقلم لیتا تو وہ ایک غیر معمولی یا فوق الفطرت انسان بن جاتا۔ اور لوگ اُس کے شاہکاروں کی بہت قدر و منزلت کیا کرتے تھے۔

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ پہلے پہل وہ محض ہیگی کی دلفریب شکل و شباہت کے باعث ہی اُس کا مداح و دلدادہ بنا تھا۔ کیونکہ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ مصور کو صرف ایسے انسانوں ہی سے ملنا چاہئے۔ جو غیر معمولی طور پر خوبصورت و دلفریب ہوں۔ جن کو دیکھنے سے مصور کے آرٹ کی خوبیاں نظر آئیں۔ اور جن سے گفتگو کرتے وقت اُسے ایک روحانی فرحت محسوس ہو . . . . . بہرحال جب رفتہ رفتہ ہیگی سے اُسکی دوستی بڑھتی چلی گئی تو وہ اُسکی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ اُسکی حوصلہ مندی۔ فیاضی اور دلیر فطرت کا بھی معترف ہو گیا۔ اور اسکے بعد ہیگی کے لئے اُس کے نگار خانے کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھل گیا۔

چنانچہ آج جب ہیگی، ٹریور کے نگار خانے میں آیا تو اُس نے دیکھا کہ ٹریور ایک گداگر کی قدِ آدم تصویر پر آخری نقش و نگار کر رہا ہے۔ نگار خانے کے ایک کونے میں ایک اونچی جگہ پر ایک گداگر بھی ایک مجسمہ کی حیثیت سے

بیٹھا ہوا تھا جس کے کاندھوں پر ایک پھٹی پرانی گدڑی پڑی ہوئی تھی۔ اُس کے بھدّے سے بوسیدہ بُوٹ پر کئی جگہ بدنما پیوند لگے ہوئے تھے۔ اُس کے ایک ہاتھ میں ایک چوبی چھڑی تھی جس کے سہارے وہ کھڑا تھا اور دُوسرے ہاتھ میں اُسکی بوسیدہ ہیٹ کشکول کا کام دے رہی تھی۔

"بہت ہی دلفریب مجسمہ ہے"! ہیگی نے لٹرپور سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا

"دلفریب مجسمہ ہے؟" لٹرپور نے چلّا کر کہا "ہاں! مجھے ایسا ہی سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ اِس قسم کے گداگر ہر روز نہیں مِلا کرتے"۔

"بدنصیب بوڑھا" ہیگی نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا "بیچارہ کتنا مصیبت زدہ نظر آتا ہے — لیکن میرا خیال ہے کہ تم مصوّروں کیلئے اس کا چہرہ بھی ایک زبردست نعمت سے کم نہیں"۔

"یقیناً!" لٹرپور نے مسکرا کر کہا "کیونکہ تم یہ ہرگز پسند نہ کروگے کہ ایک گداگر کے چہرے پر مسرت کے آثار بھی ہونے چاہئیں۔

"ایک آدمی کو مجسمہ بن کر بیٹھنے کی کیا اُجرت مِلتی ہے"! ہیگی نے ایک آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ایک شلنگ فی گھنٹہ"۔

"اور تم تصویر کی قیمت کیا وصول کرتے ہو"۔

"دو ہزار پونڈ"۔

"پونڈ؟"

"ہاں! ہاں!! پونڈ! شاعر، مصوّر اور حکیم ہمیشہ اپنی اُجرت پونڈوں کی صورت ہی میں وصول کیا کرتے ہیں"۔ لٹرپور نے جواب دیا۔

"لیکن میرا خیال ہے کہ اِس اُجرت میں سے بیچارے مجسمہ کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور مِلنا چاہیئے"! ہیگی نے مسکرا کر کہا "کیونکہ وہ بھی تو تمہاری طرح نہایت مشقت سے کھڑے رہتے ہیں"۔

"ہُوں! کیسی واہیات تجویز ہے"۔ لٹرپور نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا "پہلے ذرا رنگ آمیزی کی مشکلات کا اندازہ لگاؤ۔ پھر یہ بھی قیاس کرو کہ مصوّر کو کتنے کتنے گھنٹوں تک مُوقلم ہاتھ میں لئے تصویر کے سامنے کھڑا رہنا پڑتا ہے . . . . کوئی بات مُنہ سے کہدینا بہت آسان ہے . . . . لیکن خیر! اب تمہیں زیادہ باتیں کرنے کی اجازت نہیں میں اِس وقت بہت مصروف ہوں۔ لو۔ سِگریٹ پیو۔ اور اب بالکل خاموش ہو جاؤ"۔

ایک معمولی سے وقفہ کے بعد ہی لٹرپور کا ایک مُلازم آیا۔ اور اُس نے آکر لٹرپور سے کہا "فریم بنانے والا آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہے"۔

"کہیں جانا مت"۔ لٹرپور نے جلدی سے باہر جاتے ہوئے ہیگی سے کہا "میں ایک لحظہ کے بعد واپس آجاؤں گا"۔

گداگر بوڑھا بھی لٹرپور کی غیر حاضری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایک قریبی بینچ پر بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے پر اتنی معصومیت چھائی ہوئی تھی کہ ہیگی کے دل میں خواہ مخواہ اُس کے لئے رحم پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ ہیگی نے اِس جذبے سے متاثر ہو کر فوراً اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ جیب میں صرف ایک شلنگ اور چند پنس ہی باقی بچے تھے اُس نے اپنے دل میں خیال کیا کہ اِس غریب بوڑھے کو تو اِس رقم کی مجھ سے زیادہ ضرورت ہوگی۔ لیکن افسوس یہ اُس کے لئے زیادہ عرصہ تک کافی نہ ہو سکے گی۔ چنانچہ ہیگی نے بوڑھے کے قریب جا کر اُس کے ہاتھ پر ایک شلنگ رکھ دیا۔ بوڑھے نے ہیگی کو غور سے دیکھا اُس کے لبوں پر ایک ہلکی سی مُسکراہٹ دَوڑی اور اُس نے کہا۔

"خدا آپ کا بھلا کرے! خدا آپ کا بھلا کرے!!"

اِس اثنا میں لٹرپور بھی واپس چلا آیا۔ اور ہیگی نے بھی جانے کی اجازت مانگی اُس نے لٹرپور سے اپنی اِس "ضرورت" کا مطلقاً کوئی ذکر تک بھی کرنا پسند نہ کیا اور وہاں سے رُخصت ہو کر تمام دِن لارا کی رفاقت میں بسر کیا جس نے ہیگی کو اِس "سخاوت" پر نہایت نرمی سے جھڑکا بھی۔ اور اُس کی اِس حرکت پر ہنستی بھی رہی۔

شام کے وقت جب ہیگی واپس گھر جا رہا تھا تو وہ شب کو گیارہ بجے کے قریب کلب میں گیا اور اُس نے دیکھا کہ لٹرپور بھی وہیں بیٹھا شراب پی رہا ہے۔

"کیا تم نے وہ تصویر ختم کر لی ہے؟" ہیگی نے اپنا سگریٹ سُلگاتے ہوئے کہا۔

"مکمل کر کے اُس پر فریم بھی چڑھا دیا گیا ہے"! لٹرپور نے کہا "اور ساتھ ہی ساتھ مجھے یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ وہ بوڑھا جو تم نے صبح میرے نگار خانے میں دیکھا تھا۔ وہ تمہارا بہت مداح اور عقیدتمند بن گیا ہے۔ اور تمہارے متعلق بہت سے سوالات دریافت کرتا رہا تھا چنانچہ مجھے مجبوراً تمہارا سب حال، پتہ۔ آمد اور کاروبار کے متعلق اُسے تفصیلاً بتانا پڑا"۔

"لٹرپور!" ہیگی نے مُسکرا کر کہا "میرا خیال ہے کہ جب میں گھر پہنچوں گا تو وہ میرے انتظار میں کھڑا ہوگا۔ واقعی وہ بیچارا نہایت غریب آدمی معلوم ہوتا ہے۔ کاش میں اُس کیلئے کچھ کر سکتا۔ میرا خیال ہے کہ اتنی شدید غربت بھی نہایت مصیبت ناک ہوتی ہے۔ میرے گھر میں پُرانے کپڑوں کا ایک انبار پڑا ہوا ہے۔ کیا وہ اُسے بخوشی قبول کریگا؟ آخر اُس کے کپڑے اِس قدر بوسیدہ کیوں تھے؟"

"لیکن وہ تو اپنے موجودہ کپڑوں ہی میں بہتر معلوم ہوتا ہے" لٹرپور نے کہا "اور میں اُسکی تصویر کسی قیمت پر بھی موجودہ کپڑوں سے اچھے کپڑوں میں بنانے کیلئے تیار نہیں کیونکہ جو چیز تمہارے نزدیک ایک چیتھڑا ہے وہ میرے

نزدیک ایک رُومان ہے۔ جو تمہیں غربت نظر آتی ہے وہ میرے لئے ایک دلفریب آرٹ ہے . . . . لیکن بہر حال میں تمہاری پیشکش سے اُسے مطلع کردونگا۔"

"لٹرلور" ہیگی نے بے ساختگی سے کہا "مصوّروں کے دل بھی پتھر ہی ہوا کرتے ہیں۔"

"مصوّر کا دل اُس کا دماغ ہے۔" لٹرلور نے جواب دیا "پھر اس کے علاوہ ہمارا کام ہی یہی ہے کہ ہم دُنیا کو بالکل حقیقی صورت میں پیش کریں . . . . اور ہاں یہ تو بتاؤ کہ لارا کی طبیعت کیسی ہے۔ بوڑھا گداگر تو اُس سے بھی دلچسپی ظاہر کر رہا تھا۔"

"کیا تمہارا مقصد یہ ہے کہ تم نے بوڑھے سے اُس کے بارے میں بھی کوئی گفتگو کی تھی؟" ہیگی نے حیران و ششدر ہو کر کہا۔

"یقیناً میں نے اُس کے بارے میں بھی باتیں کی ہیں۔ اور اَب وہ لارا اُس کے باپ، اور دس ہزار پونڈ سب کے بارے میں جان چکا ہے۔"

"تو پھر تم نے اُس گداگر کو میری ذاتی باتیں بھی بتادیں؟" ہیگی نے لٹرلور کی جانب خشم آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے یار!" لٹرلور نے مسکراتے ہوئے کہا "وہ بوڑھا جسے تم ایک گداگر سمجھ رہے ہو یورپ کا متموّل ترین انسان ہے۔ وہ اگر چاہے تو تمام لنڈن کو خرید سکتا ہے۔ یورپ کے ہر ایک دارالسلطنت میں اُس کا ذاتی مکان ہے۔ سونے کے برتنوں میں کھانا کھاتا ہے۔ اور اگر وہ چاہے تو ہر ناممکن بات کو ممکن کر دکھائے۔"

"لیکن ان تمام باتوں سے تمہارا مقصد کیا ہے؟" ہیگی نے برافروختہ ہو کر کہا۔

"کہنے کا مقصد یہ ہے" لٹرلور نے سنجیدگی سے جواب دیا "کہ جس آدمی کو تم نے آج میرے نگارخانہ میں دیکھا تھا۔ وہ بیرن ہیسبرگ ہے۔ وہ مدت سے میرا گہرا دوست ہے۔ اور اکثر میری تصویریں ہی خریدا کرتا ہے۔ اُس نے ایک ماہ پیشتر مجھے ایک معقول رقم دی تھی۔ تاکہ میں اُس کی تصویر ایک گداگر کے لباس میں تیار کردوں، چنانچہ مجھے اعتراف ہے کہ اُس نے اِن پھٹے پُرانے چیتھڑوں میں ایک حقیقی گداگر کی نقالی کر دکھائی ہے۔ حالانکہ یہ کپڑے اُس کی ذاتی ملکیت نہ تھے۔ بلکہ یہ میرا ایک نہایت ہی پُرانا سوٹ تھا جسے میں نے کسی زمانے میں اسپین سے خریدا تھا۔"

"بیرن ہیسبرگ؟" ہیگی نے متحیر ہو کر کہا "افسوس میں تو اُسے حقیقی گداگر سمجھ کر ایک شلنگ بھی دے بیٹھا ہوں۔"

"اچھا۔ تو کیا تم نے اُسے ایک شلنگ بھی دیا تھا" لٹرلور نے متعجب ہو کر کہا اور پھر بے اختیار قہقہہ لگانا شروع کر دیا۔

"واہ واہ! یہ بھی ایک ہی کہی۔ سخی ہو تو ایسا ہو۔"

"لیکن میرا خیال ہے۔" ہیگی نے سنجیدگی سے کہا "کہ تمہارا یہ فرض تھا کہ جس وقت میں تمہارے نگارخانے میں آیا تھا تم مجھے اِس گداگر کی اصلیت سے آگاہ کر دیتے تاکہ میں اِس قسم کی بیہودہ حرکت کا مرتکب نہ ہو سکتا۔"

"لیکن ہیگی" لٹرلور نے کہا "مجھے تو یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ تم میری غیر حاضری میں اِس فیاضی سے نگارخانے میں خیرات کرنے لگ پڑو گے۔ اور پھر اس کے علاوہ جس وقت تم آئے تھے تو اُس وقت میں کچھ غیر معمولی طور پر مصروف و منہمک بھی تھا۔ اور مجھے یہ بھی قطعی طور پر معلوم نہ تھا کہ بیرن ہیسبرگ ایسی ذلیل حالت میں اپنی حقیقی شخصیت کے انکشاف کو پسند کریگا یا نہیں۔"

"لیکن اَب تو وہ مجھے یقیناً ایک پہلے درجے کا احمق ہی تصوّر کرتا ہوگا۔" ہیگی نے شرمندہ ہو کر کہا۔

"نہیں! نہیں!! ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ تو تمہارے جانے کے بعد غیر معمولی طور پر مسرور نظر آتا تھا اور میری سمجھ میں نہ آیا تھا کہ اِس غیر معمولی مسرت کا حقیقی باعث کیا ہے اور وہ کیوں تمہارے متعلق اِس قسم کے عجیب و غریب سوالات دریافت کرنے لگ پڑا ہے۔ لیکن معاملہ اَب میری سمجھ میں آیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ تمہارے شلنگ کو اپنے پاس ہمیشہ بطور امانت جمع رکھے گا۔ اور ہر سال اِس رقم کے عوض میں بھاری سُود ادا کیا کریگا۔" لٹرلور نے کہا۔

"لیکن لٹرلور واقعی میں نے ایک نازیبا حرکت کا ارتکاب کیا ہے۔" ہیگی نے پریشان خاطر ہو کر کہا "اَب میں گھر جا رہا ہوں۔ ہاں! لیکن لٹرلور خدا کے واسطے اَب اِس واقعہ کا ذکر کسی دُوسرے آدمی سے نہ کرنا نہیں تو میں محلہ بھر میں مُنہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہونگا۔"

"یہ تمہارے لچر خیالات ہیں۔ تمہاری اِس حرکت سے تو تمہاری قابل قدر "ہمدردی مخلوق" کا روشن ثبوت ملتا ہے . . . . اور ابھی سے کہاں جا رہے ہو۔ بیٹھو۔ لو یہ سگریٹ پیو اور ذرا لارا کے بارے میں بھی کچھ ذکر کرو۔"

لیکن مغموم ہیگی نے مزید قیام مناسب نہ سمجھا اور لٹرلور کو قہقہے لگاتے ہوئے چھوڑ کر گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

دُوسرے دِن کی صبح کو جب ہیگی دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا۔ تو اس کا نوکر ایک کارڈ لایا جس میں "موسیو بیرن ہیسبرگ کا ایک خادم" لکھا ہوا تھا۔ ہیگی نے خیال کیا کہ شاید یہ شخص موسیو بیرن ہیسبرگ کی جانب سے کل کے واقعہ پر معذرت کرنے آیا ہے۔ لہذا اُس نے اپنے نوکر سے کہا کہ نووارد مہمان کو اندر لے آؤ۔

ایک سفید ریش بوڑھا سُنہری عینک لگائے کمرے میں داخل ہوا اور فرانسیسی زبان میں یوں گویا ہوا۔

"کیا میں موسیو آرسکائن ہیگی سے شرفِ گفتگو حاصل کر سکتا ہوں؟" ہیگی تعظیماً جھک کر آداب بجالایا۔

"میں بیرن ہیبرگ کی جانب سے یہاں حاضر ہوا ہوں" بوڑھے نے کہا۔
"اوہ! بیرن" ہیگی نے گھبرا کر قطع کلام کرتے ہوئے کہا "بیرن ہیبرگ میں بہت شرمندہ ہوں۔ اور اپنی کل والی حرکت کے باعث انتہائی قصور پر شرمندہ ہوں۔ امید ہے کہ آپ میرے یہ الفاظ اُن تک پہنچا دیں گے۔"
"بیرن نے یہ خط مجھے دیا ہے تاکہ اسے میں آپ تک احتیاط سے پہنچا دوں" بوڑھے نے مسکراتے ہوئے کہا! اور لفافہ ہیگی کو دے دیا۔
لفافے کے اوپر لکھا ہوا تھا:۔
"مسٹر سکاٹی ہیگی اور تارا کی تقریب شادی خانہ آبادی پر ایک بوڑھے گداگر کا حقیر تحفہ"
اور لفافے کے اندر دس ہزار پونڈ کا ایک چیک تھا۔

نغمۂ پنہاں

گھر اس قدر اُجڑا کہ بیاباں نظر آیا

از شبلی بی کام

جس وقت مجھے جلوۂ جاناں نظر آیا! — دل کہہ اُٹھا انساں میں یزداں نظر آیا
اُف رے ترے جلوؤں کا ضیا ریز تلاطم — اُٹھتا ہوا اِک نور کا طوفاں نظر آیا
پھر بربطِ دل چھیڑ دیا اُس کی نظر نے — پھر آہ میں بھی نغمۂ پنہاں نظر آیا
تمئیزِ کُل و جزو سے جب ہو گیا آزاد — ہر پھول کے دامن میں گلستاں نظر آیا
اب دشت نوردی کی نہیں فکر جنوں کو — گھر اس قدر اُجڑا کہ بیاباں نظر آیا
کہتا ہے یہ اُس سے مرا ہر اشکِ مصیبت — کیا تجھکو بھی دردِ غمِ پنہاں نظر آیا
یہ فصلِ بہار اور جنوں کے یہ کرشمے — دامن نظر آیا نہ گریباں نظر آیا
پروانے کی تھی راکھ تہِ شمعِ فسردہ — ہر صبح یہ انجامِ شبستاں نظر آیا

آفات کے مارے ہوئے شبلی کی نہ پوچھو
وہ جب بھی نظر آیا پریشاں نظر آیا

لاہور — ۲۲ نومبر ۱۹۴۰ء

امریکن سائنسدانوں نے آبِ حیات ڈھونڈھ نکالا!



سدا جوان رہنے کا آسان طریقہ

موڈرن سائنس کا معجزہ

ہر معلوم اور نامعلوم دریافت کرنے کے بعد بھی سائنس دائمی جوانی کا کوئی کامیاب طریقہ دریافت نہ کر سکی۔ لیکن اب دنیا کو ڈاکٹر ہرشفیلڈ ایم ڈی۔ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے انتہائی جدوجہد اور ریسرچ کے بعد افریقہ کے ایک درخت سے ایسا ایلکلائڈ دریافت کیا ہے جو انسان میں ہمیشہ جوانی قائم رکھ سکتا ہے۔ اس کے تجربات سیکسولوجی سائنس انسٹی ٹیوٹ آف برلن امریکہ اور یورپ کے دیگر ممالک میں کئے گئے جس سے شاندار اور حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی۔

اس جادو اثر آب حیات کا نام اوٹون "Otone" ہے جسے سلور ڈراپ (SILVER DROPS) میں پیش کیا گیا ہے۔

اوٹون کے سلور ڈراپ کھانے کے بعد آپ اپنے جسم میں ایک خوشگوار اور دل خوش کن تبدیلی محسوس کریں گے۔ چہرے کی جھریاں غائب ہو جائیں گی بدن کی جلد پر شباب کی تروتازگی اور ملائمیت آ جائیگی۔ رخسارے گوشت و خون سے بھر کر کشمیری سیب کی طرح دمکنے لگیں گے۔ چہرے پر حسن و جوانی کی شادابی اور نورانیت اپنی پوری رعنائیوں سے ظہور پذیر ہو جائیگی۔ اور آپ اپنی اصلی عمر سے بہت کم عمر کے نظر آنے لگیں گے۔ مثلاً آپ پینتالیس سال کے ہیں تو پچیس سال کے معلوم ہوں گے

اوٹون کے سلور ڈراپ مندرجہ ذیل شکایتوں کا مکمل علاج ہیں۔

خون کی کمی۔ دماغی وجسمانی کمزوری۔ سر کا چکرانا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آنا۔ چڑچڑاپن۔ دل کی دھڑکن۔ بے تحاشا موٹاپا۔ ذیابیطس۔ دمہ۔ نابینائی۔ بھوک نہ لگنا۔ جلد خشک ہونا۔ دائمی قبض۔ سانس کا پھولنا۔ بالوں کا قبل از وقت سفید ہو جانا یا گرنا۔ کمر کا درد۔ جریان وسیلان۔ ضعف باہ۔ ضعف اعضائے رئیسہ۔ ضعف گردہ ومثانہ۔ عورتوں کی پرسوت کی بیماری۔ ہسٹریا (لیکوریا) سیلان الرحم۔ اور دیگر رحمی شکایتوں کو آناً فاناً دور کر دیتے ہیں۔

اوٹون کی آب حیات تاثیرات کے لئے ضروری ہے کہ آپ اپنا صحیح وزن کرائیں۔ اور ایک فوٹو لیں ایک ہفتہ استعمال کے بعد پھر اپنا وزن کریں اور فوٹو لیں اس سے آپ کو اس دوا کی حیرت انگیز تاثیرات کا اندازہ ہوگا۔

اوٹون کے سلور ڈراپ عورتیں بچے۔ بوڑھے ہر موسم میں استعمال کر سکتے ہیں اس کے لئے کسی موسم یا عمر کی قید نہیں ہے۔

15,000 روپیہ کا نقد انعام

اوٹون ریسرچ لیبارٹری اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ اگر کوئی فرد یا ادارہ یہ ثابت کر دے کہ اوٹون کی آب حیات تاثیرات کسی حیاتی ہرمون یا انسان کی موجودگی کا باعث ہیں تو ہم اسے پندرہ ہزار روپیہ کا انعام دیں گے۔

اوٹون کے سلور ڈراپ کی اصلی قیمت ممالک غیر میں بارہ روپیہ ہے۔ لیکن ہم نے اسے ہندوستان میں رائج کرنے کے لئے اس کی قیمت کچھ مدت کے لئے تین روپیہ آٹھ آنے رکھی ہے ہو سکتا ہے کہ اوٹون لیبارٹری کب اس کی قیمت میں اضافہ کر دے۔

Otone An Ideal and Unique Preparation for Rejuvination

The Elixir of Life IN SILVER DROPS

سول ڈسٹری بیوٹرز

میسرز گرانڈ فارمیسی (A.G.L.) پوسٹ بکس نمبر ۲۳۲۳ کلکتہ

تار کا پتہ "اوٹون" کلکتہ۔ ٹیلیفون بڑا بازار ۵۳۰۰

Sole Distributor

GRAND PHARMACY( )

POST BOX 2323 · CALCUTTA

عورت کو سفید پانی

جو عورتیں سفید پانی کی بیماری میں مبتلا ہیں یعنی وقت بے وقت زردی مائل یا سفید رطوبت ان کے خفیہ جسم سے نکلتی رہتی ہے وہ اپنی ہری بھری جوانی کو چند روز میں خاک کر دیتی ہے کیونکہ سفید پانی کی بیماری سے غفلت برتنا اور اس کا علاج نہ کرنا بے حد خطرناک ہوتا ہے۔ یہی سفید رطوبت دراصل جوانی اور شباب کا جوہر ہوتا ہے جو رفتہ رفتہ بدن سے خارج ہو جاتا ہے اور عورت کو بیکار کر دیتا ہے۔ اس بیماری کے شروع میں عورت کے تمام بدن میں بیکلی اور پنڈلیوں۔ کمر ناف کے نیچے میٹھا میٹھا درد ہوتا ہے۔ پھر سر چکرانے لگ جاتا ہے۔ کام کی زیادتی چلنے پھرنے سے بے حد تکان اور کمزوری محسوس ہونے لگتی ہے اس کے بعد ماہواری ایام میں کچھ ایسی گڑبڑ پڑ جاتی ہے جو بعض اوقات عورت کی صحت کا بالکل ہی خاتمہ کر دیتی ہے پس ایسی حالت میں اس سفید بیماری (یعنی سیلان الرحم) سے عورت کو غفلت ہرگز نہ کرنا چاہئے۔

سفید پانی کو روکنے کی ترکیب

اگر کوئی عورت سیلان الرحم کی مریض ہے اور اس کے خفیہ جسم سے سفید پانی رطوبت نکلتی رہتی ہے تو اس کو روکنے اور اس کا علاج کرنے کی سب سے آسان اور سب سے سستی ترکیب یہ ہے کہ وہ ایک شیشی دوا **"زوک"** استعمال کرے۔ یہ دوا تقریباً بارہ سال سے تجربہ میں آ رہی ہے اور سیلان الرحم کی بیماری کو تیسرے دن ختم کر دیتی ہے۔ ہزاروں عورتوں نے اس دوا کے ذریعہ اس بیماری سے نجات حاصل کی ہے دوا شروع کرنے کے تیسرے دن ہی مریضہ بول اٹھتی ہے کہ دوا زوک نے کتنی جلدی اسے صحت کا یقین دلا دیا۔ کیونکہ استعمال شروع کرنے کے تیسرے روز سفید رطوبت کا خارج ہونا بند ہو جاتا ہے اور پھر پوری شیشی ختم ہونے تک مرض کی بنیاد ختم ہو جاتی ہے پس جن عورتوں کو سفید پانی کی بیماری ہو انھیں چاہئے کہ اپنی جوانی کی حفاظت کریں اور

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے۔ بی نمبر ۳۴ دہلی کے پتے پر خط لکھ کر دوا زوک کی ایک شیشی بذریعہ وی۔ پی پارسل منگا کر استعمال کر لیں۔ سفید رطوبت سے نجات مل جائیگی۔ ایک شیشی دوا زوک کی قیمت صرف تین روپے (سے) ہے سات آنہ محصول لگتا ہے۔

عورت کو ماہواری ایام میں درد ہوتا ہے!

ہر عورت کو ماہواری ایام کا باقاعدہ اور بغیر درد کے آنا ضروری ہے اگر کسی باعث ایام کم آتے ہوں یا درد اور سخت تکلیف دیکر آتے ہوں یا بند ہو گئے ہوں یا مہینہ میں دو بار رک رک کر آتے ہوں یا ایام ماہواری کی اور کوئی خرابی ہو۔ دورے وغیرہ پڑتے ہوں تو یقین کیجئے کہ ماہواری ایام کو درست اور باقاعدہ اور ہر ماہ وقت مقرر پر لانے کے لئے سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ مریضہ کو ایک شیشی دوا کورس استعمال کرا دی جائے دوا کورس کا حیرت انگیز اثر دیکھ کر ہر شخص خوش ہو جاتا ہے اس دوا کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ماہواری ایام کو باقاعدہ کر دیتی ہے اور پھر بغیر تکلیف کے ہر ماہ ایام ماہواری آتے ہیں اور پھر ایام کے دنوں میں درد وغیرہ کی کوئی تکلیف نہیں ہوتی بڑی سحر کی دوا ہے اور سالہا سال سے ہندوستان میں شہرت حاصل کر رہی ہے۔

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے۔ بی نمبر ۳۴ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر دوا کورس کی ایک شیشی بذریعہ وی پی پارسل منگا لیجئے ایک شیشی دوا کورس کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے (عہ) اور سات آنے اس پر محصول ڈاک کے علیحدہ خرچ ہوتے ہیں واضح رہے کہ یہ دوا ماہواری ایام کی ہر خرابی اور ہر تکلیف میں اپنا پورا اثر دکھاتی ہے۔

اولاد پیدا کرنے کی ترکیب

ایک ہندوستانی لیڈی ڈاکٹر کا عجیب و غریب کمال

ہندوستان میں ایسے ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں جن کے پاس مال و دولت سب کچھ ہے مگر ان کے ہاں اولاد نہیں ہوتی اور وہ اولاد کے لئے ہزاروں جتن کرتے ہیں مگر ناکامی ہوتی ہے اس ضرورت کو سائنس والے سائنس والے سالہا سال سے محسوس کر رہے تھے اور اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح کوئی ایسی ایجاد کی جائے جس کے ذریعہ انسان اولاد کی پیدائش پر قابو پا سکے چنانچہ برسوں کی لگاتار کوشش اور تجربہ کے بعد آخر کار سائنس نے ایک کروٹ بدلی اور ان لوگوں کو کامیابی حاصل ہو گئی سائنس کا یہ زندہ کارنامہ کئی سال سے تجربہ میں آ رہا ہے اور ہر جگہ کامیابی ہوئی ہے۔

اولاد پیدا کرنے کی ترکیب سائنس کے اصولوں پر ایک خاص دوا تیار ہوئی ہے ہندوستانی زبان میں اس کا نام "محافظ اولاد" ہے اور اس میں عجیب اثر یہ ہے کہ یہ دوا مسلسل سات رات تک عورت کو دکھلائی جاتی ہے ان سات دن میں وہ مرد سے بالکل علیحدہ رہتی ہے، اور ٹھیک آٹھویں رات عورت مرد اس پرہیز کو توڑ دیتے ہیں تو اسی رات کو حمل ہو جاتا ہے اور ٹھیک نو مہینے بعد ایک جیتا جاگتا بچہ عورت کی گود میں ہوتا ہے۔ تجربہ کے دوران میں بھی اس عجیب دوا کی بدولت ہزارہا عورتوں کے ہاں اولاد ہونی شروع ہو گئی ایجاد کرنے والوں کو اپنی اس ایجاد پر فخر ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اس نے دنیا کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے لہذا اس اعلان کے ذریعہ اطلاع دی جاتی ہے کہ اگر کسی عورت کو یہاں اولاد نہ ہوتی ہو اور نہ ہونے کا کوئی سبب ہو اسے چاہئیے کہ مسلسل ۷ رات تک "محافظ اولاد" کی ایک ایک خوراک استعمال کرے اور ان سات دن تک مرد سے بالکل علیحدہ رہے اور ٹھیک آٹھویں رات پرہیز توڑ دے یعنی مرد و عورت ایک جگہ ہو جائیں تو اسی رات حمل قائم ہو جائیگا ـــــ "محافظ اولاد" کی ایک شیشی میں ایک عورت کے لئے پوری سات خوراک دوا ہوتی ہے اور اس شیشی کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے۔ جسے ضرورت ہو ـــــ وہ

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے بی نمبر ۳۴ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر یہ دوا بذریعہ وی پی پارسل منگا لے۔ پارسل پر سات آنے محصول لگتا ہے۔

امساک

اگر مردانہ طاقت میں کمی ہو تو سرعت انزال وغیرہ کی شکایات پیدا ہو جاتی ہیں ایسے لوگوں کے ہاں اولاد بھی نہیں ہوتی۔ مردانہ طاقت کچھ دیر قائم رہنا ضروری ہے جو لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں یعنی مردانہ طاقت فوراً ختم ہو جاتی ہے انھیں چاہئیے کہ سائنس کی نئی ایجاد سے امداد لیں یہ ایک دوا ہے جس کا نام فارلانگ ہے یہ عجیب و غریب ایجاد نہ کھائی جاتی ہے بلکہ اس دوا کا ایک قطرہ مرد اپنی ناک کے نیچے مونچھوں کی جگہ پر لگا لیتا ہے۔ دس منٹ کے اندر اندر یہ دوا مرد کے جسم میں مردانہ قوت کو کافی مضبوط اور دیرپا کر دیتی ہے اور ضرورت کے وقت قوت مردمی مناسب وقت تک قائم رہتی ہے اس کے علاوہ اس دوا کا اثر مرد کے جسم میں تقریباً سات گھنٹہ تک برقرار رہتا ہے اس دوا کی زیادہ وضاحت مناسب نہیں ہے عقلمندوں کے لئے اشارہ کافی ہے ایک شیشی فارلانگ جو عرصہ کے لئے کافی ہوتی ہے کی قیمت صرف تین روپے سات آنے ہے۔ پارسل پر سات آنے محصول لگتا ہے ہر قسم کی نشہ کی آمیزش سے یہ دوا پاک ہے اور کسی حال میں نقصان نہیں کرتی۔ کمزور مردوں کو چاہئیے کہ وہ

منیجر آل انڈیا میڈیکل سٹور اے بی پوسٹ بکس ۱۵ دہلی

کے پتہ پر خط لکھ کر بذریعہ وی پی پارسل منگا لیں۔

کوڑھی

بنگالی افسانے کا ترجمہ

ازجناب محمد یونس احمر کلکتہ

اُس دن بھی ڈاکیہ آیا۔ اور ڈاک دیکر چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ خطوں اور اخباروں کے انبار میں ایک خط ہے۔ جس کی تحریر نئی ہے۔ لیکن معلوم ہوتا تھا۔ کہ میں نے یہ تحریر پہلے بھی کہیں دیکھی ہے۔ شاید پدما کی تھی۔ میں نے لفافہ چاک کیا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ خط کو پڑھنے لگا۔ اسمیں تحریر تھا۔

"بھیا رتن!

وہ آج اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ اس بات کا مجھے ذرا بھی افسوس نہیں کیونکہ اُن کی خواہش یہی تھی۔ کہ وہ دنیا اور دنیا والوں کی نظروں سے ہمیشہ کے لئے روپوش ہو جائیں۔ لیکن کبھی کبھی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں کوئی بیش بہا موتی کھو بیٹھی ہوں اس وقت میرا دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔ اور میں بیہوشی کے عالم میں ادھر اُدھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگتی ہوں......

میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ جنوں میں کیا کیا بک گئی مجھے تو تمہارے پاس صرف انکا پیغام پہونچانا ہے —— وہ جب جانے کے لئے کمربستہ ہوگئے تو مجھ سے بولے —— "پدما! میں جاؤں گا' یہ میرا اٹل فیصلہ ہے —— اب تمہیں زندگی کی گاڑی تنہا ہی کھینچنا پڑے گی۔"

میں نے فوراً بات کاٹ کر کہا —— "میں کھینچ لوں گی"

وہ مسکرا اُٹھے۔ پھر بولے —— "پدما! ایک بات کہنا ہوں رتن کو بلا کر میری ڈائری دے کر تاکید کر دینا کہ دنیا کے تمام اخبار و رسائل میں اُسے شائع کر دیں" —— بس اب ختم کرتی ہوں۔ باقی ملنے پر باتیں ہونگی۔ کیا آؤ گے ——؟" تمہاری بہن پدما

میں اُسی رات پدما کے مکان کی طرف چل کھڑا ہوا۔ وہاں جا کر دیکھا۔ مرحوم کی پرچھائیں جیسے گھر کی دیواروں سے چمٹی ہوئی ہیں اور پدما کی آنکھوں کے کٹوروں میں غم کے آنسو ڈبڈبا رہے ہیں

—— (۱) ——

پدما نے مجھے مرحوم کی ڈائری دی —— ڈائری ہاتھ میں لیتے ہی جیسے سارا جسم کانپ سا گیا —— میں نے اُسکے ایک ایک لفظ کو بغور پڑھا۔ مرقوم تھا ——!

۱۱۔ اگست۔ آج درد حد سے زیادہ تجاوز کر گیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا —— "تم ٹھیک ٹھیک کیوں نہیں کہتے ڈاکٹر؟"

"ڈاکٹر نے کہا —— "ٹھیک کیا؟"

"یہی کہ یہ بیماری مجھے ورثہ میں تو نہیں ملی ہے؟"

"لیکن تمہیں بیماری ہے کیا؟"

"کیا ہے......؟"

"کیا ہے؟ یہی تو دیکھنا ہے۔ تو رنجیدہ کیوں ہوتے ہو؟"

"رنجیدہ کیوں ہوتا ہوں ڈاکٹر؟ کاش تمہارے پاس میرے جیسا دل ہوتا۔ دل میں امنگیں ہوتیں اور امنگوں میں جوش۔ تو تم سمجھ سکتے کیا ہوتا......!"

یہ سُنکر ڈاکٹر ہنس دیا۔ اُس نے چُپ چاپ میری اُنگلی کا اپریشن کیا اور یقین دلایا کہ میرا خوف فضول ہے۔

۱۲۔۱۳۔ اگست۔ شام کو بیٹھا میں پدما سے گفتگو کر رہا تھا۔ کہ وہ بولی —— "ارے آپ کے کان کے پاس کیا ہے؟

"کیا ہے.....؟"

سُرخ ہو رہا ہے"

"سُرخ ہو رہا ہے" میں چونک پڑا۔

وہ بولی "ایک گول سا سُرخ نشان معلوم ہوتا ہے"۔

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ میں نے کہا "رانی اب کیا ہوگا۔؟"

پدما تعجب سے بولی "کیا ہوگا؟ کچھ نہیں۔ آپ پریشان کیوں ہوگئے؟"

لیکن میں کچھ اور خیال کر رہا تھا میں نے کہا "تم نہیں جانتیں رانی یہ کیا ہے؟"

پدما کچھ گھبرا سی گئی اور بولی —— "کیا ہے؟"

میں نے کچھ بھی نہ کہا۔ میں خیال آرائی کے نتیجہ پر پہنچ گیا تھا۔ میرے سامنے کتاب زندگی کے صفحے منتشر ہو رہے تھے وہ موت کی نشانی نہ تھی ——

"نہیں، نہیں وہ تو زندگی کا ایک جھونکا تھا — اس زندگی کا جھونکا جو موت سے کوسوں میل دور ہے۔ اوہ! وہ زندگی کتنی بھیانک ہے —؟

۱۶-۱۷ اگست۔ ڈاکٹر کچھ نہیں بتا رہا ہے لیکن میرا دل مسرور نہیں ہے — انگلی کا جو اپریشن ہوا تھا۔ اس کی سوزش اب تک کم نہیں ہوئی ہے۔

خارش بہت زیادہ ہے —!

۱۹ اگست۔ آج ڈاکٹر نے سب کچھ کہہ دیا — سنو ہریش اب مجھ سے تمہاری پریشانیاں نہیں دیکھی جاتیں۔ تمہیں جو مرض ہے جانتے ہو وہ کیا ہے؟

کوڑھ! لیکن ڈرو نہیں۔ اس کا علاج ہے۔ تم ہسپتال چلے جاؤ —" میں نے ڈاکٹر کی بات سُنی اور سُن کر نہ ڈرا نہ رویا میری آنکھوں میں جیسے آنسو برف کی طرح جم گئے تھے۔

میں گھر آیا سپدما بولی — "ڈاکٹر نے کیا کہا؟"

"ڈاکٹر نے ......" میں جیسے کانپ اُٹھا۔

"ہاں! کہا ہوگا اب سب ٹھیک ہے۔ یہی بات ہے نا؟" کہتے کہتے پدما ہنس پڑی — مجھے نہ جانے کیا ہونے لگا جی میں آیا کہوں — سب ختم ہو گیا پدما بس ...... لیکن میں بول ہی نہ سکا۔

پدما کہتی رہی — "نرملا اپنے پتی کے ساتھ گھر لوٹ رہی ہے۔ آج رات یہیں مقیم رہے گی"

میں نے کہا — "بہت اچھی بات ہے"

۲۰ اگست۔ نرملا صرف ایک رات نہیں ایکدن بھی رہی وہ بالکل پدما کی طرح بھولی اور محبت کرنے والی تھی۔ اس کے سامنے میں گفتگو کرنا بالکل ہی بھول گیا۔

۲۱ اگست۔ پہروں سے تنہا بیٹھا اپنی زندگی کے مستقبل کے بارے میں کچھ سوچ رہا تھا۔ کہ پدما آگئی اور بولی — "تنہا بیٹھے کیا سوچ رہے ہو؟"

میں نے پدما کی طرف دیکھا — اُس کی آنکھوں میں شراب کی کشش تھی۔ اور محبت کا جادو۔ لیکن اُسے دیکھ کر میری آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

"ارے تم رونے لگے۔" وہ مضطرب ہو کر میرے پاس بیٹھ گئی۔ اُس نے مجھے اپنی باہوں میں جکڑ لیا — "کیا ہوا ہریش! ......" لیکن میں اُسی طرح بیٹھا رہا۔ میں پدما کی گود میں سسک سسک کر رونے لگا۔ پدما اپنی پریشانی، خوف، گھبراہٹ سب بھول کر بولی — "چھی چھی مرد ہو کر روتے ہو۔ مرد ہو کر ...!"

میں اس کا کیا جواب دیتا! آنسو بڑی تیزی سے بہہ رہے تھے۔ اس نے اپنے آنچل سے انہیں پونچھا اور زور سے مجھے اپنی چھاتی سے چمٹا کر بولی۔

"اب نہ رو میری روح! ذرا سے دکھ میں اتنا گھبرا جاتے ہو۔ تم مرد ہو کر اتنا ڈرتے ہو تو بھلا میرا کیا حال ہوگا؟" اس کے بعد بات اسی طرح ختم ہو گئی۔

۲۲ اگست۔ ڈائری نہیں لکھی۔

۲۳ سے ۳۰ اگست۔ میری حالت عجیب ہو رہی ہے کسی سے بولتا نہیں۔ ڈاکٹر کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ وہی خود گھر آ جاتا ہے۔ دماغ چڑھا چڑھا رہتا ہے۔ بات بات پر مجھے غصہ آ جاتا ہے۔ پدما دور ہی سے مجھے دیکھتی ہے اور کڑھتی ہے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن کہہ نہ سکتی تھی۔

۳۱ اگست۔ میں روز کی طرح تنہا تھا۔ پدما یکایک میرے پاس آئی اور بیٹھ گئی۔ میں بولا نہیں جیسے میں نے اُسے دیکھا ہی نہ تھا۔ وہ چپ چاپ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔ پھر بہت خفیف آواز میں بولی — "ہریش ......"

میں نے آنکھ اٹھا کر اُسے دیکھا!

نہ جانے اُسے کیا ہوا؟ اپنا سر میری چھاتی پر رکھ کر بولی — "ہریش! تم اس طرح پریشان کیوں رہتے ہو؟"

میرا کلیجہ دہل گیا اور میں بول نہ سکا۔

وہ بولی — "کچھ تو کہو ہریش! ایسے تو مجھ سے جیا نہیں جاتا۔"

"جیا نہیں جاتا"۔ میں ہنس پڑا۔ وہ ہنسی سچ مچ بڑی پھیکی تھی۔ پدما مجھے دیکھتی رہ گئی میں نے کہا — "پدما میں بھی سوچتا ہوں۔ ایسے تو جیا نہیں جاتا؟"

"کیسے ......" پدما نے غمگین آواز میں کہا۔

"سنو گی پدما! کیسے؟"

میں نے چاہا کہ ہنسوں۔ لیکن ہنسی کی بجائے میرے سینے میں رنج و محن کی چنگاریاں سُلگنے لگیں۔ اس لئے پدما کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کہا — "تو سنو ......!"

دل تو نہیں چاہتا تھا کہ اپنا مرض بتا کر پدما کو بھی فکر میں ڈال دوں

لیکن نہ جانے کیسے میری زبان سے نکل گیا —— "پدما سنو! مجھے کوڑھ ہو گیا ہے!"

پدما یکبارگی کانپ اٹھی اور بولی —— "کوڑھ؟"

"ہاں پدما! ڈاکٹر نے مجھے کہدیا ہے میں کوڑھی ہوں" —— یہ کہہ کر میں ہنس پڑا۔

وہ مجھے دیکھتی رہ گئی۔ اس کا دل شاید کانپ رہا تھا۔ اور اس کے سامنے موت کی سیاہ تصویر تھی۔ لیکن چند منٹ بعد وہ میری طرف دیکھ کر بولی — "کوڑھ کا علاج بھی ہے۔ تم اتنے دکھی نہ ہو۔"

میں نے کہا — "تم جانتی ہو یہ ہوا کیوں ——؟"

"ہوا کیوں —— پدما بولی —— "تمہارے پتا جی کو یہ مرض تو ہے۔"

"ہاں . . . . ." میں جیسے غصہ سے کانپنے لگا۔

پدما بولی —— "تم کیا سوچنے لگے؟ ابھی تو اس کا آغاز ہے۔ ہمیں الموڑہ چلنا چاہیے۔ مجھے امید کامل ہے تم صحت یاب ہو جاؤ گے۔ اچھا تو آؤ۔ باہر چل کر دل بہلائیں" اور وہ مجھے کھینچ کر لے گئی۔

۱-۳ ستمبر۔ کسی کام سے باہر چلا گیا تھا۔

۴ ستمبر۔ پدما کو بتانے کے بعد میرے دل میں بہت گہرا اثر پڑا۔ میں دیکھتا ہوں وہ اندر ہی اندر کڑھتی جا رہی ہے۔ لیکن بولتی نہیں۔ میرے دماغ میں ایک اور خیال گردش کر رہا ہے۔ اُسے سوچ کر میں کانپ اٹھتا ہوں لیکن وہ خیال سچ ہے وہی سچا خیال میرے لئے زندگی کا زہر بن رہا ہے۔

۸ ستمبر۔ اس خیال نے مجھے پاگل بنا رکھا ہے۔ بازار میں نکلتے مجھے شرم آتی ہے۔ میں دن بھر کمرہ میں پڑا رہتا ہوں۔ سوچتا ہوں —— کیا ہو گا؟

پھر سوچتا ہوں میری حالت یہ کیوں ہوئی۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ ان باتوں کو سوچ کر میں کانپ اٹھتا ہوں۔

۹ سے ۱۰ ستمبر۔ میں بہت پریشان ہوں۔ باہر جانے کو دل نہیں چاہتا۔

۱۱ ستمبر۔ میں آج بھی بہت پریشان ہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ ضرور اس سزا کے مستحق ہیں۔ آج ہی میں نے پدما سے کہا۔ جس نے مجھے اس گڑھے میں دھکیلا ہے میں اُس سے ضرور انتقام لوں گا۔"

پدما بہت اداس ہو رہی تھی۔ چونک پڑی "کیسی بات کہتے ہو تم؟"

"ٹھیک کہتا ہوں پدما۔ انہوں نے میری زندگی تباہ کر ڈالی ہے۔"

پدما کانپ اٹھی — "تم کیا کہہ رہے ہو؟ کس کے متعلق؟ وہ کون ہیں جن سے تم انتقام لو گے؟"

"وہ کون ہیں؟ وہ ہمارے پتا ہیں۔ انہوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کوڑھی ہیں — میرے تمہارے . . . . . اور اور"

"اور ہماری آنے والی نسلوں کی زندگی برباد کر دی۔ انہیں کیا حق تھا کہ شادی کرتے۔ وہ دشمن ہیں، پاپی ہیں —— رذیل انسان —— کوڑھی انسان بھی کیا انسان ہے؟"

پدما بول اٹھی — "تم پاگلوں ایسی باتیں کیوں کہتے ہو یہ پتا جی کا نہیں۔ سماج کا قصور ہے۔"

"سماج! سماج کیا ہے۔ وہ ہماری ہی تو جماعت ہے۔ ہمیں نے اُسے بنایا ہے۔"

پدما کیا جواب دے۔ اس کا دل خود دکھ رہا تھا لیکن وہ اتنی دور نہیں جا سکتی تھی۔ اسی سبب سے اس کا چہرہ خوف سے زرد ہو گیا تھا۔ وہ بولی — "میں نہیں جانتی یہ کیا ہو رہا ہے لیکن التجا کرتی ہوں کہ تم مطمئن رہو۔"

"مطمئن رہوں —— میں چلا اٹھا "میرے سامنے موت کی بھیانک شکل ہے۔ تڑپتی ہوئی روحیں ہیں اور کہتی ہو کہ میں مطمئن رہوں؟ پدما! کیا تمہارا دل نہیں دکھتا۔ کیا اس بدنصیب انسان نے تمہاری امنگوں پر ضربیں نہیں لگائیں ——؟"

پدما بولی —— "نہیں نہیں! تم ایسا نہ کہو ہریش۔"

"ایسا نہ کہوں" آگے کچھ کہنے کو تھا کہ پدما نے آکر منہ پر ہاتھ رکھ دیا —— "اب کچھ نہ کہو۔ بس کرو۔"

میں بے بس ہو کر تڑپ اٹھا۔ لیکن دل کی چنگاریاں ابھی تک سلگ رہی تھیں۔

۱۲-۱۳-۱۴ ستمبر۔ میں اپنی ضد کا پکا ہوتا جا رہا ہوں انتقام کی آگ نے مجھے پاگل بنا رکھا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ لوگ میری طرف انگلی اٹھا کر کہتے ہیں —— یہ کوڑھی ہے۔

اور بچے مجھے دیکھ کر ہنستے ہیں میں کانپ اٹھتا ہوں — کیا یہ دن بھی مجھے دیکھنا تھا — ؟

۱۶ ستمبر — اوہ! آج وہ بھیانک واقعہ ہو گیا۔ سویرے میں بہت پاگل ہو رہا تھا۔ پتاجی کو میں نے بہت کچھ الٹا سیدھا سنا دیا۔

"تم نے اپنی راحت و آرام کے لئے میری اور پدما کی زندگی تباہ کر دی۔"

پتاجی سُنکر خاموش رہے۔ ماں دوڑی ہوئی آئی — "کیا ہے ہریش —؟"

"کیا ہے ماں —!" میں چیخ اُٹھا — "مجھے تم نے پیدا کیوں کیا تھا۔؟ تمہیں کیا حق تھا پیدا کرنے کا؟"

ماں کا جیسے یہ سُن کر کلیجہ ٹوٹ گیا۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی — "کیا ہوا ہریش؟"

"ہوا کیا؟ سنو گی ماں! تمہارے پتی کی طرح تمہارا بیٹا بھی کوڑھی ہو گیا۔"

"کوڑھی — ماں اور پتا دونوں چونک اُٹھے۔

"تم کوڑھی ہو گئے۔ ماں کی آنکھوں میں سرخیاں دوڑنے لگیں۔ میرے پاس آ کر بولی — "کیا تم نے سچ کہا ہے بیٹا؟"

"ہاں ماں! کیا تمہیں یقین نہیں آتا یہ جو بدنصیب انسان تمہارے سامنے تڑپ رہا ہے۔ میں اُسی کا بیٹا ہوں۔"

ماں کچھ نہ بولی۔ دیوار سے جا لگی۔ اُس کا دل پاش پاش ہو رہا تھا۔ اُس کے مُنہ سے اتنا ہی نکلا — "اوہ پرماتما!"

کچھ دیر تک میں خاموش رہا۔ میں نے ماں کو دیکھا۔ دل تڑپ اُٹھا۔ میں پاگل ہو گیا۔ چلا کر میں نے کہا — "میں آج تمہیں مار ڈالوں گا۔

پتاجی! میں تمہارا خون چوس لونگا۔ تم ...." یہ کہہ کر میں جھپٹا لیکن ..... میں نے دیکھا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے ہیں ماں چیخ کر گر پڑی — "ہریش!"

چیخ سن کر پدما دوڑی ہوئی آئی۔ اُس نے سب کچھ دیکھا ماں کو اُٹھاتے ہوئے بولی — "تم یہاں کیوں آئے؟"

میں اب کانپ رہا تھا .....

روتے روتے پتاجی بولے — "تم رک گئے بیٹا! نہیں نہیں میں کہتا ہوں مجھے مار ڈالو میں پاپی ہوں۔ سچ مچ میں سب کا دشمن ہوں۔ اوہ ....." اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ میں خاموشی سے ان مناظر کو دیکھ رہا تھا۔ بول نہ سکا۔

۱۷ ستمبر۔ کل کے واقعہ نے مجھے بہت پریشان بنا دیا۔ میں شرم کے مارے گڑا گیا تھا۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ میں نے پدما کو بلا کر کہا — "پدما!

اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ سوچتا ہوں۔ اُن کو مارنے سے میرا دکھ دور نہیں ہوگا۔ شاید ایسے آدمیوں کے لئے یہ زبردست گناہ ہوتا۔ لیکن ..... لیکن پدما! اب میں اُنہیں نہیں مارونگا وہ تو خود مرے ہوئے ہیں۔ لیکن اب مجھے یہاں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ..."

"نہیں رہوگے؟" پدما بولی۔

"ہاں میں جاؤں گا اور تمہیں کہتا ہوں تم ....."

پدما تعجب سے مجھے دیکھتی رہی۔

میں نے کہا — "پدما! تم آزاد ہو" لیکن میں آگے کچھ کہہ نہ سکا اور رونے لگا۔

پدما کی آنکھیں بھر آئیں۔ بولی — "کیا کہہ رہے ہو ہریش میں آزاد ہوں پھر کیا کروں۔ شاید تم کہنا چاہتے ہو میں تمہیں چھوڑ کر جہاں چاہوں چلی جاؤں۔"

پھر وہ میری طرف دیکھنے لگی۔

میں خاموش رہا۔

اُس نے کہا — "بولو ہریش!"

میں نے چاہا کہوں — "ہاں" ... لیکن وہی میرے منہ پر ہاتھ رکھکر بولی ..... "نہیں ہریش نہیں۔ تم ہاں مت کہہ دینا۔ میں تمہیں نہ چھوڑ سکوں گی۔ میں کہتی ہوں میں بیوی نہیں بلکہ دوست کی شکل میں ایک ساتھی کی طرح تمہارے ساتھ رہونگی۔"

وہ بہت اُداس ہو رہی تھی۔ اور میری گود میں پھوٹ پھوٹ کر رو اُٹھی۔

میں کیا کہوں۔ پدما نہ جانے کیا کیا کہہ گئی۔

۱۹ ستمبر۔ میں سو کر اُٹھا ہی تھا۔ کہ پدما آگئی شب کو میں بڑے سکون کے ساتھ سویا تھا۔ اب بھی میں مسرور تھا میں نے کہا — "پدما! سنو میں نے المولڑہ جانے کا عزم صمیم کر لیا ہے۔ پتاجی بھی چلیں گے اور تم بھی لیکن ....؟"

"لیکن کیا ....." وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔

میں نے کہا ــــ "کل والی بات تم کو یاد ہوگی"۔

"ہاں" پدما بولی ــ "تم مطمئن ہونا چاہتے ہو"۔

میں نے کچھ نہیں کہا۔

اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ تھوڑی دیر تک وہ دباتی رہی۔ اور پھر میں نے دیکھا ــ اُس کے سُرخ اور نازک ہونٹ میرے ہونٹوں پر تھے۔ اُس نے مجھے اپنی گرفت میں لیکر بھینچا اور چھوڑ دیا۔ پھر بولی ــ "آخری بار پیارے! آخری بار"۔

اور وہ چلی گئی۔ میں اُسے دیکھتا رہا۔

۲۱-۲۴ ستمبر۔ گھر کے قریب کھڑی ہوئی موٹر اسٹارٹ ہو رہی تھی۔ میں نے آخری بار گھر کو دیکھا۔ پھر نیم کے درخت سینما ہاؤس پریڈ گراونڈ یہ سب آخری بار میری آنکھوں میں آگئے پھر وہ شہر جہاں میں پیدا ہوا تھا اور جس کے اندر میں نے زندگی کی خوشنما بہاریں گذاری تھیں۔ میں نے مُڑ کر دیکھا "پورا شہر درد بھری آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

ماما اور پتاجی چپ چاپ آنکھیں بند کئے کچھ سوچ رہے تھے پدما کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے ــــ صرف ڈرائیور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہینڈل پر ہاتھ رکھے سامنے دیکھ رہا تھا۔ "کوئی سڑک پر ہو تو ہارن دیدے۔

پدما نے کہا ــــ "پدما آخری بار!"

پدما چونک پڑی ــــ "آخری بار نہیں ہریش، پہلی بار ــ جہاں انجام ہے وہیں تو آغاز ہے"۔

اور موٹر بڑی تیزی سے ایک دنیا کو پیچھے چھوڑتی چلی گئی۔

(۲)

بس ہریش کی ڈائری یہیں ختم ہو گئی ــ!

ڈائری پڑھ کر میرے دل و جگر پاش پاش ہو گئے ــــ یہ دیکھ کر پدما بولی ــ "بھیا! یہ کہانی ادھوری ہے"۔

"ادھوری!" میں نے تعجب سے کہا ــ "کیا اور بھی ہے!"

"ہاں"۔

وہ میرے پاس فرش پر بیٹھ گئی۔ پھر درد بھری آواز سے بولی "بات بہت مختصر ہے لیکن بھائی! اس کہانی کی یہ بھی ایک کڑی ہے۔ میں اُسے دو ہی جملے میں کہوں گی ــــ ہریش نے جس دن مجھے بلا کر کہا تھا کہ اُسے کوڑھ ہو لہے تو میں کانپ اُٹھی تھی جوں جوں میں اُن کے متعلق غور کرتی تھی۔ خوف میری روح کو ڈراتا۔

دن اسی طرح گذر گئے اور میں اُداس سی رہنے لگی" پدما چند منٹ کے لئے یہاں رُکی ــ پھر بولی ــ "تنی پریشانی کی ایک اور وجہ تھی"۔

"کیا...." میں فوراً پوچھ بیٹھا۔

"یہی کہ اُن دنوں ڈاکٹر روز گھر آتا اور مجھ سے کہتا تھا "مرض خطرناک ہے"۔

میں سُنکر لرز اٹھتی تھی۔

وہ پھر کہتا ــــ "اس کا علاج بھی نہیں ہے"۔

اس کی ان باتوں نے مجھے خوف سے جکڑ لیا تھا۔ اس وقت میں زندگی کے آغاز میں تھی۔ میرے سامنے مکمل زندگی کھڑی تھی۔ وہ زندگی نہ جانے کتنی اُمنگوں اور ارمانوں بھری تھی۔ اُن اُمنگوں کو میں برباد ہوتے دیکھ رہی تھی۔

میں نے ایک دن ڈاکٹر سے پوچھا "اب کچھ نہیں ہو سکتا ڈاکٹر!"

"کچھ بھی نہیں!" ڈاکٹر نے کہا تھا۔

"کچھ بھی نہیں" میں خوفزدہ ہو گئی تھی۔

ڈاکٹر خوبصورت تھا، اُس کی گفتگو شیریں تھی ــــ لیکن یہ تو میں نے بہت دنوں بعد جانا۔ کہ اُس کا دل خوبصورت نہیں تھا۔

اُسی ڈاکٹر نے کہا تھا ــــ "سنو پدما! اب تو صرف ایک بات ہو سکتی ہے"۔

"کیا......؟"

"تم مسٹر ہریش کو طلاق دے دو"۔

"طلاق......" میں تھر تھر کانپ اُٹھی تھی۔

"میں درست کہتا ہوں پدما! اب تو اسمیں جان باقی نہیں۔ اُس کے پاس رہکر تمہاری زندگی بھی برباد ہو جائے گی"۔

یہ کہہ کر وہ چلا گیا تھا۔ پھر واپس نہیں آیا۔ میں روتی اور کانپ جاتی۔ ہریش کمرہ میں تھا۔ میرے چاروں طرف خوف اور نااُمیدی کی تصویریں تھیں۔ اس کے درمیان ڈاکٹر ہی اُمید اور زندگی کا پیغام لے کر کھڑا ہوا تھا ــــ لیکن ایک بات تھی ــ دنیا کیا کہے گی......!

جواب میں ڈاکٹر نے کہا تھا ــــ "دنیا! تم دنیا کی بات کہتی ہو۔ دنیا کسی کی فکر نہیں کرتی۔ اُس کے لئے سب برابر ہیں وہ

خود اچھی ہے — کیا وہ اچھی ہے جس کے پاس اُس کا مُنہ بند کر دینے کی قوت ہے؟"

سچ تو ہے میں سوچ رہی تھی۔

اور اسی لئے میں نے ایک دن دل سے کہا تھا۔ ڈاکٹر میں تیار ہوں۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

یہ کہہ کر پدما کا جسم بجلی کی طرح کانپ اُٹھا۔ اُس کا چہرہ سفید ہو گیا۔ اور ایک لمحہ کے لئے آنکھیں نیچے جھک گئیں۔

میں یہ سب کچھ دیکھتا رہا لیکن بول نہ سکا۔

پھر وہی بولی — "لیکن اسب کچھ ہو جاتا۔ لیکن چند ہی دنوں میں وہ بھیانک واقعہ رونما ہوا۔ ہرلیش نے اپنے پیار سے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ وہ سچ مچ انہیں مارنا چاہتے تھے۔ انہیں دکھ تھا۔ صرف اپنے لئے نہیں میرے لئے بھی۔

یہ میں اُس وقت جان سکی جب ہرلیش نے کہا تھا — پدما تم آزاد ہو جہاں چاہو جا سکتی ہو؟"

میں نے سُنا تھا اور کانپ اُٹھی تھی۔ ڈاکٹر بھی تو کہتا تھا۔ لیکن . . . . لیکن میں نے دیکھا — ان دونوں کے دلوں میں میرے لئے کتنا درد تھا۔ میری بھلائی کے لئے وہ مجھے راستہ بتا رہے تھے۔ ڈاکٹر کے دل میں جو درد تھا — وہ درد در اصل درد نہ تھا بلکہ اُس سے طمع اور لالچ کی بُو آ رہی تھی۔"

پدما یہاں رُک گئی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے سسکیاں بھرتے ہوئے بولی "اور ہرلیش مجھ سے محبت کرتا تھا — پاک محبت! اُس محبت نے میرے دل میں آگ لگا دی تھی — کسی نے مجھے بار بار کہا تھا۔ "تم اُسے نہ چھوڑ سکو گی"

"اور سچ مچ میں انہیں چھوڑ نہ سکی" کہتے کہتے پدما چُپ ہو گئی۔ اُسی وقت کسی نے باہر سے آواز دی — "ماں! تم کہاں ہو؟"

پدما غمگین آواز میں بول اُٹھی — "میں یہاں ہوں بیٹا ابھی آتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

میں سوچتا رہا۔ کیا سچ مچ پدما نے ٹھیک کیا؟ کیا سچ مچ ٹھیک کیا پدما نے؟

دق اور سل کے مریضوں کو مژدہ صحت

آج کل ہندوستان میں دق و سل جیسی خطرناک بیماریاں بہت کثرت سے پھیلی ہوئی ہیں ہر روز ہزاروں قیمتی جانیں ان جان لیوا مرض کی نظر ہو جاتی ہیں کئی خوش و خرم گھرانے اس کی وجہ سے ماتم کدہ بنے ہوئے ہیں اطبائے کرام جن کا فرض ہے کہ ایسے متعدی اور خوفناک امراض کے معالجہ کی تحقیقات کریں اپنی تحقیق و تدقیق کے نتائج دنیا کے سامنے پیش کر کے پیام صحت پہنچائیں لیکن افسوس ہے ہمارے اطبا کو امساک کی گولیوں کی تحقیق اور مقوی باہ طلاؤں کی ایجاد سے ہی فرصت نہیں ہمدرد دواخانہ میں خدمت خلق و فن میں ایک امتیاز خصوصی رکھتا ہے اور اپنی اسی ہمدردی اور خدمت کی بدولت آج دنیا میں یونانی طب کا سب سے بڑا کامیاب دواخانہ ہے اس مرض کے متعلق عرصے سے تجربات کئے جا رہے تھے اور شافی علاج کی جستجو برابر جاری تھی الحمد للہ ان مبارک کوششوں میں حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی چنانچہ اب ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ دق سل اور پرانے بخار کے مریضوں کو مژدہ صحت سنائیں تاکہ وہ ان جان لیوا امراض کے چنگل سے رہائی حاصل کریں اگر آپ خدانخواستہ ان امراض میں مبتلا ہیں تو ہمدرد دواخانہ یونانی دہلی کی تیار شدہ لاثانی و صحت بخش مجربات خصوصی یعنی قرص صحت رجسٹرڈ اور ماء اللحمات رجسٹرڈ استعمال کیجیے اور قدرت خدا کا تماشا دیکھئے صدہا ایسے مریض جن کی سل اور دق تیسرے درجہ تک پہنچ گئی تھی جراثیم کا غلبہ تھا اور وہ محض پوست و استخوان کا مجموعہ تھے ان دو عجیب و غریب دواؤں کے استعمال سے تندرست و توانا ہو گئے جراثیم مرض کا قلع قمع ہو گیا مریض کی قوت جو ضعف کے انتہائی درجات طے کر رہی تھی سنبھل گئی اور اپنے اہل و عیال کے لئے سرمایہ عیش و مسرت ہو گئے ادویہ کے استعمال کی مدت مرض کے درجات پر موقوف ہے لیکن انتہائی درجات میں بھی چالیس روز میں صحت کلی ہو جاتی ہے ترکیب استعمال بالکل سہل اور آسان ہے صبح کو ایک قرص سحر منہ میں ڈال کر اوپر سے ماء اللحمات ۵ تولہ پی لیجیے ترش اور ثقیل چیزوں سے پرہیز کیجیے فواکہات میں انگور اور سنگترہ استعمال کیجیے۔ غذا نرم اور زود ہضم کھائیں اگر شوربا گوشت ہو تو زیادہ مناسب ہے۔ قیمت قرص صحت رجسٹرڈ ۵ روپیہ فی قرص ماء اللحمات رجسٹرڈ فی بوتل جو بارہ روز کیلئے کافی ہے صرف ۵ روپے زیادہ مقدار منگوانے میں رعایت ہے ریلوے پارسل کیلئے چہارم قیمت پیشگی بھیجیے۔

ملنے کا پتہ :- ہمدرد دواخانہ یونانی دہلی

نوائے راز

غزل

ابوالفاضل حضرت راز چاندپوری

دہر کا انتظام کرتا ہوں
راز ہستی کو عام کرتا ہوں

بتکدے میں قیام کرتا ہوں
نفسِ سرکش کو رام کرتا ہوں

حسن کا احترام کرتا ہوں
بتکدے کو سلام کرتا ہوں

مجتہد ہوں نہ مصلحِ عالم
حق پرستی کو عام کرتا ہوں

فکرِ دنیا و فکرِ عقبیٰ کیا
ذکر اُس کا مدام کرتا ہوں

رسمِ دنیا سے میں نہیں واقف
فرض ہے جو، وہ کام کرتا ہوں

شیخ کی کجروی معاذ اللہ
برہمن کو امام کرتا ہوں

خانقاہیں تو ہو چکیں ویراں
بتکدوں میں قیام کرتا ہوں

وہ فریبِ کرم یہ دلداری
پیاری دنیا سلام کرتا ہوں

کتنی خوش کیف ہے شرابِ سخن
شکرِ ساقی مدام کرتا ہوں

رند مشرب ہوں میں مگر اے راز
شیخ کا احترام کرتا ہوں

میری بیجا نفرت کے بعد۔؟

افسانہ

از جناب سید اخلاق حسین رضوی

"امّی! — امّی!! عشرت چچا جان کے ساتھ جا رہا ہے — اے عشرت! ..... تم میرے گھر کیوں نہیں آتے —" نجمہ اپنی توتلی زبان سے مجھے مخاطب کرنے کے بعد سڑک پر جاتے ہوئے عشرت کو دیکھ کر پکار رہی تھی۔

میں نجمہ کو عشرت کا نام پکارتے ہوئے سن کر اپنے مطالعہ سے چونک پڑی اور چلا کر اس کی طرف دوڑی "نجمہ! نجمہ!! بیہودہ ..... بدتمیز، جاہل۔ چپ رہ بیوقوف —" میں نے اُسے کھڑکی سے جھنجوڑ کر نیچے اتارتے ہوئے کہا۔ "کیا میں نے تجھے بارہا نہیں سمجھایا کہ تو عشرت کو اپنے یہاں نہ بلایا کر؟"

میں غصّہ سے کانپ رہی تھی۔ میں نے کھڑکی سے اس پار سڑک پر جاتے ہوئے عشرت کو نہ دیکھنا چاہا کیونکہ مجھے اس سے دلی کدورت اور دشمنی ہوگئی تھی۔ اس کے خلاف میرے دل میں نفرت کا ایک چشمہ ابل رہا تھا۔

میں نے اس کی طرف نہیں دیکھا ——

چھوٹی نجمہ میرے سامنے سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کی معصوم آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ اس کے ہونٹوں میں ایک لرزش ہوئی۔ اور وہ بہت معصومانہ انداز میں بولی:—

"امّی جان! ..... مجھے عشرت بھائی کے ساتھ کیوں نہیں کھیلنے دیتیں؟ پہلے تو آپ شاہد بھائی جان کو ان کے ہمراہ کھیلنے دیتی تھیں —— مگر اب جب کہ بھائی جان ....."

"نجمہ!" میں اس کے ننھے ہاتھ کو جھٹک کر چلائی "خبردار! جواب تو نے کبھی بھائی جان کا تذکرہ کیا ——"

مگر اسی وقت میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس سے کچھ حاصل نہ تھا۔ ایک معصوم بچی میرے جذبۂ تنفر کا اندازہ کرنے سے قاصر تھی۔ وہ میرے تاثرات انتہائی حدود سے ہنوز باہر تھی ——

ابھی چند ہی ماہ میرے نورِ نظر شاہد لطیف کی ننھی قبر کو بنے ہوئے گذرے تھے۔ اور میرے جگر کا ناسور ہنوز مندمل نہ ہوا تھا —— آہ! قدرت کی کرشمہ سازیاں ——

پروردگار! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے ....

اب ان مصائب کو فراموش کرنے کی ایک ہی صورت تھی کہ صفیہ رشدی اور عشرت ہماری نظروں سے اوجھل رہیں تا کہ ہم نہیں اپنے حافظہ سے رفتہ رفتہ اتار دیں لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا تھا۔ کہ ہم ان کی شرکت سے علیحدہ ہو کر دور — بہت دور چلے جائیں۔

میرا ضمیر مجھے اب صفیہ سے اشتراکِ عمل کی دعوت سے احتراز ہی کرنے پر مطمئن تھا —— صفیہ! میری چھوٹی بہن! —— وہ صفیہ جو چند ماہ قبل تک میری آنکھوں کا نور، دل کا سرور اور میری ناتوانیوں کا سہارا تھی۔ صفیہ سے تنفر کا سبب اس کا لڑکا عشرت تھا۔ در حقیقت عشرت کی صورت سے مجھے فطرتاً نفرت ہو گئی تھی —

مغربی ہندوستان کا وہ عظیم الشان خطہ جسے بمبئی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ لبِ ساحل واقع ہونے کی وجہ سے ہندوستان کی ایک بہت بڑی تجارتی منڈی ہے یہاں کی تفریح گاہیں، دلفریب و فرحت افزا باغیچے، عمدہ عمدہ فلک بوس عمارتیں اور درسگاہیں نیز دیگر بہت سی چیزیں مگر مؤخر الذکر چیز ہمارے پیشِ نظر تھی جن سے ہم اور صفیہ وابستہ تھے۔

ہم دونوں اسی دلآویز بستی میں پیدا ہوئے۔ بڑھے اور جوان ہو گئے۔ عہدِ طفولیت ہنستے کھیلتے گذرا اور لڑکپن مسرت و انبساط میں بیت گیا۔ والد مرحوم یہاں کے نمایاں تاجروں میں سے تھے۔ ان کی زندگی بہت اچھی گذری مگر زمانہ ہمیشہ سازگار نہیں رہتا۔ ان کے انتقال کے بعد ہماری نگہداشت کے لئے والدہ رہ گئیں مرحوم کا پس انداز روپیہ اور ایک سہ منزلی عمارت چونکہ ہمارے کوئی بھائی نہ تھا اس لئے والد کی تجارت پر ملازمین کی خود آرائی کا بُرا اثر پڑا۔ اور والدہ میں سے سنبھال سکنے کی صلاحیت نہ تھی۔ اس لئے وہ بہت جلد زوال پذیر ہو گئی۔

خوش قسمتی سے والدین کی علم دوستی نے ہم دونوں بہنوں کو کسی قابل بنا دیا اور جب ہم لوگوں نے اُردو فائنل اور ہائی اسکول پاس کر لیا تو والدہ نے ہمارے

رجحانات کو مدِنظر رکھ کر نیز والد مرحوم کے دیرینہ تعلقات سے مستفید ہوتے ہوئے ہمیں اسکول کی ملازمتوں سے متعلق کر دیا۔

صفیہ اور ہم قدرتی طور پر ایک دوسرے سے حد درجہ محبت کرتے تھے۔ اس کی وجہ کچھ تو فطرت تھی۔ اور کچھ ہر وقت کا ساتھ۔ ہماری الفت کی حدیں اس قدر مضبوط اور استوار تھیں کہ جن پر حوادثِ زمانہ کے اثرات کا گمان بھی بے حقیقت تھا۔ ہم ایک دوسرے کے مونس بھی تھے۔ اور غمگسار بھی۔ ہماری زندگیاں آپس کے مناقشات سے بیگانہ، جس طرح ایک دوسرے کی خوشی اور راحت میں حصہ لینے کی عادی تھیں۔ اسی طرح دکھ، درد میں بھی ——

کبھی کبھی ہم تنہائی میں بیٹھتے اور ایک دوسرے کی دلی کیفیات کو سن کر جذبات کی ایک ایسی دنیا میں کھو جاتے جہاں محبت، الفت، فرحت و انبساط کے سوا اور کچھ نہ ہوتا ——!

اسکول میں ملازم ہونے کے بعد بہت جلد والدہ نے ہماری پسند کے مطابق ہماری شادیاں کر دیں۔ اور حسن اتفاق سے ہمارے سرتاج بھی دونوں حقیقی بھائی نکلے۔ بڑے بھائی رفتی سے میں منسلک کر دی گئی۔ اور صفیہ رشدی سے۔

ہمارے گزشتہ خوابوں کی تعبیر کے نتیجہ خیز ہونے کا آغاز اب ہوا...... کیونکہ صفیہ اور ہم عہد کر چکے تھے کہ ہم لوگ اپنی اپنی پسند سے گھر بسائیں گے۔ اس کے بعد اپنے رابطۂ اتحاد و الفت کو مزید استواری بخشنے کی خاطر ایک ہی مکان میں رہیں گے ہمارے بچے ایک ہی جگہ پیدا ہوں گے۔ پروان چڑھیں گے۔ ساتھ ہی زیور تعلیم سے آراستہ ہوں گے۔ اور اگر قدرت نے ہمیں استقامت عطا فرمائی۔ تو ہماری آنے والی نسلیں بھی منسلک کر دی جائیں گی ——

رفقی اور رشدی سے منسلک ہونے کے بعد ہمارے ایام بڑی فرحت و شادمانی میں بسر ہونے لگے ہم لوگ حقیقی معنوں میں ایک ایسی رومانی وادی میں پہنچ چکے تھے جہاں کیف و سرور، مسرت و انبساط، فرحت اور راحت فراوانی سے میسر تھی۔ اسی نوعیت سے کئی ماہ گزر گئے۔ اور ایک دن والدہ نے مجھے ناشتہ تیار کرتے وقت صفیہ کے حاملہ ہونے کی مسرت بخش خبر سنائی مجھے اس خبر سے ناقابل بیان خوشی ہوئی۔

اب ہم لوگوں کے لئے بہت دنوں تک فرصت کے اوقات بجائے کتب بینی و تفریح کے مولود کے لئے ضروری تیاریوں میں منہمک رہنے کا مشغلہ بن گیا آخر وہ روزِ سعید بھی آیا کہ جب صفیہ کو زچہ خانہ میں داخل ہونا تھا میں نے بھی صفیہ کی دلجوئی کی خاطر ہمراہ جانا چاہا۔ مگر والدہ نے مجھے یہ کہہ کر روک دیا کہ اول تو تمہیں خود بھی آج کل زیادہ چلنا پھرنا نہ چاہئے۔ دوسرے صفیہ کے لئے تمہیں متردد ہونے کی ضرورت نہیں وہ خطرے کی حدود سے باہر ہے۔

گھر مکان پر بھی میرا دل صفیہ میں لگا رہا۔ اور کان ٹیلی فون کی گھنٹی کی طرف تھے خدا خدا کر کے رشدی سے فون پر معلوم ہوا کہ صفیہ کے لڑکا تولد ہوا ہے۔

صفیہ تقریباً ایک ہفتہ ہسپتال میں رہ کر مکان پر واپس آئی۔ اس کے لئے قبل از وقت ایک موزوں کمرہ مخصوص کر دیا گیا تھا جہاں وہ مع اپنے بچہ کے رہتی اور والدہ بھی گاہے گاہے ضرورت کے وقت وہاں چلی جاتیں۔ مگر اسکول سے آنے کے بعد میں تقریباً دن کا بقیہ حصہ اور رات کا زیادہ وقفہ اس کے ہمراہ گزار دیتی۔ صفیہ کا لڑکا رشدی کی ہم شکل اور غیر معمولی حسین و شکیل تھا کچھ ہفتوں بعد صفیہ تندرست ہو کر اپنی ملازمت کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اسی دوران میں ہم لوگوں نے اس کا نام عشرت رکھا۔

جب عشرت چار ماہ کا ہو گیا۔ تو رفقی نے مجھے زچہ خانہ میں داخل کیا۔ اب میری باری تھی۔ مگر چونکہ مجھے صفیہ کے معاملہ میں پوری واقفیت ہو کر اطمینان ہو چکا تھا۔ اس لئے کوئی جھجک اور خوف نہ محسوس ہوا۔ مگر آہ! وہ منحوس صبح! سورج کی پہلی کرن کے نمودار ہونے سے قبل ہی مجھے اس کا علم ہو چکا تھا۔ کہ میں ایک مردہ بچہ کی ماں ہوں۔

"رفقی! —— میرے سرتاج!! میرے بچہ کو میرے پاس لے آؤ —— آہ میں اسے ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں ——" میں نے ٹوٹے ہوئے فقروں میں ان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے نحیف لہجہ میں التجا کی۔ وہ میرے سرہانے خاموش بیٹھے رہے مگر میں نے محسوس کیا کہ میری پیشانی پر گرم آنسو کا قطرہ گرا۔ یہ آنسو میرے شوہر کا تھا جو مجھے ڈبڈبائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "پیاری رضو! مشیتِ ایزدی میں کیا چارہ؟ ——" وہ انتہائی مایوسانہ لہجہ میں بولے۔

"مگر کیوں؟...... ایسا کیوں ہوا؟ مشیت ایزدی نے صفیہ کی گود بھری۔ اور میری خالی کر دی ——؟ آہ! میں جوان ہوں! تندرست و توانا ہوں بولو!! بولو میرے آقا ——؟"

"نہیں جانِ آرزو —— تم توانا نہیں ہو —— ڈاکٹروں کا یہی فیصلہ ہے —— مشیت ایزدی ان فہم لمس الزام سے بالاتر ہے یہ سب ہماری غلطیوں کا ثمرہ ہے۔ نہ جانے کون سی باطنی خامی ہماری نامرادی کی وجہ قرار پائی۔ گزشتہ شب باوجود انتھک کوششوں کے ناکامیاب رہے"

اس طرح میں کئی دنوں بعد رفقی کے ہمراہ خالی گود مکان واپس آئی۔ مگر کچھ ہی عرصہ میں صفیہ اور والدہ کی محبت و التفات نے میرا غم غلط کر دیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی نامرادیوں کو عشرت کی معصومانہ اداؤں میں تحلیل کر کے فراموش کر چکی تھی۔ اس کے ننھے منے ہاتھ پیر چھوٹے چھوٹے متحرک اعضا۔ اس کی معصوم شیریں مسکراہٹ۔ ان سب نے مل جل کر میرے زخم کو مندمل کر دیا۔

مشیتِ ایزدی کی کرامات کا ایک ادنیٰ کرشمہ دوبارہ سرسبز نظر آیا۔ امرت

میں عشرت تقریباً تین سال کا ہو چکا تھا جب کہ میرا شاہد لطیف عالم وجود میں آیا
عشرت کی دلچسپیوں کا مرکز اب شاہد تھا۔ اور ہم لوگ اپنی چھوٹی سی دنیا میں مست و سرشار ہو کر تفکرات و آلام سے بیگانہ و بے پروا ہو چکے تھے۔ ہر روز شام کو ہم لوگ باغیچہ میں فطرت کے مخملی فرش پر اپنے دونوں بچوں کو کھیلنے کے لئے چھوڑ دیتے اور مسرت آمیز انداز سے انھیں ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتے۔

شاہد کی دوسری سالگرہ کے ایک ماہ بعد نجمہ پیدا ہوئی ——
صفیہ کی تمنا تھی۔ کہ لڑکی اس کے ہاں ہوتا۔ کہ وہ اسے شاہد سے منسوب کرنے کا مجھ سے وعدہ لے لے اور اس طرح ہماری آرزوؤں کی تکمیل ہو جائے مگر بجائے اس کے لڑکی میرے حصہ میں آئی —— یہ بھی مشیت ایزدی کا ایک ادنےٰ کرشمہ تھا۔ مگر صفیہ اس واقعہ سے باطل نہ ہوئی۔ بلکہ نہایت خندہ پیشانی سے قدرت کے اس فیصلہ پر سر نیاز خم کئے ہوئے صابر و شاکر رہی۔ اور اس نے اسی طرح نجمہ میں دلچسپی و محبت کا اظہار کیا جس طرح میں نے عشرت کے معاملہ میں کیا تھا۔ غم روزگار سے بے بہرہ، زندگی اپنی تمام دلفریبیوں اور لطافتوں کے ساتھ گنگناتی چلی جا رہی تھی۔

جس طرح باغبان کی انتھک کوششوں کے نتیجہ میں چھوٹے چھوٹے پودے کچھ عرصہ کے بعد بڑھ کر سرسبز و شاداب ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح عشرت بھی بڑا ہو کر اب اسکول جانے کے قابل ہو گیا۔ مگر اس کی مکان سے غیر حاضری کے دوران ابتدا میں میرے دونوں بچے شاہد و نجمہ بہت گھبرایا کرتے تھے۔ نجمہ ہمیشہ سہ پہر کو کھڑکی پر چڑھ کر سلاخوں سے سر جوڑے کھڑی رہتی۔ اور عشرت کی واپسی کے لئے اس کی نظریں متلاشی رہتیں۔

۱۴ شعبان المعظم ——— میرے لئے وہ بدبخت دن تھا کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ گو رفتار زمانہ کی بدولت اس کا اثر اب مجھ پر سے زائل ہو چکا ہے۔ مگر اس روز سیہ کا نقش ہنوز میرے لوح دل پر کندہ ہے ——
میں اور صفیہ اس دن اپنی ایک سہیلی کے ہاں تقریب میں مدعو تھے اتفاق سے والدہ چند ہفتوں کے لئے بیرون بمبئی تشریف لے گئی تھیں چنانچہ والدہ کی غیر موجودگی میں بچوں کو یا تو ہم لوگ اپنے ہمراہ لے جاتے یا پھر تقریب میں عدم شرکت ہر طور میں نے صفیہ سے شرکت کے لئے کہا۔ اور خود مکان پر رہ کر بچوں کی نگہداشت کا فیصلہ کیا۔ مگر وہ نہ مانی اور کہنے لگی:-
"نہیں آپا! اگر آپ نہیں چلیں گی۔ تو میں بھی نہیں شرکت کرتی"
"صفو! مجھے چلنے سے انکار نہیں۔ مگر بچوں کو کس کے سپرد کریں! بہتر تو یہ تھا کہ ہم میں سے ایک ضرور لازماً شریک ہوتا"
"تو پھر آپ جائیے بچوں کی دیکھ بھال میں کرلوں گی" وہ بولی۔
"صفو! میرا تو خیال ہے۔ کہ تم چلی جاؤ"

"نہیں آپا! یہ ہرگز نہ ہوگا" اس نے اداس ہو کر کہا۔
ہم لوگ اسی کشمکش میں مبتلا شرکت اور عدم شرکت کے مسئلہ پر غور و خوض کر رہے تھے۔ کہ فہمیدہ ارشاد مع اپنی موٹر کے سر پر آ موجود ہوئیں۔ اور ہم لوگوں کو مع بچوں کے اپنے ہمراہ چلنے پر مصر ہوئیں۔
"بچے میری ناصری کے ساتھ کھیلیں گے بھئی کیا بچے ہوں تو سرے سے تقریب ہی اڑا دی جائے۔"
فہمیدہ نے قہقہہ لگا کر کہا "یہی خیال تھا۔ تو پے در پے اتنی غلطیاں کیوں کرتی رہیں ——؟"
"اسی قسم کی ایک غلطی کا ثمرہ آپ بھی تو ہیں!" صفیہ نے بر وقت فہمیدہ پر چوٹ کی۔ میں بھی اس کی حاضر جوابی پر مسکرا دی۔ اور بولی:-
"اگر بچے تقریب میں آپ کے لئے باعث زحمت نہ ہوں۔ تو مجھے کوئی عذر نہیں"
میں نے یہ جملہ کہنے کو تو کہہ دیا مگر مجھے ان کی زحمت سے زیادہ بچوں کی تکلیف کا خیال تھا۔ اور حقیقتاً مجھے تقریب میں شریک ہونے سے زیادہ سرور مکان پر رہ کر بچوں کی نگہداشت میں ملتا۔ پھر بھی ہم لوگ ان کی خاطر کے پیش نظر مزید غور کئے بغیر ہمراہ ہو لئے۔

شام ہو چلی تھی۔ آفتاب کی الوداعی کرنیں دریا کی لہروں پر مچلتی ہوئی اونچے اونچے درختوں اور فلک بوس عمارتوں کے بالائی حصوں کو خدا حافظ کہتی رخصت ہو رہی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بہت لطیف معلوم ہو رہے تھے۔ سمندر کی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی جاں بخش موجوں سے فردوسی نغمات کی بارش ہو رہی تھی۔ موجیں ساحل سے ہر بار اپنی پوری طاقت سے ٹکرا ٹکرا کر سعی عمل میں مصروف نظر آتیں۔ مگر پھر کسی نامراد و محزون عاشق کی طرح ناشاد واپس ہونے پر مجبور ہو جاتیں۔ ہماری موٹر لب ساحل بچھی سڑک پر فراٹے بھرتی ہوئی چلی جا رہی تھی —— آخر تھوڑی دیر بعد ہم سب لوگ ارشاد منزل پہنچ گئے۔
فہمیدہ نے بچوں کو اپنی خادمہ کے سپرد کر دیا۔ اور ان کے لئے اپنے شوہر ارشاد صاحب کا کمرہ مخصوص کر دیا ساتھ ہی خادمہ سے بچوں کی نگہداشت کی تاکید کر دی۔ اس کے بعد ہم لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ گو ہم لوگ فہمیدہ کے یہاں بطور مہمان گئے تھے۔ مگر صفیہ اور میں نے گھر کے کاموں میں ان کی معاونت کرتے ہوئے تھوڑا تھوڑا کام اپنے ذمہ لے لیا اور مشغول ہو گئے۔ مگر تھوڑے تھوڑے وقفہ بعد ہم میں سے ایک بچوں کو ضرور دیکھ آتا۔ ہمارے بچوں کے ہمراہ فہمیدہ کا بڑا لڑکا ناصر بھی تھا۔ جو ان لوگوں سے بہت جلد مانوس ہو کر کھیل و تفریح میں شریک ہو گیا۔ ایک پہر رات گزرتے ہی نجمہ کو سلا کر خادمہ تقریب کی رنگینیوں سے دلچسپی لینے کے لئے بچوں سے بے پروا ہو کر وہاں سے چلی آئی۔ اسے آئے ہوئے نہ معلوم کتنا عرصہ

گزرا ہوگا کہ مکان کے کسی حصہ سے پستول چھوٹنے جیسی آواز سنائی دی۔ جسے سن کر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مگر فوراً ہی میں نے اپنے واہمہ کو لوگوں کے وہم خیال ہوتے ہوئے تسلی دے لی کہ کوٹھی کے کسی حصہ میں کسی نے آتشبازی چھوڑی ہوگی لیکن ایک لمحہ بعد بیک وقت کئی بچوں کے رونے کی صدائیں سنائی دیں۔ میں، صفیہ اور فہمیدہ جھپٹ کر ارشاد صاحب کے کمرہ میں پہنچے۔ وہاں کے منظر نے میرے دل پر جو کیفیت کی وہ احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ خوف سے میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ غم اور غصہ کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کر میں کانپ رہی تھی۔ عشرت کے قریب فرش پر ایک پستول پڑا ہوا تھا۔ اور اُس کے سامنے میرا ننھا شاہد!........ خون سے نہایا ہوا نیم مردہ! جسے دیکھ دیکھ کر عشرت اور ناصری رو رہے تھے۔ نینت سے گھبرا کر اُٹھی ہوئی نجمہ مسہری پر علیحدہ ان کی آہ وزاری میں شریک تھی —— نہ معلوم کیسے ناصری نے اپنے ابو کا بھرا ہوا پستول الماری سے نکال لیا تھا۔ جسے وہ لوگ کھلونا سمجھ کر کھیل رہے تھے۔ اور اس دوران میں پستول نہ معلوم کیسے عشرت کے ہاتھ آگیا تھا۔ اور پھر —— !شومئی قسمت سے میرا چھوٹا سا شاہد اس کی زد میں —— آہ! موت اور زیست کا خونی کھیل ——!

میں نے لپک کر ننھے شاہد کو اپنی گود میں اُٹھا لیا۔ پستول کی گولی اس کے سینہ کو پار کر چکی تھی۔ معصوم کا خون بہہ بہہ کر فرش پر جم رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر قریب قریب سرد ہو چکے تھے۔ پھر بھی فہمیدہ ہم لوگوں کو لے کر فوراً ہسپتال پہونچی۔ اور ڈیرے لعل کو دوبارہ زندہ کرنے کی انتھک کوشش صرف کر دی۔ مگر شاہد جانبر نہ ہو سکا

کئی ہفتے اس اتفاقی حادثہ کے غم کی عمیق وادی میں پڑ کر گذر گئے۔ اور میں دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر ہو کر اپنے لختِ جگر کی مفارقت میں نڈھال رہی۔ اس دن سے جبکہ میرا ننھا شاہد مجھ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا تھا۔ میں نے صفیہ اور عشرت کی صورت نہ دیکھی اور نہ ہی کبھی دیکھنا گوارا کرتی تھی۔ کیونکہ ہر بار جب کہ ان کی آوازیں میرے کانوں میں آتیں نہ معلوم کون سا جذبۂ نفرت میرے دل کی گہرائیوں سے امنڈ امنڈ کر مجھے ان کی جانب سے بیزاری پر آمادہ رکھتا۔ میری مامتا اُجڑ چکی تھی۔ دنیا میرے لئے ایک عرصہ دار تکلیف سی رہی۔ میں اپنے شاہد کے غم جدائی کی وجہ سے ایک عرصہ تک بسترِ علالت پر پڑی رہی۔ میری کیفیت مجنونانہ اور میرے حواس مختل ہو چکے تھے۔

میرے صحت یاب ہونے کے بعد ایک دن رفیق نے مجھ سے بڑے لجاجت آمیز انداز میں کہا:۔

"پیاری رضو! تم صفیہ سے ناحق بیزار ہو۔ آخر اس بے چاری نے تمہارا کیا بگاڑا ہے —— جس طرح وہ تمہاری مسرتوں میں ہمیشہ شریک رہی اُسی طرح غموں میں بھی حصہ لیتی رہی ہے۔ اب بھی وہ انتہائی مغموم ہے اور تمہارے رویے نے تو اُس کا دل اور توڑ دیا —— تمہاری ایک ہی تبسم نگاہ اُس کے غموں کو دور کر دے گی"

میں خاموشی سے ان کی گفتگو سنتی رہی۔ وہ پھر بولے:۔

"اب رہا عشرت کا معاملہ، تو تم جانتی ہی ہو کہ وہ بھی بے گناہ ہے۔ کیونکہ وہ شاہد سے والہانہ محبت کرتا تھا۔ اور یہ فعل لڑکپن کے ایک اتفاقی حادثہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا —— کم از کم تم اِسے تو بآسانی سمجھ سکتی ہو کہ عشرت کا وہ مقصد ہرگز نہ تھا جو وقوع پذیر ہو گیا"

"صفیہ کی اولادِ نرینہ زندہ ہے۔ میرا پہلا بچہ مشیتِ ایزدی کی نذر ہو چکا اور دوسرا عشرت کی —— یہ سچ ہے کہ صفیہ اس ضمن میں قطعی معصوم ہے۔ مگر اس کے قاتل اور سفاک عشرت کی صورت سے مجھے نفرت ہو گئی ہے۔ چنانچہ یہ بہتر ہے کہ ہم ان لوگوں سے راہ و رسم نہ رکھیں" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

اب اس طرح ہم دونوں نہیں جو ایامِ پارینہ میں دنیا کے سرد و گرم کا ایک جہتی اور یگانگی سے مقابلہ کرتی تھیں، اب تنہا اور بے کیف زندگی گذار رہے تھے۔ لیکن صفیہ کو نہیں۔ مگر کم از کم مجھے اسی میں سکونِ قلب حاصل تھا۔ ہمارے ان تعمیر کردہ منصوبوں کی تکمیل نہ ہو سکی جنہیں ہم لوگوں نے صلح جوئی اور فرحت و انبساط کی فضا میں تجویز کیا تھا۔ ایک ناقابلِ بیان خلش۔ ایک ہمیشہ کھٹکنے والا خار ہمارے درمیان پیدا ہو گیا تھا اگر کبھی میرے ذہن میں اس خلش اور اس خار کو دور کرنے کا خیال بھی پیدا ہوتا۔ تو تخیلات پر چھائی ہوئی شاہد کی ننھی سی تربت میرے ارادہ کو تشنۂ تکمیل ہی رکھتی ——

اب زندگی کی کیف زائیاں ہمیشہ کے لئے مجھ سے رخصت ہو چکی تھیں.......!!

جس طرح ارباب نظر نے فسانہ کی ابتدا میں مطالعہ فرمایا ہے۔ میں کشیدہ خاطر ہو کر غم و غصہ کا شکار ہو رہی تھی کہ رفیق مکان میں داخل ہوئے۔ اور میں اپنا بخار ان پر اتارتے ہوئے بولی:۔

"آخر ہم لوگ کب تک اس ناسازگار فضا میں زندگی کو ناخوشگوار و تلخ لمحات میں گذارتے رہیں گے؟ —— کیوں نہ ہم کسی دوسرے مقام پر چل کر ان لوگوں سے دور رہیں۔ تاکہ نجمہ عشرت کی صحبت سے بھی الگ ہو جائے اور میری کوفت بھی کم ہو ——؟"

"مگر بیگم! یہ تمہارا گھر ہے تمہیں اس سے اُنس ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم لوگوں کے لئے یہ مقام کس قدر موزوں ہے! تمہارا اسکول بھی یہاں سے قریب ہے اور میرا دفتر بھی!!"

"دفتر اور اسکول کی دوری کو ہم اپنا غم فراموش کرنے کے لئے برداشت کر سکتے ہیں" میں نے جواب دیا۔

"ہاں بالکل ٹھیک! اگر میری تمنا تھی۔ کہ تم ایک مرتبہ صفیہ کے معاملہ میں

فراخ دل اور فیاض ہو جائیں پھر تمہیں اختیار تھا کہ ان لوگوں سے ہنسی خوشی رخصت ہو کر ہم لوگ علیحدہ رہنے لگیں" وہ سمجھاتے ہوئے بولے۔

مگر جب انھوں نے میری آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ تو گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا:۔

"اچھا۔ ہوگا۔ اگر تمہاری یہی مرضی ہے کہ ہم لوگ اسی نوعیت سے دوسری جگہ منتقل ہو جائیں تو مجھے تم سے اختلاف نہیں"

اُسی ہفتہ ہم لوگ والدہ سے رخصت ہو کر ان لوگوں سے دور کرایہ کے مکان میں رہنے لگے۔

ہم لوگوں کو اپنا ذاتی گھر چھوڑے ہوئے تین سال کا عرصہ گذر چکا نجمہ اب اسکول جانے لگی تھی۔ مگر مجھے ایک خیال یہاں بھی سوہانِ روح ہوتا تھا کہ نجمہ اور عشرت میں ربط وضبط نہ ہونے پائے کیونکہ یہ لوگ ساتھ ساتھ ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ میں نے اپنے اس خیال کا اظہار کسی سے نہ کیا حتیٰ کہ نجمہ تک سے میں نے کبھی تذکرہ نہ کیا اور نہ ہی نجمہ اب مکان پر عشرت کا ذکر کرتی۔ کیونکہ وہ میرے مزاج سے اب کلیتہً واقف ہو چکی تھی۔

اگرچہ زندگی میں اب وہ لطافتیں نہ تھیں، جو ایک خوش حال اور بشاش کنبہ کی شرکت میں رہ کر حاصل تھیں۔ مگر پھر بھی مجھے سکون واطمینان ضرور میسر تھا اور یہی میری لٹی ہوئی کائنات میں بچا کھچا سرمایہ باقی رہ گیا تھا جو بہر حال غنیمت تھا۔

سالانہ امتحان ختم ہوتے ہی اسکول کمیٹی اور انسکاوٹس سنٹر کے اشتراک سے حسب معمول ایک ڈرامہ کھیلنے کا اہتمام ہوا۔ اتفاق سے امسال ہیروئن کے لئے نجمہ کو منتخب کیا گیا کیونکہ ہیڈ مسٹرس کو اس سے بہتر کوئی دوسری لڑکی نہ مل سکی۔ اسکول کی گراؤنڈ پر اسٹیج تیار کی گئی۔ اور اس شب جب ڈرامہ ہونے والا تھا شہر کی بہت سی معزز خواتین جنہیں دعوت دی گئی تھی تشریف لائیں۔

رومیو جولیٹ کا ڈرامہ اسٹیج پر ہونے والا تھا ———

پردہ اُٹھا اور ایک لڑکی جو رومیو کا کردار کر رہی تھی اپنے ہاتھ میں ستار لئے ہوئے نغمات کی دنیا بیدار کرتی ہوئی قصر جولیٹ کے نیچے آکر رُکی۔ جولیٹ نے اس کی آواز سنی۔ اُس نے دریچہ سے جھانک کر نیچے دیکھا اور ہاتھ میں شمع لئے ہوئے اس سے ملنے کے لئے محل کی بالائی منزل سے اتر کر بے تابانہ اس کی طرف لپکی۔

جولیٹ کا پارٹ نجمہ کے ذمہ تھا۔ اس کی ہر برجستہ اور چھوتی اداکاری پر مجمع سے بار بار تحسین وآفریں کی صدائیں بلند ہو ہو کر اس کی ہمت افزائی کر رہی تھیں۔ جولیٹ شمع لئے ہوئے آہستہ آہستہ رومیو کی طرف والہانہ انداز میں لپکی۔ مگر شومیٔ قسمت سے شمع کے کسی ترکیب سے جل جانے سے قریب کے پردہ میں آگ لگ گئی۔ اور آناً فاناً ہوا کے سرد جھونکوں سے مشتعل ہو کر نجمہ کی بیش قیمت پوشاک نے بھی آگ پکڑ لی۔

اس منظر سے خوفزدہ ہو کر مجمع میں ہیجان واضطراب چھا گیا۔ ہر شخص چیختا ہوا اسٹیج پر چڑھ کر بھڑکتی ہوئی آگ کو سرد کر کے نجمہ کو بچانے کی فکر کرنے لگا۔ میں اس متوحش کن منظر کے دیکھنے کی زیادہ دیر تک تاب نہ لا سکی اور اپنی نشست سے دیوانہ وار اُدھر لپکی مگر تھوڑی دور چل کر میرے پیر لڑکھڑائے منہ سے ایک چیخ نکلی اور میں وہیں گر کر بے ہوش ہو گئی۔

مجھے نہیں معلوم کہ آگ پر کس طرح قابو پایا گیا اور کس طرح میری نجمہ لقمۂ آتش ہونے سے بچی کیونکہ جب مجھے ہوش آیا تو میں والدہ کی نگہداشت میں تھی۔ وہ مجھے بیہوش دیکھ کر اپنی کار میں اٹھا لائی تھیں۔ یہاں میں نے روفی کو بھی اپنے قریب کرسی پر بیٹھے دیکھا۔ میں نے اُٹھتے ہوئے ان سے دریافت کیا۔

"نجمی! ——— میری بچی نجمی!! ——— کیا نجمہ کو میں نے ضائع کر دیا؟"

شدت غم سے میں زار وقطار رونے لگی۔

"نہیں رضیہ! تم کیا کہہ رہی ہو نجمہ اچھی ہے۔ وہ ہسپتال میں ہے" روفی مجھے دلاسا دیتے ہوئے بولے۔

"اور آگ ———؟" میں نے مزید استفسار کیا۔

"فوراً ہی بجھا دی گئی۔ فائر بریگیڈ والوں نے تھوڑے ہی لمحہ بعد اس پر قابو پا لیا اور کسی کو گزند نہ پہونچا۔ ماسوا اسٹیج کے سامان آرائش کے"

میں نجمہ کو دیکھنے کے لئے بے تاب تھی چنانچہ ہم لوگ فوراً ہی ہسپتال روانہ ہو گئے راستہ میں میں نے روفی سے چند مزید سوالات کئے۔

"نجمہ خدانخواستہ جلی تو نہیں ———؟"

"نہیں کہیں کہیں خفیف سی خراشیں آگئی ہیں مگر ڈاکٹروں نے پورے انہماک سے علاج شروع کر دیا ہے۔ اور جلد شفا کا یقین دلاتے ہیں ——— لیکن ......" وہ کچھ اور کہتے کہتے رک گئے۔

"لیکن ———؟"

"لیکن جس نے اس کی جان بچائی وہ بہت جل چکا ہے اور اس کے بچنے کی توقع نہیں"

"کس نے میری بچی کو بچایا ———؟"

"ایک لڑکے نے!"

"ایک لڑکے نے ———؟"

"ہاں"

"کون تھا وہ — — ———؟"

میرا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا ایک لمحہ کے لئے نجمہ کا غم بھول گئی تھی۔ انہوں نے جواب دیا۔

"ہم اُس کے احسان کا بدلہ کبھی ادا نہیں کر سکتے"

"مجھے پہلے اُس کے پاس لے چلو میرے سرتاج! میں پہلے اسے دیکھوں گی پھر نجمہ

کو میرے دل میں اس لڑکے کی طرف سے غائبانہ ہمدردی پیدا ہو چکی تھی ۔ وہ بولے "مگر اُسے دیکھ کر تمہاری ہمدردی نفرت و بیزاری میں تبدیل ہو جائے گی۔"

"کیوں ——— ؟"

"اس لئے کہ اُسے بچانے والا عشرت ہے۔"

عشرت کا نام سن کر میرا دل محبت و نفرت کے ملے جلے جذبات سے لبریز ہو گیا۔ آخر میں بولی۔

"یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ شاہد کا قاتل اور نجمہ کا مسیح ایک شخص ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

میں بیکار ضد کر رہی تھی ———

"مگر تم پر میری صداقت ابھی روشن ہو جائے گی۔" روفی نے اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

اب ہماری گاڑی ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں پہنچ چکی تھی۔ میں اتر کر روفی کے ہمراہ اندر گئی۔ سب سے پہلے ہم لوگوں نے نجمہ کو دیکھا۔ اُسے ڈاکٹروں کی خصوصی توجہ کے باعث سکون ہو چکا تھا اور وہ سو گئی تھی۔ میں والہانہ انداز میں اس کی مسہری پر جھک گئی اور اس کی خوبصورت پیشانی چوم کر خدائے وحدہٗ لاشریک کی بارگاہ میں ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کیا۔ اس کے بعد ہم لوگ عشرت کے کمرہ کی طرف چلے ہال میں پہنچ کر میں نے قریب کھڑی ہوئی نرس سے دریافت کیا :۔

"ہم لوگ لڑکے کو دیکھنا چاہتے ہیں کوئی ہرج تو نہیں ——— ؟"

"نہیں خاتون۔" اُس نے جواب دیا "ڈاکٹر ہنوز اس کی مرہم پٹی میں مشغول ہیں میرے خیال میں آپ کو ذرا دیر توقف فرمانا پڑے گا۔ اگر مناسب خیال فرمائیں تو لڑکے کے والدین کے ہمراہ بڑے دیوان خانہ میں تشریف رکھیں جہاں وہ لوگ بھی اُسے دیکھنے کے لئے منتظر ہیں۔"

نرس کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ رشدی اور صفیہ دیوان خانہ میں ہیں۔ چنانچہ ہم لوگ وہاں پہنچے ———

اب میری بے جا نفرت مفقود ہو چکی تھی ....!

جس وقت میں وہاں پہنچی تو میں نے دیکھا کہ صفیہ رشدی کے کندھے پر سر رکھے سسکیاں بھر رہی ہے۔ اُسے میرے وجود کا اس وقت تک علم نہ ہوا۔ جب تک میں نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر نہ رکھ دیا۔

"صفو! ——— میری پیاری بہن! ——— مجھے معاف کر دو۔"

یہ کہتے کہتے میری آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو گئے۔ صفیہ نے رشدی کے کندھے سے اپنا سر اٹھا کر ڈبڈبائی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور فوراً ہی اٹھ کر بے تابی میں وہ مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس طرح ہم دونوں بچھڑی ہوئی بہنوں کو قدرت نے ایک عرصۂ دراز کے بعد پھر گلے ملنے کا شرف عطا فرمایا۔

آج جب کہ میں اپنی زندگی کے اس ناخوشگوار واقعہ کو قلم بند کر رہی ہوں۔ کئی برس گذر چکے ہیں اور اب نجمہ اور عشرت ماشاءاللہ زیورِ تعلیم سے مرصع ہو کر جوانی کی بہاریں لوٹ رہے ہیں ——— والدہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ ہم لوگ پہلے کی طرح پھر ایک ساتھ رہنے لگے ہیں۔ اور گذشتہ ہفتہ ہم لوگوں کے خوابوں کی آخری تعبیر بھی خوشگوار طریقہ سے عملی جامہ پہن چکی ہے یعنی ہم لوگوں نے نجمہ اور عشرت کو ازدواجی زندگی میں منسلک کر دیا۔

کل ۱۴ شعبان المعظم تھی ———

ہم لوگ والدہ ، والد اور ننھے شاہد کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے گئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ عشرت نے تازہ تازہ پھولوں کا ایک ہار شاہد کی ننھی تربت پر چڑھایا ———

یہ عشرت کی محبت کے پھول تھے ......

میری آنکھوں سے خوشی کے دو آنسو نکل کر رخساروں پر ڈھلک آئے!

——— (انگریزی سے) ———

ایک خوراک ایک ٹکیہ میں دمہ غائب!

تعجب کی بات نہیں سینکڑوں مریض تندرست ہو رہے ہیں یہ ایسا علاج ہے آج تک کبھی خطا نہیں کی دمہ کے پرانے سے پرانے مریض بالکل تندرست ہو گئے جو مریض اپنی زندگی سے عاجز آ چکے تھے وہ "دمول" کے استعمال سے دوبارہ زندہ ہو گئے مریض کو دورہ خواہ کتنا ہی سخت پڑتا ہو وہ سانس کتنی ہی تنگی سے لیتا ہو اس معجز نما دوا سے صحت پا جاتی ہے جو مریض تندرست ہو چکے ہیں وہ اس دوا کو طلسم کہتے ہیں بڑے بڑے ڈاکٹر اس علاج کی تلاش میں حیران و سرگرداں ہیں مگر ناکام رہے دمہ کے مریضوں کو چاہیے کہ وہ آج ہی دمول کا پورا کورس منگا کر پندرھویں دن بالکل تندرست ہو جائیں اور زندگی آرام سے گزارنے لگیں قیمت پانچ روپیہ ڈاک خرچ آٹھ آنے علاوہ

منیجر اکسیری دواخانہ کلاں محل ۷۷ دہلی

پیشاب کے بعد سفید قطرہ

اگر پیشاب کرنے کے بعد یا پیشاب سے پہلے سفید رنگ کا پانی خارج ہوتا ہو تو یہ بہت خطرناک بات ہے اسے جریان کی بیماری کہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ مرض بڑھ جاتا ہے تو پھر آدمی شادی کے مطلب کا نہیں رہتا اس کی قوت مردمی ختم ہو جاتی ہے۔ اس واسطے جن مردوں کو یہ شکایت ہو یعنی پیشاب کرنے سے پہلے یا پیشاب کے بعد یا بیوی کے قریب جانے سے پیشتر ہی سفید رنگ کی رطوبت خارج ہو جائے یا رات کو سونے میں احتلام ہو جائے (یعنی خواب ہو جائے) تو اس خطرناک مرض سے غفلت نہ کرنی چاہئے۔ ورنہ ایک دن زندگی کا خاتمہ کر دے گا۔

جریان کا مرض صرف ایک ہفتہ میں ختم کیا جا سکتا ہے

اور صرف ساڑھے تین روپے خرچ ہوں گے۔ دہلی کے مشہور زنانہ دواخانہ کی تیار کردہ دوا جوہر اعظم اس مرض کیلئے اکسیر کا کام کرتی ہے صرف ایک شیشی جوہر اعظم سے بڑے بڑے پرانے مریضوں کو تندرستی ہو گئی ۱۹۲۸ء کے انعامی مقابلہ میں بھی یہ دوا سرتاج رہی اور یقین کیا گیا کہ جوہر اعظم جریان کے مرض کا بہترین علاج ہے چنانچہ اسوقت سے آجتک اس دوا پر محصولڈاک معاف ہے جن لوگوں کو ضرورت ہو وہ

جنرل منیجر زنانہ دواخانہ اے بی نمبر ۳۴ دہلی

کے پتہ پر خط لکھ کر جوہر اعظم کی ایک شیشی بذریعہ وی پی منگالیں۔ ایک شیشی کی قیمت تین روپے آٹھ آنے ہے (۳؎) پارسل کا محصول کسی ہندوستانی خریدار سے نہیں لیا جاتا۔

سوزاک کے مریض ختم

ختم کیا جا رہا ہے۔ اگر دوا "اکلوزول" اسی طرح سوزاک کے مریضوں کو تندرست کرتی رہی تو بہت جلد وہ وقت آ رہا ہے کہ جب ہندوستان بھر میں سوزاک کا مریض نہ مل سکیگا۔ سوزاک نیا ہو یا پرانا ہر حالت میں صرف ایک شیشی دوا "اکلوزول" سوزاک کے مرض کا پوری طرح خاتمہ کر کے مریض کو بالکل تندرست اور جوان بنا دیتی ہے کبھی آجتک ایسا نہیں ہوا کہ کسی سوزاک کے مریض نے دوا "اکلوزول" استعمال کی ہو اور اسے فائدہ نہ پہنچا ہو کیونکہ یہ دوا ہندوستانی آب و ہوا کے لحاظ سے بیحد عجیب ثابت ہوئی ہے لوگ اسے جادو کی دوا کہنے لگے ہیں پس جو لوگ سوزاک کے مرض میں مبتلا ہیں چاہیئے کہ

جنرل منیجر زنانہ دواخانہ اے بی نمبر ۳۴ دہلی

کو خط لکھ کر ایک شیشی دوا اکلوزول بذریعہ وی پی پارسل طلب کرلیں استعمال کرنے کی تمام ہدایات دوا کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ایک شیشی دوا اکلوزول کی قیمت صرف دو روپے نو آنے ہے اور محصولڈاک سات آنے لگتا ہے۔

عورت کو حمل سے بچاؤ

مصیبت ہے بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ بچوں کی اکثریت سے مرد پریشان ہو جاتا ہے۔ یا عورت کی تندرستی زیادہ بچے پیدا کرنے سے خراب ہو جاتی ہے تو ایسی حالت میں عورت کو چاہئے کہ کچھ عرصہ کے لئے اولاد کا پیدا کرنا بند کر دے تاکہ اس کی تندرستی پھر ٹھیک ہو جائے اس کی ترکیب یہ ہے کہ ایسی شیشی دوا "نرمیل" منگا کر عورت اپنے پاس رکھ لے اور خاص وقت سے پہلے اس دوا کی ایک خوراک کھالے۔ حمل نہ ٹھہر سکے گا۔ چنانچہ جب تک یہ عمل رہے گا۔ عورت کو حمل نہ ٹھہر سکیگا اور جب اس دوا کا استعمال ترک کر دیگی۔ حمل ٹھہر جاتا ناممکن ہے اس دوا سے عورت کی صحت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔ ایک شیشی میں اسّی مرتبہ استعمال کے لائق دوا ہوتی ہے اس کی قیمت چار روپے آٹھ آنے ہے اور محصولڈاک گیارہ آنے لگتا ہے۔ اگر کسی کو ضرورت ہو تو وہ

منیجر زنانہ دواخانہ اے بی نمبر ۳۴ دہلی

کے پتہ پر خط لکھ کر بذریعہ وی پی پارسل منگا کر اپنے پاس رکھیں

کاوشِ پیہم

پہلو میں میرے ایک شرار خموش ہے
ہر سانس میری ان دنوں شعلہ بدوش ہے

افسردگی سی ان دنوں طاری ہے روح پر
جانے ہے کس خیال میں اُلجھی ہوئی نظر

اکثر شبِ خموش اُٹھتی ہے ٹیس سی
اکثر پیامِ مرگ کا لاتی ہے خامشی

اپنے وجود سے مجھے بیگانگی سی ہے
طاری دل و دماغ پہ دیوانگی سی ہے

آہٹ کسی کے آنے کی دیتی ہے جب خبر
رہ جاتا ہوں ٹھٹک کے میں ہر ایک گام پر

تاروں کے جھلملانے سے دل داغدار ہے
اے غمگسار دیکھ لے آنکھ اشکبار ہے

ہذیان سا خلش سی جنوں سا ہے اندنوں
کیا پوچھتے ہو حال کیا رہتا ہے اندنوں

دُنیا مری نگاہ میں صحرا سے کم نہیں
کیا حشر ہوگا دہر کا مجھکو یہ غم نہیں

مجھکو کوئی بتائے یہ کاوش ہے کس لئے
اس راز سے مجھے بھی کوئی آشنا کرے

از
جناب صاقب عاصمی!

نقلی سونے کے زیورات





نقلی سونے کی تیار کردہ صرف چوڑیاں اور انگوٹھیاں اور کانوں کے بندے کانٹے ہمارے ہاں مل سکتے ہیں قیمت مندرجہ ذیل ہوگی سادہ انگوٹھی فی عدد ڈیڑھ روپیہ نگدار انگوٹھی فی عدد دو روپیہ - چوڑی فی جوڑی ساڑھے تین روپیہ - کانٹے کی جوڑی تین روپے - زیورات ہمیشہ ایک روپیہ تولہ کے حساب سے واپس لئے جاسکتے ہیں سا گران کے علاوہ کوئی اور زیور بنوانا ہو تو اجرت اڑھائی روپیہ تولہ پہلے بھیجدیں ورنہ تعمیل حکم نہ ہوسکے گی اور کوئی بات پوچھنی ہو تو ایک آنہ کا ٹکٹ خط کے ہمراہ روانہ کردیں - یہ نقلی سونا ہم سے سلاخوں میں بھی تین روپے بارہ آنہ فی تولہ یا دس روپے کا تین تولہ کے حساب سے منگایا جاسکتا ہے تین تولہ پر محصول ڈاک معاف - ناپسند ہونے پر دو روز کے اندر واپس بھیجکر قیمت واپس منگالیں - یہ نقلی سونا کسوٹی پر گنی کا رنگ دیتا ہے - ایک تولہ سے کم نہیں مل سکتا -

فرنچ گولڈ سپلائی کمپنی بکس نمبر ۱۴۵ دہلی (A.L)

سات دن میں نئی جوانی!

ایک حیرت انگیز علاج

جوان بنانے کے کتنے ہی اشتہار شایع ہو رہے ہیں جن کی گنتی مشکل ہے۔ مشاہدات نے ثابت کیا ہے کہ کوئی دوا یا علاج اس مقصد کے لیئے کامیاب نہیں ہو سکا۔ محققین مدت سے اس تگ ودو میں لگے ہوئے تھے کہ آخر نامردی کے علاج میں کون سا طریقہ مفید اور کامیاب ہو سکتا ہے اور ہم کیونکر اس کے علاج میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں چنانچہ چند سال کی لگاتار اور لاانتہا کوششوں اور تجارب کے بعد

"ری جووین"

ایک ایسا نایاب علاج دریافت کر لیا گیا ہے جو حقیقت میں نامرد کو مرد بنا دیتا ہے۔ گیا گزرا مرد عیش و بُری باتوں میں مبتلا رہ کر اپنے جوہر حیات کو برباد کر چکا ہو۔ پورے سات دن میں تعجب انگیز طریقہ پر مکمل مردمی حاصل کر لیتا ہے۔ اگر اس کو وقت پر شرمندگی ہوتی ہو جوانی میں بڑھاپے کے آثار نظر آنے لگے ہوں غرضیکہ جوہر حیات کو برباد کرنے کے بعد جو بُری علامات ظاہری و اندرونی پیدا ہو گئی ہوں ان سب کو دور کر دیتا ہے اس علاج کا کمال یہ ہے کہ پہلی آدھ گھنٹہ میں دوا کا اثر محسوس کرنے لگتا ہے مگر شرط یہی ہے کہ کامل سات دن تک اپنے پر قابو رکھنا پڑیگا اگر بے صبری سے کام لیا تو اصول علاج میں خرابی آجائیگی اس لئے اس کورس کو صرف وہی حضرات منگائیں جو سات دن تک صبر سے کام لینے کا اقرار کریں

آپ مرد بننا چاہتے ہیں؟

تو میدان میں آیئے اور "ری جووین" کا کرشمہ دیکھیئے۔ نہیں بتایا جا سکتا کہ طاقت کا کیا حال ہوگا۔ آپ خود ہی دیکھ لیں گے کہ "ری جووین" یقیناً جادو کی طرح اثر کرتا ہے۔ تیر کی طرح لگتا ہے اور ساری شرمندگی اور ندامت ختم ہو جاتی ہے اور حیرت ہونے لگتی ہے کہ ہم کیا تھے اور کیا بن گئے۔ تجربہ کر لیجیئے۔ سچائی کو آزما لیجیئے آپ کی کمزوری طاقت میں تبدیل ہو جائیگی۔ ہر خوراک جسم میں خون ہی خون بنا دے گی مردہ اعصاب کو جگا دیگی۔ بس ان ہی دنوں میں ضبط سے کام لیا جائیگا اعضا کی جملہ خرابیاں دور ہو جائینگی۔ اس علاج کے موجد نے دو دواؤں کا کورس ایجاد کیا ہے ایک کھانے کی دوا "وبلڈن" اور دوسری لگانے کی دوا "فاسفورس آئل" ہے اس کورس میں دونوں دوائیں پوری تعداد میں ہوتی ہیں جو ایک مریض کے لئے بالکل کافی ہوتی ہیں۔ یہ طاقت مردمی اور دوبارہ جوانی کا طلسمی بکس کہلاتا ہے خدا کی ذات پر یقین کیجیے جس نے اس کورس کے محقق کو معلومات اور تجربات کی دنیا میں خدمت خلق کے لئے وقف کر دیا ہے۔ آزمایئے اور حیرت کیجیئے "ری جووین" اس صدی کا انمول علاج ہے۔ ہر عمر اور ہر مزاج کا انسان اس سے ہر موسم میں فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ مکمل کورس کی قیمت پانچ روپے ڈاک محصول کے سات آنے خرچ ہونگے اگر فائدہ نہ ہو تو قیمت واپس یا دوبارہ دوا مفت جھوٹ بولنا حرام ہے۔

ملنے کا پتہ

اکسیری دواخانہ کلاں محل دہلی

گاڑی کے سفر میں

افسانہ

از جناب رحمت علی صابر نور محلوی

گاڑی کا سفر کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔ بعض اوقات دل و دماغ پر ایسے غیر فانی نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ کہ باوجود کوشش کے ہم انہیں مٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ شروع ستمبر کے دن تھے۔ میں ایک شادی میں شریک ہونے کی غرض سے چھٹی لے کر گھر جا رہا تھا۔ سارا دن بعض فرائشتی چیزوں کی خرید و فروخت میں لگے رہنے کی وجہ سے تھک کر چور ہو گیا تھا۔ اس لئے جیسے ہی میں سیکنڈ کلاس میں سامان رکھوا کر ایک نشست پر لیٹا۔ فوراً نیند آ گئی نہ جانے کب تک سوتا رہا۔ کہ یکایک پانی کی چند بوندیں میرے چہرہ پر پڑیں میں آنکھیں ملتا ہوا گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ شام کا جھٹپٹا پھیل چکا تھا۔ گاڑی کی بتیاں جل چکی تھیں۔ اور باہر دھیمے دھیمے بارش ہو رہی تھی میں نے جلدی سے کھڑکی کا شیشہ چڑھا دیا۔ اور منہ پھیر کر ڈبے میں بیٹھے ہوئے مسافروں کی طرف دیکھنے لگا

جب میں چار بجے شام کو دانا پور سے سوار ہوا تھا۔ تو ڈبے میں میرے علاوہ صرف دو مسافر اور تھے۔ ایک بنگالی بابو اور دوسرے ایک پنجابی ٹھیکیدار۔ بنگالی بابو تو پہلے ہی سے سو رہے تھے البتہ پنجابی ٹھیکیدار صاحب کچھ عرصہ تک تو چند نقشے دیکھتے رہے۔ پھر کوئی گورمکھی کا اخبار پڑھنے لگے۔ مگر اب جو اٹھا ہوں۔ تو ڈبے میں ٹھیکیدار صاحب کا تو کوئی پتہ نہ تھا۔ ہاں بنگالی بابو بدستور کونے کی ایک نشست پر پڑے خراٹے لے رہے تھے۔ اور ڈبے کے دوسرے کونے میں دیدہ زیب لباس میں ملبوس ادھیڑ عمر کی ایک خاتون بیٹھی پان چبا رہی تھی شکل و صورت تو خیر کسی زمانے میں ہو تو ہو۔ اس وقت تو اللہ اللہ خیر سلّا والا معاملہ تھا۔ مگر ایک بات نے مجھے چکر میں ضرور ڈال دیا تھا۔ وہ تھا ان کا اس عمر میں بناؤ سنگار سے والہانہ عشق اور بیش قیمت جواہرات کے پہننے کا شوق ..... ان زیورات کو وہ گھر میں تو ضرور پہن سکتی تھیں۔ مگر سفر میں اور وہ بھی رات کے سفر میں پہن کر گاڑی میں سوار ہونا میری نظروں میں کوئی عاقبت اندیشانہ فعل نہ تھا۔ پھر حیرت تو یہ تھی۔ کہ ان کے ہمراہ کوئی مرد بھی نظر نہ آتا تھا جس کی موجودگی میں ان کی حفاظت کا کوئی خاطر خواہ انتظام ہو سکتا۔ میں ابھی جواہرات اور چہرے کے مشاہدے ہی کر رہا تھا۔ کہ ان کی نگاہیں میری طرف اٹھ گئیں۔ اور مجھے اپنی جانب متوجہ دیکھ کر انہوں نے انتہائی بے پروائی سے مجھے سر سے پاؤں تک گھورا۔ اور پھر میری حیرت و سادگی کا آنکھوں ہی آنکھوں میں مذاق اڑاتی ہوئی باہر کی طرف دیکھنے لگیں۔ ان کے اس حقارت بھرے انداز سے مجھے دکھ تو بہت پہنچا۔ مگر کچھ کر نہ پانے کی وجہ سے جی ہی جی میں گھٹ کر رہ گیا۔ اور خفت مٹانے کی نیت سے تکیئے کے نیچے سے اخبار نکال کر پڑھنے لگا۔ اخبار پڑھتے ہوئے مشکل سے چند منٹ گذرے ہوں گے۔ کہ بڑی بی کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھیں "سلمیٰ! اب اٹھو بھی شام ہو گئی کیا سوتی ہی رہو گی!!"

یا مظہر العجائب! میں سمجھے بیٹھا تھا۔ کہ تنہا بڑی بی ہی کونے کی بنچ پر براجمان ہیں۔ مگر اب معلوم ہوا۔ کہ سلمیٰ نام کی کوئی اور ہستی بھی ان کی شریک سفر ہے۔ سلمیٰ کتنا پیارا اور حسین نام ہے۔ جب میں نے یہ نام سنا۔ تو اس طرح محسوس ہوا۔ کہ فضا میں ایک لطیف ارتعاش پیدا ہو گیا ہے جس کے نام میں اتنی رومانیت اور شعریت ہے وہ خود کیسی ہوگی؟ یہی دیکھنے کے لئے میں اخبار چھوڑ کر ادھر متوجہ ہو گیا۔ اتنے میں وہ اٹھ کر بیٹھ گئی...... الٰہی یہ خواب تھا یا حقیقت۔ کوئی اٹھارہ انیس سال کی ایک انتہائی حسین دوشیزہ بادامی رنگ کی ریشمی ساڑھی اور ہلکے نیلے رنگ کے آستین بریدہ بلوز میں ملبوس میری طرف پیٹھ کئے بیٹھی تھی۔ گو اس کے سرخ و سپید چہرے کا بہت ہی تھوڑا سا حصہ مجھے نظر آتا تھا۔ مگر اس سے میں نے اندازہ لگا لیا۔ کہ وہ اپنے دلفریب خد و خال اور جسم کی موزونیت کی وجہ سے اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ موم کی طرح سپید اور گداز دو نیم عریاں بانہوں میں پتلی پتلی طلائی چوڑیاں تھیں سیاہ گھونگریالے بالوں کی پریشان لٹیں ایک دلفریب انداز سے اس کے شانوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ کانوں میں فیروزے کے آویزے تاب حسن نہ لا کر عاشق خستہ جان کے دل کی طرح بار بار کانپ اٹھتے تھے۔ اس کی وہ صراحی دار گردن اور اس میں پڑا ہوا موتیوں کا ہار عجب بہار دکھا رہا تھا اس نے انگڑائی لینے کے لئے بانہیں پھیلائیں۔ سینے کے ابھار میں ایک حسین تموج پیدا ہوا۔ اور پھر بائیں ہاتھ کی حنا آلودہ ہتھیلی سے اپنے غنچے سے دہن کو چھپا لیا۔ جو جمائی لیتے وقت کسی نو شگفتہ کلی کی طرح کھل گیا تھا۔ انگڑائی سے فارغ ہوتے ہی اس نے ڈبے کا اندازہ لینے کے لئے آہستہ آہستہ گردن گھمائی مجھ جیسے تماشبینوں کے لئے اس کی نشہ جوانی میں [illegible]

سوتے ہوئے بنگالی بابو کے تنفس کے زور سے اٹھتے بیٹھتے جسم پر رکیں۔ اور پھر وہ شاید بڑی بی کی طرف مخاطب ہونے والی تھی۔ کہ معاً مجھ پر نظر پڑ گئی میں بے ساکت وصامت رہ گیا۔ اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مجھے میرے دوست جمالیات کا نقاد اور مبصر سمجھتے ہیں۔ اور مجھے بھی اپنی لطافت مذاق اور ذوق حسن پر مبالغہ کی حد تک ناز تھا۔ مگر اس کافر جمال حسینہ کو دیکھنے کے بعد سب مجھے اپنا قائم کردہ نظریہ حسن اپنی کوتاہ نظری اور غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوا۔ حسن و خوبی کی جملہ صفات سے متصف ایک ایسا نادر الوجود مجسمہ میرے روبرو تھا جسے دیکھنا تو ایک طرف، میں نے کبھی اس کا تصور بھی نہ کیا تھا۔ جوانی کی فردوسی رعنائیوں میں ڈوبی ہوئی، سر سے پیر تک مجسم شعر، سراپا نغمہ، پھول سے نازک ہاتھ۔ سیاہ رنگ کی خمار آلود آنکھیں، ملائک فریب معصوم چہرہ، سیب کی طرح چھوٹی سی ٹھوڑی اور ہونٹوں پر گلاب جیسی شگفتہ سرخی...... میں ایک محویت کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کہ پیچھے سے بنگالی بابو کے کھانسنے کی آواز سن کر میں چونک پڑا۔ اس نے ایک دلفریب انداز سے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور میں بھی باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر نہ جانے کیوں میری نگاہیں خود بخود ادھر اٹھ گئیں۔ بالکل اتفاقیہ طور پر وہ بھی میری طرف دیکھنے لگی۔ بے اختیار میں زیر لب کسی کا یہ شعر گنگنانے لگا ؂

ایک تو نشہ مئے اس پہ نشیلی آنکھیں ✣ ہوش اڑتے ہیں جو وہ نظر کرتے ہیں

میرے لب ہلتے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ مگر...... نہ جانے کیا دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے یاقوتی لبوں پر تو کیف پاش تبسم کی جھلک تھی مگر آنکھیں...... ان وہ حسین اور کیف بار آنکھیں اس کے دل کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے درد کی غمازی کر رہی تھیں۔ ممکن ہے میرا یہ اندازہ کسی نفسیاتی کمزوری کا نتیجہ ہو۔ یا پھر مجھے نظری دھوکہ ہوا ہو۔ مگر اس کے باوجود میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں۔ کہ میں نے اپنی بیدار آنکھوں سے ان مسرور و متبسم نظر آنیوالی نگاہوں میں غم بے حساب کو کروٹیں لیتے ہوئے دیکھا۔ شاید اسے اپنی چوری کے کھل جانے کا حال معلوم ہو گیا تھا۔ اس لئے جلدی سے اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور پھر ہنس ہنس کر بڑی بی سے باتیں کرنے لگی۔ اس نے مجھے غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش تو بہت کی۔ مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ اور اب بھی مجھے اس کے مترنم قہقہے کسی مضطرب و بیقرار روح کی صدائے بازگشت معلوم ہوتے تھے۔ اور میں محسوس کر رہا تھا کہ یہ ہنسی نہیں۔ بلکہ کسی کے غم پیہم نے گھٹی ہوئی ہچکیوں کی شکل اختیار کر لی ہے۔

رات کے دس بجے تھے۔ بڑی بی پہلے ہی کھانا کھا کر سو چکی تھیں بنگالی بابو نے بھی مختصر سا کھانا کھایا اور لمبی تان کر سو گئے۔ مجھے اشتہا نہ تھی۔ مگر نہ جانے اس حسینہ نے کیوں کھانا کھانے سے انکار کر دیا تھا باہر رم جھم رم جھم بارش ہو رہی تھی۔ دم بدم پردۂ سحاب سے بجلی عریاں ہو کر کبھی کبھی آنکھوں میں چکا چوند سی پیدا کر دیتی تھی۔ ہوا بدستور چل رہی تھی اور بارش کے قطرے کبھی کبھی نیم بند کھڑکی سے اندر گرنے لگتے تھے۔ اس وقت ڈبے میں صرف دو ہی ہستیاں جاگ رہی تھیں۔ ایک میں اور دوسری وہ حسینہ، جو ابھی تک کسی کتاب کی ورق گردانی میں مصروف تھی۔ اور میں اس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسوؤں کی وجہ معلوم کرنے کی فکر میں دل ہی دل میں ابتدائے کلام کے لئے الفاظ موزوں کر رہا تھا۔ کہ یکایک اس نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔ اور جمائی لیتے ہوئے اٹھی۔ کھڑکی کا شیشہ اتار کر اس نے چٹخنی لگا دی۔ اور پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔ میں اسے مخاطب کرنے کے لئے کچھ کہنے ہی والا تھا۔ کہ اس نے ایک دفعہ پھر جمائی لی۔ اور کروٹ بدل کر سو گئی۔ میں مایوس سا ہو کر کچھ عرصے تک پڑا سوچتا رہا پھر نہ جانے کب سو گیا۔

مجھے سوتے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہ گذرا ہو گا۔ کہ یکایک آنکھ کھل گئی میں حیران تھا کہ آنکھیں تو نیند کے مارے بند ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر میں جاگ کس طرح گیا۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ گاڑی اپنی پوری رفتار سے قطع منازل میں مصروف تھی۔ بڑی بی اور بنگالی بابو کے ملے جلے خراٹوں سے ڈبے کی خاموشی کا پردہ چاک ہوتا تھا۔ مگر وہ...... حسینہ اپنی جگہ پر نظر نہ آتی تھی۔ گو بنچ کی اوٹ ہونے کی وجہ سے نظر تو مجھے وہ پہلے بھی نہ آتی تھی۔ مگر سوتے وقت نشست کے آخری سرے پر اس کے حنا مالیدہ پاؤں کو نظر آنا چاہیئے تھا۔ مگر اب وہ بھی نظر نہ آتے تھے۔ شاید غسل خانے میں ہو۔ میں یہ سوچ کر آنکھیں بند ہی کرنے والا تھا۔ کہ چونک کر رہ گیا۔ وہ میری طرف پیٹھ کئے دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ اور آہستہ آہستہ اسے کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے اوضاع و اطوار اور حرکات و سکنات سے انتہائی رازداری کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ نہ چاہتی تھی۔ کہ دروازے کے کھلنے کے شور سے کسی کی آنکھ کھل جائے۔ جب نصف کے قریب دروازہ کھل گیا۔ تو اس نے اطمینان کرنے کی غرض سے آہستہ آہستہ گردن گھما کر پیچھے نگاہ ڈالی۔ میں نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ مطمئن ہو گئی اب اس نے منہ پھیر کر پورا دروازہ کھول لیا اور کوئی...... ہاں چلتی گاڑی سے کودنے کے لئے دروازہ میں کھڑی ہو گئی۔ میرے لئے پیچھے پڑنا مشکل ہو گیا۔ اثنائے سحر کی دیر لئے موت نے اسے پنجوں سے ہمکنار کر دیتی

خودکشی کی اس المناک واردات کو دیکھنے کے بعد میری کیا حالت ہوئی۔ اس کا اندازہ بھی میرے لئے ناممکن تھا۔ میں بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھا اور بمشکل تمام اس کا ہاتھ پکڑنے میں کامیاب ہو سکا۔ وہ ہاتھ چھوڑنے ہی والی تھی۔ کہ عین وقت پر میرے ہاتھ تھام لینے کی وجہ سے وہ نیچے گرنے سے بچ گئی۔ میں نے جلدی سے اسے اندر کھینچ لیا۔ اس کا چہرہ لاش کی طرح سفید تھا۔ اور وہ ملامت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے اپنا دل سینے میں ڈوبتا ہوا معلوم ہوا۔ اور مجھے اس طرح محسوس ہوا جیسے میں نے کوئی ناقابل معافی جرم کیا ہو۔ یہ احساس چند منٹ تک ہی میرے حواس پر طاری رہا۔ اور پھر میں اسے محبت سے سہارا دیتے ہوئے اس کی جگہ پر پہنچا آیا۔ وہ شکست خوردہ سپاہی کی طرح اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ میں نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر الفاظ گلے ہی میں اٹک گئے۔ اور میں کچھ کہے بغیر ہی اپنی جگہ پر آ گیا۔ اس کی ہستی میرے لئے ایک راز تھا۔ ایک ناقابل حل معمہ۔ جسے میں نے جتنا بھی سمجھنا چاہا۔ وہ اتنی ہی پراسرار ہوتی گئی۔ وہ دیکھنے میں کسی خوشحال گھرانے کی چشم و چراغ معلوم ہوتی تھی۔ ہر طرح کا سامان عیش اسے میسر تھا حسن و خوبی کے لحاظ سے بھی فطرت نے اسے بڑی فراخدلی سے نوازا تھا۔ ناز بردار ماں کی محبت بھری گفتگو ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ پھر نہ جانے کیوں وہ جان دینے پر تلی ہوئی تھی۔ آخر اس کے رونے کا کیا سبب تھا۔ وہ کیوں جان دینا چاہتی تھی اسی قسم کے رجنوں سوال یکے بعد دیگرے میرے دماغ میں اٹھنے لگے مگر جواب کسی کا بھی نہ ملتا تھا۔

چند منٹ بعد اس کی سسکیوں کی آواز سن کر میں اور بھی بے چین سا ہو گیا۔ اس کے سینۂ پنہاں سے لبریز سسکیاں میرے دل و دماغ پر جراحت کر رہی تھیں۔ بڑی بی کی آنکھ کھل گئی۔ اور وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ بابو بنگالی بابو کی بھی نیند اچاٹ ہو گئی اور وہ گھبرائی ہوئی نظروں سے کبھی بڑی بی کو اور کبھی اس گریاں و نالاں حسینہ کو دیکھنے لگے۔ مگر میں بدستور لیٹا رہا۔ بڑی بی اس کے پہلو میں بیٹھ کر تسلی دے دیکر رونے کی وجہ پوچھنے لگی۔ جواب دینے کی بجائے اس نے بڑی بی کے سینے سے سر لگا دیا۔ اور زور زور سے رونے لگی۔ "کیا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے بیٹی!" بڑی بی پوچھ رہی تھی۔ مگر وہ برابر روئے جا رہی تھی۔ "کچھ کہو تو آخر ہوا کیا۔ جو تم یوں بلک بلک کے رو رہی ہو" بڑی بی نے دوبارہ کہا۔ مگر وہ پھر بھی روتی رہی۔ بڑی بی کی بے چینی قابل دید تھی۔ اس غریب کی سمجھ میں رونے کی وجہ نہ آتی تھی۔ میں جانتا تھا۔ مگر تمہارے کی ہمت نہ تھی۔ کہ وہ جان دینا چاہتی تھی۔ مگر میری بروقت مداخلت نے اس کے دل کا ارمان نہ نکلنے دیا۔ اور یہ تو خدا ہی جانتا ہے۔ کہ وہ کیوں جان دینا چاہتی تھی......

"سلمیٰ! چپ ہو جاؤ بیٹی" بڑی بی بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "تمہارے رونے سے مجھے کتنا دکھ ہوتا ہے۔ اس کی بھی تمہیں خبر ہے۔" یہ کہکر اس نے اپنے آنچل سے اس کے آنسو پونچھے۔ مگر آنسو تھے۔ کہ ساون بھادوں کی جھڑی کی طرح تار ہی نہ ٹوٹنے دیتے تھے۔

"اچھی... بھلا یوں بھی کوئی روتا ہے"۔ بڑی بی اسے بھینچ کر سینے سے لگاتے ہوئے بولی "چلو ہنسو...... ہنسو ہنستیں! تو لو میں بھی رو دی ہوں" بڑی بی نے ایک ہی دو دفعہ آنچل سے اپنی آنکھوں کو چھوا تھا۔ کہ سسکیاں دھیمی ہوتے ہوتے بالکل بند ہو گئیں۔ بڑی بی نے اسے گدگدا کر ہنسانے کی کوشش کی۔ مگر وہ محض مسکرا کر ہی رہ گئی اور تھوڑی دیر بعد بڑی بی نے اسے تھپک تھپک کر بالکل ننھی سی بچی کی طرح سلا دیا۔ اور خود بھی سو گئی۔ بنگالی بابو جو اس حیرت انگیز ڈرامے کو خاموشی سے بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ جمائی لے کر اٹھے۔ اور کوٹ کی جیب سے ایک بیڑی نکال کر سلگائی۔ اور کش لگاتے ہوئے اپنی سیٹ پر دراز ہو گئے۔ میں بھی طرح طرح کے خیالات میں الجھا ہوا دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔

صبح چھ بجے کے قریب میری آنکھ کھلی۔ سورج حجلۂ مشرق سے زعفرانی رنگ کی بدلیوں کی نقاب اوڑھے ہوئے آہستہ آہستہ نمودار ہو رہا تھا۔ موسم بے حد خوشگوار تھا۔ مطلع ابر آلود تھا۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں اس دلفریب منظر سے پوری طرح لطف اندوز بھی نہ ہونے پایا تھا۔ کہ معاً میری نظر اس بنچ کی طرف اٹھ گئی۔ اور یہ دیکھ کر میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ کہ بڑی بی اور وہ پراسرار حسینہ اب اپنی جگہ پر نہ تھیں۔ اور ان کا سامان بھی غائب تھا۔ شاید راستے ہی میں کسی اسٹیشن پر ان کا سفر ختم ہو چکا تھا۔ اور وہ اتر گئی تھیں۔ مگر میرا دل نہ جانے کیوں ڈانوانڈول سا ہونے لگا۔ میرے کٹے ہوئے ارادوں پر پانی پھر گیا۔ اور اس طرح محسوس ہونے لگا۔ جیسے میری کوئی چیز گم ہو گئی ہو۔ میں کھڑکی سے سر لگا کر گم سم بیٹھ گیا۔ اور کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اور اب میں کیا سوچ رہا تھا۔ یہ مجھے معلوم نہیں۔

جب طبیعت کی گرانی ناقابل برداشت ہو گئی۔ تو میرے لئے بیٹھے رہنا دشوار ہو گیا میں نے بڑی بے دلی سے سگریٹ سلگایا اور......

میں لیٹتے لیٹتے اٹھ بیٹھا۔ میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں اور میں کسی فالج زدہ مریض کی طرح ساکت و صامت بیٹھا اس چیز کی طرف گھور رہا تھا۔ جو میرے تکیہ کے نیچے سے برآمد ہوئی تھی۔ آپ جانتے ہیں۔ کہ وہ کیا تھا! ایک مجلد کتاب تھی...... سبز رنگ کے کپڑے سے منڈھی ہوئی...... اور مجھے اپنی آنکھوں پر اس لئے اعتبار نہ ہوتا تھا کہ یہ وہی کتاب تھی۔ جسے رات کو سونے سے قبل وہ حسینہ لیٹی ہوئی پڑھ رہی تھی...... میں نے جلدی سے اسے اٹھا لیا۔ تاکہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ دیکھنے کے لئے مانگ نہ بیٹھے۔ اور جلدی جلدی ورق گردانی کرنے لگا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا۔ کہ یہ کیسے میرے تکئے کے نیچے آ گئی ہے۔ یا پھر اس حسینہ نے کس مقصد سے اسے یہاں رکھا! مگر آخری صفحے پر۔ مجھے چند سطریں لکھی ہوئی نظر آئیں۔ الہٰی! یہ تو کوئی خط تھا۔ جو جلدی میں کسی نے پنسل ہی سے گھسیٹا ہوا تھا۔ میں پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔

"محترمی......!

معاف کیجئے گا کسی تمہید و تعارف کے بغیر ہی آپ کو مخاطب کرنے کی جرأت کر رہی ہوں۔ اور سچ پوچھئے تو ان سطور کے قلمبند کرنے کا اصل محرک۔ آپ کا وہ جذبۂ ہمدردی تھا۔ جس کا مظاہرہ آج رات آپ نے ایک بے بس و مجبور خاتون کو موت کے پنجے سے چھڑا کر کیا ہے اگر میں ان حالات سے دوچار نہ ہوتی جن کے پیش نظر میں یہ اقدام کرنے پر مجبور ہوئی تھی۔ تو شاید آپ کے اس قابل فخر کارنامے کو میں بھی سراہتی مگر...... اب یہ سوچ رہی ہوں۔ کہ اس کارگزاری پر آپ کو مبارکباد دوں۔ یا فطرت انسانی کے اس جذبے کا ماتم کروں جس سے متاثر ہو کر آپ نے مجھے مرنے سے بچایا۔ میرے خیال میں تو آپ نے ایک آوارہ گشت اور بے پناہ لڑکی کو خودکشی سے باز رکھ کر کوئی قابل فخر کام نہیں کیا۔ کاش یہ آپ کو معلوم ہوتا۔ کہ جس کارنامے پر آپ کو ناز ہے۔ جسے شاید آپ اپنی زندگی کا شاہکار سمجھ بیٹھے ہیں۔ فی الحقیقت ایک بدترین گناہ اور ایک ناقابل تلافی جرم ہے۔ آپ نے آج ہمدردی کے پردے میں جو ظلم مجھ پر کیا ہے۔ یہ جاننے کے بعد شاید آپ بھی اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھیں گے......

میری شریک سفر خاتون جسے آپ شاید میری ماں سمجھے ہوئے ہیں۔ حقیقتاً میری ماں نہیں۔ بلکہ ایک ایسی عورت ہے جس کی میرے دل میں عزت ہے۔ اُس نے مجھے اس وقت پناہ دی۔ جب دنیا کے تمام دروازے مجھ پر بند ہو چکے تھے! اور میں نئی روشنی کا شکار ہو کر تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ اپنی بدنامی کے خیال سے مجھے میرے والدین نے بھی گھر سے نکال دیا تھا۔ میں اس کی اس ہمدردی کو مرتے دم تک نہ بھولوں گی...... مگر مجھے اس کا کاروبار پسند نہیں کاروبار آپ خود ہی سمجھ لیں۔ کہ وہ کیا کرتی ہو گی۔ آج تک نوخیزی کی صورت سے میں گناہ آلود ماحول میں رہنے کے باوجود بچی رہی تھی۔ مگر آج وہ مجھے ایک ایسی جگہ لے جا رہی ہے۔ جہاں پہنچ کر میری عصمت و عزت کا محفوظ رہنا محال ہی نہیں بلکہ غیر ممکن ہے۔ اس لئے ارادہ تھا۔ کہ اس نامراد زندگی کا راستے ہی میں خاتمہ کر لوں۔ تاکہ وہ اس گناہ کی دوبارہ مرتکب نہ ہوں۔ جس کی بنا پر مجھے یہ دن دیکھنا پڑا۔ اور سوسائٹی نے اپنے وسیع و عریض دامن کے نیچے پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ شاید میں کامیاب بھی ہو جاتی۔ مگر آپ کی بے وقت مداخلت نے میرے دل کا ارمان پورا نہ ہونے دیا اور میرے ہاتھ سے وہ آخری موقعہ بھی نکل گیا۔ جو نہ جانے کتنی منتوں اور آرزوؤں کے بعد مجھے ملا تھا۔ یوں تو مرنے کے ہزاروں طریقے ہیں۔ مگر میں تو بقول شاعر...... ؎

ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا۔

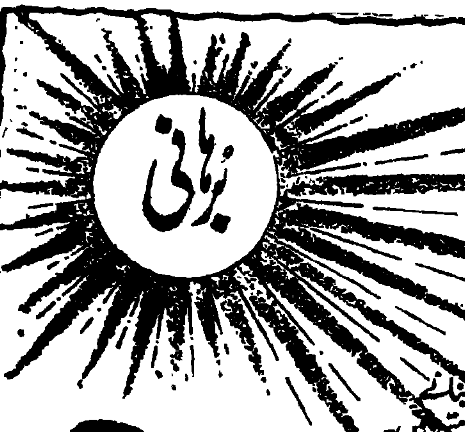
ایسی ہی موت مرنا چاہتی تھی۔ مگر نہ سکی کیونکہ آپ نے مجھے مرنے دیا ہوتا......

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ کہ میں اپنے آپ کو اس گناہ آلود ماحول کا خوگر بنا لوں۔ اور زندہ رہنے کے لئے وہی طریقہ اختیار کروں۔ جو میری طرح سوسائٹی کی ٹھکرائی ہوئی ہزاروں آوارہ بخت دوشیزائیں کئے ہوئے ہیں۔

خیر خدا کو یہی منظور تھا۔ تو اس میں میرا اور آپ کا کیا قصور ہے۔ البتہ تقدیر سے یہ گلہ ضرور ہے۔ کہ اس نے مجھے ایک بزدلی سی لغزش پر اتنی بڑی سزا دی جس کے میں قابل نہ تھی...... خیر اب اس کا ذکر فضول ہے۔ میں آپ کی زیادہ سمع خراشی نہیں کرنا چاہتی اس لئے پھر کبھی ملنے کی آرزو لے کر رخصت ہوتی ہوں۔ خدا حافظ

محترمہ "تمنا سلمیٰ"
......

خط کے ختم ہوتے ہی میں نے بے اختیار سر پیٹ لیا۔ میں خود اپنی نظروں میں دنیا کا بدترین انسان تھا۔ جس نے اپنی حماقت سے "گناہ کی بستی" میں ایک اور مظلوم ہستی کا اضافہ کر کے ایک ایسے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ جس کی شاید قیامت تک تلافی نہ ہو سکے اور کبھی بھی شرمندۂ عفو نہ ہو...... شاید......



دل و دماغ کی روشنی

معدہ اور جگر کو خون کی پیدائش کیلئے صحتیاب کریں

زمانۂ حال کی ایک بہترین ایجاد

کیمیائی تحقیقات اور طبی تجربات کے ذریعہ سے ادویہ کے نئے اثرات اور ان کے بنانے کے نئے طریقے معلوم ہوتے رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ روز بروز ادویہ عمدہ اور زیادہ زود اثر تیار ہوتی ہیں۔



حیات انسانی صرف خون کی پیدائش پر منحصر ہے خون صالح ہی سے جسم میں تازگی چہرے پر جوانی کی بہار قوت اعصاب قلب میں تفریح دماغ میں قوت دل میں اُمنگ قوت مردمی، جوش جوانی اور لطف زندگی پیدا ہوتا ہے اور خون کی پیدائش کا دارومدار معدہ اور جگر کی صحتیابی پر منحصر ہے

برہانی کے اجزا:۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے "برہانی" تمام ادویات مفید کے علاوہ کئی قسم کے اعلیٰ خشک میوہ جات، مفرحات مشک اور تریاقی ادویات سے پے در پے جدید تجربات کے بعد تیار کی گئی ہے اس کے اجزا ایسے ہیں جو جسم کے اندر کسی خرابی سے پیدا شدہ زہریلے مادے کو نکال کر طبیعت کو فوراً ٹھیک کر دیتے ہیں۔



گارنٹی آپ کی حفاظت کرتی ہے استعمال کے بعد خالی پیکنگ واپس کر دیں کہ فائدہ نہیں ہوا تو پوری قیمت واپس وصول کیجئے

برہانی کی تاثیر:۔ پٹھوں نسوں دل و دماغ کو قوت دیتی حافظہ اور دماغ کی قوتیں بیدار کر کے زندگی میں ایک نئی حرکت لاتی ہے تھکاوٹ، سر درد، بدہضمی، نیند کی کمی، جسمانی کمزوری، دماغی کمزوری، دردنس، جوڑوں کا درد، خون کی کمی، عام کمزوری، ضعف اعصاب و تمام جسمانی کمزوریوں کو دور کرتی ہے۔

قیمت فی شیشی دو روپے صرف

سول ایجنٹ:۔ سجاد اینڈ کمپنی (میڈیسن ڈیپارٹمنٹ) لٹن روڈ۔ لاہور

BURHANI

دل و دماغ مردانہ قوت، جوانی بحال کر کے زندگی کا لطف اور مسرت بخشتی ہے!

SUPREME REJUVENATING TONIC

سائیٹو! آنکھوں کے امراض کیلئے بہترین دوا

آنکھوں کی بصارت میں کسی وجہ سے ضعف اور کمزوری آگئی ہو، آنکھیں دکھتی ہوں، سرخ ہوں، نظر کمزور ہو گئی ہو بغیر عینک کے لکھنا پڑھنا مشکل ہو ان تمام امراض سے نجات پانے اور آنکھوں کی خوبصورتی اور طاقت کو قائم رکھنے کیلئے سائیٹو کا استعمال آنکھوں کی گارنٹی ہے۔

قیمت تین روپے علاوہ محصولڈاک

مینجر دی گپتا ہیلتھ سٹورز۔ بی برانچ چوڑے موری لاہور



سفید داغ برص پھلبہری کا مجرب علاج

ہمارا قیصری روغن برص کو صرف دو یوم مالش کرنے سے بغیر کسی درد تکلیف کے سفید داغ جڑ سے جاتے رہیں تو کل قیمت واپس اعتبار نہ ہو تو پہلے اقرارنامہ لکھائیں اپنی حالت اور عمر ضرور تحریر فرمائیں قیمت فی شیشی ہے

اصلی ہندستانی شفاخانہ ۸۰ نمبر ۲ نئی دہلی

اورینٹل لائف انشورنس کمپنی لمیٹڈ

۲ر اکتوبر ۱۹۴۰ء کو اورینٹل گورنمنٹ سیکورٹی لائف انشورنس کمپنی لمیٹڈ کے حصہ داروں اور پالیسی ہولڈروں کا ایک غیر معمولی اجلاس کمپنی کے رجسٹرڈ ہیڈ آفس میں زیر صدارت سر پرشوتم داس ٹھاکر داس سی۔ آئی۔ ای منعقد ہوا صاحب صدر نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ پریمیم کی مد سے ۴۹۶۴۴۴۴ روپیہ آمدنی ہوئی جس سے ۳۰ فیصدی کا اضافہ ظاہر ہوتا ہے گذشتہ تین برسوں میں پریمیم کی آمدنی تسلی بخش ہے اور سود کی آمدنی بھی جو ۲۹۳۹۵۸۰۲ ہے ظاہر کرتی ہے کہ آمدنی میں ۲۷ فیصدی اضافہ ہوا ہے ان تین برسوں میں اموات سے جو دعاوی ادا کئے گئے ہیں ان کی مجموعی رقم ۱۸۹۹۴۷۲ روپیہ ہے یہ بہت تسلی بخش نتائج ہیں۔

وہ دعاوی جو پالیسی کی تکمیل پر ادا کئے گئے ہیں ان کی مجموعی رقم ۲۳۳۲۶۳۵ روپیہ بنتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قریباً ۳۵ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے۔

اس کے بعد صاحب صدر نے تحریک پیش کی کہ کمپنی کی رپورٹ بابت سال ۱۹۳۹ء منظور کر لی جائے اور اعلان کیا جائے کہ ایکچیوری نے جو منافع بتایا ہے وہ ۴۲۵۰۶ ۱۶۱ روپیہ ہے۔

اس تحریک کی سر کاؤس جی جہانگیر بیرسٹر نے تائید کی اس کے بعد مسٹر جے ٹی ہلانی، مسٹر چمن لال، مسٹر جے چند، مسٹر جے کپادیا اور مسٹر جے جے شرف نے مختلف موضوع پر تقاریر کیں اس کے بعد صاحب صدر نے مختلف استفسارات کے تسلی بخش جواب دیئے پھر رپورٹ کو منظور کر لینے کا رزلیوشن پیش کیا گیا چنانچہ یہ رپورٹ متفقہ طور پر پاس ہوگئی اور ہول لائف پالیسیوں پر ۱۸/ فی ہزار بونس اور میعادی پالیسیوں پر ۱۲/۰ فی ہزار بونس دینے کا اعلان کیا گیا موجودہ جنگ اور اقتصادی انتشار کے باوجود اورینٹل کمپنی کی یہ ترقی حیرت انگیز ہے۔ (مدیر عالمگیر)

یاد رکھئے

ٹریڈ مارک، لیبل کا ڈیزائن، ادویات و فرم کارخانہ وغیرہ کو گورنمنٹ آف انڈیا سے رجسٹرڈ کرانے کے لئے آج ہی پتہ ذیل سے مفصل قواعد اور قیمتی مشورہ مفت طلب کریں ہمیں نہایت معمولی ہر قسم کے اطمینان کی سو فیصدی گارنٹی ایک مقناطیسی اشتہار کا مضمون رجسٹری کی سرٹیفکیٹ کے ساتھ مفت

منیجر دی کلکتہ ٹریڈ مارک کمپنی رجسٹرڈ
چاندنی چوک نزد فتحپوری، دہلی

گھی کا مسئلہ حل ہو گیا

ان دونوں میں سے ایک پر عمل کیجئے

اصلی گھی حاصل کرنے کیلئے بھینس پالئے اور اس کو بنولے کھلایئے

یا

بنولوں سے بنا ہُوا

کوٹوجم

استعمال کریں!





مودی بناسپتی مینوفیکچرنگ کمپنی۔ بیگم آباد۔ یو۔پی

دس ہزار روپیہ کی گھڑیاں بالکل مفت

ہماری فارمیسی نے اپنی تین چمتکاری دوائیوں کی مشہوری کیلئے ہر شیشی کے خریدار کو دو فینسی رسٹ واچ مفت دینے کا فیصلہ کیا ہے جلدی کیجئے اور فائدہ اٹھائیے!

بال عمر بھر نہیں اُگتے ہماری مشہور دوائی جوہر حسن اصلی رجسٹرڈ کے استعمال سے ہر جگہ کے بال بغیر کسی تکلیف کے ہمیشہ کیلئے دُور ہو جاتے ہیں اور پھر زندگی بھر دوبارہ اس جگہ کبھی پیدا نہیں ہوتے جگہ ریشم کی طرح ملائم اور خوبصورت نکل آتی ہے قیمت فی شیشی ایک روپیہ پندرہ آنے ڈاک خرچ الگ ہر ایک شیشی کے خریدار کو دو فینسی رسٹ واچ مفت انعام دی جاتی ہے جس کی خوبصورتی اور مضبوطی کی گارنٹی دس سال ہے گارنٹی کا اقرار نامہ ہر گھڑی کے ساتھ بھیجا جاتا ہے

کالا تیل رجسٹرڈ یہ بار بار لگانے والا خضاب نہیں ایک آزمودہ چمتکاری تیل ہے معمولی تیلوں کی طرح اس کا استعمال کیا جاتا ہے اور اس کی خوبی یہ ہے کہ اس کے استعمال کرنے والے دنگ رہ گئے ہیں اس سے سفید بال ایک دم کالے ہو جاتے ہیں اور ہمیشہ پھر کالے ہی پیدا ہوتے ہیں یہ ہمارے پوجیہ سوامی جی کی ایک بھینٹ ہے جو دماغ کو ہر طرح کی طاقت پہنچاتا ہے آنکھوں کی روشنی بڑھاتا اور ٹھنڈک پہنچاتا ہے گویا بالوں کی یہ خوراک ہے قیمت فی شیشی ایک روپیہ پندرہ آنے ڈاک خرچ الگ ہر ایک شیشی کے خریدار کو دو فینسی رسٹ واچ مفت انعام دیجاتی ہے جس کی خوبصورتی اور مضبوطی کی گارنٹی دس سال ہے گارنٹی کا اقرار نامہ ہر گھڑی کے ساتھ بھیجا جاتا ہے

کالے بھی گورے ہو کر دکھائی دیں اگر آپ کے شریر اور منہ کا رنگ کالا پڑ گیا ہے تو اس دوا کا استعمال کیجئے اس سے چہرے کی چھائیاں۔ کالے داغ، کیل، پھنسیاں، چھپک کے داغ مٹ کر چہرے کا رنگ پھول کی طرح نکھر آتا ہے ہماری یہ ایک آزمودہ دوائی ہے جو شریر کا رنگ پلٹ کر دکھا دیتی ہے۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ پندرہ آنے ڈاک خرچ الگ۔ ہر ایک شیشی کے خریدار کو دو فینسی رسٹ واچ مفت انعام دی جاتی ہے جس کی خوبصورتی اور مضبوطی کی گارنٹی دس سال ہے۔ گارنٹی کا اقرار نامہ ہر گھڑی کے ساتھ بھیجا جاتا ہے۔

نوٹ:۔ ایک ساتھ تین شیشی منگوانے والے کو چھ گھڑیاں مفت اور ڈاک خرچ معاف۔ مال پسند نہ ہونے پر قیمت واپس کر دیجاتی ہے

ملنے کا پتہ: سنیاسی آیورویدک فارمیسی (A.S.L) کے ہسی امرتسر

امرتسر میں سونا دو روپیہ پندرہ آنے تولہ

منروا گولڈ کا گھر گھر میں چرچا!

مہربان دیکھیے اس کے متعلق دنیا کیا کہتی ہے جس گھر میں یہ نقلی سونا گیا وہاں سے دوبارہ سہ بارہ فرمائش آئی جناب لالہ ودیا رتن میونسپل کمشنر پٹھانکوٹ مورخہ ۱۵ ستمبر سے فرماتے ہیں کہ آپ کا منروا گولڈ کا پارسل ملا یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ منروا گولڈ اور اصلی سونے میں کوئی فرق نہیں آپ نے ۱۲ چیز کو تیار کر کے دنیا کی ایک بھاری ضرورت کو پورا کر دیا ہے ۲ تولہ میرے دوست کیلئے اور روانہ فرمائیں یہ سونا کسوٹی پر اصلی سونے کا رنگ دیتا ہے اصلی سونے کی طرح کوٹا اور پگھلایا جاسکتا ہے بالکل اصلی سونے کے برابر ہے ہوشیار سے ہوشیار صراف بھی مشکل سے پہچان سکتا ہے ہزاروں آدمی اس کی تعریف کے حق میں ہیں ناپسند ہونے پر قیمت واپس ہوگی۔ ہر قسم کے زیورات آج کل کے فیشن کے مطابق تیار ہو سکتے ہیں مشہوری کیلئے رعایتی قیمت ایک تولہ دو روپیہ پندرہ آنے تین تولہ -/۸/۷ چالیس تولہ -/۹۰ محصولڈاک سے پہلے ایک یا دو تولے کا آرڈر دیکر دیکھیں اور پھر بعد میں اکٹھا آرڈر دیں۔ (نوٹ) ایجنٹوں کی ہر جگہ ضرورت ہے +

ملنے کا پتہ: امریکن کارپوریشن K.C (A.S.L) امرتسر

رفتارِ زمانہ

عالمگیر واقعات پر ماہانہ تبصرہ

از ۔۔۔۔ شبلی ۔ بی کام

جنگِ یونان

۲۸ اکتوبر کی رات کو سفیر اطالیہ مقیم ایتھنز نے حکومت یونان کو اس مطلب کا الٹی میٹم دیا کہ اطالیہ کے "مطالبات" پانچ گھنٹے کے اندر اندر پورے کر دیئے جائیں ورنہ فاشی فوجیں یونان پر دھاوا بول دیں گی۔ یہ الٹی میٹم نہ تو قابلِ عمل تھا، نہ مسولینی ہی چاہتا تھا کہ یونان اس پر غور و خوض کرے۔ چنانچہ اگلے دن ہی اطالیہ نے اپنی فوجیں، جو پہلے ہی البانیہ و یونان کی سرحد پر جمع تھیں، اس ننھے سے ملک میں اُتار دیں۔ اور قمری و شہباز کی ایک خوں ریز جنگ شروع ہو گئی، جو تادمِ تحریر جاری ہے۔

تاریخ سیاسیات کے طالب علموں کے نزدیک یونان پر اطالیہ کا یہ حملہ کوئی "حادثہ" یا "اچانک واقعہ" نہیں ہے کیونکہ اٹلی قریباً نصف صدی سے مشرقی بحیرۂ روم کے شمالی ساحل پر مسلط ہونے کے خواب دیکھتا رہا ہے۔ اور ان خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے یونان کی تسخیر لازمی تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء میں بھی البانیہ کو نگلنے کے بعد مسولینی نے چاہا کہ یونان کو بھی لقمۂ استعمار بنا لے لیکن خوش قسمتی سے برطانیہ کا "اعلانِ تحفظ" آڑے آیا اور مسولینی کی تمنائیں بحیرۂ ایڈریاٹک کے ساحل پر غرق ہو کر رہ گئیں۔ موجودہ جنگ میں جب فاشی بھیڑیا جرمنی کے پیچھے پیچھے شکار کی تلاش میں نکلا تو سب سے پہلے اُس کی رال اسی عضوِ ضعیف کو دیکھ کر ٹپکی۔ لیکن جب تک "اتحادِ بلقان" کی چٹان رستہ میں حائل تھی، اُسے یونان کا رُخ کرنے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔ ادھر ہٹلر کو محسوس ہوا کہ جب تک بحیرۂ روم میں برطانی استحکامات زندہ سلامت ہیں وہ انگلستان کا بال تک بیکا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس نے شرقِ وسطیٰ کی طرف بڑھنے کی کوشش کی اور "اتحادِ بلقان" کی دیوار کو توڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ رستہ صاف دیکھتے ہی مسولینی کی مُردہ تمناؤں میں جوش پیدا ہوا اور وہ قشونِ قاہرہ کو ہمراہ لے کر یونان پر چل پڑا۔ مگر خوش قسمتی سے یونان اس کیلئے کوئی تر لقمہ ثابت نہیں ہوا۔ پنڈس کی پہاڑیوں اور ایپی رس کے میدانوں میں جس جرأت و بسالت اور بے نظیر شجاعت سے یونانی فوجوں نے اطالوی حملہ آوروں کا مقابلہ کیا ہے وہ بہت زیادہ حوصلہ افزا ہے۔ اور اگر یونانی فتوحات کی یہی رفتار رہی تو کوئی عجب نہیں کہ نہ صرف اطالوی فوجیں بے نیل مرام روم واپس جانے پر مجبور ہوں۔ بلکہ ہٹلری استعماریت کا اُمڈتا ہوا طوفان بھی بحیرہ ایجین کے ساحل پر آ کر رُک جائے۔ چنانچہ واقعات کی رفتار یہی بتاتی ہے کہ اگر جرمنی نے فاشی فوجوں کی امداد نہ کی تو انہیں ذلت آمیز حالات کا سامنا کرنا پڑیگا۔

یونان کو "محوری سازبلز" میں شامل کرنے کے لئے ہٹلر عرصہ دراز سے ڈورے ڈال رہا ہے۔ یونان ایک زرعی ملک ہے اور "بے حیثیت" ہونے کی وجہ سے اپنا مال "عالمگیر منڈیوں" میں فروخت نہیں کر سکتا۔ جرمنی نے اپنے پٹارے سے پُرانا شعبدہ نکالا۔ اور "خریدار" کا بھیس بدل کر یونان کے گلے میں رائخ کی غلامی کا ازلی و ابدی طوق ڈال دیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ نازی یونان کی پیداوار کے عوض چمکتا ہوا سونا پیش کرتے ہیں۔ بلکہ یہ خرید و فروخت "مبادلہ" کے اصول پر ہوتی ہے اور چونکہ حساب کتاب صاف کرنے کی کبھی نوبت نہیں آتی اور جرمنی ہمیشہ فائدہ میں رہتا ہے اسلئے وہ آہستہ آہستہ اس سرزمین پر "اقتصادی قبضہ" کرنے میں کامیاب ہو رہا ہے اور اب اپنے "حلیف" سے مل کر اس کے گلے پر استعماری چھری پھیرنے کا ناپاک ارادہ رکھتا ہے۔ اس قتل و غارت سے چونکہ برطانوی مفاد کو بھی شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اسلئے انگریزی فوجیں بھی حتی المقدر یونان کی امداد کر رہی ہیں، اور تازہ ترین اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یونان و برطانیہ کی متحدہ مساعی مشکور ہو رہی ہیں اور اطالوی بیڑے کو اسدرجہ زک پہونچائی جا چکی ہے کہ وہ جلد یا بدیر بحیرۂ ایجین کی محشر خرام موجوں میں غرق ہونے پر مجبور ہوگا۔

ترکی کا مستقبل

تسخیر یونان کی مہم کو کامیاب بنانے کے لئے جرمنی و اٹلی ہر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف وہ "اتحادِ بلقان" کو آمری محور میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو دوسری طرف جمہوریہ انگورہ کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ برطانیہ کا ساتھ چھوڑ کر محوری طاقتوں کی دوستی قبول

کرلے۔ جہاں تک "اتحادِ بلقان" کو "آمری محور" میں تبدیل کرنے کا سوال ہے جرمنی کو اس مقصد میں کسی حد تک کامیابی ہو چکی ہے۔ اور وہ یوگوسلافیہ۔ رومانیہ۔ اور ہنگری کو اپنے ڈھب پر لا چکا ہے لیکن جب تک استنبول کے مناروں کے عقب میں ترکوں کی بنیں لاکھ سنگینیں چمک رہی ہیں۔ ان تینوں ممالک کی دوستی اٹلی یا جرمنی کو کوئی فائدہ نہیں دے سکتی۔ کیونکہ یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ ترکی ہرگز برداشت نہ کریگا کہ جنگ کا دیوتا یورپی ٹرکی کے دروازے پر دستک دینے لگ جائے اور درّہ دانیال اور بحیرۂ باسفورس کا مستقبل معرضِ خطر میں پڑ جائے چنانچہ عصمت انونو اور سراج اوغلو بارہا اعلان کر چکے ہیں کہ اگر آمروں نے ترکی مفاد پر دست درازی کی تو بہادر ترک اپنی شمشیرِ دودم کو بے نیام کرنے پر مجبور ہونگے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں کا یہ نعرۂ شجاعت بہرے کانوں پر پڑا ہے۔ چنانچہ ہٹلر بلغاریہ کے رستہ نازی فوجیں گزار کر یونان پر حملہ آور ہونے اور اس طرح اپنے حلیف اٹلی کو امداد پہونچانے کے منصوبے باندھ رہا ہے اور اپنی سکیم کو کامیاب بنانے کیلئے روس سے بھی ساز باز کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوریہ انگورہ نے یورپی ترکی کو "محصور" قرار دیدیا ہے اور اب وہاں "مارشل لا" نافذ ہے۔ آئندہ کیا ہوگا؟ اس کا علم تو عالم الغیب کو ہے لیکن جہاں تک ظن و قیاس انسان کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر جرمنی اپنے ارادہ میں کامیاب ہوگیا تو ایک طرف عراق۔ عرب اور شام اور دوسری طرف نہر سویز اور شمالی افریقہ کا مستقبل بہت زیادہ تشویشناک ہو جائیگا کیونکہ یونان کی تسخیر کے پردہ میں آمرین دراصل انہی ممالک کو اپنے پنجۂ استبداد کا شکار بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن کیا نوبت اس حد تک پہنچ سکے گی؟ جب تک رائل ایرفورس کے جہاز مشرقی بحیرۂ روم کی حفاظت کیلئے موجود ہیں۔ اور ترک بلقان و ایشیا کے تحفظ و دفاع کیلئے سر بکف نظر آتے ہیں۔ اس سوال کا جواب یقیناً "نہیں" ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ آمرین کو انجام کار اپنی غلط روی کا خمیازہ بھگتنا پڑیگا۔

جنگ کے دوسرے محاذ

"چائنا میل" کے ایک مراسلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جاپان کے بحری بیڑے نے سیگون کے قریب آوارہ خرامی کرکے فرانسیسی ہندچینی کو ایک مرتبہ پھر دھمکی دی ہے کہ اگر اس فرانسی رقبہ کے بحری اڈے جاپان کے حوالے نہ کئے گئے تو وہ زبردستی اُن پر قابض ہونے کی کوشش کریگا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ گزشتہ ستمبر میں جاپان نے فرانسی ہندچینی کو الٹی میٹم دیا تھا کہ وہ اپنے بحری اور ہوائی اڈے جاپان کے سپرد کردے لیکن وہاں کے فرض شناس گورنر نے وشی گورنمنٹ کی بزدلی کے باوجود مقابلہ و مدافعہ کا اعلان کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عارضی طور پر جاپانیوں کی پیش قدمی رک گئی۔ لیکن جب تک فرانسی ہندچینی کی بندرگاہوں پر جاپان کا قبضہ نہ ہو وہ تھائی لینڈ (سیام) ملایا اور ولندیزی جزائر شرق الہند میں اپنے مجوزہ استعماری پروگرام کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا۔ اس لئے اب پھر اُس نے دستِ تطاول دراز کیا ہے اور محشر خرام جہازوں کے ذریعہ سے فرانسی ہندچینی کو مرعوب کر رہا ہے۔ اگر اُسے اپنی کوشش میں کامیابی ہوئی تو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ نہ صرف جنوبی بحیرۂ چین کا مستقبل خطرے میں ہے بلکہ سنگاپور اور خلیج بنگال بھی براہ راست "زرد خطرہ" کی زد میں آجائیں گے۔

یورپ کے مغربی سرے پر برطانیہ و جرمنی کی ہوائی جنگ جاری ہے۔ یونان کے محاذ پر مصروفیت کی وجہ سے اگرچہ طرفین کے حملوں میں وہ زور نہیں رہا جو اگست اور ستمبر میں نظر آتا تھا۔ تاہم رائل ایرفورس اپنے بہادرانہ کارناموں کا حوصلہ افزا مظاہرہ کر رہی ہے اور جزیرۂ برطانیہ کو خوفزدہ کرنے کے لئے ہٹلر نے جو ہوائی قلعہ تیار کیا تھا اُس کے پرزے روز بروز رود بار انگلستان کی تلاطم خیز موجوں میں غرق ہوتے نظر آرہے ہیں۔ لندن پر دن دہاڑے بم برسائے گئے۔ اور ساحلِ انگلستان کئی ماہ تک جرمن گولوں کے پھٹنے سے گونجتا رہا۔ اس کے باوجود انگریزوں کی ہمت و شجاعت میں کوئی فرق نہیں آیا اور نازی اُنہیں مرعوب یا دہشت زدہ کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اسلئے یقین کیا جاتا ہے کہ کم سے کم اس محاذ پر ہٹلریت کو مرگِ ناکامی کا تلخ جام پینا پڑے گا۔

فرانکو سے ہٹلر کی ساز باز جاری ہے۔ دونوں ڈکٹیٹر خلوت آرائی کر چکے ہیں اور خیال کیا جاتا تھا کہ جرمنی کی انگیخت پر سپانیہ بھی میدانِ جنگ میں آکودے گا اور جبل الطارق پر قبضہ کرکے بحیرۂ روم کا مغربی دروازہ بند کرنے کی کوشش کریگا۔ لیکن غالباً انقلاب اسپین کے ناخوشگوار اثرات ابھی اس ملک سے دُور نہیں ہوئے اور فرانکو اپنے آپ کو نازیوں کی بھٹی میں جھونکنے کیلئے فی الحال تیار نہیں پاتا۔ تاہم اُس نے پنجے پھیلانا شروع کردیئے ہیں اور اپنے ناخنِ استعمار کا سب سے پہلا شکار "طنجہ" کو بنایا ہے جو ایک گزشتہ معاہدہ کے مطابق "بین الاقوامی" حیثیت رکھتا تھا۔

شمالی افریقہ میں اطالوی فوجیں مصری سرحد پر آکر رک گئی ہیں

غالباً مسولینی کا ارادہ یہ ہے کہ پہلے یونان سے نمٹ کر نہر سویز پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی جائے۔ اس کے بعد شمالی افریقہ کے پروگرام کی طرف توجہ کی جائے گی۔ لیکن اس اثنا میں مصری فوجیں کیل کانٹے سے لیس ہورہی ہیں اور شاہ مصر نے اعلان کر دیا کہ اگر کسی یورپی طاقت نے مصر کی جانب نگاہِ بد سے دیکھا تو وہ پوری قوت سے اسکا مقابلہ کرینگے۔

سیاسیاتِ ہند

گاندھی جی نے اپنی مضحکہ خیز سول نافرمانی کی جو آگ مہاراشٹر کے ایک گاؤں میں سلگائی تھی۔ اس کے شعلے اب تمام ہندوستان میں پھیلائے جارہے ہیں۔ بہت سے کانگرسی لیڈروں نے اپنے آپ کو گرفتاری کیلئے پیش کیا ہے۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آسکا کہ پنجاب، بنگال اور سندھ میں سول نافرمانی کرنے سے کانگریس کا مقصد ہے۔ کیونکہ ان صوبوں پر نہ تو غیر ذمہ دار حکومتیں مسلط ہیں اور نہ یہاں آئین ہی معطل ہے۔ کیا اس اقدام سے کانگرس نادانستہ طور پر یہ ثابت نہیں کر رہی کہ اس کا اصل منشا انگریزی طرزِ حکمرانی کا مقابلہ کرنا نہیں بلکہ رائے عامہ کی نمائندہ حکومتوں سے ٹکرانا ہے؟

۵ نومبر کو سر جرمی رائسمین نے جنگی ضروریات کیلئے مرکزی اسمبلی میں ایک ضمنی بجٹ پیش کیا جس کی کانگرس پارٹی نے پُر زور مخالفت کی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ کانگرس پارٹی نے مدت سے مرکزی اسمبلی کا بائیکاٹ کر رکھا تھا اور اس اجلاس میں اسکی شمولیت کا مقصد محض اس بجٹ کی مخالفت میں (بقول رکنِ مالیات) مظاہرہ کرنا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیاب رہی اور یہ بجٹ رائے عامہ کی تائید و حمایت حاصل نہ کر سکا۔ اس بجٹ کو اسمبلی کے سامنے رکھتے ہوئے رکنِ مالیات نے جو حیرت انگیز انکشاف کیا وہ یہ تھا کہ ہندوستان آج کل دفاعی مصارف پر قریباً بیس لاکھ روپیہ روزانہ کے حساب سے خرچ کر رہا ہے۔ لیکن اس عدد پر کسی کو حیرت کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ آجکل جنگ کی وجہ سے تمام ممالک کے مصارف میں ناقابلِ یقین حد تک اضافہ ہو چکا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں وزارتِ جنگ برطانیہ کی طرف سے اعلان ہوا ہے کہ میدانِ جنگ میں برطانیہ کا قریباً ۹ ملین پونڈ (بیس کروڑ روپیہ) روزانہ خرچ ہو رہا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اگر ہندوستان محض پیشقدمی کے طور پر بیس لاکھ روپیہ روزانہ جنگ کے دیوتا کی نذر کرے تو یہ بعید از قیاس قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مالیات ہند کا اتنا بڑا اضافہ کس مد سے پورا کیا جائیگا؟ وزیرِ مالیات کی تجویز یہ تھی کہ انکم ٹیکس، سپیر ٹیکس اور کارپوریشن ٹیکس پر پچیس فیصدی زائد وصولی کی جائے۔ لفافہ پر ایک آنہ کی بجائے پانچ پیسے کا ٹکٹ لگایا جائے۔ اور اسی طرح تار اور ٹیلیفون کی فیس میں اضافہ کر دیا جائے۔ ان تدابیر سے وزیرِ مالیات کا اندازہ تھا کہ قریباً چھ کروڑ روپیہ کی رقم وصول ہو سکے گی جو متوقع سولہ کروڑ روپیہ کے خسارے کا قریباً تیسرا حصہ ہے۔ اسمبلی کی اکثریت نے اس مطالبہ کو بدیں وجہ مسترد کر دیا کہ یہ روپیہ ایک ایسی جنگ میں استعمال ہوگا۔ جو کانگرسیوں کے خیال میں ملوکیت پرستانہ مقاصد کیلئے جاری ہے۔ تاہم کونسل آف سٹیٹ میں اس مطالبہ پر ہمدردانہ بحث ہوئی اور اب یہ بجٹ مجلس منتخبہ کے سپرد کر دیا گیا ہے۔

سندھ کی فرقہ وار فضا بہت زیادہ مسموم ہو چکی تھی۔ ہر روز قتل و غارت کی خبریں آتی رہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فرقہ پرست سرمایہ دار حکومت کو اس صوبہ سے آئینی اصلاحات واپس لینے پر مجبور کر کے ہی چھوڑینگے۔ کچھ عرصہ پہلے سندھ پراونشل مسلم لیگ کمیٹی نے فسادات سکھر کی باقاعدہ تحقیقات کر کے ایک رپورٹ شائع کی تھی جس میں سندھ کی لاقانونی اور بے آئینی کا ذمہ دار بجا طور پر کانگرس اور ہندو مہاسبھا کو ٹھہرایا گیا۔ اس ماہ مولینا ابو الکلام آزاد سندھ تشریف لے گئے اور آپ نے مختلف پارٹیوں کے لیڈروں سے مبادلۂ افکار کر کے سندھ کی آئینی فضا کو پُرسکون بنانے کی کوشش کی۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کو اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیابی ہوئی اور اب سندھ میں ایک ایسی مخلوط وزارت قائم کی جائیگی۔ جس کو تمام پارٹیوں کا اعتماد حاصل ہوگا۔ ہم دل سے چاہتے ہیں کہ یہ تجربہ کامیاب رہے لیکن جب تک ہندو مہاسبھائی اور سندھ کے ہندو سرمایہ دار اپنی ذہنیت نہ بدلیں گے اور سندھی مسلمان ہر فتنہ کا مقابلہ اخوت و اتحاد کی قوت سے نہ کرینگے اس باب میں زیادہ کامیابی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

لاہور ——— ۲۸ نومبر ۱۹۴۰ء

مؤلفہ و مصنفہ حکیم ہربنس لال صاحب بہنی میڈیکل سپرنٹنڈنٹ مالک مطب [illegible]

"رتن پرکاش"

حکیم صاحب ممدوح طبی دنیا میں بخوبی مشہور ہیں۔ اور اس کے پیش نظر انہوں نے اپنے چودہ سالہ معمولہ مطب تجربات کا نادر و نایاب ذخیرہ کمال دریا دلی سے صاف کر کے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ اس کتاب کو یہ خصوصی امتیاز حاصل ہے کہ اس میں صرف وہی نسخہ جات درج ہیں جن کو ہزاروں مریضوں پر زود اثر اور مفید پایا جا چکا ہے، جن کو دیکھ کر اور بعد تجربہ آپ بیحد مسرور ہونگے۔ ان میں بعض مجربات ایسے بھی بلا کم و کاست درج کئے گئے ہیں جو کہ حکیم صاحب کو زر کثیر صرف کرنے اور نہایت محنت و مشقت سے بدقت حاصل ہوئے بلکہ صحیح اندازہ حاصل کنندہ ہی کر سکتا ہے۔ حکیم صاحب نے کمال دریا دلی سے ملک کی مشہور و معروف دوا کا نسخہ۔ دمہ کا پوڈر، فاقی والا نسخہ، سنگرہنی۔ اطریفل اور اولادِ نرینہ کے نسخہ جات بھی اس طبی گلدستہ میں بہاں کر دئیے ہیں۔ کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت [illegible]

پتہ:۔ منیجر [illegible] امرت اوشدھالیہ کہام ضلع جالندھر

نقلی سونا مقابلہ میں سب سے اوّل

پنجابی زبان کے سب سے پُرانے اُردو رسالے کی رائے

ستمبر کے پرچے میں آپ کو ایک اشتہار نقلی سونے کا ملیگا جو فرینچ گولڈ سپلائی کمپنی کی طرف سے چھپا ہے ہمارے رسالے کے ناظرین کو معلوم ہے کہ ہم کوئی جھوٹا اشتہار نہیں چھاپتے اور انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ جب انہوں نے دوسرے اخباروں اور رسالوں میں چھپے ہوئے گھڑیوں پستولوں اور سینا پاکی مشینوں کے اشتہار کی بابت پوچھا تو ہم نے صاف تبلادیا تھا کہ یہ سارے ٹھگ ہیں لیکن ہمیں خوشی ہے کہ اس کمپنی نے ملک کی غریبی اور شادی بیاہ کا کام چلانے کیلئے اس قسم کا سونا بنایا ہے جو سونے کی طرح چمکتا ہے اس سونے سے بنایا ہوا زیور کبھی کالا نہیں ہوتا غریبوں کو اپنے لڑکیوں کا بیاہ کرنے کے لئے سونے کی بڑی ضرورت رہتی ہے اس کمپنی نے نقلی سونا اصلی کی طرح معلوم ہونے والا بناکر ان کا پردہ بنا رکھا ہے آج کل لڑائی کے دنوں میں سونا بہت مہنگا ہے جو لوگ اصلی سونا خرید کر اپنی عزت برقرار نہیں رکھ سکتے وہ بھائی اس کمپنی سے سونا منگا کر اپنی ضروریات پوری کریں ہندوستان میں اور بھی بہت سے کارخانے نقلی سونا بناتے ہیں ہم نے سب کے سونے خرید کر انگوٹھیاں بنوائی تھیں لیکن اس کمپنی کا سونا سب سے بہتر نکلا پنجابی اس کمپنی سے ہر طرح کا کاروبار کر سکتے ہیں ہم نے یہ اشتہار پنجابی بھائیوں کی بہتری کیلئے مفت چھاپا ہے کیونکہ چندن وارثی لوگوں کے اشتہار نہ چھاپنے کی پالیسی کا فیصلہ کر چکی ہے اور اس پر بہت جلدی عمل شروع ہو رہا ہے قیمت فی تولہ تین روپیہ بارہ آنے محصولڈاک ۹ الگ تین تولہ کیلئے صرف دس روپے محصولڈاک معاف ـــــــ اس نقلی سونے کی تیار کردہ صرف چوڑیاں انگوٹھیاں اور کانوں کے کانٹے بندے ہی ہمارے ہاں مل سکتے ہیں باقی کوئی زیور تیار نہیں مل سکتا ہاں خریدار جو زیور چاہے بنوا کر بھیجا جاسکتا ہے بنوائی کی قیمت ۲ روپیہ تولہ کے حساب سے آرڈر کے ہمراہ آنی چاہیے بنے ہوئے زیوروں کی قیمت مندرجہ ذیل ہوگی سادہ انگوٹھی فی عدد ڈیڑھ روپیہ نگدار انگوٹھی فی عدد دو روپیہ چوڑی فی جوڑی ۳ روپیہ اس سونے کے بنے ہوئے زیور ہمیشہ ایک روپیہ تولہ کے حساب سے واپس لئے جاسکتے ہیں اگر ان کے علاوہ کوئی اور زیور بنوانا ہو تو بنوائی کی اُجرت پہلے بھیج دیں ورنہ تعمیل حکم نہ ہوسکے گی اور کوئی بات پوچھنی ہو تو ایک آنہ کا ٹکٹ خط کے ہمراہ روانہ کریں۔

فرینچ گولڈ سپلائی کمپنی ڈی بکس نمبر ۴۵ دہلی (A. L)



سیاسیاتِ اسلامی پر لاجواب کتاب

دُنیائے اسلام کا ماضی و مستقبل

مصنفہ مولانا اظہر امرتسری سابق مدیر زمیندار

اسلامی تاریخ پر سیکڑوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن ایسی کتاب مشکل سے ملیگی جس میں تاریخ
کی سیاسی رفتار بتائی گئی ہو اس کتاب سے یہ ضرورت بوجہ تمام پوری ہو گئی ہے
فاضل مصنف نے ترکی۔ ایران، مصر، مراکش، الجزائر، تونس، طرابلس، حجاز، عراق،
نجد، فلسطین، یمن، سوڈان، شام، افغانستان کی تاریخ سیاسی انقلابات کی روشنی میں
لکھی ہے جس میں ماضی و مستقبل کی روشنیوں سے بتایا گیا ہے کہ اس انقلاب انگیز زمانہ
میں اسلامی ممالک کی راہِ عمل کیا ہے اور جنگ کے ہاتھوں جس مستقبل کی تعمیر ہو رہی ہے اُس
میں مسلمان کس درجہ حصہ دار ہیں کتاب اس علمی نگارش کی آئینہ دار ہے جو تاریخ و سیاست کے
امتزاج سے پیدا ہوتی ہے اور خشک حقیقتوں کو ادیبانہ لطافت کے گلفشاں لباس میں
پیش کیا گیا ہے سیاست، تاریخ، تنقید اور ادب کا اتنا جامع مجموعہ آپکی نظر سے گذرا نہ ہوگا۔

کاغذ، لکھائی، چھپائی اور ترتیب دلکش
جلد رنگین و قیمت ایک روپیہ۔

مسلمانوں کے عروج و زوال کا مرقع

تاریخ اسلام

از مورخ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی مرحوم ان محققین میں سے ہیں جو شبلی علم
تحقیق لے کر تاریخی دُنیا کے ہر گوشہ میں گھومتے رہے آپنے تاریخ
کو جو حقیقت افروز لباس پہنایا ہے اسکی مثال مشکل سے ملیگی تاریخ
اسلام کو نہایت محققانہ، ناقدانہ اور دلنشیں انداز میں پیش کیا گیا ہے
یہ تاریخ غلط روایات اور بیہودہ افسانہ طرازی سے پاک ہے
مسلمانوں کے عروج و زوال اور سیاست و حکمرانی پر واقعات صحیحہ
کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ جو حضرات تاریخ کو حقیقی شان
سے دیکھنا چاہتے ہیں وہ اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں
قیمت جلد اول للعہ رعایتی ہے جلد دوم للعہ رعایتی ہے۔ قیمت
جلد سوم ہے رعایتی ہے تینوں جلدوں
کی مجموعی قیمت رعایتی

ملنے کا پتہ۔ عالمگیر بک ڈپو۔ بازار سید مٹھا۔ لاہور

کتاب التقدیر

ضخامت
سات سو صفحات
بڑی تقطیع!

قیمت
تین روپے بارہ آنے
رعایتی ایک روپیہ بارہ آنے
علاوہ محصول ڈاک

حضرت امام ابن قیم کی شہرۂ آفاق کتاب کا اُردو ترجمہ

اس کتاب میں مسئلہ قضا و قدر کے ہر پہلو پر عقلی و نقلی دلائل اور فلسفہ و شریعت کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ فکر و نظر کی پختگی کا یہ عالم ہے کہ کسی مرحلے پر بھی وہم و تذبذب کے لئے گنجائش نہیں رہی لیکن فلسفہ و حکمت کے دقیق معارف اس شگفتگی اور لطافت کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں کہ مطالعہ کے وقت دماغ و وجدان کو فرحت محسوس ہوتی ہے۔ اور پیچیدہ ترین مسائل کو بھی حکایات و امثال کے ذریعے اس درجہ خوشگوار اور عام فہم بنا دیا گیا ہے کہ معمولی قابلیت کا آدمی بھی توحید و معرفت کے حقایق سمجھ سکتا ہے۔ اور ترجمہ کی فصاحت نے کتاب کی شان دوبالا کر دی ہے۔ بایں ہمہ قیمت اصلی لاگت سے بھی کم ہے۔ اس ارزانی کی وجہ یہ ہے کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے یہ کتاب مولوی کرم بخش امیونسپل کمشنر امرحوم و مغفور نے بصرفِ زرِ کثیر شائع کرائی تھی۔ لیکن ان کی رحلت کے بعد یہ علمی کارنامہ گوشۂ تغافل میں پڑا رہا ہے۔ آخر ہمیں یہ انمول موتی سستے داموں میسر آ گیا۔ اس لئے کتاب التقدیر انتہائی طور پر ارزاں بیچی جا رہی ہے۔ یعنی ۳/۱۲ کی بجائے صرف ۱/۱۲۔ چونکہ چند سو جلدیں باقی رہ گئی ہیں اس لئے فرمائشیں اولیں فرصت میں بھیجئے۔ ورنہ ہم تعمیلِ ارشاد سے قاصر ہوں گے

کتاب التقدیر کو خود پڑھیے اور دوسروں کو پڑھنے کی ترغیب دیجئے یہ سب سے بڑی علمی خدمت ہے

عالمگیر بک ڈپو - بازار سید مٹھا - لاہور

رسالہ عالمگیر کی شاندار ادبی خدمات

متقاضی ہیں کہ آپ اس کی سرپرستی قبول فرمائیں ہندوستان بھر میں صرف

''عالمگیر'' ہی ایک ایسا ماہنامہ ہے

- جو سترہ و اٹھارہ برس سے نہایت پابندیٔ وقت کے ساتھ شایع ہوتا ہے۔
- جس میں صرف ایسی یکرنگی و سہ رنگی تصاویر شائع کی جاتی ہیں جو مشرق و مغرب کے بہترین آرٹ کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔
- جس میں صرف بلند پایہ علمی و ادبی مقالات درج ہوتے ہیں۔
- جس کے افسانے نہایت دلچسپ اور طرزِ جدید کے مظہر ہوتے ہیں۔
- جس کا حصۂ نظم خاص طور پر معیاری اور وجد آفریں ہوتا ہے۔
- جس کے مستقل خریداروں کو حسبِ ذیل خاص اشاعتیں بالکل مفت نذر کی جاتی ہیں

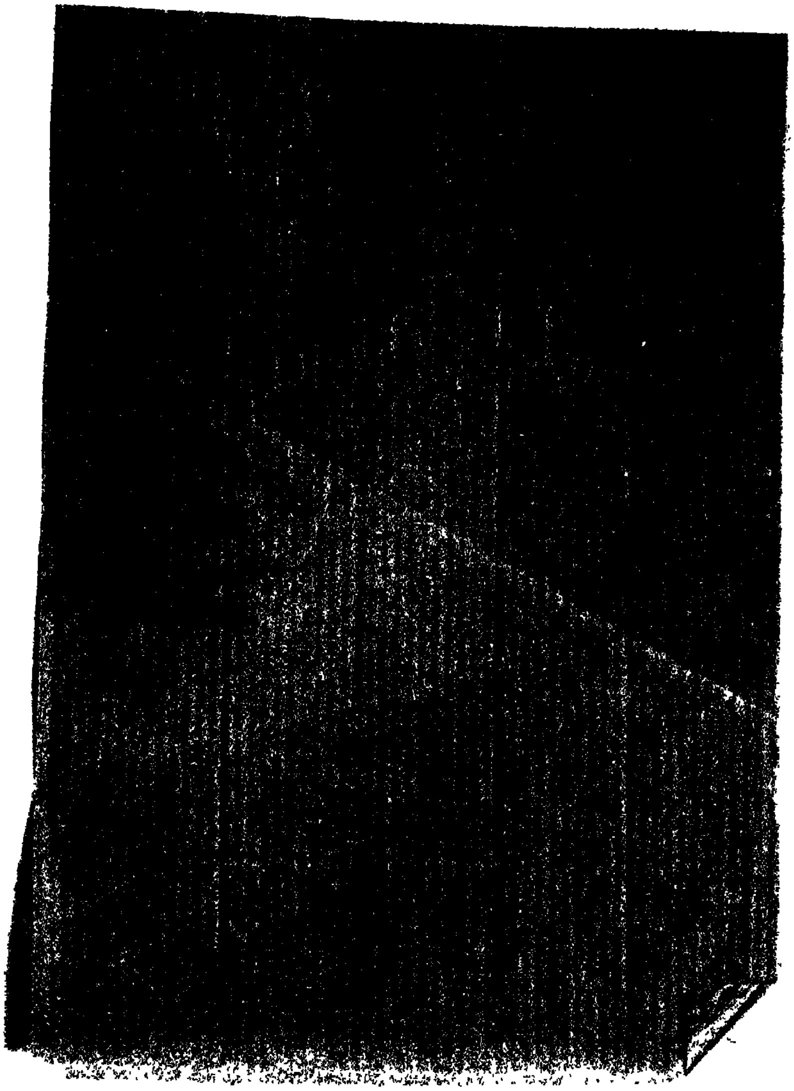
تاریخ نمبر	سالانہ نمبر	خاص نمبر
ماہ اپریل ضخامت ۱۵۰ صفحات	ماہ جون ضخامت قریباً ۳۰۰ صفحات	ماہ دسمبر ضخامت قریباً

باقی نو پرچے جن کی مجموعی ضخامت ۷۲ x ۹ = ۶۴۸ صفحات ہوتی ہے ان خاص نمبروں کے علاوہ پیش کئے جاتے ہیں

دوسرے الفاظ میں آپ ۱۳۹۸ صفحات کے بیش قیمت مواد کا صرف چار روپے چار آنے کی معمولی رقم میں مطالعہ کر سکتے ہیں

کیا اب بھی آپکو عالمگیر کا مستقل خریدار بننے میں تامل ہے

آج ہی ایک سال کی خریداری کے لئے فرمائش بھیجئے



دارالسلطنت حیدرآباد کا واحد بے مثل کارخانہ

جو یورپ کے مقابلہ میں ایسے بٹن (گھنڈیاں) تیار کرتا ہے

دکن بٹن فیکٹری حیدرآباد



منیوفکچررس آف

گولڈ بیکاٹ گولڈ سلور امیٹیشن سلور، پیور امیٹیشن انامل اینڈ ملٹری بٹن مختلف خوبصورت و دلکش ڈیزائن اور پائیداری میں

ٹریڈ مارک خریدتے وقت ہمارے کارخانہ کا ٹریڈ مارک ضرور ملاحظہ فرمائیے تاکہ نقلی مال کے دھوکہ سے محفوظ رہیں

پروپرائٹر: محمد غوث الدین گورنمنٹ کنٹراکٹر حیدرآباد دکن


عالمگیر
لاہور